پیامِ تعلیم

۷

جنوری ۱۹۸۴ء / جلد ۲۱ شمارہ ۱۰

اڈیٹر — ولی شاہجہانپوری

قیمت : ۲/۵۰ روپے / سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

قارئین کو نیا سال اور یوم جمہوریہ مبارک ہوں۔ خدا کرے کہ لون کا یہ سال ان زخموں کا مرہم ثابت ہو جو پچھلے کئی برسوں میں ملک و قوم بلکہ دنیا نے کھائے ہیں۔

۳۰ر جنوری مہاتما گاندھی کی شہادت کا دن ہے۔ اس دن کی مناسبت سے حامد اللہ افسر کی "گاندھی جی کی باتیں" پڑھیے۔

لیجیے ۱۹۸۴ء کا پہلا شمارہ حاضر ہے۔ ڈاکٹر قنبر احمد رضوی نے "مقدس ایشیا" کے بعد اس ماہ آپ کو جنوب کے ایک ایسے خطّے کی سیر کرانا شروع کیا ہے جہاں برف ہی برف ہے۔ برف کے سوا اور کچھ نہیں۔ یقین ہے کہ آپ اس انوکھے براعظم کی سیر سے محظوظ بھی ہوں گے اور اپنی معلومات میں اضافہ بھی کریں گے۔ سید محمود نقوی کی کہانی "سہ گوشیہ ہیٹ" دلچسپ کہانی ہے آپ کو پسند آئے گی۔ "دو شکاری" جاری ہے۔ خاصی پسند کی جارہی ہے۔

ڈاکٹر عرفان علیمی، ندیم انصاری، آفتاب عالم اور مدبرہ عثمانی کی کہانیاں بھی آپ کو پسند آئیں گی۔

نظموں میں ناوک حمزہ پوری اور سطوت رسول کی نظمیں بھی خوب ہیں۔

پیامی معمّے ۲ کا حل فروری کے شمارے میں شائع ہوگا۔ تیسرا معمّا اس ماہ شائع ہو رہا ہے۔

پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

کہانی: ارشد جمال حشمی
تصاویر: جاوید نہال حشمی
آج اتوار تھا۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ اسی لئے چنو، منو سے ملنے اس کے گھر چلا کر راستے میں اسے ایک پرس پڑا ہوا ملا۔
بچوں کا پرانا ساتھی
ماہنامہ
پیام تعلیم
دہلی
قیمت: ۲/۵۰
ارے! یہ تو منو کا پرس ہے
چلو، آج اسے خوب پریشان کروں گا۔
کیوں منو؟ خیریت تو ہے؟
پریشان دکھائی دے رہے ہو۔
کیا بتاؤں چنو، میرا
پرس کھو گیا ہے۔
کبھئی موتی! تم میرا منہ کیا تک
رہے ہو۔ چلو، جلدی سے پرس تلاش کرو۔
چنو! مجھے یقین ہے
موتی میرا پرس ضرور تلاش
کر لے گا۔
شاید موتی کو سراغ
مل گیا ہے۔
رُک جاؤ موتی رُک جاؤ،
میں پرس واپس کر رہا ہوں، رُک جاؤ۔
ہائے! بچاؤ! ارے باپ رے! آہ!
JAVED NEHAL
HASHAMI
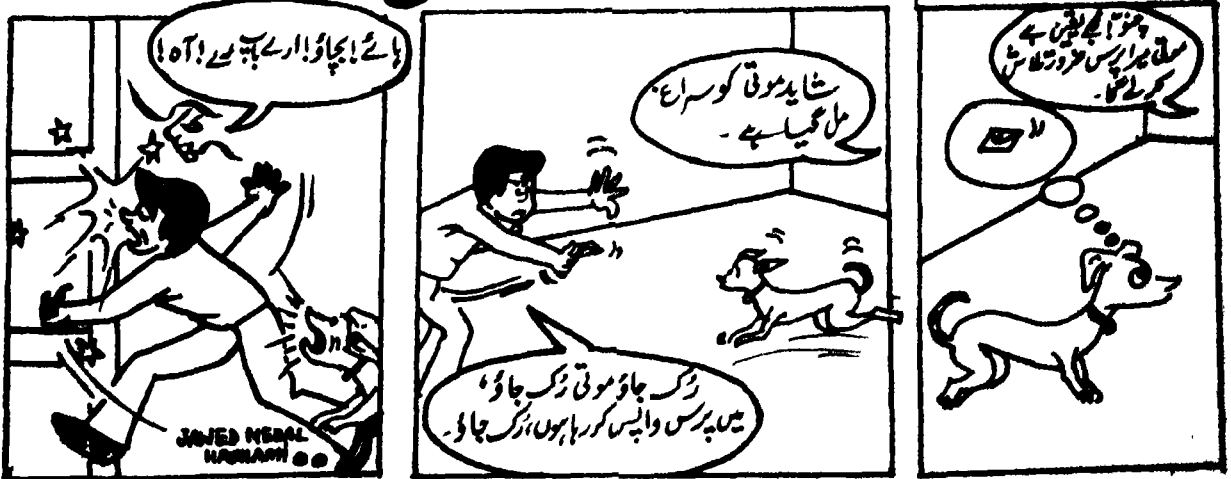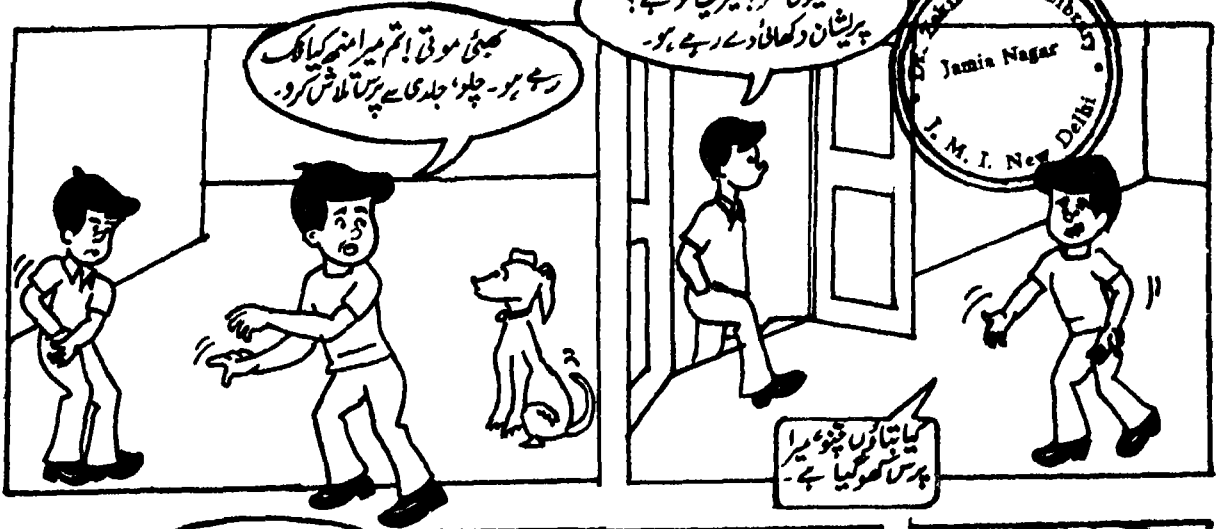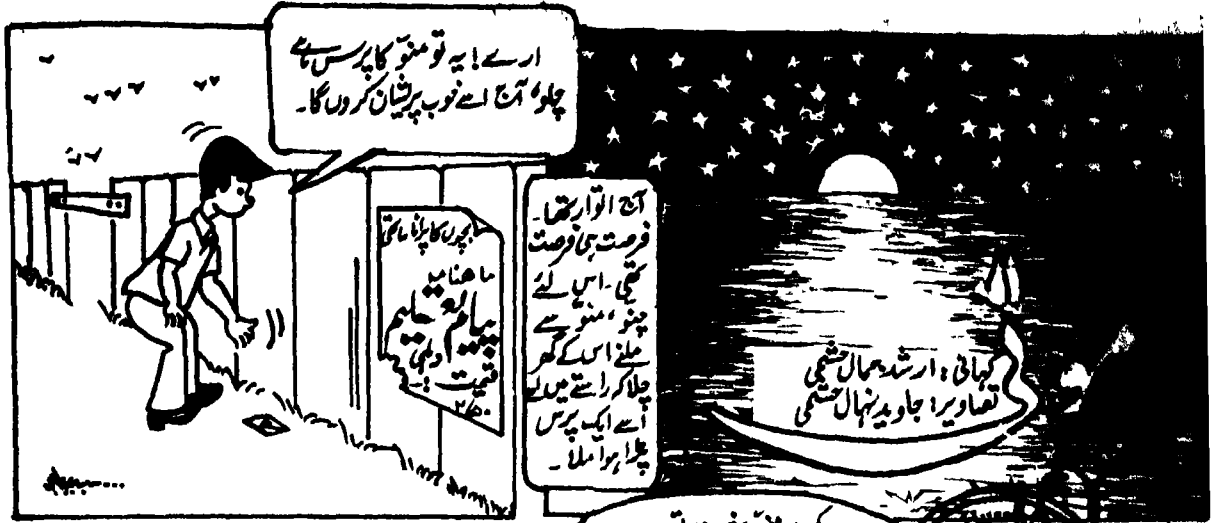
سطوت رسول

یہ جشنِ نو مُبارک چھبّیس جنوری کا

بھارت کے ہر بشر کو توفیق یہ خدا دے
دل سے بدی، بُرائی ہر شخص پھر مٹا دے
اور آشتی سے رہنا ہر قوم کو سکھا دے
یہ جشنِ نو مُبارک چھبّیس جنوری کا

آیئن زندگی میں اک روشنی سی آئے
ہر گھر میں رنگ بکھرے اور دیپ جگمگائے
ذرّہ مرے وطن کا اپنی مُراد پائے
یہ جشنِ نو مُبارک چھبّیس جنوری کا

تعبیر ہو جو پوری، صدیوں کے بند ٹوٹیں
خوابوں میں آج اپنے کتنے کنول سے چھوٹیں
اے کاش راس آئے، اہلِ ستم نہ لوٹیں
یہ جشنِ نو مُبارک چھبّیس جنوری کا

علی اسد

چور سیڑھی

شام کا دھندلکا ہوتے ہی خوانچے والوں نے اپنے اپنے ٹھیلے بڑھا دیے۔ سڑک پر ویرانی چھا گئی۔ سرد ہوا کے جھونکے ردی کاغذ کے ٹکڑوں کو ادھر ادھر اڑانے لگے۔ بابی جب روشن شاہ راہ سے گھوم کر اس اندھیری سڑک پر آیا تو اسے بہت برا لگا۔ اس سڑک پر تھوڑی بہت روشنی صرف اس بلب سے ہو رہی تھی، جو ایک بڑے سے دروازے کے اوپر جل رہا تھا۔ بلب کے نیچے موٹے حروف میں لکھا تھا:

"پیلس تھیٹر"
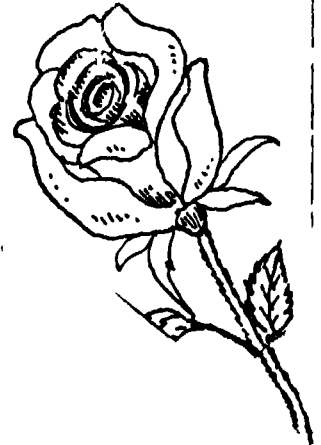
بابی نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر اور بھی اندھیرا تھا۔ وہ ذرا دیر کھڑا رہا تاکہ اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو سکیں۔ پھر اسے اسٹیج کے دربان کا کمرہ نظر آگیا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بابی نے اب تک جتنے تھیٹر دیکھے تھے، ان سب میں لندن کا یہ تھیٹر انتہائی بے رونق بلکہ کسی حد تک بھیانک تھا۔ وہ ڈرپوک نہ تھا پھر بھی اسے ایک جھرجھری آگئی۔ وہ سوئچ کی تلاش میں دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ اچانک ایک تیز روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ چیخ کر اچھل پڑا۔

"کون ہے؟" اس نے کانپتے ہوئے پوچھا۔ بہر حال جس آواز میں اسے جواب ملا وہ تحکمانہ تھی۔ اس سے بابی کی کچھ ڈھارس بندھی۔

"میں پولیس افسر ہوں، تم اس عمارت میں کیا کر رہے ہو؟" ٹارچ کی روشنی ذرا دیر کے لیے دوسری طرف ہوئی تو بابی نے پولیس والے کو دیکھا۔

بابی نے کہا، "تم نے تو مجھ کو ڈرا ہی دیا۔ میں اس تھیٹر کمپنی کے ساتھ ہوں جو اس ہفتے ڈرامے دکھا رہی ہے۔"

پولیس والے نے غرا کر کہا، "ڈراما تو ساڑھے سات بجے شروع ہوتا ہے، ابھی تو ساڑھے پانچ بجے ہیں۔"

بابی نے جلدی سے وضاحت کی، "بات یہ ہے کہ ہم لوگ کل ہی تو آئے ہیں تمام انتظامات کرنا ہیں

میں اسسٹینٹ اسٹیج مینیجر ہوں پردہ اٹھنے سے پہلے مجھے بہت سے کام کرنا پڑتے ہیں۔"

"کیا تم یہ ثابت کرسکتے ہو؟" پولیس والے نے پوچھا۔

"ابھی تو مشکل ہے، کیوں کہ ابھی تو کوئی بھی نہیں آیا ہے جو میرے بارے میں تصدیق کرسکے۔ مگر ہاں، میں اپنا کارڈ دکھا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا کارڈ پیش کر دیا، جس میں لکھا تھا کہ وہ اداکاروں کی انجمن کا رکن ہے

سپاہی بولا "ٹھیک ہے جاؤ اپنا کام کرو۔"

"مگر، آخر یہ سب پوچھ گچھ کیوں؟" بابی نے پوچھا۔

سپاہی نے کہا، "مسٹر پیر جوہری کی دکان لوٹ لی گئی ہے ایک گھنٹا ہوا، کھڑکی توڑ کر جواہرات چرائے گئے ہیں۔ ہم نے اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ چور یہیں کہیں ہے۔ لہذا ہم ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔"

بابی نے کہا "اچھا تو یہ بات ہے! تو تمھارا خیال ہے کہ چور یہاں چھپا ہوا ہے؟"

یہ سن کر سپاہی نے قہقہہ مارا اور بولا "اس کا تو امکان خیر نہیں ہے۔ پھر بھی ہمارا خیال ہے کہ وہ اسی علاقے میں ہے۔ بہر حال وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔ تم اب جاؤ، اپنا کام کرو۔ گھبراؤ نہیں، ہم تم کو شو کے بعد گرفتار کریں گے۔"

یہ کہہ کر سپاہی نے اپنے مذاق پر خود ہی قہقہہ لگایا۔ بابی آگے بڑھا، مگر اندھیرے میں چلنا دشوار تھا۔ بڑی مشکل سے ایک سوئچ ملا۔ اس نے اسے دبایا، مدھم سی روشنی اسٹیج پر پڑنے لگی۔ بابی نے اپنا سامان کھولنا شروع کر دیا۔ اس بلب کے علاوہ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بابی کو اسٹیج کے سامنے فٹ لائٹ اور اس کے آگے تماش بینوں کی نشستیں نظر آئیں۔ اسٹیج کے دونوں جانب سین سینری کے بازو تھے۔ بلب تو بہت سے لگے ہوئے تھے، مگر اس وقت وہ روشن نہ تھے اور سب سے اوپر ایک وسیع جنگلا تھا اور چرخیاں اور گراریاں لگی ہوئی تھیں، جو پردے گرانے اور اٹھانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ بابی نے اسٹیج کو سجانے کا کام جب کر لیا تو سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔

اتنے میں قریب ہی کہیں دروازہ کھولنے اور بند کرنے کی آواز سنائی دی۔ بابی چونک پڑا۔ تھیٹر میں اتنا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ ذرا سی آواز بھی بڑے زور کی محسوس ہوتی۔ اس نے سوچا کہ اتنے میں وہ نقلی شراب تیار کر لی جائے جو ڈرامے میں استعمال کی جائے گی۔ اسٹیج کے نزدیک ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں کچھ ساز و سامان رکھا جاتا تھا۔ بابی اس کمرے میں چلا گیا اور وہ نقلی شراب بنانے لگا۔ اس نے بوتل میں تھوڑا سا رنگین مادہ ڈالا اور نل سے بوتل میں پانی بھرنے لگا پھر اس نے نل کو بند کر دیا اور فوراً سہم کر غور سے سننے لگا۔ اسے دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا مگر اسے کوئی دکھائی نہ دیا اس نے چپکے سے بوتل بینچ پر رکھ دی اور دبے پاؤں دروازے کے پاس پہنچا، جو دروازہ اسٹیج کی طرف تھا وہ آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا، بابی حیران رہ گیا۔ ابھی تو صرف چھ بجے ہیں۔ ابھی تو کسی کے آنے کا وقت نہیں ہوا اور اگر کوئی آ بھی گیا ہے تو اسے یوں دبے پاؤں چلنے کی کیا ضرورت ہے؟ اتنے میں اسے سپاہی کی باتیں یاد آئیں اور جوہری کی دکان لوٹنے والا واقعہ یاد آیا۔ تو کیا؟ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا، مگر چور اسٹیج والے دروازے سے تو گزر نہیں سکتا، کیوں کہ وہاں پر تو پولیس والا ہے۔ شاید ہوا سے دروازہ بند ہو گیا ہو مگر اس کو اطمینان نہ ہوا وہ اسٹیج کی طرف جانے والے دروازے کی طرف بڑھا اور یکایک اسے کھول دیا۔ اسٹیج پر صرف ایک مدھم سی روشنی ہو رہی تھی، بابی نے چاروں طرف دیکھا سب چیزیں اپنی جگہ پر معلوم ہوئیں، مگر پھر اسے اسٹیج کے ایک کونے میں کچھ آہٹ محسوس ہوئی۔

"کون ہے؟" وہ چلّایا۔

کوئی جواب نہ ملا، مگر کوئی چیز تیزی سے حرکت میں آئی اور ایک سایہ سا اسٹیج کے بازوؤں میں چلا گیا اور اسٹیج کی چور سیڑھی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اب چونکہ بابی نے اس آدمی کو دیکھ لیا تھا لہٰذا اس کا خوف کچھ کم ہو گیا۔ اب صرف پولیس والے کو بلانا رہ گیا تھا مگر پھر اسے خیال آیا کہ تھیٹر سے باہر جانے کے لیے تو بہت سے راستے ہیں جب کہ اندر آنے کے لیے صرف دو راستے ہیں۔ چور سامنے والے دروازے سے آیا ہوگا۔ اب اگر اسے موقع ملا تو وہ آسانی سے باہر نکل جائے گا۔ لہٰذا بابی کے لیے اب صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ وہ خود ہی چور کا پیچھا کرے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ چلا کر سپاہی کو بلانا چاہے تو بھی سپاہی تک اس کی آواز نہ پہنچے گی۔ چنانچہ وہ ہمت کر کے اسٹیج پر آیا۔ جب وہ چور سیڑھی کی طرف بڑھنے لگا تو اسے ایک بکس دکھائی دیا جو سرخ رنگ کا تھا اور دیوار میں جڑا ہوا تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا:

"اگر آگ لگ جائے تو شیشہ توڑ ڈالو اور دستے کو گھسیٹ لو۔"

اس نے سوچا یہ ٹھیک رہے گا۔ لہٰذا اس نے رومال اپنے ہاتھ میں لپیٹا اور شیشہ توڑ کر دستے کو گھسیٹ لیا۔ پھر وہ سیڑھی پر چڑھنے کے لیے دوڑا۔ سیڑھی اوپر جاتی تھی، جہاں وہ رسیاں تھیں جن سے پردے گرائے جاتے ہیں۔ بابی تیزی سے اس عمودی سیڑھی پر چڑھ گیا اور پلیٹ فارم تک پہنچ گیا۔

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ چور کہیں دکھائی نہ دیا۔ پردوں والا پلیٹ فارم اسٹیج کے اوپر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک چھجے کی شکل میں تیس فٹ کی بلندی پر تھا۔ بابی کو سیڑھی کے قریب ایک سوئچ مل گیا۔ اس نے اس کو دبا دیا۔ پلیٹ فارم پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چاروں طرف چھوٹے چھوٹے بلب روشن ہو گئے، مگر روشنی مدھم تھی۔ سناٹا ایسا تھا کہ ڈر لگ رہا تھا۔ اتنے میں بابی کو اچانک پیروں کی چاپ
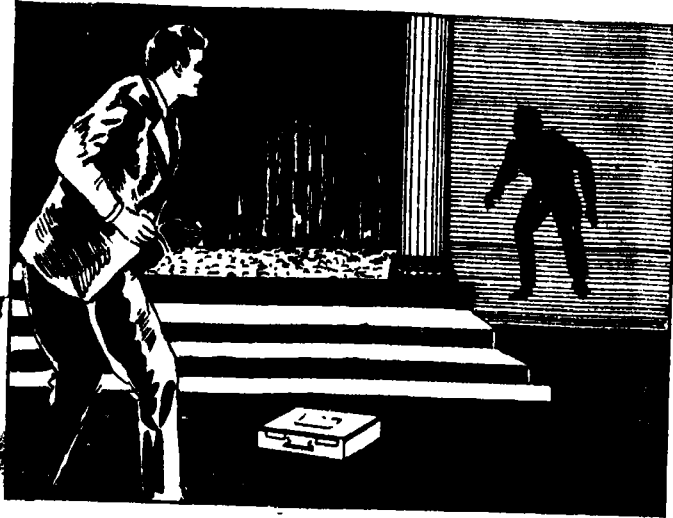
سنائی دی، ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی کا پیر کسی چیز سے ٹکرا گیا ہو۔ بابی اس آواز کی طرف گھوما اور کٹہرے کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ اسٹیج کے پچھلے حصّے کے پاس کوئی چیز حرکت کرتی نظر آئی، وہ آگے بڑھا، مگر اس شخص کو بھی معلوم تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ لہٰذا وہ بھی آگے بڑھتا گیا، بابی جب پلیٹ فارم کے آخری حصّے تک پہنچ گیا تو اس نے دیکھا کہ چھجا اسٹیج کے اگلے حصّے کی طرف گھوم گیا ہے۔ یہاں کوئی نظر آیا مگر عین اسی وقت اس کی نظر ایک سوٹ کیس پر پڑی جو کونے میں پڑا تھا اور اسی وقت اوپر سے ایک آواز سنائی دی۔ چور دوسری سیڑھی سے اور اوپر چڑھ رہا تھا اور تھیٹر کی چھت کی طرف جا رہا تھا اس نے لوٹے ہوئے جواہرات سے بھرا ہوا سوٹ کیس چھوڑ دیا تھا تاکہ چھت تک چڑھنے میں آسانی رہے۔

بابی نے جلدی سے سوٹ کیس اٹھا لیا۔ سوٹ کیس پر ایک کاغذ چپکا ہوا تھا۔ بابی نے تیزی سے اس پر لکھ دیا، "چور اوپر پردوں میں ہے، جلدی کرو!"

اور پھر سوٹ کیس کو نیچے پھینک دیا۔ سوٹ کیس نیچے جو گرا تو کھل گیا اور تمام جواہرات اس میں سے نکل

کر بکھر گئے۔ آگ بجھانے والے جب آئیں گے تو وہ اس کو
ضرور دیکھ لیں گے۔ پھر بابی نے چوبی سیڑھی پر قدم رکھا
اور اوپر چڑھنے لگا۔ پردوں کا کٹہرہ اسٹیج سے جتنا اونچا
تھا اس سے اتنا ہی اور اونچا ایک پلیٹ فارم تھا یہاں
پر لکڑی کا جالا لگا ہوا تھا۔ بابی اس پلیٹ فارم پر چڑھ
گیا اور غلطی سے اس نے نیچے دیکھ لیا اسے ایسا معلوم
ہوا کہ اسٹیج ایک کنویں کے اندر ہے یعنی بہت ہی نیچے
فرنیچر ایسا کہ جیسے گڑیوں کا فرنیچر ہو۔

بابی کا سر چکرانے لگا، اس نے اپنے آپ کو سنبھالا
اور چاروں طرف نظریں ڈالیں۔ لوہے کی لمبی سلاخیں
جن میں چرخیاں لگی تھیں اسٹیج کے ایک سرے سے
دوسرے تک چلی گئیں تھیں۔ یہ پلیٹ فارم اس کے نیچے
والے پلیٹ فارم سے بھی چھوٹا تھا، مگر یہ بھی چاروں
طرف چلا گیا تھا۔ بابی کان کھڑے کیے سنتا رہا اور پھر
قریب ہی آہستہ سے دروازے کھلنے کی آواز سنائی
دی، وہ سوچنے لگا کہ اسٹیج سے اتنی بلندی پر یہ دروازہ
آخر کہاں ہو سکتا ہے؟ وہ اندھیرے میں گھور کر دیکھنے
لگا اور پھر پلیٹ فارم کے ایک کونے میں قریب قریب
چھت کے نزدیک اسے روشنی کی ایک لکیر چوڑی ہوتی نظر
آئی۔ جنگلے میں ایک دروازہ تھا جس سے چھت تک
پہنچا جا سکتا تھا۔ چور اسی راستے سے بھاگنا چاہتا تھا
بابی اس کونے کی طرف چلا گیا، مگر نیچے سے کچھ آوازیں
جو سنائیں دیں تو وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس نے جنگلے پر
سے جھک کر نیچے دیکھا۔ ساٹھ ستر فٹ نیچے اسے بہت
سے آدمی نظر آئے جو بونے معلوم ہو رہے تھے یہ لوگ
سوٹ کیس کو دیکھ رہے تھے ان آدمیوں میں کچھ فائر
بریگیڈ کی وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ وہ پولیس کا سپاہی
بھی تھا۔ بابی چلایا: "یہاں! وہ چھت پر ہے!"

ایک آواز آئی: "اچھا! ہم آرہے ہیں۔ تم اپنے آپ
کو سنبھالو!"

اب بابی کو اطمینان ہو گیا کہ لوگ مدد کو آرہے
ہیں۔ وہ چھت والے دروازے کی طرف بڑھا چند زینوں
کو چڑھ کر وہ چھت پر پہنچ گیا۔ چھت پر بھی اندھیرا تھا۔ تارے
جھلملا رہے تھے۔ آس پاس اور کوئی چھت نہ تھی، بابی
سمجھ گیا کہ چور اب پکڑ لیا جائے گا۔ چھت کے چاروں طرف
ایک چھوٹی سی منڈیر تھی۔ بابی نے اس منڈیر پر سے
جھک کر دیکھا کہ چور کہیں وہاں تو نہیں چھپا ہے، مگر وہاں
کوئی نہ تھا اور یہ منڈیر شکستہ اور بڑی خطرناک تھی
تقریباً ایک سو بیس فٹ بلند تھی۔ بابی منڈیر پر سے
اٹھنے لگا، مگر اچانک کوئی اس کے کندھے پر سوار
ہو گیا اور اسے آگے دھکیلنے لگا۔ بابی نے زور لگا کر
اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ چور بابی کو نیچے گرا دینا
چاہتا تھا۔ بابی نے چور کی ٹانگ میں اپنی ٹانگ پھنسا دی
اور خوب زور لگایا۔ چور لڑکھڑا گیا۔ بابی کو موقع مل گیا۔
وہ منڈیر سے دور ہٹ گیا۔ اتنے میں چور نے اس کا گلا
پکڑ لیا اور گھٹنا بابی کے پیٹ میں مار دیا۔ اب بابی بے بس
ہو گیا۔ چور اسے گھسیٹ کر پھر منڈیر کے پاس لے آیا منڈیر
کو دیکھ کر بابی کی جان نکل گئی۔ چور کا ایک ہاتھ اس کے
گلے پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ بابی کی ٹھوڑی کو دھکیل

رہا تھا۔ بابی نے زور لگا کر اپنے سر کو آگے بڑھایا اور
چور کی کلائی کو کاٹ لیا۔ چور بلبلا اٹھا اور بابی منڈیر

کے پاس سے کھسکنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر اس نے اپنا گھٹنا اٹھا کر زور سے چور کے پیٹ میں مار دیا۔ چور درد سے دہرا ہوگیا اور بابی نے فوراً داہنے ہاتھ سے ایک زبردست گھونسا چور کی ٹھوڑی پر رسید کیا۔ چور وہیں ڈھیر ہوگیا اور اسی وقت فائر بریگیڈ کے آدمی چھت پر آگئے۔ ان کے پیچھے پیچھے پولیس کا سپاہی بھی تھا۔ بابی ہانپتے ہوئے اپنے گلے کو سہلانے لگا۔

"شاباش جوان" فائر بریگیڈ کا ایک آدمی بولا، تم نے تو کمال کر دیا۔ ادھر آؤ۔ دیکھیں تم کو کتنی چوٹ لگی ہے۔

جب بابی کا معائنہ کیا جا چکا اور معلوم ہوا کہ اس کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تو پھر ایک آدمی نے چور کو اٹھا کر اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ چور بے ہوش تھا۔ پولیس کا سپاہی بولا، "ہاں، اب رپوٹ لکھواؤ" یہ کہہ کر اس نے اپنی نوٹ بک نکالی۔ بابی نے اپنی گھڑی دیکھی اور چلایا "ارے بہت دیر ہوگئی۔ ۴۵ منٹ بعد ڈراما شروع ہونے والا ہے اور مجھے ابھی بہت سے کام کرنا ہیں"

پولیس والا بولا "ٹھہرو، ٹھہرو! قانون کا احترام کرو۔ تم ابھی نہیں جا سکتے ...."

"معاف کرو" بابی بولا "میں بعد میں سب بتا دوں گا۔ ڈراما وقت پر شروع کرنا ہے"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف لپکا اور زینے سے نیچے اسٹیج کی طرف روانہ ہوگیا۔ پولیس والا اس کے پیچھے چلاّتا ہوا دوڑا۔ (بہ شکریہ نونہال، کراچی)

ناوک حمزہ پوری

ہمالہ کا پیغام

ہزار طوفانِ باد و باراں
ہمیں نہیں کر سکے ہراساں
کھڑے ہوئے ہیں اچل اٹل ہم
وہیں ہیں اب بھی جہاں تھے کل ہم
ہزار سر مشکلوں نے مارے
بڑے مصائب نے سر ابھارے
نہ ڈگمگائے قدم ہمارے
نہ لڑکھڑائے قدم ہمارے
جو مشکلوں میں اٹل رہے گا
بلندیوں کو وہ چھو سکے گا
جو سیکھ لے مستقل مزاجی
تو لے قدم اس کے کامیابی

توسّط اردو لائبریری حمزہ پور، شیر گھاٹی۔ گیا (بہار)

سید محمود نقوی

[illegible]

گرمیوں کی ایک شام کو ایک غریب آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک بیل کو ہانکتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس نے یہ بیل اپنے ایک دوست سے حاصل کیا تھا اور دوسرے گاؤں کے بازار میں اسے بیچنے جا رہا تھا، اسے امید تھی کہ اس تندرست بیل کی اسے معقول رقم مل جائے گی۔ وہ راستہ طے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اسے سامنے سے تین نوجوان آتے دکھائی دیے۔

قریب پہنچنے پر ان میں سے ایک نے پوچھا "اس بکرے کو تم کہاں لے جا رہے ہو؟"

"یہ بیل ہے، اسے میں بازار بیچنے لے جا رہا ہوں" غریب آدمی نے جواب دیا۔

کیا؟ تینوں نوجوانوں نے ایک دوسرے کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "عجیب آدمی ہے بکرے کو بیل بتا رہا ہے!"

"ہاں بھائی یہ بیل ہی ہے" غریب آدمی نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کیا تم ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو، کیا ہمیں بیل اور بکرے کا فرق نہیں معلوم؟" ایک نوجوان نے کہا۔

"تمھیں کسی نے دھوکا دیا ہے، بکرے کو بیل کہہ کر دے دیا اور تم بے وقوف بن گئے۔ کتنے میں لائے اس بکرے کو؟" دوسرے نوجوان نے سوال کیا۔

"یہ میرے ایک دوست نے مجھے دیا تھا، وہ میرے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا وہ بہت اچھا آدمی ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کتنے میں بیچو گے؟" تیسرا نوجوان اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"جتنے زیادہ مل جائیں کیونکہ اس رقم سے میں کوئی دھندا شروع کروں گا۔"

"اس بکرے کے کوئی دو سو سے زیادہ نہیں دے گا" ایک نوجوان نے قیمت لگائی۔

"چلو ہم تینوں مل کر تین سو روپے دیں گے اس سے زیادہ نہیں" دوسرے نوجوان نے قطعی فیصلہ سنایا۔

کچھ حیل حجت کے بعد اس غریب آدمی نے مجبور ہو کر تین سو روپے میں اپنا بیل ان نوجوانوں کے ہاتھ فروخت کر دیا، حالانکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ اسے دھوکا دے رہے ہیں اور اس کے بیل کو بکرے کے داموں لے رہے ہیں مگر کرتا بھی کیا؟ وہ اکیلا تھا اور وہ لوگ تین، اور ان کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ زبردستی بیل چھین لیتے اور اتنی رقم بھی اسے نہ مل پاتی۔ وہ تینوں بیل لے کر ایک دو تین ہو گئے۔ اور یہ بیچارا سوچ میں غرق وہیں کھڑا رہ گیا۔ کس طرح ان تینوں سے بدلہ لیا جائے۔ اسے ایک ترکیب سوجھی

کیوں نہ ان تینوں کے ساتھ رہ کر ہی ان سے
فائدہ اٹھایا جائے۔ وہ تیز قدموں سے آگے بڑھا
اور ان تینوں کے پاس پہنچ کر بولا: "جناب آپ
لوگوں نے مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے میرا بکرا خرید لیا اور
مجھے دوسرے گاؤں تک اسے بیچنے جانا نہیں پڑا۔ میں
اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ اب اگر اجازت ہو تو
میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی چلوں تاکہ کچھ سیکھ
سکوں اور کوئی دھندا شروع کرلوں"۔

تینوں نوجوانوں نے سوچا اچھا ہے اس
احمق کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ ابھی تو اس کے
پاس رقم بھی ہے، فائدہ ہی رہے گا۔

کچھ دنوں تک معاملات ٹھیک چلتے رہے،
کیوں کہ بے چارہ غریب آدمی کافی محنت سے
اپنے تینوں نوجوان ساتھیوں کی خدمت کرتا
اور انھیں ہر طرح سے آرام پہنچاتا۔ ایک دن وہ بازار
گیا اور واپسی میں ایک عجیب وغریب ہیٹ اپنے لیے
لیتا آیا۔ ہیٹ عام طریقے کے خلاف سہ گوشیہ یعنی تین
کونے والا تھا جسے اس نے اپنے سر پر اس طرح پہن
رکھا تھا جیسے کوئی بہت اچھا اور بیش قیمت ہیٹ
ہو۔ تینوں نوجوان دوست اسے دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔
ان میں سے ایک بولا: "ارے یہ کہاں سے اٹھا لائے،
تمھیں کوئی اور ہیٹ شہر میں نہیں ملا؟" انھوں نے ہیٹ
کا ایک ایک کونہ پکڑ لیا، اور اس کا مذاق اڑانے لگے۔

"دوستو! اگر تمھیں اس ہیٹ کی حقیقت معلوم ہو جائے
تو اس طرح سے مذاق نہ اڑاؤ۔" غریب آدمی نے بڑی
سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اچھا تو یہ جادو کا ہیٹ ہے"۔ ایک دوست بولا۔
"اس کی کیا خاصیت ہے، ذرا بتاؤ نا؟" دوسرے
نے پوچھا۔

اس ہیٹ کو پہن کر میں جس ہوٹل میں چاہے
جا سکتا ہوں اور جو چاہے کھا پی سکتا ہوں، کوئی
بھی مجھ سے پیسے نہیں مانگے گا۔ اس ہیٹ میں یہ بھی طاقت
ہے کہ جو چاہے کر سکتا ہوں لیکن ایک بات آپ لوگوں
کو پہلے سے بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اس ہیٹ کو کسی
بھی قیمت پر کسی کو دوں گا نہیں۔"

"کسی نے پھر تمھیں بے وقوف بنا دیا ہے اس
معمولی سے ہیٹ میں اتنی خوبیاں نہیں ہو سکتیں۔"
ایک نوجوان نے اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے
کہا۔ "ہم تو جب تک اپنی آنکھوں سے اس کا کوئی کرشمہ
نہیں دیکھ لیں گے ہمیں یقین نہیں آئے گا۔" دوسرے
نے اپنے دوست کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کو اس کا کرشمہ
جلد ہی دکھا دوں گا، لیکن شرط یہی ہے کہ پھر آپ
لوگوں میں سے کوئی مجھ سے ہیٹ نہیں مانگے گا۔"

"تمھارا یہ عجوبہ ہیٹ کوئی نہیں مانگے گا تم اطمینان
رکھو۔" ایک نوجوان نے اسے یقین دلانے کی
کوشش کی۔

دوسرے دن وہ غریب شخص چپ چاپ شہر
کے تین خاص ہوٹلوں میں جا کر بتا آیا کہ وہ کل
اپنے تین دوستوں کے ساتھ آئے گا، ان کی اچھی
طرح خاطر مدارات کی جائے اور اس کے لیے مناسب
رقم پیشگی ہی جمع کرا دی۔ واپس آکر تینوں دوستوں
سے کہا "آپ لوگ جب چاہیں اس عجیب وغریب ہیٹ
کا کرشمہ دیکھ سکتے ہیں۔"

"پھر نیک کام میں دیر کیوں کی جائے ہم کل ہی
اس کی آزمائش کریں گے۔" ایک نوجوان بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے، کل چھٹی کا دن بھی ہے۔" باقی
دونوں دوستوں نے تائید کی۔

دوسرے دن چاروں ایک ساتھ روانہ ہوئے
اور تینوں نوجوانوں نے اپنی مرضی کے کسی ہوٹل میں
کھانا کھانے کا پروگرام بنایا، وہ شہر کے سب سے اچھے
ہوٹل میں پہنچ گئے۔ آگے وہی غریب شخص اپنا سہ گوشیہ

ہیٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کے پیچھے تینوں نوجوان دوست۔ ہوٹل میں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور نشست کے لیے الگ ایک خاص میز پر انتظام کیا گیا۔ اچھے کھانوں سے خاطر تواضع کی گئی۔ چلتے وقت ہوٹل کے منیجر نے سہ گوشیہ ہیٹ والے شخص سے جھک کر کہا: "جناب والا! جب بھی ادھر تشریف لائیں تو ہمیں خدمت کا موقع ضرور دیں۔"

چاروں بازار میں گھومتے پھرتے رہے۔ اور سہ پہر کو ایک دوسرے ہوٹل میں چائے پینے کی غرض سے داخل ہوئے۔ ہوٹل کا منیجر سہ گوشیہ ہیٹ والے شخص کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک بیرے کو آواز دے کر کہا صاحب لوگوں کو بٹھاؤ اور جو کہیں پیش کرو۔ انھوں نے چائے کے ساتھ کیک، پیسٹری وغیرہ جی بھر کے کھائی اور قیمت کی ادائیگی کے بغیر باتیں کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔

اسی طرح وقت گزاری کے بعد شام کو وہ چاروں تیسرے ہوٹل میں پہنچے۔ یہاں بھی سہ گوشیہ ہیٹ والے شخص کو دیکھ کر خصوصی برتاؤ کیا گیا اور جب وہ لوگ خوب کھا پی کر چلنے لگے تو منیجر نے ہیٹ والے شخص سے کہا میں امید کرتا ہوں کہ آپ پھر تشریف لائیں گے اور پہلے کی طرح یہاں بھی نہ تو بل پیش کیا گیا اور نہ پیسے مانگے گئے۔

تینوں نوجوان اس ہیٹ کی کرامت سے کافی متاثر ہو گئے تھے۔ باربار للچائی ہوئی نظروں سے ہیٹ کی طرف دیکھتے اور آپس میں اشارے کرتے۔ آخر ان میں سے ایک نے تجویز پیش کی، ارے بھائی اس ہیٹ کو ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو، ہم تمھیں اس کی اچھی قیمت دیں گے۔

نہیں جناب، میں پہلے ہی آپ لوگوں سے کہہ چکا ہوں کہ یہ بہت بیش قیمت ہیٹ ہے، میں اسے بیچوں گا نہیں، ہیٹ والے شخص نے برجستہ جواب دیا۔

تینوں دوست کافی اصرار کرتے رہے اور بہت حجت کے بعد جب ان تینوں نے اس ہیٹ کے بدلے اپنا سارا قیمتی سامان اسے دے دینے کی پیشکش کی۔ تو ہچکچاتے ہوئے وہ شخص رضامند ہو گیا اس نے ان تینوں کا سامان باندھتے ہوئے کہا چونکہ آپ لوگوں کا میرے اوپر کافی احسان تھا اس لیے میں یہ ہیٹ دینے پر آمادہ ہو گیا ورنہ کسی اور کو میں کسی قیمت پر کبھی نہ دیتا۔ اب خدا کے لیے اس ہیٹ کا دھیان رکھیے گا اور کسی اور کے حوالے نہ کیجیے گا۔ اور اس ہدایت کے ساتھ سارا سامان سمیٹ کر وہ شخص اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے ان لوگوں سے کہا امید ہے کہ آپ لوگ مجھے بھول نہیں جائیں گے اور اگر میں کبھی آؤں تو اس ہیٹ کا لطف مجھے بھی کچھ دیر اٹھانے دیں گے۔"

ضرور ضرور کہتے ہوئے تینوں دوستوں نے اسے رخصت کیا۔ دوسرے دن وہ لوگ اس ہیٹ کو لے کر شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں پہنچے، پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ چلنے لگے تو دروازے پر منیجر نے روکا جناب کھانے کا بل تو ادا کرتے جائیے۔

"کیسا بل؟" ایک نوجوان بولا

"عجیب آدمی ہیں ہوٹل میں کھانا کھانے آتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کھانے کے پیسے بھی دیے جاتے ہیں۔ اپنے بل کی ادائیگی کرتا ہوا ایک شخص بولا۔

مزید ندامت سے بچنے کے لیے دوسرے دوست نے بل کی ادائیگی کی اور تینوں باہر نکل آئے، لیکن تینوں میں تکرار شروع ہو گئی جس نے بل ادا کیا تھا وہ دوسرے سے کہہ رہا تھا، یار تم ہو بے وقوف ہیٹ ہاتھ میں لٹکانے کی چیز تھوڑی ہے، سر پر پہنتے تو منیجر کو دکھائی بھی دیتا۔

ہاں اس کی نظر نہیں پڑی ہو گی، دوسرے دوست

نے تائید کی۔

"تم ہی پہن لیتے میں نے منع تو نہیں کیا تھا" تیسرا جھلا کر بولا۔

کافی بحث کے بعد آخر انھوں نے طے کیا کہ باری باری وہ تینوں ہیٹ پہن کر ساتھ جایا کریں گے تاکہ آیندہ اس طرح کی سبکی اور گھاٹا برداشت نہ کرنا پڑے۔

دوسرے دن وہ تینوں ایک دوسرے ہوٹل میں پہنچے خوب جی بھر کے کھایا پیا اور پھر اٹھ کر چل دیے۔ دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ بیرا دوڑا ہوا آیا "ارے جناب! آپ لوگوں نے کھانے کی رقم تو ادا کی ہی نہیں!"

"کیسی رقم. دیکھتے نہیں ہو ہم لوگ سہ گوشیہ ہیٹ والے ہیں"؟

"ہیٹ والے ہیں تو کیا ہوا، کھانے کے پیسے تو دینے ہی ہوں گے"! بیرا بولا۔

"لیکن پہلے جب ہمارا ایک ساتھی یہ ہیٹ پہن کر آیا تھا تو کھانے کے پیسے نہیں مانگے گئے تھے"! ایک دوست نے دبی زبان سے کہا۔

"اچھا آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اس وقت تو ایڈوانس رقم جمع کرا دی گئی تھی" منیجر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"اب بغیر پیسے دیے آپ کو یہاں سے جانے نہیں دیا جائے گا" منیجر کا اشارہ پاکر دوسرا بیرا بولا۔

تینوں دوستوں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی لیکن ان کی جیبوں میں بہت کم پیسے نکلے اور کھانے کا بل خاصی بڑی رقم کا تھا۔

بیرے برابر انھیں باتیں سنائے جا رہے تھے۔ "ہیٹ پہن لیا اور یہ نہیں معلوم کھانا پیسے دے کر کھایا جاتا ہے۔ جیب میں پیسے نہیں اور یہ آگئے ہوٹل میں کھانا کھانے"۔ دوسرا بیرا بولا۔ "اچکے معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں دھکے دے کر باہر نکال دو"، منیجر نے کہا۔ بیروں کو موقع مل گیا اور سب ہی نے انھیں اپنے ہاتھوں کا مزہ چکھایا اور ہوٹل سے باہر دھکیل دیا۔

تینوں منہ لٹکائے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹے۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ غریب دیہاتی انھیں کس طرح بے وقوف بنا گیا تھا۔ اس نے اپنے بیل کی پوری قیمت بھی وصول کرلی تھی اور انھیں زیادہ چالاک بننے کی سزا بھی دے گیا تھا۔

امۃ الرحمٰن غنی

دو شکاری

(قسط ۱۱)

ابو کپڑے بدل کر باہر آئے۔ انھوں نے ایک پرانا نیوی بلو سوئیٹر اور بھورے کپڑے کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ٹوپی کا چھجا آنکھوں تک جھکا ہوا تھا۔ میں نے ان کو دیکھ کر کہا۔ "ابو! یہ آپ کے پیٹ پر ابھار کیا ہے؟" انھوں نے سوئیٹر الٹ کر مجھے دکھایا۔ ان کے پیٹ اور کمر کے گرد دو باریک سفید سوتی تھیلے بڑی نفاست سے لپٹے اور بندھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "سامان بھر کر لانے کے لئے! بس جاؤ۔ اب تم بھی تیار ہو جاؤ۔ اپنا براؤن سوئیٹر پہن لینا اور کالے جوتے پہن لینا۔"

اندر جاکر میں نے سوئیٹر اور جوتے بدلے اور باہر آگیا۔ میں نے دیکھا کہ ابو کچھ بے چین ہو کر سورج کو نیچے جاتے دیکھ رہے تھے۔ جو کہ درختوں کے پیچھے ٹیلوں کے کنارے بہت چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔

باہر آکر میں نے ابو سے کہا۔ "ابو میں تیار ہو گیا ہوں۔ بہت خوب! بس اب ہم چلتے ہیں۔

ابو آپ نے کشمشیں بھی لے لیں؟ "ہاں دیکھو یہ رہیں"۔ انھوں نے اپنے پتلون کی جیب تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ جہاں ایک اور ابھار نظر آ رہا تھا۔ میں نے ان کو ایک تھیلی میں کر کے جیب میں رکھ لیا ہے۔

ہماری روانگی کے وقت شام خوشگوار اور چمکیلی تھی۔ آسمان پر سفید روشن بادلوں کے جھنڈ تیر رہے تھے۔ موسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ہم سڑک سے مڑ کر داہنی طرف سنسان ٹیلوں میں آ گئے تھے۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ صرف ابو کے جوتوں کی کھٹ کھٹ کی آواز تھی۔ جو ایسی لگ رہی تھی۔ جیسے کیل پر کوئی ہتوڑی مار رہا ہو۔

لو دانی اب یہاں سے ہمارا اصل راستہ شروع ہوتا ہے۔ ابو نے کہا۔ اور اس وقت میرا دل چاہ رہا ہے کہ کاش میرے ابا زندہ ہوتے اور وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔ میں تصور کر سکتا ہوں کہ وہ کس قدر خوش ہوتے۔

اور امی بھی تو! میں نے کہا۔ آہ ہاں! ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس لے کر بولے اس وقت ان کی خوشی کی کوئی حد نہ ہوتی۔

دانی! تمھاری ماں چلنے کی بہت شوقین تھیں۔ گھر سجانے کے لئے دور دور سے پھول لایا کرتی تھیں۔ گرمیوں میں جنگلی پھول اور بیج گھاس لاکر گلدان سجایا کرتی تھیں۔ پھول سجانے کا انھیں بڑا سلیقہ تھا۔ سردیوں میں طرح طرح کے جنگلی پھل اور رنگ برنگے پھول لاکر رکھتی تھیں۔

باتیں کرتے ہوئے ہم چل رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا۔ دانی! اب تمھیں کیسا لگ رہا ہے؟

ابو بہت خراب! میں نے کہا۔ لیکن باوجود اس کے کہ میرے پیٹ میں سانپ کود رہے تھے۔ میں سچی بات کہتا ہوں کہ اگر بدلے میں کوئی بادشاہت بھی دیتا تو مجھے منظور نہ ہوتا۔

ابو کیا شکاریوں کو پکڑنے کے لیے انھوں نے اور کھائیاں کھود رکھی ہوں گی؟

دانی! تم کھائیوں کی فکر نہ کرو۔ اس دفعہ میں پوری احتیاط رکھوں گا۔ جیسے ہی ہم جنگل میں قدم رکھیں گے۔ خوب دیکھ بھال کر قدم رکھیں گے۔ جب ہم اندر پہنچیں گے تو اندھیرا نہیں ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا۔

نہیں زیادہ اندھیرا نہیں ہوگا۔ راستہ دیکھنے کے لائق روشنی رہے گی۔ تو پھر چوکیداروں سے کیسے بچیں گے؟

مسکن دودھ پور علی گڑھ

اوہ! دانی! اس سارے کھیل میں بس وہ ہی وقت تو بڑی تفریح اور دلچسپی کا ہوتا ہے۔ ایسے سمجھو کہ یہ آنکھ مچولی کا کھیل ہوتا ہے۔ باقی راستے ہم خاموشی سے چلتے رہے۔ جیسے جیسے جنگل قریب آتا جا رہا تھا۔ ابو کا جوش بڑھ رہا تھا۔ ان میں عجیب تناؤ کی سی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بجائے کوئی گانا گانے کے صرف گانے کی دھن گنگنا رہے تھے۔ اور اپنے پیر کی کھٹ کھٹ پر دھن بنا رہے تھے۔

جب وہ اس دھن سے اکتا گئے تو مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ دانی ایک بڑے مزے کی بات سنو باہر پرندوں اور جانوروں سے متعلق ایک قانون ہے۔ وہ یہ کہ جنگلی پرندے جس کی زمین پر رہتے ہوں وہ زمین والے کی ملکیت ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ بات تم نے سنی ہے؟

نہیں ابو میں نے تو اس سے پہلے سنی نہیں!

تو اب سنو! اگر شہباز صاحب کے جنگل کا کوئی پرندہ آکر ہمارے ہنٹرل سمت پر بیٹھ جائے تو وہ ہمارا ہو جائے گا۔

تو کیا شہباز صاحب نے جو چوزے خرید کر اپنے جنگل میں پالے ہیں ان پر بھی یہ ہی قانون لاگو ہوگا؟

ہاں بالکل! ابو نے کہا۔ اگر کوئی پرندہ کسی کی زمین سے اڑ جاتا ہے تو اس پر سے زمین والے کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر وہ واپس آجائے تو پھر وہ اسی کا ہو جائے گا۔ یہ ہی قانون مچھلی کے لیے بھی ہے اور دوسرے مویشی جیسے گائے، بکری، بھیڑ وغیرہ کے لیے بھی وہی قاعدہ ہے۔

سوا گھنٹہ مسلسل چلتے رہنے کے بعد اب ہم جھاڑیوں سے گھری ناہموار پگڈنڈیوں پر آ گئے تھے اور وہیں سے وہ بڑا جنگل اب ہم کو صاف نظر آنے لگا تھا۔ جس میں تیتر رہتے تھے۔

بس اب ہم کو خاموش رہنا چاہیے۔ ابو نے کہا۔

اب ہم ان جھاڑیوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ جن کی دوسری طرف جنگل تھا۔ جھاڑیوں میں ایک پتلا سا گیپ تھا۔

ابو نے کہا آؤ اسی میں سے اندر چلیں۔ جھاڑیوں میں ہو کر ہم جنگل کے اندر آ گئے۔ یہاں باہر سے زیادہ ٹھنڈک تھی۔ روشنی بھی دھندلی سی تھی۔ مگر راستہ پانے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ جنگل کے درخت اس قدر گھنے تھے کہ دھوپ تو ان میں سے کبھی بھی نہیں پہنچتی ہوگی۔ ابو میرا ہاتھ پکڑے ہوئے درختوں کے درمیان سے چل رہے تھے۔ اور بحد احتیاط سے قدم اٹھا رہے تھے۔ ادھر ادھر دیکھتے بھی جاتے تھے کہ کہیں چوکیدار تو چھپے ہوئے نہیں کھڑے ہیں۔ چار پانچ منٹ آہستہ چلنے کے بعد ہم جنگل میں کافی دور تک چلے گئے۔ ایک جگہ زمین کا تھوڑا سا حصہ صاف تھا۔ آسمان بھی نظر آ رہا تھا۔ ابو نے مجھے بتایا کہ یہ ہی وہ جگہ ہے۔ جہاں چوزے پال کر بڑے کیے جاتے ہیں۔ دیکھو دانی! یہاں کتنے تیتر ہیں۔

ابو چوکیدار بھی تو ہوں گے؟

ہاں نہیں! مگر جھاڑیاں گھنی ہونے کی وجہ سے ہمارا دیکھا جانا آسان نہیں ہے اور بس اب اندر چلو۔ اگر تم مجھے لیے دیکھو تو ویسے ہی تم بھی لیٹ جانا۔ اندر گھستے وقت انھوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

دانی تم ٹھیک میری سیدھ میں رہنا۔ انھوں نے مجھے تاکید کی۔ اب ابو الٹے لیٹ کر گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے میں بھی اسی طرح آگے کھسک رہا تھا۔ مگر وہ حیرت انگیز طور پر تیز تیز سرک رہے تھے۔ اور مجھے ان کے قریب رہنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ ہر دو تین سیکنڈ پر مڑ کر وہ مجھے دیکھ لیتے تھے۔ میں سر ہلا اور مسکرا کر ان کو اطمینان دلا دیتا تھا۔

اب ہم صاف جگہ کے گرد لگی ہوئی جھاڑیوں میں پہنچ گئے تھے۔ ابو نے مجھے ٹہوکا دیکر ان شاخوں کی طرف متوجہ کیا جن پر تیتر بیٹھے تھے۔ وہاں ان کی تعداد دو سو سے کم نہیں ہوگی۔ دیکھا تم نے یہ ہیں وہ چڑیاں۔ ابو ان پر نظریں جمائے کہہ رہے تھے۔ کیسا عجیب منظر ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں شکاریوں کے خواب حقیقت بن سکتے ہیں۔ دیکھو تو وہ ہم سے کتنے نزدیک ہیں۔ کچھ تو دس قدم پر ہیں۔ وہ سب اتنے موٹے پلے پلائے تھے کہ چلتے میں ان کے سینے کے پر زمین سے لگ رہے تھے۔ نر چڑیاں بہت زیادہ موٹی تھیں۔ ابو کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں چمکیلے ستارے بھرے ہوئے تھے۔ اور تیتروں پر نظریں جمی ہوئی تھیں۔ یہاں ایک چوکیدار بھی ہے۔ انھوں نے کہا۔

ان کی یہ بات سن کر میں تو ایک دم جیسے جم سا گیا تھا۔ مجھے اس کی طرف نگاہ ڈالنے تک کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بس ایک ہی

خیال ذہن میں تھا کہ مجھے کوئی حرکت نہ کرنا چاہیے۔ اگر اس نے مجھ کو پایا، میں نے اس کو دیکھ لیا تو وہ ہم کو بندوق کا نشانہ بنا دے گا۔ ابو نے سرگوشی میں کہا۔ دیکھو سامنے اس بڑے درخت کے پیچھے ہے وہ! دانی بس جمے رہنا اپنی جگہ پر تم پریشان مت ہونا۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکتا۔

چوکیدار پر نگاہ رکھتے ہوئے ہم زمین پر الٹے لیٹ گئے۔ وہ ایک معمولی قد کا آدمی تھا۔ سر پر ٹوپی بغل میں ڈبل بیرل بندوق دبائے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ ٹوپی میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی نگاہیں سیدھی ہم پر پڑ رہی ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ابو کیا ہم واپس چلیں؟

"چپ!" انھوں نے کہا اور آنکھیں چوکیدار پر جمائے ہوئے آہستہ آہستہ ان کا ہاتھ جیب پر گیا۔ ایک کشمش نکالی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھی اور پھر کلائی کے ایک ہلکے سے جھٹکے میں اسے ہوا میں اچھال دی۔ وہ زمین پر دو چڑیوں کے درمیان گری۔ انھوں نے چونک کر کشمش کو دیکھا۔ ایک نے آگے بڑھ کر جلدی سے نگل لی۔ میں نے چوکیدار کو دیکھا کہ اسے کچھ شبہہ ہوا کہ نہیں، مگر وہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

ابو نے ایک کشمش اور پھینکی۔ تیسری، چوتھی، پانچویں۔ میں ان کی پھینکنے کی مہارت کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے لیے انھوں نے کافی مشق کی ہوگی۔ میں اگر وہاں اکیلا ہوتا تو ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ مگر ابو اس اطمینان سے پوچنگ کے قاعدے استعمال کر رہے تھے۔ جیسے یہ ایک بڑا تفریحی مشغلہ ہو، جب کہ وہ وقت بے حد خطرناک تھا۔ اسی دوران چوکیدار نے اپنا منہ پھیر کر دوسری طرف نظریں دوڑائیں ابو نے اسے دوسری طرف مصروف دیکھا اور ایک جھپاکے میں انھوں نے کشمشوں کی تھیلی جیب سے نکال کر ساری کشمشیں اپنی ہتھیلی پر الٹ لیں۔ اور نگاہ جھپکتے میں ساری کشمش صاف جگہ پہنچ چکی تھیں۔ سوکھی پتیوں پر ان کے گرنے کی آواز ایسے ہوئی جیسے بوندیں پڑنے کی ہوتی ہے۔ آواز تیتروں نے سنی۔ دیکھا اور پر پھڑ پھڑاتے ہوئے کشمشوں کی طرف بھاگے اور ان پر ٹوٹ پڑے۔

چوکیدار نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن موڑی اور تیتروں کو دیکھا کہ وہ دیوانہ وار کوئی چیز چن رہے ہیں۔ اس نے دو تین قدم آگے بڑھائے۔ مجھے لگا کہ وہ جھاڑیوں کی تلاشی لینے آ رہا ہے۔ مگر وہ رک گیا اور منہ اوپر اٹھا کر جھاڑیوں پر نگاہیں دوڑانے لگا۔

ابو نے مجھے لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ میں زمین سے چپک کر لیٹ گیا۔ اور آنکھ کے گوشوں سے ابو کو دیکھتا رہا۔ انھوں نے تھوڑا سا سر اٹھا رکھا تھا۔ اور چوکیدار کو نگاہ میں رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا "تمہیں اس میں مزا نہیں آ رہا ہے؟" اور مجھ میں ان کو جواب دینے تک کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں بیٹھے ہوئے ہمیں صدیاں بیت گئیں۔ آخر ابو نے کان میں کہا خطرہ ٹل گیا ہے۔ دانی! میرے پیچھے آؤ۔ لیکن بہت ہوشیاری سے کیونکہ چوکیدار ابھی تک کھڑا ہے۔ ابو گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اب پیچھے کی طرف کھسک رہے تھے۔ اور میں ان کے پیچھے تھا اس وقت پوری طرح یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ پوچروں کی تلی ہی کیوں نشانہ بنتی ہے۔ کھسکتے میں ہر لمحہ مجھے ڈر رہا کہ میری تلی پر اب کوئی گولی لگی۔ جب ہم کھسکتے ہوئے جھاڑیوں سے نکلے تو ابو نے کہا۔ آؤ بس اٹھ کر بھاگ چلیں۔ ہم بھاگتے ہوئے کھلی پگڈنڈی پر آ گئے اور وہاں سے محفوظ روشن کچی سڑک پر۔

شکر ہے سب کام بہت عمدہ طریقے سے ہو گیا۔ ابو نے پھولی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ان کا چہرہ کامیابی کے جوش میں لال ہو رہا تھا۔ اور چمک رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ابو چوکیدار نے تو ہم کو نہیں دیکھا ہوگا؟

نہیں پیارے بالکل نہیں! انھوں نے کہا۔ بس اب تھوڑی دیر میں سورج چھپ جائے گا۔ سب پرندے بسیرے کے لیے درختوں پر چلے جائیں گے۔ تب ہم واپس جائیں گے اور اپنی مدد آپ کریں گے۔ ہم گری ہوئی چڑیوں کو زمین پر سے ایسے چنیں گے۔ جیسے کنکر پتھر اور اپنے تھیلوں میں بھر لیں گے۔

ہم دونوں جھاڑیوں کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے میرے گلے میں باہیں ڈال دی اور مجھے اپنے سے لپٹا لیا۔

دانی! انھوں نے کہا۔ تم نے سب کام بہت ہی سلیقہ اور خوش اسلوبی سے کیا۔ میں تم پر بجا فخر کرتا ہوں۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر قنبر احمد رضوی

۳ دسمبر ۱۹۸۳ء کو جب گوا کے بندرگاہ سے
ڈاکٹر شرما کی قیادت میں ہندستان کا
تیسرا بحری بیڑا تحقیق اور دریافت کے مشن پر روانہ ہوا
تو مجھے بھی بڑا اشتیاق ہوا کہ آخر سائنس داں ۸۱ مردوں
اور عورتوں کا یہ قافلہ اتنے جوش و خروش سے تیسری بار
کہاں جا رہا ہے۔ میں اسی جستجو میں تیز قدموں کے ساتھ
لائبریری میں داخل ہوا۔ ایک کونے میں ایک الماری کے
شیشوں کے پیچھے سے موٹی موٹی کتابوں میں سے ایک
برف جیسے سفید چہرے نے مجھے خوش آمدید کہا۔ میں ہاتھ
ملانے بڑھا۔ اس قدر ٹھنڈک محسوس ہوئی کہ مجھے
جھرجھری سی آگئی۔ میں نے پوچھا "آپ کی تعریف؟"
اس نے کہا مجھے "سفید ریگستان" یا "برفیلا براعظم"
کہتے ہیں۔

میں — جناب کا دولت خانہ کہاں ہے۔

وہ — میں یہاں سے جنوب میں اس مقام کا رہنے والا ہوں
جس کے جنوب میں دنیا میں اور کوئی مقام نہیں ہے۔

میں — "میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔"

وہ — "جی! میں قطب جنوبی پر رہتا ہوں۔ دنیا کا ہر مقام
اس سے شمال میں ہے۔ جنوب میں کوئی نہیں ہے۔"

میں — آپ کیا جنوبی براعظم "اینٹارکٹکا ہیں"۔

وہ — آپ نے مجھے پہچان لیا۔ لوگ مجھے "اینٹارکٹک" "براعظم"

یا اینٹارکٹکا کہتے ہیں۔

میں — مگر آپ کے اس اسم مبارک کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

اینٹارکٹکا — جناب۔ قطب شمالی کے گرد میرے بھائی آرکٹک بحر اعظم
رہتے ہیں۔ چونکہ میں نے ان کے جائے قیام کے
مخالف سمت یعنی قطب جنوبی کے چاروں طرف
رہائش اختیار کر لی ہے اس لیے دنیا والے مجھے
اینٹارکٹک براعظم کہتے ہیں اسی طرح میرے برف
کے لحاف یا نو دیکھ کر اور میرا برفیلا لباس دیکھتے ہوئے
لوگوں نے میرا نام برفیلا براعظم بھی رکھ دیا ہے۔
میرا برف جیسا سفید رنگ اور چاروں طرف بے
آب و گیاہ سنسان خطہ دیکھتے ہوئے لوگوں نے
مجھے سفید ریگستان کے نام سے بھی پکارنا شروع کر دیا۔

میں — آپ تو کافی وسیع و عریض دکھائی دیتے ہیں۔

اینٹارکٹکا — جی نہیں بلکہ مجھے آپ گول مٹول کہیے تو صحیح ہوگا۔
میں قطب جنوبی سے چاروں طرف دائرہ قطب

جنوبی تک یعنی ۶۶°۳۳ جنوبی تک پھیلا ہوا ہوں۔ میرا کل رقبہ ۱۳۳۳۸۵۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ میرا رقبہ آسٹریلیا اور یورپ (روس کے علاوہ) کے برابر اور U.S.A کا ۱½ گنا ہے۔

میں۔ آپ مجھے سفید ریگستان نہیں بلکہ سفید کوہستان سے لگتے ہیں۔

براعظم اینٹارکٹکا

اینٹارکٹکا۔ میری اوسط اونچائی سطح سمندر سے ۱۸۳۰ میٹر ہے۔ میرے جسم کا سب سے بلند حصہ ۵۱۴۰ میٹر سطح سمندر سے بلند ہے۔

میں۔ آپ کی قیام گاہ خط استوا سے دور ہونے کی وجہ سے آپ کا درجۂ حرارت بھی تو کم ہے۔ میں

اینٹارکٹکا۔ جی ہاں۔ گرمیوں میں بھی میرا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کے قریب رہتا ہے۔ گرمیوں اور سردیوں کا ملا جلا اوسط درجۂ حرارت ۵° سینٹی گریڈ سے بھی کم رہتا ہے۔ قطب جنوبی کی طرف یہ بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس شمال میں گراہم لینڈ میں 'خلیج امید' HOPE BAY کا درجہ حرارت +۱۵ء۲° سینٹی گریڈ ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اور جنوب میں واسٹک کا درجۂ حرارت -۶۷ء۰۷° سینٹی گریڈ پایا گیا جو دنیا میں سب سے کم ہے۔ اتنا کم درجہ حرارت ہونے کی بنا پر ہی میرے جسم پر کئی ہزار میٹر موٹی برف کی تہہ جمی رہتی ہے۔ اور اگر یہ سارا برف پگھل کر سمندروں میں بہ جائے تو ساری دنیا میں سمندروں کی سطح ۱۰۰ میٹر اونچی اٹھ جائے۔

(باقی آئندہ)

(بقیہ صفحہ ۲۱)

کیا۔ "بیٹا! اگر آج ہی سے تم دونوں میں بڑے اور چھوٹے کی بات پیدا ہو گئی تو آگے چل کر تم کچھ نہیں کر پاؤ گے۔ جو اپنے کو چھوٹا سمجھتا ہے وہی آگے چل کر بڑا بنتا ہے۔" آسمان نے مسکرا کر کہا۔

"ہمیں کچھ نہیں بننا ہے، ہم یوں ہی رہیں گے" بجلی نے کہا اور بادل نے اس کی بات کی تائید کی۔ باپ کو غصہ آگیا۔ اس نے دونوں کو ایک ایک لات جماتے ہوئے کہا "تم بختو دفع ہو جاؤ میرے پاس سے، ایسے بچوں سے کیا فائدہ جو کر بیں دھریں کچھ نہیں اور اپنے نام کا ڈھنڈھورہ پیٹتے پھریں اور اپنے منہ میاں مٹھو بنتے پھریں۔ آج سے پھر مجھے منہ نہ دکھانا"

آسمان نے انہیں باہر ڈھکیل کر دروازہ بند کر لیا، "لڑتے جھگڑتے اور شیطانی کرنے والے تم دونوں کی طرح ہی برباد ہو جاتے ہیں"۔ بجلی چیخ چیخ کر زمین پر گر پڑی اور بادل پانی بن کر برسنے لگا۔ آج بھی بجلی اور بادل آسمان کے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں لیکن باپ آسمان ان کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ دونوں اپنی عادت کے مطابق آج بھی لڑتے جھگڑتے ہیں جب بادل گرجتا ہے تو بجلی اپنی بڑائی دکھانے کے لیے کڑکنے لگتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہی لڑ جھگڑ کر برباد ہو جاتے ہیں۔

(ہندی سے ماخوذ)

آستین کا سانپ

پُرانے زمانے کی بات ہے۔ ایک ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ بڑا متقی، پرہیزگار اور انصاف پسند تھا۔ بادشاہ اپنی رعایا کی خوشحالی کے لیے نئے نئے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ اس کی رعایا بھی اپنے بادشاہ کو دل و جان سے چاہتی تھی۔

بادشاہ پھولوں کا بہت شوقین تھا۔ اس نے اپنی رعایا کے لیے کئی بڑے اور خوب صورت باغ لگوائے تھے۔ اس نے اپنے محل کے قریب بھی ایک باغ لگوایا جس میں دنیا بھر کے مختلف قسم کے خوب صورت پھولوں کے پودے لگوائے تھے۔ بادشاہ کے اس باغ کی دور دور تک شہرت تھی۔ بادشاہ صبح اٹھتے ہی فجر کی نماز ادا کرتا اور سیدھا باغ میں پہنچ جاتا اور بہت دیر تک سنگ مرمر کی روش پر چہل قدمی کرتا رہتا تھا۔

ایک دن بادشاہ باغ میں پہنچا تو ایک درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ اس درخت پر بیٹھی ایک بلبل بڑی شیریں آواز میں ایک گانا گا رہی تھی۔ اس کے گانے نے بادشاہ پر ایک جادو سا کر دیا۔ بلبل خاموش ہوئی تو بادشاہ اس سے مخاطب ہوا، "بلبل تیرا شیریں گانا مجھے بہت پسند آیا لیکن آج سے پہلے میں نے کبھی تجھے اپنے باغ میں نہیں دیکھا!"

بلبل بولی: "بادشاہ سلامت! میں سیکڑوں میل سے اڑ کر یہاں آئی ہوں۔ جانتے ہیں کیوں؟"

"نہیں" بادشاہ نے جواب دیا۔

"اس لیے کہ تین مہینے پہلے میرے شوہر کو ایک شکاری اپنے جال میں پھانس لایا تھا۔ اس وقت میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میرے اوپر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جیسے تیسے میں نے ان کی پرورش کی جب وہ اڑنے کے قابل ہو گئے تو میں اپنے شوہر کی تلاش میں نکلی اور یہاں تک آ پہنچی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جس بادشاہ کا عدل و انصاف دور دور تک مشہور ہے اسی کے محل میں میرا بے گناہ شوہر قیدی کی زندگی گزار رہا ہے۔"

"زبان کو لگام دے بلبل" بادشاہ طیش میں آکر بولا۔ "تیری یہ جرأت کہ میرے انصاف کو للکارے"

"یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بادشاہ کسی کی آزادی کو چھین لے۔ بادشاہ کا تو فرض ہے کہ وہ اپنی سلطنت میں رہنے والے ہر جاندار کا خیال رکھے۔"

"میں تیرے شوہر کو رہا کر دوں گا" بادشاہ چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ "لیکن تجھے میری ایک بات ماننی ہوگی۔"

"وہ کیا" بلبل نے پوچھا۔

"تجھے اسی باغ میں رہنا ہوگا تاکہ میں روز تیرے سُریلے نغمے سن سکوں۔"

"ایک بے گناہ کو رہا کرانے کے لیے مجھے اپنا گھر بار چھوڑنا پڑے گا؟" بلبل بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرا مقصد تیرا دل دکھانا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تیرے نغمے شاہی باغ کی رونق بڑھائیں۔ میں نے تجھ جیسے سُریلے نغمے گانے والی بلبل پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

۱۔ مالبوزئی متصل ڈاکخانہ مشیرالدین شاہجہاں پوری

میں کچھ دن آپ کے کہنے سے رک جاؤں گی لیکن جب مجھے اپنے گھر اور بچوں کی یاد تڑپائے گی تو میں یہ شاہی باغ چھوڑنے کی اجازت چاہوں گی۔

"جیسی تیری مرضی!" بادشاہ یہ کہہ کر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا باغ سے نکل گیا۔

دوسرے دن بادشاہ حسب معمول باغ میں پہنچا تو بلبل اپنے شوہر کے ساتھ اسی درخت پر بیٹھی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی اس نے اپنا نغمہ چھیڑ دیا۔ بادشاہ اس نغمے میں کھوگیا۔

تھوڑی دیر بعد جب بادشاہ چلنے لگا تو بلبل بولی "بادشاہ سلامت! آپ کے عدل و انصاف کی میں قدر کرتی ہوں۔ آپ نے میرے شوہر کو رہائی دی۔ میں آپ کے اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتی ہوں۔"

"بدلہ ___ وہ کس طرح؟" بادشاہ دلچسپی سے بلبل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں ایک حقیر پرندہ ہوں لیکن انسان کی طرح خود غرض اور فریبی نہیں۔ میں آپ کو ایک خطرے سے خبردار کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کا خصوصی وزیر جس پر آپ اٹوٹ بھروسا رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے خلاف سازش میں مصروف ہے۔"

"کیا بکتی ہے؟" بادشاہ کا چہرہ غصّے سے سرخ ہوگیا۔ "دس سال سے وہ میرا قابل اعتماد آدمی ہے۔ اس نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ تو مجھے اس کے خلاف ورغلانا چاہتی ہے"

"انسان اور جانور میں یہی تو فرق ہے بادشاہ سلامت۔ انسان اپنے اوپر کی گئی مہربانیوں اور احسانات کو بھلا کر حرص اور اقتدار کے لالچ کا شکار ہوجاتا ہے مگر جانور اپنے مالک کا آخر تک وفادار رہتا ہے۔"

"تو میرے وزیر کے بارے میں کیا کہنا چاہتی ہے۔ صاف صاف کہہ"

"آج رات وہ آپ کے شب خوابی کے کمرے میں داخل ہوگا۔ وہ آپ کو قتل کرکے حکومت پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے آپ کے پہرے داروں کو بھی لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔"

"تجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" بادشاہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"آپ کے محل کے مشرقی جانب جو گھنا جنگل ہے کل میں اس کے ایک درخت پر بیٹھی تھی۔ وہیں پر آپ کا وزیر آپ کے ایک سپاہی سے بات کر رہا تھا۔"

بادشاہ یہ سن کر ایک لمحے کو کانپ گیا پھر خود پر قابو پاتے ہوتے بولا۔ "میں تیری بات کی سچائی کو آزماؤں گا اور اگر تیری بات غلط نکلی تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں انسان کی طرح لالچی اور دھوکے باز نہیں بادشاہ سلامت۔ آپ کا فیصلہ مجھے منظور ہے۔" بلبل بڑے اعتماد سے بولی۔

بادشاہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا محل کی طرف چلا گیا۔

رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جارہی تھی۔ بادشاہ کا لمبا چوڑا محل اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ بادشاہ کے شب خوابی کے کمرے میں ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ کمرے کے باہر بادشاہ کے خصوصی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے قدموں کی ہلکی چاپ سناٹے میں سنائی دے رہی تھی۔ یکایک ایک طرف سے ایک سایہ نکلا اور دبے قدموں سے بادشاہ کی خواب گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا خنجر تھا جو اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ سپاہیوں نے اسے دیکھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ سایہ بادشاہ کے کمرے میں داخل ہوکر مسہری کے قریب رک گیا۔ پھر اس سایے کا خنجر والا ہاتھ بلند ہوا اور اس نے مسہری پر لیٹے بادشاہ پر بھرپور وار کردیا لیکن دوسرے لمحے کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی اور آنے والا شخص گھبرا گیا۔ اس کی نظر سامنے اٹھی تو بادشاہ کو مسہری سے دور کھڑے پایا۔ وہ شخص تھر تھر کانپنے لگا۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ بادشاہ چند قدم آگے بڑھا اور نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ "نمک حرام! تیری وفاداری پر مجھے بڑا ناز تھا لیکن

تو تو آستین کا سانپ نکلا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا وہ پہرے دار جو لالچی کتوں کی حیثیت رکھتے تھے میں نے انھیں خاموشی سے رات کو ہی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈلوا دیا ہے، اگر تیری سازش سے میں باخبر نہ ہو جاتا تو آج تیرا خنجر بجائے مسہری پر رکھے تکیوں کے میرے سینے میں پیوست ہو جاتا۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے تالی بجائی۔ ایک دم کئی سپاہی اندر آگئے اور وزیر کو گرفتار کر لیا۔ پھر بادشاہ نے حکم دیا: "اسے لے جاؤ اور قید خانے میں ڈال دو۔ کل میں اپنی رعایا کے سامنے اسے ایسی سزا دوں گا جو موت سے بھی زیادہ بھیانک ہو گی۔"

صبح ہوتے ہی بادشاہ نے فجر کی نماز ادا کی اور بہت دیر تک سجدے میں پڑا روتا رہا۔ جب سورج نے زمین پر اپنی سنہری کرنیں بکھیریں تو بادشاہ باغ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا انسان کتنا عیار اور لالچی ہوتا ہے جس انسان کو اس نے ایک معمولی سپاہی سے اپنا وزیر بنایا وہی اس کی جان کا دشمن بن بیٹھا۔ انسان کے مقابلے میں جانور اور پرندے کس قدر وفادار ہیں۔

وہ باغ میں پہنچا تو بلبل اس کی منتظر تھی۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی وہ خوشی بھرے لہجے میں بولی "بادشاہ سلامت! آپ کو نئی صبح مبارک ہو۔"

"خدا کے حکم اور تجھ جیسے چھوٹے سے پرندے کی وفاداری نے میری جان بچا لی۔ اب میری سلطنت میں جانور اور پرندے قیدی نہیں بنیں گے۔ قدرت کی طرف سے ان کو دی گئی آزادی چھیننے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہوگا۔"

"میں آپ کے فیصلے سے بہت خوش ہوئی۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔" بلبل نے کہا پھر اپنے شوہر کے ساتھ خوشی کے نغمے گاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف اڑ گئی۔

افتاب عالم

جھگڑے کا نتیجہ

بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ آسمان کی دو اولادیں تھیں۔ لڑکے کا نام تھا بادل اور لڑکی کا نام تھا بجلی۔ ماں کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے باپ آسمان نے اپنے ہاتھوں سے دونوں کی پرورش کی تھی۔ مگر آسمان کے حد سے زیادہ لاڈ پیار نے بادل اور بجلی کو ضدی اور شیطان بنا دیا تھا۔ بھائی بہن بات بات میں ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرتے اور جس چیز کے لیے ضد کرتے، اُسے لے کر ہی دم لیتے۔

بجلی جب بادل کو پڑھتے لکھتے دیکھتی تو اُسے چڑھاتی ہوئی کہتی "دیکھو میرا رنگ و روپ! میرے سنہرے بدن کو دیکھ کر زمین والوں کی آنکھ بھی چوندھیا جاتی ہے۔"

"ہنہ! بڑی چلیں خوبصورت بننے! پہلے جاکر پانی میں اپنا منہ تو دیکھ آ!" بادل چڑھاتا ہوا بولتا۔ "جا جا کالا کلوٹا کہیں کا! جانتا نہیں، میں جب کڑکتی ہوں تو لوگ ڈر سے تھر تھرا اُٹھتے ہیں کہ پتا نہیں کہاں بجلی گرے!" بجلی نے آنکھ نچا کر کہا۔
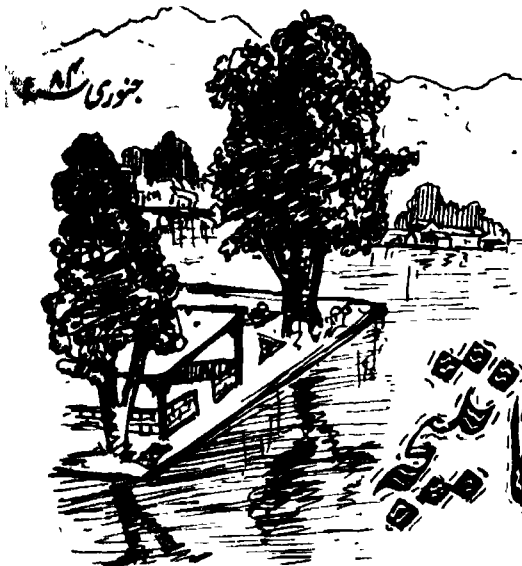
"میں بھلے ہی کالا کلوٹا ہوں مگر تجھ جیسی چڑیل سے کہیں اچھا ہوں! کبھی کالا کلوٹا ہو جاتا ہوں تو کبھی رنگ بدل کر بھورا بھی ہو جاتا ہوں۔ کیا تجھے بھی یہ رنگ بدلنے کی کلا آتی ہے جب میں امنڈتا گھمنڈتا ہوں تو لوگ میرے لیے ہل چل اُٹھتے ہیں۔ مور اور چڑیاں خوشی سے جھومنے لگتی ہیں، اور جب بھی گرجتا ہوں بڑے بڑوں کی گھگھی بندھ جاتی ہے سمجھی؟" بادل نے اپنی تعریف کا پل باندھتے ہوئے کہا۔

"تم میرے سامنے کیا بات کرو گے! میں تم سے بڑی ہوں۔" بجلی نے سر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے بڑا ہوں، سمجھی!" بادل نے غراتے ہوئے کہا۔

دونوں بھائی بہنوں میں کہا سنی چل ہی رہی تھی کہ بیچ میں باپ آسمان آدھمکا۔ آسمان نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا، "دیکھو بیٹا تم دونوں تو جڑواں پیدا ہوئے تھے اس لیے کسی کے چھوٹا بڑا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آخر تم دونوں کیوں لڑ رہے ہو"۔

"آپ کون ہوتے ہیں ہم دونوں کے بیچ دخل دینے والے" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"میں؟ میں تم دونوں کا باپ ہوں اور ایک باپ کے ناطے میرا فرض ہوتا ہے کہ میں تمہیں اچھی تعلیم دوں۔ میری بات مانو اور جاکر اپنا سبق یاد کرو۔" آسمان نے پھر سمجھاتے ہوئے کہا۔ "آپ صاف صاف بتلاتے کیوں نہیں کہ ہم دونوں میں کون بڑا ہے اور کون چھوٹا" بادل نے تنک کر پھر سوال

شیراز ہند اردو لائبریری، موڑکی، جون پور، یوپی

حامد اللہ افسر مرحوم

گاندھی جی کی باتیں

۱۹۲۱ء کا ذکر ہے، میں ایل۔ ایل۔ بی کا طالب علم تھا، گاندھی جی میرے وطن میرٹھ میں تشریف لائے، مجھے ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا آخر میری آرزو بر آئی اور مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ باتیں کرتے کرتے گاندھی جی نے میری اچکن کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "دیسی کپڑا کیوں نہیں پہنتے؟" میں نے عرض کیا "میں چار چیزیں مستقل طور پر استعمال کرتا ہوں۔ دیسی آم کھاتا ہوں، دیسی پان کھاتا ہوں، آلو کھاتا ہوں اور دیسی شکر استعمال کرتا ہوں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟" گاندھی جی نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور فرمایا "تب تو آپ کے لیے دیسی کپڑا پہننا اور بھی آسان ہے، ایک ہی دیسی چیز کا تو اور اضافہ ہوگا۔"

اس کے بعد متعدد بار کئی کئی برس کے وقفے کے بعد مجھے گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا مگر حیرت یہ ہے کہ ہر مرتبہ مجھے دیکھتے ہی انھیں میری چار دیسی چیزوں میں اپنی اسی پانچویں دیسی چیز کے اضافے کا خیال آگیا۔

۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا، گاندھی جی مسوری پہاڑ پر برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں بھی اس سال مسوری گیا ہوا تھا اور گاندھی جی کی خدمت میں کبھی کبھی حاضر ہوتا رہتا تھا۔

مسوری میں ان دنوں بہت سے لداخی مزدور آئے ہوئے تھے۔ لداخ کشمیر میں ایک جگہ ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کو لداخی کہتے ہیں۔ سنتے ہیں ہر سال سردی کے موسم میں کام کی تلاش میں مسوری اور دوسرے مقامات پر آجاتے ہیں۔ یہ سب کے سب یا ان میں سے زیادہ تر مسلمان تھے۔ بے چارے بہت غریب تھے۔ ایک پھٹے ہوئے جانگیے اور پیوند لگے ہوئے شلوکے کے سوا ان کے بدن پر کچھ نہ ہوتا تھا۔ رات کے وقت ٹاٹ کے بورے میں لپٹ جاتے تھے۔ یہی ٹاٹ کا بورا ان کا لحاف تھا اور یہی ان کا گدا۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر گاندھی جی کو بڑا ترس آیا اور انھوں نے ان کی امداد کے لیے مختلف تجاویز پر غور کرنا شروع کیا۔ اسی سلسلے میں گاندھی جی نے ایک ایسی عمارت کی تعمیر کی تحریک بھی شروع کی۔ جہاں پر یہ بے چارے پہاڑی مزدور ٹھہر سکیں اور ان سے اس کا کرایہ نہ لیا جائے۔ شاید اس عمارت کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے کے وعدے بھی ہو گئے تھے۔

ایک دن میں بیٹھا ہوا تھا کہ یہ ذکر چلا کہ اس عمارت کا کیا نام رکھا جائے۔ کئی نام تجویز ہوئے مگر گاندھی جی کو کوئی نام بھی پسند نہ آیا آخر فیصلہ اس پر ہوا کہ اسے "دھرم شالہ" کہا جائے۔

میں نے عرض کیا اگر اس کا نام دھرم شالہ رکھا گیا تو ان بے چارے لداخی مزدوروں میں سے زیادہ تر تو اس میں داخل بھی نہ ہو سکیں گے، کیونکہ وہ مسلمان ہیں۔ یہ عمارت بھی اسی طرح کی ہو جائے گی جیسے اور بہت سے دھرم شالے ہیں"۔

مہاتما جی نے کہا" مگر ان کے لیے ہم اس عمارت میں خاص طور پر کچھ کمرے مقرر کر دیں گے"۔

میں نے عرض کیا" پھر بھی شاید وہ اس میں نہ ٹھہر سکیں کیونکہ دھرم شالے میں مسلمان کہاں ٹھہر سکیں گے"۔

مہاتما جی نے فرمایا" پھر اس کا علاج کیا ہے"؟

میں نے عرض کیا" اس عمارت کا نام آپ غریب خانہ کیوں نہیں رکھتے"۔

ایک دوسرے اور صاحب وہاں بیٹھے ہوئے تھے بولے "غریب خانہ تو شاید اپنے گھر کو کہتے ہیں"۔

میں نے کہا" جی ہاں کہتے تو ہیں۔ لیکن اپنے گھر کو غریب خانہ محض انکساری کی غرض سے کہتے ہیں خود کو غریب فرض کر لیتے ہیں اور اپنے گھر کو غریب خانہ قرار دیتے ہیں۔ ورنہ غریب خانے کے معنی غریب کے گھر کے سوا اور کچھ نہیں۔

گاندھی جی کو یہ نام پسند آیا اس کے بعد مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ عمارت بنی بھی یا نہیں اور اس کا نام غریب خانہ رکھا گیا یا نہیں۔

گاندھی جی جھوٹ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ستیہ گرہ آشرم میں نیک چلنی اور سچائی کے قواعد بہت سخت تھے۔ یہاں تک کہ بچوں کو بھی ان کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔

ایک دفعہ ایک نوجوان آشرم میں رہنے کے لیے آئے یہ بی اے پاس کر چکے تھے حسب دستور گاندھی جی نے ان کے سپرد یہ کام کیا کہ تین مہینے تک وہ آشرم میں روزانہ جھاڑو دیا کریں۔

اس نوجوان کو بچوں سے بڑا انس تھا اور بچے بھی اس سے بہت مانوس تھے۔ ایک دن آشرم کی ایک آٹھ سالہ لڑکی اس سے ایک لیمو چھیننا چاہتی تھی وہ اس لڑکی کے ساتھ کھیلنے لگا اور اسے بچا مارا اور لیمو نہیں دیا۔ لڑکی تنگ آ کر رو پڑی۔ اصل میں یہ لیمو وہ آشرم کے ایک مریض کے لیے لے جا رہا تھا اسے کیسے دے دیتا۔ جب لڑکی رونے لگی تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔ آخر اسے ایک ترکیب سوجھی اس نے لیمو ہاتھ میں لے کر زور سے اپنا ہاتھ ہلایا اور یہ ظاہر کیا کہ جیسے لیمو کو سابرمتی ندی میں پھینک دیا ہو۔ مگر اصل میں ایسا نہیں کیا تھا بلکہ چالاکی سے لیمو کو اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب لڑکی کا دھیان ندی کی طرف گیا اور کہنے لگی میں لیمو کو ندی سے نکال لاؤں۔ کنارے ہی پر تو ہوگا۔" نوجوان نے جواب دیا" لیمو ندی میں ڈوب بھی گیا' اب تم اسے نہیں نکال سکتیں"۔

بات آئی گئی ہو گئی دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے اتفاق ایسا ہوا کہ مریض کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نوجوان نے اپنی جیب سے رومال جو نکالا تو اس کے ساتھ لیمو بھی جیب سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔ لڑکی ہکا بکا رہ گئی اور نفرت سے نوجوان کی طرف دیکھ کر بولی" اچھا آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ لیمو آپ نے جیب میں رکھ لیا تھا اور مجھ سے کہہ دیا کہ میں نے ندی میں پھینک دیا۔ آشرم میں رہ کر آپ نے اتنی بری بات کی' میں باپو سے کہوں گی کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں"۔

یہ کہہ کر وہ بھاگی اور سیدھی گاندھی جی کی خدمت میں پہنچی اور ان سے کہہ دیا کہ فلاں آدمی نے اس طرح جھوٹ بولا۔ گاندھی جی نے کہا" ہم معلوم کریں گے کہ کیا بات ہے اور کیوں انھوں نے جھوٹ بولا"۔

شام کو دعا کے بعد گاندھی جی نے اس نوجوان کو بلایا اور اس سے پوچھا کیا بات تھی۔ اس نے سارا قصہ سنا دیا اور کہنے لگا کہ یہ سب محض مذاق تھا۔

گاندھی جی نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا" دیکھو آئندہ سے اس بات کا خیال رکھو کہ بچوں سے مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولو"۔

محمد شاہد جمیل خاں

خلیفۂ دوم حضرت عمر ابن خطابؓ کے عدل و انصاف اور مساوات کے بہت سارے واقعات زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ انھوں نے بیت المال کی بھی مثالی حفاظت کی ہے۔ بیت المال کی حفاظت کے سلسلے میں ایک دو واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ اخراجات کے لیے بیت المال سے اس قدر کم رقم لیتے تھے کہ انھیں بڑی تنگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا جب ان کی حالت لوگوں سے دیکھی نہ گئی تو حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت زبیر اور دیگر صحابۂ رسول ان کی بیٹی امّ المؤمنین حضرت حفصہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اس شرط کے ساتھ کہ ہم لوگوں کا نام ظاہر نہ ہو اپنے والدِ محترم تک ہم لوگوں کا پیغام پہنچا دیں کہ وہ جو رقم بیت المال سے اخراجات کے لیے لیتے ہیں وہ کسی حالت میں کافی نہیں ہے لہٰذا اس میں کچھ اضافہ کریں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ کون لوگ ہیں جو ایسی ترغیب دیتے ہیں میں ان کی خبر لوں گا۔ حضرت حفصہ نے کہا نام ظاہر نہیں کیا جا سکتا ہے سن کر فرمانے لگے تم میرے اور ان کے درمیان ہو کیا رسول اللہ صلعم نے فاقے نہیں کیے؟ پیوند لگے ہوئے کپڑے نہیں پہنے؟ پھر جب انھوں نے فضولیاتِ دنیا کی طرف توجہ نہیں کی تو مجھے بھی اسی حالت میں رہنے دو۔

حضرت عمرؓ کے دونوں بیٹے عبداللہ اور عبیداللہ عراق کی فوج میں شامل تھے جب مدینہ واپس آنے لگے تو والیِ بصرہ ابو موسیٰ اشعری نے یہ کہہ کر کچھ رقم دونوں بھائیوں کے حوالے کی کہ یہ رقم خلیفہ کے پاس بھیجنا تھی تم اس کو لے کر یہاں سے کوئی تجارتی سامان خرید لو۔ مدینہ پہنچ کر اس کو فروخت کر کے اصل رقم بیت المال میں جمع کر دینا اور نفع خود لے لینا۔ دونوں بھائیوں نے ایسا ہی کیا۔ جب حقیقتِ حال حضرت عمرؓ کو معلوم ہوئی تو انھیں بلا کر نفع طلب کیا۔ دونوں بھائیوں نے جواب دیا والیِ بصرہ نے نفع خود لے لینے کی اجازت ہمیں دے دی تھی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ صرف امیر المومنین کے بیٹوں کو اجازت دی تھی یا ساری فوج کو۔ یہ سن کر عبداللہ خاموش ہو گئے لیکن عبیداللہ نے فرمایا اس کی ذمہ داری بھی تو ہمارے اوپر تھی اگر نقصان ہوتا یا مال ضائع ہو جاتا تو ہم کو اپنے پاس سے ادا کرنا پڑتا۔ اس پر لوگوں نے فیصلہ کیا کہ منافع میں سے نصف ان لوگوں کو دیا جائے اور نصف بیت المال میں داخل ہو۔

اسی طرح جب ایک بار قیصرِ روم کو خط بھیجا گیا تو ام کلثومؓ (حضرت عمرؓ کی بیوی) نے اسی قاصد کے ہاتھوں اپنی طرف سے ملکۂ روم کے لیے کچھ تحفے بھیجے وہاں سے ملکۂ روم نے بھی ان کے لیے ہدیہ بھیجا جس میں موتی کی ایک بیش قیمت مالا تھی۔ حضرت عمرؓ نے اسے بیت المال میں جمع کروایا۔ لوگوں نے کہا یہ ملکۂ روم کا ہدیہ ہے جو آپ کے زیرِ فرمان ہے نہ اس کے مال سے آپ کو کچھ تعلق ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا قاصد تو مسلمانوں کا تھا اور اس کے اخراجات بیت المال سے دیے گئے تھے اس لیے ام کلثوم کو صرف اسی قدر ملا جتنا ان کا صرف پڑا تھا۔

غرض حضرت عمرؓ بیت المال کے ایک ایک پیسے کو مسلمانوں کا اور اسلام کا پیسا سمجھتے تھے اور ایسی اس کی حفاظت کرتے تھے جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اسی طرح خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہو جانے کے بعد بھی تجارت کرتے رہے جس سے خلافت کے کاموں میں خلل پڑنے لگا بالآخر اسے ترک کر دینا پڑا تب بیت المال سے ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ اخراجات کے لیے مقرر کر دیا گیا لیکن بعد میں ان کی وصیت کے مطابق ان کی زمین بیچ کر خرچ کیے گئے کل روپے بیت المال میں جمع کر دیے گئے۔

حضرت خالد بن ولید سپہ سالارِ اسلام کا نام کون نہیں جانتا انھوں نے ایسے ایسے معرکے سر کیے جب کہ فتح کا یقین بہت کم ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ خالد بن ولید نے ایک شاعر کو جس نے ان کی تعریف میں شعر کہے تھے بیت المال سے کثیر رقم بطورِ انعام دے دی تھی اس کے علاوہ کچھ اور وجہیں تھیں جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے انھیں معزول کر دیا تھا۔ ●

سائنتھ کالونی ڈاک خانہ صاحب گنج، ضلع سنتھال پرگنہ (بہار)

محمد عرفان نجف علیمی
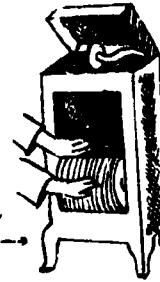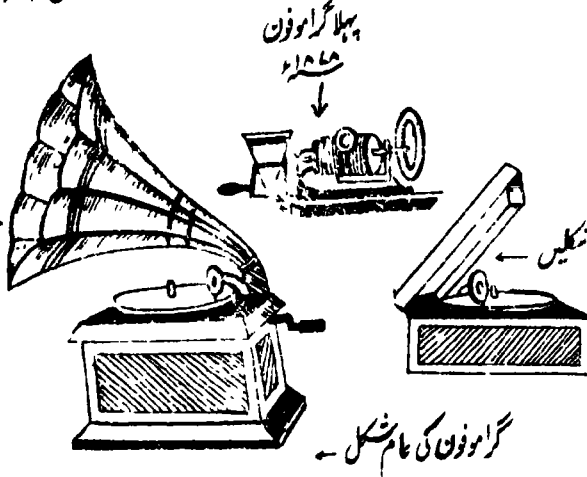
ایڈیسن - ایک عظیم سائنس داں

ایڈیسن امریکہ کا مشہور سائنس داں تھا۔ وہ بہت ہی محنتی اور عقلمند تھا۔ بچپن سے ہی اسے نئی نئی چیزوں کو جاننے اور ان پر تجربات کرنے کا شوق تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ جب اسے استانی کوئی سبق پڑھاتیں تو وہ سوالات ضرور کرتا اور تب تک خاموش نہ ہوتا جب تک کہ ان کے جوابات سے مطمئن نہ ہو جاتا۔

ایک دن وہ کلاس میں بیٹھا تھا۔ استانی نے بچوں کو پرندوں کے بارے میں ایک کہانی سنائی۔ ایڈیسن پوری کہانی بڑے غور سے سنتا رہا۔ آخر کو اس سے رہا نہ گیا۔ وہ سوال کر بیٹھا۔ "کیا صرف پرندے ہی اڑ سکتے ہیں انسان نہیں"؟

"نہیں انسان پرندوں کی طرح اڑ نہیں سکتا کیوں کہ اس کے پنکھ نہیں ہوتے۔ پرندوں کے پنکھ ہوتے ہیں جن کے سہارے وہ آسمان میں اڑتے ہیں" استانی نے سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔ "پتنگ کے بھی تو پنکھ نہیں ہوتے، لیکن ہم اسے آسمان میں کافی اونچائی تک اڑا لیتے ہیں۔ پھر انسان کیوں نہیں اڑ سکتا ہے؟" ایڈیسن نے دوسرا سوال کیا۔

یہ سوال و جواب سن کر کلاس کے سبھی لڑکے ہنسنے لگے لیکن استانی کو ایڈیسن کا یہ سوال پسند نہ آیا۔ اُس نے اسے شریر، بے وقوف اور بد معاش کہہ کر اسکول سے نکال دیا۔ اب ایڈیسن اسکول چھوڑ کر گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہ روز روز نئے نئے تجربات کرتا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک چڑیا کیڑے مکوڑے کھا رہی ہے فوراً اس نے سوچا کہ چڑیوں کے اڑنے کی اصل وجہ کیڑے مکوڑے کھانا ہی ہے۔ اگر انسان بھی کیڑے مکوڑے کھانے لگے تو وہ بھی اڑ سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اسے تجربہ کرنے کی سوجھی۔ اس نے کچھ کیڑے مکوڑے اکٹھا کیے اور انھیں پیس کر پانی میں ملایا اور اپنی نوکرانی کی لڑکی کو گلاس دیتے ہوئے کہا "لو اسے پی لو۔ اسے پیتے ہی تم بھی چڑیوں کی طرح آسمان میں اڑنے لگو گی"۔ اس بھولی بھالی لڑکی نے ایڈیسن کی بات کو سچ سمجھ کر اسے پی لیا لیکن اڑنے کی کوشش کرنے پر اس کے چوٹ بھی لگی اور وہ بیمار بھی پڑ گئی۔

اسی طرح ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک مرغی انڈوں پر بیٹھی بچے نکال رہی ہے۔ فوراً اس نے سوچا کیا انسان انڈوں سے بچے نہیں نکال سکتا؟۔

اس نے کچھ انڈے اکٹھے کیے اور ان پر خود ہی بیٹھ گیا لیکن انڈوں سے بچے نکلنا تو درکنار رہے، خود اس کے کپڑے انڈے ٹوٹ جانے سے گندے ہو گئے۔ اس حرکت پر اس کی ماں نے خوب پٹائی بھی کی۔

اس کے باپ کی یہ دلی خواہش تھی کہ ایڈیسن خوب پڑھ لکھ کر کہیں اچھی جگہ ملازمت کرے۔ ایڈیسن کو پڑھانے کے لیے اس کے باپ نے ہر طرح کی کوشش کی روزانہ اسکول جاتے وقت اسے ۲۵ سینٹ دیے جاتے جس سے وہ کتاب اور کاپی کا خرچ پورا کرتا اور تجربات کرنے کے لیے کچھ ضروری سامان خرید لاتا۔ لیکن اتنے پیسوں سے اس کی ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں، اس لیے اس نے ریل گاڑی پر اخبار اور پھل بیچنا شروع کر دیا۔ کچھ دن تک وہ یہی

بیگم سرائے الہ آباد

کرتا رہا۔ آخر کو اس نے خود بھی ایک اخبار نکالنا شروع کر دیا جس سے اس کی مالی حالت سدھر گئی۔

کچھ دنوں کے لیے اس نے ریلوے میں ملازمت بھی کر لی تھی مگر تجربے کرنے کی اس کی پرانی عادت ابھی چھوٹی نہ تھی۔ ایک دن وہ ریل کے ڈبے میں بیٹھا کوئی تجربہ کر رہا تھا کہ اچانک ڈبے میں آگ لگ گئی۔ آگ لگنے کی وجہ سے اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔

پھر کئی سالوں تک وہ ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔

ایک بار ایڈیسن اپنے ایک دوست سے ملنے ایک کمپنی میں گیا۔ وہاں پر ایک مشین کسی خرابی ہو جانے کے سبب چلتے چلتے رک گئی تھی۔ سبھی لوگ اسے ٹھیک کرنے میں لگے تھے، لیکن ٹھیک نہیں کر پا رہے تھے۔ ایڈیسن کچھ دیر اسے بغور دیکھتا رہا اور آخر میں خود ہی اس مشین کو ٹھیک کر دیا۔ سب لوگ تعجب میں پڑ گئے کمپنی کا منیجر بھی بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنی کمپنی میں اسے ایک اونچے عہدے پر رکھ لیا۔ اب ایڈیسن دن بھر وہاں کام کرتا اور رات کو گھر پر تجربات کیا کرتا۔ آخر تجربات کرتے کرتے ۱۸۷۷ء میں اس نے گراموفون کی ایجاد کی اور ۱۸۷۸ء میں اس نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ دنیا کو بہت جلد بجلی کی روشنی بھی دے گا۔ ایسے زمانے میں جب کہ لوگ اپنے گھروں میں موم بتی اور تیل کا چراغ جلا کر اجالا کرتے تھے، ایڈیسن کا یہ دعویٰ بے بنیاد اور ناممکن معلوم ہوا۔ اس زمانے کے سائنس دانوں نے اس کی اس بات کا مذاق اڑایا۔ لیکن ۱۸۸۰ء میں اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور بجلی کے بلب کی ایجاد کر کے دنیا والوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ بلب کی ایجاد کرنے میں اسے ۱۲۰۰ تجربات کرنے پڑے اور ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اور آخر میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اور اسے عالمی شہرت ملی۔ لیکن زندگی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور ۱۹۳۱ء میں وہ اس دنیا سے چل بسا۔

ماں : بیٹے اسلم جلدی سے چھوٹی آری اٹھا لاؤ"
اسلم دوڑ کر ایک چھری اٹھا لایا۔
ماں ۔ بے وقوف یہ آری ہے ؟" ماں نے جھنجھلا کر کہا۔
اسلم : جی یہ آری کا بچّہ ہے۔ ابھی دانت نہیں نکلے ہیں۔

شگفتہ جاوید، ڈالی گنج، لکھنؤ

ایک لالچی نے خواب میں دیکھا۔ اللہ اسے دس روپے دے رہا ہے۔ اس نے کہا "اے اللہ! تجھ سے اور صرف دس روپے۔ کم از کم ایک سو روپیا تو دے دے"۔
اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ تو دیکھا وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ فوراً آنکھیں بند کرلیں اور کہنے لگا:
"اچھا دس روپے ہی لا"

روشن آرا، قاسمی منزل، پورنیہ

ایک بچّہ نے ایک فقیر سے کہا کیا آپ چور ہیں ؟
فقیر نے کہا : نہیں بیٹے۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں چور ہوں ۔
بچّہ ! بابا آپ کی داڑھی میں تنکا نظر آرہا ہے۔

اُستاد شاگرد سے کہتا ہے۔ اللہ نے آنکھیں کیوں دی ہیں ؟
شاگرد کہتا ہے : "سر" کو دیکھنے کے لیے۔
استاد نے پھر پوچھا اور کان کس لیے دیے ہیں۔
شاگرد کہتا ہے : جی سر! مُرغا بننے کے لیے۔

ایوب عبداللطیف

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں

پیامی ادبی معمّا نمبر ۳ کا صحیح جواب ذیل کی کتابوں میں ہی ملے گا

کتاب	مصنف	قیمت
نیلا ہیرا	مظفر حنفی	۴/۵۰
ہمارے محاورے	سیفی پریمی	۷/۵۰
کہاوت اور کہانی	"	۶/۰۰
چنبیلی	محمد حسن حسّان	۱/۲۰
صحت کی الف بے۔	مسعود احمد برکاتی	۳/۰۰
مچھیرا اور اس کی بیوی	عبدالواحد سندھی	۲/۵۰
آؤ ڈراما کریں	پروفیسر محمد مجیب	۲/۰
جوہرِ قابل	مسعود احمد برکاتی	۳/۰
پہیلیاں	ڈاکٹر سیفی پریمی	۰/۸۰
گاندھی بابا کی کہانی	قدسیہ زیدی	۴/۰
بچوں کی کہانیاں	عبدالواحد سندھی	۱/۵۰
بندر اور نائی	"	۲/۵۰
میاں ڈھینچو کے بچے	ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۱/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (اوّل)	"	۲/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (دوم)	"	۲/۵۰
تین اناڑی	عصمت چغتائی	۳/۰
ہار کی تلاش	ریاض احمد خاں	۶/۰
دُم کٹا سانپ	محمد قاسم صدیقی	۱/۰
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰

کتابیں حاصل کرنے کے پتے :

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵
۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار، دہلی ۶
۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
۴۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

لومڑی کی کہانیاں

مدبرہ عثمانی

۱:- دم کٹی لومڑی

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ لومڑی کافی چالاک ہوتی ہے اور آسانی سے دھوکا نہیں کھاتی۔ لیکن اتفاق سے ایک دن ایک لومڑی جال میں پھنس گئی۔ اس نے نکلنے کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے اور آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی مگر اس کھینچا تانی میں اس کی دم جال میں ہی پھنس کر ٹوٹ گئی۔

لومڑی کو اپنی یہ حالت اچھی نہ لگی۔ اس نے سوچا دوسری لومڑیاں جب یہ دیکھیں گی تو مذاق اڑائیں گی۔ اب میں کروں تو کیا کروں۔ وہ اسی سوچ میں تھی کہ اسے یہ ترکیب سوجھی کہ وہ دوسری لومڑیوں سے کہے کہ اس نے جان بوجھ کر دم کٹوادی ہے۔ دم سے فائدہ ہی کیا، ایک جھنجھٹ ہی تو ہے۔ خواہ مخواہ ایک بوجھ اٹھائے پھرو۔

چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور دوسری لومڑیوں سے کہنا شروع کر دیا۔ تم سب بغیر دم کے اچھی لگو گی۔ آخر اس کا فائدہ کیا ہے ؟ مجھے دیکھو میں بغیر دم کے بہت تیز دوڑ سکتی ہوں۔

اس کی یہ باتیں سن کر ایک بوڑھی لومڑی نے کہا: "میں سمجھتی ہوں تم یہ اس لیے کہہ رہی ہو کہ تم اپنی دم سے ہاتھ دھو بیٹھی ہو۔ اسی لیے تم نہیں چاہتیں کہ دوسروں کی دمیں باقی رہیں ہمیں اپنی دمیں اچھی لگتی ہیں اور ہم انھیں کٹوائیں گے نہیں ورنہ دوسرے جانور ہمیں دم کٹا دیکھ کر ہنسیں گے اور ہمارا مذاق اڑائیں گے کہ ہم نے اپنی خوب صورتی کو ختم کر دیا ہے۔"

۲:- کوّا اور لومڑی

ایک دن ایک کالے کوّے کو پنیر کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ اس نے سوچا میں اس ٹکڑے کو کسی گھنے درخت کی ٹہنی پر الگ بیٹھ کر کھاؤں گا تاکہ اطمینان سے کھا سکوں اور مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔ یہی سوچ کر وہ تھوڑی دور اڑ کر ایک گھنے درخت کی اندرونی شاخ پر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے اس درخت کے نیچے ایک لومڑی بیٹھی تھی جس نے کوّے اور اس کی چونچ میں دبے ہوئے پنیر کے ٹکڑے کو دیکھا تو اس کے منہ میں پانی آ گیا۔ اس نے کوّے سے پنیر حاصل کرنے کی ترکیب سوچی اور اس درخت کے چاروں طرف چکر لگانے لگی اور خود ہی سے کچھ بلند آواز میں کہتی رہی "کوّا بھی کتنا اچھا جانور ہے۔ اس کی آواز کتنی پیاری ہوتی ہے۔ آج صبح سے مجھے کوئی کوّا ملا ہی نہیں جس سے کچھ دیر گیت سن کر اپنا دل بہلاتی۔"

کچھ دیر چکر لگانے کے بعد اس نے اوپر دیکھا اور کوّے سے مخاطب ہوئی "ارے تم یہاں بیٹھے ہو اور مجھے اپنا گیت نہیں سناتے مجھے تمھاری آواز بہت پسند ہے۔ تھوڑا سا گیت سنا کر میرا دل خوش کر دو۔ میرا بس چلے تو میں تمھیں سارے پرندوں کا راجا بنا دوں۔"

کوّا خوش ہو کر لومڑی کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے "کائیں کائیں" کرنے کے لیے اپنی چونچ کھولی اور اسی کے ساتھ پنیر کا ٹکڑا نیچے زمین پر تھا جسے فوراً ہی لومڑی نے اپنے منہ میں رکھ لیا تھا۔

کوّا اب بھی کائیں کائیں کر رہا تھا اور لومڑی زبان منہ پر پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ تمھاری کائیں کائیں تو مجھے اب بھی اچھی لگ رہی ہے مگر راجا بننے کے لیے سمجھ دار ہونا بھی ضروری ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

۲۵۰۱، بارہ دری۔ بلی ماران، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

ادھر ادھر سے

آپ ہیں کانپور کے مسٹر عارف آزاد۔ آپ سری نگر سے کنیا کماری تک ایک ایسی سائکل پر سفر کر رہے ہیں جس میں صرف ایک پہیا اور پیڈل ہیں۔ اس میں ہینڈل ہی نہیں ہے۔ ان کا یہ سفر پانچ مہینے میں پورا ہوتا ہے۔ عارف صاحب روزانہ ۵۰ کلو میٹر سفر کرتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ کانپور سے دہلی کا سفر ۲۶ دن میں اور لکھنؤ سے بمبئی کا سفر ایک مہینا اور سات دن میں پورا کرچکے ہیں۔

مقابلے

۱۴ نومبر ۸۳ء نیشنل ہائی اسکول کلیان میں یوم اطفال کے موقع پر مسعود پٹیل امام صاحب کی زیر صدارت قصہ گوئی اور نظم خوانی کے مقابلے منعقد کیے گئے۔ اقبال مومن صاحب نے چاچا نہرو کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ مقابلے کے دوران تسلیم شیخ (ہشتم الف) اماونسنگ کے انعام پانے والوں میں اوّل، تحسین نورالدین قاضی ششم الف، دوم محمد عظیم شرف علی خان۔ شمیم ب۔ سوم مجاہد شیخ گلاب دہم ب کے نام ہیں۔

پانچسو کیلوں والے بستر پر بارہ دن تک سونے کا ریکارڈ

۱۷ دسمبر۔ ویلز کا باشندہ ایلن اینڈروز جب جمعہ کی صبح کو اٹھا تو وہ ایک نیا ریکارڈ قایم کرچکا تھا۔ وہ بارہ دن مسلسل ایسی چارپائی پر لیٹا رہا تھا۔ جس میں پانچ سو کیلیں ٹھکی تھیں دو سو گھنٹہ کا سابقہ ریکارڈ اپریل میں قایم ہوا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۳۵)

بچہ سوتا اٹھا نہ نوکر آیا، نہ آقا ہی روپیہ لے کر واپس آیا۔ اس وقت کپڑے والے کو فکر ہوئی۔ بچے کو اٹھایا تو مردہ پایا۔ کپڑے والے کے ہوش اُڑ گئے۔ اسی فکر میں پریشان بیٹھا تھا کہ اتنے میں وہ امیر نوکر کے ساتھ آگیا اور اس لڑکے کو دیکھ کر بہت طیش میں آگئے اور کہنے لگے کہ تم نے لڑکے کا گلا گھونٹ کر مار دیا ہے۔ آخر بڑی منت سماجت کے بعد ایک ہزار روپیہ اور نقد لے کر ٹلے۔ کپڑے والے نے چپکے سے، اپنے آپ سے کہا:

"کریے تو ڈریے نہ کریے تو ڈریے"

اور خدا کا خوف اس کے دل پر چھا گیا۔ روشن آرا (رسالہ ہفتم)

قاسمی منزل۔ پورنیہ

میں آپ کا رسالہ "پیام تعلیم" تقریباً ایک سال سے پڑھ رہا ہوں۔ یہ رسالہ مجھے بے حد پسند ہے۔ ایک شمارے کے ملنے کے بعد اگلے شمارے کے لیے بڑی بے تابی سے انتظار کرتا ہوں۔ یہ رسالہ دن بہ دن ترقی کرتا جا رہا ہے اور ہر بار اس میں پہلے سے کچھ نہ کچھ اچھا مواد ہوتا ہے۔ لیکن ان اچھائیوں کے باوجود آپ کے اس رسالے میں چند خامیاں بھی ہیں۔ آپ لوگ رسالے میں بے معنی کہانیوں کی ایک لمبی قطار لگا کر تمام پیامیوں کا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کے مختلف شماروں میں "بیوقوف سا بوردو، پھلی کا بیاہ، دور کی کوڑی، دھنک کے رنگ اور درستی خان وغیرہ جیسی کہانیاں محض رسالے کی موٹائی بڑھانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے رسالے میں کہانیوں کی زیادہ تعداد کے بجائے سائنسی اور معلوماتی مضامین میں اضافہ کر دیں۔ اس کے علاوہ آپ کو اپنے رسالے میں کھیلوں کے متعلق مضامین کے لیے جگہ وقف کر دینی چاہیے۔ کیونکہ کھیلیں موجودہ دور کی اہم ضرورت ہیں۔ "کارٹونی کہانی" سے پیام تعلیم کا قیمتی صفحہ ضایع ہوتا ہے۔ اس کے بجائے آپ کو سوال و جواب" کا کالم بڑھانا چاہیے۔

راشد اشرف وانی
کپوارا، کشمیر

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے نومبر ۱۹۸۳ء کا "پیام تعلیم" بر وقت مل گیا جس سے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے اِس بار کی ترتیب و تزئین بہت اچھے انداز میں کی ہے۔

"دو شکاری" کی قسط بہت دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ مجموعی طور پر تمام کہانیاں اور مضامین پسند ہے۔ عبدالمجید صاحب کا قمری کیلنڈر بہت خوب ہے۔ آپ نے آخر کار پیامیوں کے اِصرار پر "پیامی ادبی معمّا" کا سلسلہ شروع کر ہی دیا۔ اس مستحسن اقدام پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے گا۔

محمد زبیر آفاق
وانمباڑی

نومبر ۱۹۸۳ء کا "پیام تعلیم" باصرہ نواز ہوا۔ یہ شمارہ بلاشبہ پچھلے تمام شماروں سے زیادہ دلچسپ رہا۔ خاص کر زبیر آفاق صاحب کا انتخاب "عظیم شخصیتیں" نے ہی مجھے قلم اُٹھانے پر مجبور کیا۔ جو بچے امتحان میں ناکام ہونے پر شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور آگے تعلیم جاری رکھنے کا خیال ترک کر دیتے ہیں، یہ جان کر دنیا کی بہت سی عظیم شخصیتیں بھی اپنے طالب علمی کے زمانے میں نہ صرف ایک بار بلکہ کئی بار ناکام ہوئیں۔ لیکن مسلسل محنت سے آخر منزل کو پا ہی لیا۔ یقیناً ان کے حوصلے بلند ہوں گے اور وہ پڑھائی کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دیں گے۔ میں زبیر آفاق صاحب کو اس انتخاب پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بدر جہاں صاحبہ کا مضمون "نوبل پرائز" بھی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔

کہانیوں میں "شیشے کے ٹکڑے" بہت پسند آئی۔ کیونکہ یہ "پیام تعلیم کی عام روش سے ذرا ہٹ کر ہے اور زبان و بیان! ماشااللہ پیامیوں کو ضرور پسند آئی ہو گی۔

جاوید نہال ہاشمی
بردوان

بچوں کی کوششیں

بڑا بھائی

اُس کی عمر ۵۰ کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ کب سے گانو میں ہے کسی کو نہیں معلوم تھا لیکن اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ کوئی مہان جیوتشی ہے۔ وہ نیم پاگل قسم کا کمزور انسان تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت برستی تھی۔ آنکھیں لال انگاروں کی طرح، کھچڑی بال جن میں اکثریت سفید بالوں کی تھی۔ گال اندر کو پچکے ہوئے تھے، آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں۔ وہ ہمیشہ ایک اورکوٹ پہنے رہتا تھا جو شاید کسی وقت میں خوب صورت رہا ہوگا مگر اب نیم شکستہ ہو چکا تھا۔ اس کی شخصیت سے گانو والے واقف نہ تھے۔

وہ اکثر اس گانو کے ضلع حمیر پور کے بارے میں لوگوں کو بتایا کرتا تھا۔ اس کی گفتگو میں زندگی کے نشیب و فراز زیادہ ملتے تھے۔ اکثر شام کو کسان اس کے پاس آکر بیٹھ جاتے اور گفتگو کا دور شروع ہو جاتا۔ دنیا بھر کی گفتگو ہوتی تھی لوگوں کو راز زندگی بتا کر وہ کافی مسرور نظر آتا تھا۔

شام ہو رہی تھی، سورج نے اپنا مقررہ فاصلہ طے کر لیا تھا وہ جانا ہی چاہتا تھا تاکہ چاند میاں کو بھی میدان میں آنے دے جیوتشی بابا حسب معمول پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے، پاس ہی کچھ تھکے ماندے کسان بھی آبیٹھے تھے اچانک بابا کی کمزور آواز ابھری ”ارے رموا! کل ضلع سپرنٹنڈنٹ طاہر خاں دورہ کرنے والے ہیں؟“

”ہاں بابا! کیوں کیا بات ہے؟“ رموا کا سادہ جواب تھا

”کچھ نہیں بس یوں ہی پوچھ لیا“ بابا نے جواب دیا اور خاموش ہو گئے دوسرے دن بابا کہہ رہے تھے ”ارے رموا دیکھ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی خاطر تواضع ٹھیک سے کرنا اور انھیں لسی پلا دینا، وہ لسی پسند کرتے ہیں“

”آپ کو کیسے معلوم بابا؟“ رموا نے تعجب سے پوچھا۔

”میں اس کا بڑا بھائی جو ہوں، اس کی ہر پسند سے واقف ہوں“ اچانک بابا کے منہ سے وہ بات نکل گئی جو وہ پچھلے آٹھ سال سے چھپا رہے تھے۔ رموا حیرت کی تصویر بنا انھیں دیکھے جا رہا تھا اور بابا اپنی غلطی پر شرمندہ ہو رہے تھے۔ دوسرے دن سے بابا گانو والوں کو نظر نہیں آتے شاید وہ یہ بات چھپانا چاہتے تھے کہ طاہر نے اپنے بڑے بھائی زاہد خاں کو دھوکا دے کر ساری جایداد ہڑپ کر لی تھی وہی زاہد خاں جو کل تک ہزاروں کھیتوں کا زمیندار تھا ایک گانو میں عسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے!!!

ناہید سید محمد پالی اسکول بمبئی ۳

خواب

جمعہ کی وہ سنسان رات تھی۔ میں آخری فلم شو دیکھ کر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں کسی کی ارتھی دکھائی دی ”رام رام ستیہ ہے“ ”رام رام ستیہ ہے“۔ فلم بھی میرے لیے خطرناک تھی اور یہ ارتھی کا منظر بھی میرے قدم تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ یکایک میں کسی جاندار چیز سے ٹکرایا۔ میں تیزی سے بھاگنے لگا۔ میں نے روشنی میں دیکھا تو یہ ایک کتا تھا۔ اس نے میرا پانچے جامہ پھاڑ ڈالا تھا۔ میں نے اپنے جوتے اتارے اور بغل میں دبا کے تیزی سے چلنے لگا۔ یکایک کسی کانسٹیبل نے سیٹی بجائی۔

آواز ہوا میں گونجی "تم کون ہو اور یہ جوتے کہاں سے لائے ہو کسی مسجد سے یا مکان سے؟" "جی یہ میرے جوتے ہیں"۔ اتنے میں اس نے ایک لاٹھی میرے کمر پر رسید کر دی میں نے بھی اسے ایک گھونسا رسید کر دیا۔ پھر اس نے کہا "تو کہاں سے آ رہا ہے" میں نے کہا "میں آخری فلم شو دیکھ کر"۔ "کہاں ہے فلم کا آدھا ٹکٹ" "یہ ہے" میں نے اپنے جیب ٹٹولی بھاگ دوڑ میں وہ کہیں گر چکا تھا۔ میں نے کہا گر چکا ہے۔ اتنے میں کسی اور کانسٹبل نے سیٹی بجائی اور مجھے ہتکڑی پہنا کر لے جانے لگے میں بھوں بھوں رونے لگا۔

اتنے میں کسی نے جھنجوڑا میں نے آنکھ کھولی تو میں بستر پر پڑا ہوا تھا اور بڑے بھیا مجھے جگا رہے تھے۔

طفیل احمد
سوت گرنی کوارٹر ناگ پور۔ نمبر ۹

سوال

رات کے اندھیرے میں ٹرین بڑی تیزی سے منزل کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ چاروں طرف ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ میں ٹرین کے پہلے درجے میں بیٹھا تھا۔ اس ڈبے میں میرے علاوہ ایک اور آدمی بیٹھا تھا جس کے بغل میں ایک بیگ پڑا تھا۔ وہ سو چکا تھا۔ ٹرین کے سبھی ڈبے تقریباً خالی تھے۔ کبھی کبھی بغل کے ڈبوں میں سے کسی کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بازگشت کرتی ہوئی دور جا کر فضاؤں میں تحلیل ہو جاتیں۔ ڈبے کے اندر ہلکی روشنی کا بلب روشن تھا۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، رات کے بارہ بج رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد شہر کی بتیاں نظر آنے لگیں۔ شاید کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔ ٹرین کی رفتار بھی سست پڑ گئی تھی۔ تھوڑی دیر رکنے بعد ٹرین پھر چل پڑی۔ میں کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ میری جیب میں ایک ریوالور تھا۔

میں دم دم سے آ رہا تھا۔ اور میں نے سنا تھا کہ وہاں ہر روز کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آتا رہتا ہے۔ اخباروں میں بھی ہمیشہ ایک دو ایسی خبریں ضرور ہوتی تھیں کہ دم دم میں کسی کو ہلاک کر دیا گیا یا کسی کے گھر میں آگ لگا دی گئی۔ چوری ڈکیتی تو وہاں کا معمول بن چکا تھا۔ اس لیے میں اپنے ساتھ ریوالور بھی لے گیا تھا۔

اچانک مجھے ایک چیخ سنائی دی۔ یہ آواز پچھلے ڈبے سے آئی تھی۔ یکایک یہ آواز دب گئی جیسے کسی نے کسی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میں دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ ٹرین جب اگلے اسٹیشن پر رکی تو میں اتر گیا اور پچھلے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ مگر اندر نظر پڑتے ہی میرے اندر خوف کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یہ خیال آیا کہ میری بھی جیب میں پستول ہے۔ اس لیے ہمت بندھی میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان ایک مسافر کے منہ پر کپڑا رکھ کر اسے قتل کر چکا ہے اب وہ روپیوں کی تھیلی کھول رہا تھا۔ آہٹ پا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں بھی ٹھٹھک گیا۔ کیونکہ وہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔ جو آج سے تقریباً پانچ سال قبل گھر سے بھاگ گیا تھا۔ میں سوچنے لگا۔

آج مجھ سے کتنا بڑا گناہ ہو جاتا۔ میں خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی کا قتل کر دیتا۔ آہستہ آہستہ میرا ذہن ماضی کی طرف لوٹتا چلا گیا۔ اور میرے پردۂ تصور پر ماضی کی دھندلی یادیں یکے بعد دیگرے چھانے لگیں۔

ہم سب تین بھائی تھے۔ بدقسمتی سے کوئی بہن نہ تھی۔ ہم لوگ بڑے آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ کسی چیز کی تکلیف نہ تھی۔ مگر میرا چھوٹا بھائی بُروں کی صحبت میں پڑ کر بالکل بگڑ گیا تھا۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی وہ اپنی عادتوں سے باز نہ آیا۔ وہ گھر سے پیسے چرا کر فلمیں دیکھتا اور جوا کھیلتا۔ سب کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ پھر کبھی نہیں سدھر سکے گا۔ آخر جب اس کی عمر پندرہ برس کی ہو گئی تو وہ ایک دن ایک موٹی رقم چرا کر گھر سے نکل گیا۔ اس کے بعد پھر کبھی نظر نہ آیا۔ آج وہ میرے سامنے تھا۔ اچانک ایک بات میرے دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔

آج تک وہ نہ جانے کتنے انسانوں کو قتل کر چکا ہوگا۔ کتنوں کو گھر سے بے گھر کیا ہوگا۔ اور کتنے لوگوں کی دولت لوٹی ہوگی۔

یہ خیال آتے ہی میری نظروں کے سامنے بے شمار لوگوں کی لاشیں، رقص کرنے لگیں۔ اور میرے کانوں میں تڑپتے انسانوں کی چیخیں گونجنے لگیں اور میں بے اختیار چیخ پڑا، نہیں! ساتھ ہی میں نے ریوالور کی لبلبی بھی دبا دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک دلخراش چیخ کے ساتھ اس کی لاش چلتی ٹرین سے باہر گر گئی۔

اس واقعہ کو گزرے ہوتے آج تقریباً دس سال ہو گئے۔ لیکن آج بھی جب مجھے اس کی یاد آتی ہے تو میرے ذہن میں ایک سوال ابھرنے لگتا ہے۔
"کیا میں نے اپنے بھائی کو قتل کر کے سچ مچ غلطی کی ہے؟"

جاوید نہال حشمی
نیا بازار کانکی نارہ۔

برے وقت کا ساتھی

کسی محلے میں دو دوست رہتے تھے۔ دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ ایک کا نام ناصر اور دوسرے کا نام صمد تھا۔ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور اسکول بھی دونوں ساتھ جایا کرتے تھے۔ جب کبھی ناصر اسکول نہیں جاتا تو صمد ناصر سے ملنے کے لیے بُری طرح بے چین ہو جاتا تھا۔ کبھی سوچتا کہ شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی اس طرح صمد کے دل میں طرح طرح کے خیالات اُبھرتے۔

ناصر نے صمد کی آزمائش کرنے کا ارادہ کیا اور کہا کہ ہم دونوں جنگل کی سیر کو چلیں اور دونوں میں یہ طے پایا کہ دونوں ایک دوسرے کے بُرے وقت میں کام آئیں گے۔

اتوار کا دن تھا۔ موسم بہت ہی خوش گوار تھا دونوں جنگل کی سیر کے لیے جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ جنگل میں دونوں تھوڑے ہی دور گئے تھے کہ ان کی نظر ایک بھالو پر پڑی۔ دونوں کے ہوش گم ہو گئے۔ ناصر کو درخت پر چڑھنا آتا تھا اور صمد کو نہیں۔ ناصر جھٹ پٹ درخت پر چڑھ گیا اور صمد نے درخت پر چڑھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا تو وہ زمین پر سانس روک کر لیٹ گیا جیسے معلوم ہوتا ہو کہ وہ مر چکا ہے۔ بھالو نے صمد کے پورے جسم کو سونگھ کر محسوس کیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ بھالو وہاں سے جنگل کی طرف چل دیا۔ بھالو چلا گیا تو ناصر نے درخت سے فوراً اتر کر پوچھا "بھالو نے تمہارے کان میں کیا کہا؟" صمد نے کہا: "بھالو نے کہا ہے کہ تمہارا دوست ٹھیک نہیں ہے جو بُرے وقت میں کام نہ آئے۔ تم اس سے دوستی چھوڑ دو۔"

محمد اختر عادل عثمانی
پتیبانہ محلہ۔ کلنہ۔ بردوان۔ بنگال

لالچ کا انجام

کسی گانو میں دو کسان رہتے تھے۔ اُن کے کھیت قریب قریب تھے۔ دونوں گہرے دوست تھے، ایک کا نام رامو تھا یہ بڑا بھولا اور سیدھا کسان تھا، دوسرے کا نام شامو تھا، یہ بڑا مکار اور لالچی تھا۔

ایک مرتبہ گانو کی ندی میں باڑھ آگئی۔ تمام کھیت بہہ گئے۔ لوگ بھوکے مرنے لگے۔ مویشیوں کی قیمت گاجر مولی کی طرح ہو گئی۔ شامو نے رامو سے کہا "بھیا کیوں نہ ہم یہاں سے کم قیمت میں مویشی خرید کر قریب کے شہر میں زیادہ قیمت میں بیچ لائیں"۔ رامو نے اس کی بات کو مان لیا۔ دونوں نے مل کر مویشی خریدے اور قریب کے شہر میں چلے گئے۔ مویشیوں کی اچھی خاصی قیمت لگی۔ سیلاب ختم ہو چکا۔ دونوں گانو کی طرف بڑھے راستے میں شامو نے کہا "ان تمام روپیوں کو گانو لے جانے سے بہتر ہے کہ ہم تھوڑے روپے لے جائیں اور باقی یہیں گاڑ دیں"۔ رامو مان گیا۔ شامو نے روپے ایک درخت کی جڑ میں رکھ دیے اور مٹی سے اسے بھر دیا گانو قریب آ رہا تھا دونوں خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ وہ گانو میں داخل ہو گئے اپنے کھیتوں کے قریب پہنچ کر الگ ہو گئے۔ شامو کو رات بھر نیند نہ آئی۔ وہ روپیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اس نے

سوچا کیوں نہ تمام روپے اپنے قبضے میں کرلوں۔ تمام رات کروٹ بدلی اور جاگ کر گزار دی دن بھر وہ گھر میں پڑا رہا آخر رات آئی۔ اس رات کا شامو کو بے چینی سے انتظار تھا۔ وقت گزرتا رہا رات بھاگتی رہی۔ ۲ بجے کے قریب شامو چارپائی سے اٹھا اور اس درخت کی طرف روانہ ہوا۔ کبھی کبھی کتے بھونکنے لگتے تھے لیکن شامو بے نیازی سے آگے بڑھتا رہا درخت کے قریب پہنچ کر شامو نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر نیچے کی طرف جھک کر مٹی ہٹانے لگا، ہر طرف خاموشی تھی اچانک ایک چیخ بلند ہوتی اور شامو وہیں ڈھیر ہوگیا وہ دراصل ایک سانپ کا بل تھا شامو نے جیسے ہی اندر ہاتھ ڈالا سانپ نے اسے کاٹ لیا شامو کو لالچ کی سزا مل چکی زہر سے اس کا جسم نیلا ہوگیا جنگل میں ایک سناٹا تھا اور قدرت اس کے اس انجام سے ہنس رہی تھی۔

محمد ارمغان - (راکولا)

دنیا کا پہلا انجن

دنیا کا پہلا انجن
جس کا موجد اسٹیفن سن
پہلے پہل جب ریل بنی
لیور پول میں بھیڑ لگی
جب ریل چلی تیز رفتار
لوگ ڈرے اور ہوئے ہوشیار
کھینچتی ہے اس کو بھاپ
تم تم کیسے کاہے یہ باپ
سائنس نے کی ہے ترقی
دنیا میں لاکھوں ٹرینیں چلتی

محمد محمود عالم
آسنسول ضلع بردوان۔ بنگال

اکائی میں ہی طاقت ہے

ایک ضعیف آدمی تھا۔ اس کے چار لڑکے تھے۔ وہ بہت غریب تھا اپنی زندگی کے آخری دن گن رہا تھا۔ اس کے چاروں لڑکے آپس میں ہمیشہ لڑا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے لڑکوں کو سمجھاتا تھا۔ لیکن وہ لوگ سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس نے ایک جھاڑو لی اور اپنے چاروں لڑکوں کو بلا کر توڑنے کو کہا باری باری ہر ایک نے کوشش کی لیکن کوئی توڑ نہ سکا۔ اس کے بعد اس نے جھاڑو کو کھول کر ایک ایک تنکا ہر ایک کو توڑنے کو دیا۔ سبھی لڑکوں نے آسانی سے توڑ ڈالا۔ اس کے بعد اس نے اپنے چاروں لڑکوں کو صلاح دی کہ تم لوگ چاروں ایک ساتھ مل کر رہو گے تو تمہیں کوئی دبا نہیں سکتا جس طرح جھاڑو کو تم لوگ توڑ نہیں سکے اگر آپس میں لڑا کرو گے تو تمہارے دشمن ہمیشہ پریشان کریں گے اس لیے کہ اکائی ہی میں طاقت ہے۔

نواب منیق اظہر زاہدی
رانی گنج بردوان

تین مسخرے دوست

تین دوست تھے۔ اختر، اقبال و کلام۔ تینوں ایک دن پارک میں پہنچے۔ اقبال نے کہا "یار اختر تم اپنی بہادری کی کوئی کہانی سناؤ" اختر نے اپنی بہادری کی کہانی شروع کی۔ "ایک دن میں نے ایک ہاتھی کو اٹھا کر پھینک دیا۔ گھوڑے کی ٹانگ توڑ دی۔ شیر کی دم اکھاڑ ڈالی۔ بھالو کا سر مروڑ ڈالا" "اچھا اختر ان جانوروں نے تمھیں کچھ نہیں کہا" اقبال نے کہا "ارے نہیں یار دکاندار نے مجھے اپنی کھلونے کی دکان سے باہر دھکیل دیا تھا" اختر نے کہا۔ "اچھا اقبال اب تم اس بہادری کی کوئی کہانی سناؤ" اقبال نے اپنی بہادری کی کہانی شروع کی۔ "ایک دن مجھے ایک ڈاکو نے دھمکی دی کہ میں تمھیں جان سے مار ڈالوں گا۔ میں نے اس سے کہا "تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے" ڈاکو زور سے چلایا۔ "اچھا اقبال تم ڈاکو سے بچے کیسے" اقبال نے کہا "ارے نہیں یار میں نے ٹیلیفون کا تار کاٹ دیا" اقبال نے کہا "اچھا کلام اب تم ایک اپنی بہادری کی کہانی سناؤ" اختر، اقبال دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ کلام نے اپنی بہادری کی کہانی شروع کی۔ "ایک دن میں ایک شیر کے پاس کھڑا ہوگیا۔ شیر مجھے دیکھ کر غرایا۔

میں بھی شیر کو دیکھ کر غرّایا۔ شیر مجھے غرّاتے دیکھ کر دہاڑا"
"تب تو یار کلام تم بھاری مصیبت میں پھنس گئے ہو گے"
اختر نے کہا۔ "ارے نہیں یار میں چپ چاپ شیر کے پنجرے
سے ہٹ بھالو کے پنجرے کے پاس چلا آیا کلام نے کہا۔

جاوید انور
گوشن لمپوریم براکر بردوان

میٹھی بولی بولو تم

جب اپنا منہ کھولو تم
میٹھی بولی بولو تم!
جگ میں عزت پاؤ گے
بہت نیک کہلاؤ گے

کوئل میٹھا گاتی ہے
سب کا دل للچاتی ہے
طوطا سب کو بھاتا ہے
میٹھا میٹھا گاتا ہے

مینا کیوں خوش رہتی ہے
پوچھو تو کیا کہتی ہے
کوّا بھی تو کالا ہے
اس کو کس نے پالا ہے

سچا گن یہ جانو تم
بات شفیق کی مانو تم!
جب اپنا منہ کھولو تم
میٹھی بولی بولو تم

از ایم۔ امتیاز شبنم شفیق
اسلامیہ ہائیر سکنڈری اسکول واٹمباڑی!

لکڑ ہارا

"یہ قصہ حاتم طائی کے زمانے کا ہے"
حاتم طائی ایک بڑا شخص تھا۔ وہ ہر روز سیکڑوں
آدمیوں کو روٹی اور کپڑا دیا کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن وہ
جنگل سے گزر رہا تھا۔ یکایک وہ رک گیا اس نے دیکھا کہ ایک
لکڑہارا سر پر لکڑیوں کا گٹھر اٹھائے چلا آرہا تھا۔ اس کے پانو
وزن کی وجہ سے لڑکھڑا رہے تھے۔ اور وہ تکان سے چور نظر
آرہا تھا۔ حاتم کو اس پر رحم آیا۔ اس نے پوچھا "اتنی تکلیف
کیوں اٹھاتے ہو بابا؟"
لکڑہارے نے جواب دیا "کیا کروں بھائی؟ پیٹ کی
آگ تو بجھانی ہی ہے"
حاتم پھر بولا۔ "ہاں یہ تو سچ ہے بابا لیکن کیا تم نے
سنا نہیں کہ حاتم طائی ہر روز سیکڑوں آدمیوں کو کھانے کے
ساتھ کپڑا بھی دیتا ہے۔ تم بھی اس کے مہمان ہو جاؤ بیٹھے بٹھائے
سب کچھ مل جاتے گا" اس پر لکڑہارا مسکرایا اور بولا "آپ
بھی خوب ہیں بھائی جو مزا انسان کو محنت سے کمائی روٹی کھانے
میں ہے وہ حاتم کے احسان پر جینے میں نہیں" یہ کہہ کر لکڑہارے
نے اپنی راہ لی۔ اور حاتم طائی بڑے حیرت سے اس فرشتے کو
دیکھتا رہ گیا۔

علذا عرفان
پھلواری شریف پٹنہ (بہار)

خوف

ایک دکاندار کا اس قول پر اعتقاد تھا کہ "کرے تو
ڈرے نہ کرے تو بھی ڈرے" ایک کپڑے والا جو اس
کے قریب کی دکان میں تھا وہ اس قول کے بالکل برخلاف
تھا۔ ان دونوں میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ ایک روز ایک
شخص نہایت شاندار پوشاک پہنے، امیرانہ صورت بناتے
اور اس کے ساتھ ایک نوکر ایک بچے کو کندھے سے لگاتے
کپڑے والے کی دکان پر آیا۔ بہت سا کپڑا خریدا اور پھر نوکر
اور بچے کو دکان پر چھوڑ کر روپیہ لینے گھر آیا اور تمام کپڑا
ساتھ لیتا آیا جو تقریباً ایک ہزار روپے کا تھا۔ تھوڑی دیر
کے بعد نوکر نے اس بچے کو، جو کندھے سے لگا ہوا سوتا معلوم
ہوتا تھا اس کی دکان پر لٹا کر کپڑا اڑھا دیا اور خود پانی پینے
کے بہانے سے فرار ہو گیا۔ بہت عرصہ گزر گیا شام ہو گئی

پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 3

دفتر پیام تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۰ فروری ۱۹۸۴ء

فیس داخلہ کچھ نہیں۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

ایک سَو روپے کے نقد انعامات

پہلا انعام: بالکل صحیح حل پر مبلغ ساٹھ روپے۔ دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر مبلغ چالیس روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبروار لکھیے

1. انھوں نے خوب صورت ـــــ رنگ کی بلّی دکھائی۔ (سفید / کالی / زرد)
2. پانی کو ـــــ میں انڈیل کر جلدی گرم کرو۔ (پتیلی / کتیلی)
3. تم کچھ ـــــ نظر آتے ہو۔ (خوش / پریشان)
4. ـــــ پانی میں نہانے کی عادت اچھی ہے۔ (ٹھنڈے / گرم)
5. سب سے زیادہ ـــــ کون ہے۔ (غریب / امیر)
6. ابھی یہ ـــــ برس ہی کے تھے کہ اسلام قبول کیا۔ (پندرہ / سولہ / سترہ)
7. یہ ـــــ تو مہینوں کے لیے کافی ہے۔ (سیب / امرود / انگور)
8. وہ کاٹھ کا اُلّو ـــــ مسائل کیا جانے۔ (تعلیمی / علمی)

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ صحیح جواب صفحہ 27 کی کتابوں میں ہی ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمّے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

ٹوکن پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 3

میں اڈیٹر پیام تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام ....

پتا ....

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے

پیامی ادبی مُعمّا نمبر 3۔ ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-paym[illegible]

Regd. No. D(SE)-043

Jan[illegible] 1984

PAYAM-I-TAL[illegible]EM

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی ۲۵

بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت : ۱/۵۰
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت : ۱/۵۰
تا کے سے
چھوٹے بچوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
پانچ لونے
پانچ کام چور لونوں کی کہانی چھوٹے بچوں کے لیے۔ قیمت: ۱/۵۰
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں کی زبان میں۔ قیمت: ۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچوں کے لیے انھی کی زبان میں ایک دلچسپ کہانی۔ قیمت: ۲/۵۰
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔ بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰
بی پنڈکی اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات کی معلومات۔ قیمت ۱/۵۰
جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی گئی ایک مزے دار کہانی۔ قیمت ۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور سب کہانیاں سب کی سب مزے دار
قیمت: ۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا کیا ہوا، یہ تو پڑھنے سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت : ۱/۵۰
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

فروری ۱۹۸۴ء — جلد: ۲۱ — شمارہ ۲

اڈیٹر : ولی شاہجہانپوری

قیمت : ۲/۵۰ روپے — سالانہ ۲۰ روپے

غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

ہم چاہتے ہیں کہ پیامی بچے لکھنے لکھانے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیا کریں۔ لیکن ہماری خواہش اس حد تک پوری نہیں ہو رہی ہے جتنی ہونی چاہیے۔ بہت کم بچے اس پر دھیان دیتے ہیں جو بچے لکھتے ہیں وہ بے مقصد اور گھسی پٹی کہانیاں لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ بعض بچے تو دوسری کتاب سے نقل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

اس مرتبہ ہم ممنون ہیں امراوتی کے ضلع پریشد پرائمری اسکول کے ماسٹر اسد اللہ کے جنھوں نے سائنس سے متعلق طلبہ سے مضامین بھجوائے۔ ضرورت ہے کہ بچے اسی قسم کے مضامین لکھنے کی کوشش کریں۔ دراصل یہ کام اساتذۂ کرام کا ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو اس طرف متوجہ کریں اور اپنی نگرانی میں مضامین لکھائیں۔

اس شمارے میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی ہلکی پھلکی نظم "دوڑہی دوڑ"، شہاب الدین انصاری صاحب کا مضمون "غریبی سے علم کی دولت مندی تک" اور ڈاکٹر خلیل اللہ خاں کا معلوماتی مضمون "مونگ پھلی" پڑھنے کے لائق ہیں۔

پیامی ادبی معموں کے جوابات دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بچے اٹکل پچو جوابات لکھ دیا کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کتابوں سے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے اس لیے صحیح یا قریب صحیح حل بہت کم موصول ہوتے ہیں۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

بچوں کی
ممتاز ادیبہ
صالحہ عابد حسین
مصور:
شکیل

شمس الرحمٰن فاروقی

دوڑ ہی دوڑ
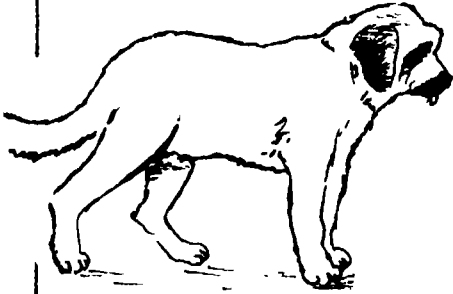
اک چوہا ایک چوہیا
اک بلّا اک بلّی
اک کتا اک کتیا
اک گھوڑا اک گاڑی
اک تھالی اک بینگن
اک آلو اک شلغم
اک چوڑی اک کنگن
اک چھکڑا اک ٹم ٹم
اک ہاتھی اک ہتھنی
اک کرتا اک ساری
اک بندا اک نتھنی
اک انجن اک لاری
سب نے مل کر دوڑ لگائی
سب سے پہلے پہنچے تم
تم کا مطلب یعنی ہم
دوڑ دھما دھم دوڑ دھما دھم

ڈی ۸۵/۱۱ کاکانگر نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

شہاب الدین انصاری

غریبی سے علم کی دولت مندی تک

(۱)

علم کی دولت کے میراث کی شکل میں ملنے کی مثالیں بہت کم ہیں۔ البتہ جو شخص طلب کا سچا اور دُھن کا پکا ہوتا ہے وہ سخت مشکلات کے باوجود اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آج جن دو معروف شخصیتوں کی زندگی کے حالات آپ پڑھیں گے ان کا شمار ایسے ہی خوش نصیبوں میں ہوتا ہے۔ ان میں ایک کا نام جوزف رائٹ ہے اور دوسرے کا نام تھومس اوکے۔ دونوں کے بچپن کے حالات تعلیم حاصل کرنے کے لیے سازگار نہیں تھے۔ انگلستان میں پیدا ہونے کے باوجود دونوں انگلستان کی کسی یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے میں ناکام رہے لیکن اپنی کوشش اور محنت سے انھوں نے علمی دنیا میں وہ مقام حاصل کر لیا کہ مشہور زمانہ یونی ورسٹیوں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں معلمی کی خدمت پر مامور ہو کر پروفیسر کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے اور علم و ادب کی دنیا میں اپنا سدا روشن رہنے والا نام چھوڑ گئے۔

جوزف رائٹ جو آکسفورڈ یونی ورسٹی میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۴ء تک لسانیات کے پروفیسر رہے، اپنی چھ جلدوں پر مشتمل انگریزی زبان کی لغت کے لیے معروف ہیں۔ پندرہ سال کی عمر تک وہ محض ایک جاہل مزدور تھے۔ وہ ۱۸۵۵ء میں بریڈ فورڈ کے پاس تھیکلے کے مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والدین کے چار بچوں میں ان کا نمبر دوسرا تھا۔ ان کے والد کے انتقال کے بعد خاندان کو مفلسی اور تنگ دستی کے دنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب جوزف چھ برس کے ہوئے تو اسکول جانے کی بجائے انھیں ایک مستری کے سامان ڈھونے والی گاڑی کا کوچوان بننا پڑا۔ صبح سے شام تک ہفتہ کے ساتوں دن انھیں یہ کام کرنا پڑتا اور اجرت میں جو چند پنس ملتے اسی سے گھر کا خرچ چلتا۔ سال بھر کے بعد انھوں نے اونی کپڑا بنانے والی ایک مل میں ملازمت کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں روس اور پروشیا کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ مل میں کھانے کے وقفے میں مزدور اکٹھا ہو کر جنگ کی خبریں اخبار میں پڑھتے۔ جوزف جب دوسرے مزدوروں کو پڑھتے دیکھتے تو انھیں اپنی جہالت پر بہت رنج ہوتا۔ آخر ایک دن انھوں نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ وہ بھی پڑھنا سیکھیں گے۔

انھوں نے سب سے پہلے بائبل پڑھی اس کے بعد انگریزی زبان کی مشہور مذہبی کتاب "پلگرمس پروگریس" پڑھنا شروع کیا۔ اب اُن میں اتنی لیاقت پیدا ہو چکی تھی کہ وہ شام کے مدرسے میں داخل ہو سکیں۔ اس طرح انھوں نے انگریزی کے بعد فرانسیسی، جرمن اور لاطینی زبانیں سیکھیں۔ اسی دوران انھوں نے زود نویسی (شارٹ ہینڈ) کی صلاحیت بھی پیدا کر لی۔ رائٹ کو حساب پڑھنے میں بہت لطف آتا تھا۔ ساتھ ہی انھوں نے کیمسٹری بھی پڑھنا شروع کیا۔ اب انھوں نے پڑھنے کے ساتھ شام کے ایک مدرسے میں پڑھانا بھی شروع کر دیا۔

اس سے انھیں اتنی آمدنی ہونے لگی کہ وہ گھر کے اخراجات
کو نکال کر کچھ بچت بھی کر سکیں۔ آہستہ آہستہ انھوں نے چالیس
پونڈ جمع کیے اور جرمنی گئے جہاں وہ ہائیڈل برگ یونی ورسٹی
میں جرمن پڑھنے کے لیے داخل ہو گئے۔ رقم تھوڑی تھی چنانچہ
یونی ورسٹی میں نصف سال کا ایک کورس کرنے کے بعد انھیں
تعلیمی سلسلہ نامکمل چھوڑ کر انگلستان واپس آنا پڑا۔ ۱۸۷۸ء میں
وہ لندن یونی ورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں ایک نجی امیدوار
کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

۱۸۸۲ء میں جوزف رائٹ دوبارہ جرمنی گئے اور اس
بار وہ چار سال تک وہاں مقیم رہے اس عرصے میں انھوں نے
فرائی برگ، لیپزگ اور ہائیڈل برگ کی یونی ورسٹیوں میں تعلیم
حاصل کی اور ۱۸۸۵ء میں ہائیڈل برگ سے ڈاکٹریٹ کی سند
لی۔ جوزف رائٹ علمی دنیا میں اب ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے
تھے اور لسانیات کے ایک ماہر کی حیثیت سے ان کی ذات معروف
ہو چکی تھی۔ انگلستان واپس آکر وہ سب سے پہلے آکسفورڈ میں
عورتوں کے انتظام کے تحت چلنے والے ایک اسکول میں جرمن
زبان پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ٹیلرین
انسٹی ٹیوشن میں بھی جرمن زبان پڑھاتے تھے۔ ان کی بڑھتی
ہوئی شہرت سے متاثر ہو کر آکسفورڈ یونی ورسٹی نے انھیں
۱۸۹۱ء میں نائب پروفیسر منتخب کیا اور ۱۹۰۱ سے ۱۹۲۰ تک
وہ یونی ورسٹی میں یونی ورسٹی پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے
رہے۔

مضمون کے شروع میں آپ اُن کی مرتب کی ہوئی انگریزی
زبان کی چھ جلدوں پر مشتمل لغت کی بات پڑھ چکے ہیں۔ اس
کے علاوہ انھوں نے انگریزی اور جرمن زبانوں کے قواعد انگریزی
کے ابتدائی دور اور دورِ وسطیٰ کی زبان، نیز گوتھک زبان پر
بھی کتابیں لکھیں۔ ہندستان میں شاید ہی کوئی یونی ورسٹی
یا کالج ہو گا جس کے کتب خانے میں جوزف رائٹ کی انگریزی
قواعد کی کتاب نہ موجود ہو۔

رائٹ ایک زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے اور
جس کام کو کرنے کا ارادہ کر لیتے اسے مکمل کیے بغیر چین نہیں
لیتے تھے۔ ان کی بیوی کا بیان ہے کہ وہ دنیا کے لیے مفید
کام کو کرنے میں اپنی تمام جسمانی طاقت اور ذاتی اثرات کام
میں لاتے اور ہمیشہ اس جستجو میں منہمک رہتے کہ علم کے دائرے
کو کس طرح وسیع سے وسیع تر کیا جائے اور دوسروں میں کام
کی وہی لگن پیدا کی جائے جو خود اُن میں موجود ہے۔ ان کے
آہنی عزم اور خود اعتمادی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے
جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کہی تھی "جس
شخص میں قوتِ ارادی ہے وہ آکسفورڈ تک پہنچنے کے لیے
اپنی راہ ہموار کر سکتا ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار اعلا
نسبی پر نہیں بلکہ اس کی اپنی محنت پر ہے۔"

۱۹۲۰ء میں انگلستان میں اعلا سطح کی تعلیم کا جائزہ لینے
والی ایک کمیٹی کے روبرو بیان دیتے ہوئے جوزف رائٹ نے
کہا کہ ایک پروفیسر کا کام یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اُس علم سے
واقف کرائے جسے وہ خود جانتا ہے۔ اپنے اس فرض کو ادا کرنے
کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ ایسی کتابیں لکھے جو اس موضوع پر
موجود کتابوں کی خامیوں کو دور کریں۔ اپنی بساط بھر جوزف
رائٹ نے اپنے خیالات پر عمل بھی کر دکھایا۔ گم نامی میں پیدا
ہونے والا یہ مشہور زمانہ ماہر لسانیات ۱۹۳۰ء میں اپنے
خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

(۳)

تھومس اوکے، انگلستان میں اسپٹال فیلڈس کے مقام پر
۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ شروع میں ان کے معاشی حالات
جوزف رائٹ کے مقابلہ میں بہتر تھے۔ چنانچہ اپنی ابتدائی تعلیم
انھوں نے مقامی اسکول میں حاصل کی لیکن ابھی وہ تیرہ
سال کے بھی نہ ہو پائے تھے کہ ان کے حالات خراب ہونے
لگے اور مجبور ہو کر تعلیم کے سلسلہ کو منقطع کر دینا پڑا۔ آئندہ
تیس برس تک وہ روزی کی تلاش میں کبھی کارخانے میں
ملازم ہوئے تو کبھی ڈاک تقسیم کرنے کا کام کیا۔ ساتھ ہی
ٹوکریاں بُن کر فروخت کرنے کا کام بھی کیا۔ پریشانی کے اس
دور میں سے ۱۵ برس ان کے لیے کڑی آزمائش کے دن
تھے جب انھیں اپنی ملازمت کا بڑا وقت ایک ایسے تنگ

تہہ خانے میں کام کر کے گزارنا پڑا جسے لاتعداد چوہوں نے اپنا
مسکن بنا رکھا تھا۔ ایسے نامساعد حالات میں بھی اوکے
ثابت قدمی کے ساتھ علم حاصل کرنے کی کوشش میں
مصروف رہے۔

انھیں غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔
لیکن غربت راہ کا پتھر بنی ہوئی تھی یہاں تک کہ وہ شام کو چلنے
والے کسی اسکول میں داخلہ لینے کی بات بھی نہیں سوچ سکتے
تھے۔ مجبور ہو کر انھوں نے کتابوں کے سہارے اپنے آپ ہی
اطالوی زبان پڑھنا شروع کر دیا۔ زبان کی مشق کے واسطے
انھوں نے لندن میں بسے ہوئے اطالوی پناہ گزینوں سے
راہ و رسم پیدا کر لی شروع کر دی۔ اتوار کے دن وہ ایسے گرجا
گھروں میں جاتے جو جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبان بولنے
والوں کی آبادی کے بیچ میں ہوتے۔ اس طرح انھیں اہل
زبان کے قریب آنے کے مواقع ملے۔ اس زمانے میں لندن
میں ایک سوشلسٹ کلب تھا جس کے بیشتر ممبران جرمن
نژاد افراد تھے۔ اوکے، جرمن سیکھنے کے شوق میں اس کلب
میں بھی جانے لگے۔

تھومس اوکے ایک بے چین دل اور مضطرب دماغ کے
مالک تھے۔ اپنے ساتھی مزدوروں کی زبوں حالی دیکھ کر ان کا دل
کڑھتا تھا۔ وہ سماج میں موجود برائیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔
آہستہ آہستہ ان کا ربط ضبط سیکولر اور جمہوریت پسند تحریکوں
میں شریک لوگوں سے بڑھنے لگا۔ سماجی مسائل سے متعلق
جلسوں اور کانفرنسوں میں اب انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا
شروع کر دیا اور لندن کے ساؤتھ پلیس کے علاقے میں اعلا
اخلاقی اقدار کی اشاعت کے لیے قائم سوسائٹی میں وہ ایک
نمایاں شخصیت بن کر ابھرے۔ یہاں انھیں ٹی۔ ایچ ہکسلے
جیسے سائنس داں رمینرے میکڈانلڈ جیسے مدبر اور سیاست
داں اور جارج برنارڈ شا جیسے ادیب کے قریب آنے کے
مواقع ملے۔

علم کی طلب نے انھیں مشہور زمانہ کتب خانہ برٹش
میوزیم تک پہنچایا جہاں وہ پابندی سے جانے لگے۔ کچھ ہی
عرصہ بعد انھیں لندن کے ٹوین بی ہال میں ملازمت مل گئی۔
اب انھیں اطالوی زبان پر پورے طور پر عبور حاصل ہو چکا تھا
چنانچہ وہ یہاں اطالوی زبان پڑھانے لگے۔ ٹوین بی ہال کے
اساتذہ اور طالب علم جب کبھی یورپ کے سفر پر جاتے تو
اوکے بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ سیر و سفر کے
دوران علمی مسائل پر گفتگو ہوتی تو ان کے ہم سفر ان کی معلومات
سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ ٹوین بی ہال میں وہ ۱۸۹۵ء
سے ۱۹۰۱ء تک ملازم رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اطالوی
زبان کے معروف شاعر دانتے کی نظموں کا ترجمہ شائع کیا۔
پھر پیرس اور اس کی کہانی اور وینس اور اس کی کہانی جیسی
کتابیں لکھیں۔

اطالوی زبان پر اُن کے عبور اور علمی دُنیا میں شہرت
کے پیش نظر کیمبرج یونی ورسٹی نے انھیں اطالوی زبان کے
پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۶۷ سال
کی تھی اور وہ اس عہدہ کو قبول کرنے میں پس و پیش کر رہے
تھے لیکن یونی ورسٹی میں انگریزی ادب کے مشہور پروفیسر سر آرتھر
کوئلر کاؤچ کے ترغیب دلانے پر وہ تیار ہو گئے۔ یہاں انھوں
نے تاریخ کی مشہور کتاب کیمبرج ماڈرن ہسٹری کی تصنیف
میں شریک مصنف کی حیثیت سے حصہ لیا۔ اوکے یونیورسٹی
کی ملازمت کے دوران اپنے ٹوکری بننے کے ابتدائی کام
کو نہیں بھولے اگرچہ اب وہ یہ کام محض شوق کے تحت کرتے
تھے۔ انھوں نے اس فن پر ایک مضمون لکھا جو انسائیکلوپیڈیا
برٹینیکا میں چھپا اور پھر اس موضوع پر ایک مکمل کتاب لکھی۔
یونی ورسٹی کی ملازمت سے وہ ۱۹۲۸ء میں سبکدوش ہوئے
اور ۱۹۳۵ء میں وفات پا گئے۔

طلب صادق اور مسلسل جد و جہد بالآخر ہمیں کامیابی سے
ہم کنار کرتی ہے۔ جوزف رائٹ اور تھومس اوکے کی زندگیاں
ہمارے سامنے اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ●

مناظر صدیقی

ملک ایران میں ایک علاقہ کرمان ہے۔ بہت دنوں پہلے کرمان پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس بادشاہ کے ایک ہی بیٹا تھا۔ بہت خوبصورت اور بہت عقل مند۔ بادشاہ نے اُسے وہ تمام فن سکھا دیے تھے جو شہزادوں کو سیکھنے چاہییں۔ مثلاً تلوار چلانا، تیر اندازی، گھوڑے کی سواری اور ایسی ہی تمام دوسری چیزیں جن کو فنِ سپہ گری کہا جاتا ہے۔ یہ شہزادہ جب چودہ برس کا ہوا تو بادشاہ نے سوچا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ شہزادے کو جب اس کی اطلاع ملی کہ بادشاہ اس کی شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ بادشاہ کے پاس گیا اور کہا:

"بابا جان! میرے استاد نے مجھے بتایا ہے کہ ہر مرد کو دنیا میں کوئی نہ کوئی ہُنر ضرور سیکھنا چاہیے کیوں کہ اس سے آدمی کبھی بھوکا نہیں رہتا۔ میرے استاد نے دوسری بات یہ سمجھائی ہے کہ ہر آدمی کو سفر ضرور کرنا چاہیے، کیونکہ سفر کرنے میں جو تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں اِن کی وجہ سے اگر آدمی کی سمجھ بوجھ میں کوئی کمی بھی رہ گئی ہو تو دُور ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں جب تک کوئی ہُنر نہیں سیکھ لوں گا اور کم سے کم ایک بڑا سفر نہ کر لوں گا اُس وقت تک شادی نہیں کروں گا۔"

بادشاہ نے شہزادے کو بہت سمجھایا کہ بادشاہوں کے بیٹوں کو دوسرے ہُنر سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شہزادوں کا اصل ہُنر تو لڑنے کا فن جاننا اور حکومت کرنے کا گُر آنا ہے اور شہزادے کو یہ سب کام آتے ہیں۔ اس لیے اسے کوئی دوسرا ہُنر سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ — بادشاہ کی یہ تمام باتیں سُن کر شہزادے نے جواب دیا:

"بابا جان! دولت تو آنی جانی شے ہے، یہ ہمیشہ ایک آدمی کے پاس نہیں رہتی، اسی طرح کوئی آدمی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب تک بادشاہ رہے گا۔ ہوسکتا ہے کوئی دشمن حملہ کر دے اور ہمیں شکست ہو، بادشاہ کی حکومت چھن جائے یا کوئی اور ایسی

بات ہو جائے جس سے بادشاہ، بادشاہ نہ رہے۔ ہر وقت ہوا ایک طرح نہیں چلتی، کوئی چشمہ ایسا نہیں ہوتا جو ہمیشہ بہتا رہے، لیکن آدمی کوئی ہُنر سیکھ لے تو وہ غربت میں بھی کام آتا ہے۔"

بادشاہ، شہزادے کی اس دُور اندیشی پر بہت خوش ہوا اور اس نے شہر میں اعلان کرا دیا کہ رعایا میں سے جو آدمی کوئی بھی ہنر جانتا ہو، وہ محل میں آکر شہزادے کے سامنے اپنا ہُنر دکھائے۔ پھر شہزادہ جو ہُنر سیکھنا چاہے وہ اس کو سکھایا جائے گا۔ بادشاہ کے اس اعلان کو سُن کر شہر بھر میں مختلف ہنر جاننے والے جتنے لوگ تھے،

وہ سب کے سب ایک بہت بڑے میدان میں جمع ہوئے، وہاں انھوں نے اپنا اپنا کام اور اپنے اپنے ہُنر دکھانے کے لیے چھوٹی چھوٹی اور نئی نئی طرح کی جھونپڑیاں ڈال لیں۔ میدان میں ہر طرف چہل پہل ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بڑی نمائش لگی ہو جن لوگوں نے یہاں اپنی دُکانیں لگائی تھیں، ان میں ایک چٹائی بننے والا بھی تھا، یہ گورگان سے آیا تھا اور بڑی خوبصورت چٹائیاں بنتا تھا۔ شہزادے کو اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چٹائیاں اتنی پسند آئیں کہ اس نے بھی یہ ہُنر سیکھنے کا فیصلہ کیا۔

کچھ دن بعد جب شہزادہ چٹائی بننے کے ہنر میں ماہر ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے سفر پر جانے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ چاہتا تو نہیں تھا کہ اس کی نظروں سے دُور ہو لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شہزادہ اس وقت تک نہ تو شادی کرے گا اور نہ حکومت سنبھالے گا جب تک وہ اپنے استاد کے کہنے کے مطابق سفر نہ کرے۔ چنانچہ اس نے مجبوراً شہزادے کو سفر پر جانے کی اجازت دے دی اور ایک ملازم لڑکے کو شہزادے کے ساتھ کر دیا۔ اسے بہت سے روپے پیسے بھی دیے تاکہ شہزادہ تاجر کی حیثیت سے اپنے ساتھ اپنے وطن کا کچھ سامان لے جائے اور راستے میں اگر ضرورت پڑے تو اس کی تجارت کر کے اپنی ضرورت پوری کرے۔

کرمان شہر سے ایک قافلہ انھی دنوں بغداد جانے والا تھا۔ یہ ایک تجارتی قافلہ تھا۔ شہزادہ اور اس کا ملازم بھی اسی تجارتی قافلے میں شامل ہو گئے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں سفر کرتے ہوئے کئی مہینوں کے بعد یہ لوگ آخر بغداد پہنچ ہی گئے۔ قافلے کے سردار نے بغداد شہر کے باہر اپنے خیمے لگا دیے اور ایک آدمی کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ دوسرے دن بغداد شہر میں جا کر خلیفہ کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت حاصل کرے اور اگر اجازت مل گئی تو سارا سامان اچھے داموں فروخت ہو سکتا ہے۔ یوں بھی طریقہ یہی ہے کہ جب بھی کسی نئی جگہ جاتے ہیں تو سب سے پہلے اس جگہ کے سب سے بڑے اور بزرگ آدمی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ہر نئے ملک میں کاروبار کرنے کے لیے پہلے اس ملک کے بادشاہ یا حاکم سے اجازت لی جاتی ہے۔ جیسے کہ آج بھی کسی ملک میں کاروبار کرنے کے لیے پہلے وہاں کی حکومت سے اجازت لینی پڑتی ہے۔

رات کو شہزادہ اور اس کا ملازم جب اپنے خیمے میں تنہا رہ گئے تو شہزادے نے ملازم سے کہا:

"سردار کا مقرر کیا ہوا آدمی تو کل خلیفہ کی اجازت لینے کے لیے دربار میں پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ کیا معلوم اس دربار میں حاضر ہونے کی اجازت کل ہی مل جائے یا اس میں بھی کچھ دن لگیں، ہو سکتا ہے کہ کل خلیفہ کو فرصت نہ ہو اور وہ ہمارے آدمی کی بات ہی نہ سن سکے، یا وزیر سے ملاقات نہ ہو اور اجازت حاصل کرنے میں کچھ دن لگ جائیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ہمارا آدمی کل دربار میں پہنچ بھی گیا تو خلیفہ یقیناً ہمیں پرسوں طلب کریں گے۔ اس طرح کل ہمیں فرصت ہی فرصت ہے، کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھا کر کچھ تفریح کر لی جائے؟"

"آپ کس قسم کی تفریح کریں گے۔ کیا شکار کا ارادہ ہے؟" ملازم نے پوچھا۔

"نہیں، ہم یہاں تاجر بن کر آئے ہیں، شکاری بن کر نہیں۔" شہزادے نے کہا۔

"پھر کیا ارادہ ہے؟" ملازم نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ کل ہم دونوں بغداد شہر میں گھوم پھر کر وہاں کے لوگوں سے ملیں اور دیکھیں کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں، ملنسار ہیں یا نہیں۔ ان سے کاروبار کرنے میں ہمیں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئے گی؟" شہزادے نے جواب دیا۔

"آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔ ہمیں بغداد کے لوگوں کے بارے میں تمام باتیں معلوم ہونی چاہییں۔" ملازم نے کہا۔

"بس تو پھر صبح نماز کے بعد ہی ہم دونوں شہر چلیں گے۔" شہزادے نے فیصلہ کر دیا۔

دوسرے دن جب وہ بغداد شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کی دُکانیں ابھی پوری طرح کھلی بھی نہیں تھیں،

اس لیے دونوں نے طے کیا کہ پہلے کچھ ناشتا کر لیا جائے، اس وقت تک باقی دُکانیں وغیرہ بھی کھل جائیں گی۔ بازار میں چہل پہل ہو جائے گی تو لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع آسانی سے ملے گا۔ یہ سوچ کر دونوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو سامنے ہی ایک نانبائی کی دُکان دِکھائی دی۔ وہ دونوں اس میں داخل ہو گئے اور ناشتا طلب کیا۔ یہ دُکان ایک یہودی نانبائی کی تھی۔ شہزادے نے جب ناشتا طلب کیا تو وہ یہودی خود ہی اُٹھ کر ان کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"آپ دونوں صورت شکل سے بہت شریف اور اچھے خاندان کے چشم و چراغ معلوم ہوتے ہیں شریفوں کا قاعدہ یہ نہیں کہ یوں دُکانوں میں اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ دُکان کے پیچھے میرا مکان ہے آپ اندر چلیے، تو میں کھانا لا کر آپ کی خدمت میں پیش کروں۔"

شہزادے نے بھی سوچا کہ واقعی اچھے آدمیوں کو اس طرح کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ اس لیے اس نے یہودی کی بات مان لی اور اپنے ملازم کو لے کر یہودی کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہودی نانبائی انھیں راستہ بتاتے ہوئے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ دونوں مکان کے ایک کمرے میں پہنچے تو یہودی کے دو حبشی غلام اچانک کمرے میں داخل ہوئے، انھوں نے شہزادے اور اس کے ملازم کو پکڑ لیا۔ اتنے میں کچھ غلام اور آئے۔ سب نے مل کر دونوں کو باندھ دیا۔ یہودی کے گھر میں ایک کنواں بھی تھا، ان حبشیوں نے شہزادے اور اس کے ملازم کو رسیوں سے باندھ کر کنویں میں لٹکا دیا۔ کنویں کی تہ تک پہنچے تو انھیں پتا چلا کہ اس میں پانی نہیں تھا، البتہ کئی دوسرے آدمی بھی انھی کی طرح وہاں بندھے پڑے تھے۔

ان قیدیوں نے بتایا کہ یہودی کا طریقہ یہی ہے کہ وہ دُکان میں آنے والوں کو مختلف بہانوں سے گھر کے اندر لے آتا ہے، پھر یہاں لا کر قید کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایک آدمی کو کنویں سے نکالتا ہے اور انھیں غلام بنا لیتا ہے یا قابو میں نہیں آتے تو مار ڈالتا ہے۔ قیدیوں کی زبان سے یہ باتیں سُن کر شہزادے کا ملازم تو بہت گھبرایا لیکن شہزادے نے کہا:

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ ہے، انسان کا کام تو یہ ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی عقل استعمال کرے اور مصیبت دُور کرنے کی کوشش کرے۔"

دوسرے دن صبح یہودی کنویں پر آیا اور اس نے شہزادے کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ ابھی وہ شہزادے کی پٹائی شروع کرنا ہی چاہتا تھا کہ شہزادے نے کہا:

"ٹھہرو، پہلے میری ایک بات سُن لو، اس کے بعد تم جو چاہو وہ کر لینا۔" پھر جب یہودی نے اپنے غلاموں کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا تو شہزادے نے کہا، "مجھے مارنے سے تمھیں نقصان ہوگا، کیوں کہ مجھے ایک ایسا ہُنر آتا ہے کہ اگر تم مجھے زندہ رکھو تو روزانہ اس سے زیادہ منافع حاصل کر سکتے ہو۔"

"کون سا ہُنر آتا ہے تمھیں؟" یہودی نے پوچھا۔

"میں ایسی چٹائیاں بنانا جانتا ہوں کہ اس علاقے کے لوگوں نے شاید کبھی دیکھی بھی نہ ہوں۔ میں تمھیں روزانہ ایک چٹائی بُن دیا کروں گا اور تم اُسے بازار میں بیچ کر خوب منافع حاصل کر سکتے ہو۔ اگر تم ابھی جنگل سے کچھ گھاس منگوا دو

تو میں اور میرا ملازم ایک ایسی چٹائی بُن کر تمھیں دکھا دیں گے۔ تم خود دیکھ لو گے کہ یہ چٹائی کتنی عمدہ ہوتی ہے اور تم اس سے کتنا منافع حاصل کر سکتے ہو؟"

اس یہودی نے لالچ کی وجہ سے شہزادے کی بات مان لی اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ فوراً جنگل جائیں اور گھاس لے آئیں۔ پھر جب گھاس پہنچ گئی تو شہزادے نے واقعی نہایت عمدہ چٹائی بُن کر یہودی کو دی اور کہا کہ یہ چٹائی شہر کے کوتوال کو دو۔ اُس سے تمھیں بہت سی رقم ملے گی۔ یہودی نے جب وہ چٹائی کوتوال کو پہنچائی تو کوتوال واقعی بہت خوش ہوا اور اس نے یہودی کو بہت سا انعام دیا۔ اتنے پیسے دیکھ کر تو یہودی کا لالچ اور بڑھ گیا اُس نے گھر آ کر شہزادے سے کہا کہ دوسرے دن وہ پہلی چٹائی سے بھی زیادہ خوبصورت چٹائی بنائے تاکہ یہ چٹائی وزیر کو پیش کی جا سکے۔ دوسرے دن شہزادے نے سچ مچ بڑی خوب صورت چٹائی تیار کی جسے دیکھ کر وزیر بہت خوش ہوا۔ اس نے یہودی کو بہت انعام دیا۔ اس سے یہودی کا لالچ اور بڑھ گیا۔ اس نے واپس آ کر شہزادے سے پوچھا کہ کیا وہ اس سے بھی اچھی چٹائی تیار کر سکتا ہے، تو شہزادے نے کہا:

"میں ایسی چٹائی خلیفہ کے لیے بنا سکتا ہوں کہ پہلے کسی نے بھی ایسی چٹائی نہ بنائی ہوگی، لیکن یہ چٹائی صرف گھاس سے نہیں بنائی جائے گی۔ اس کے لیے عمدہ قسم کے سوت اور اُون کی ضرورت بھی ہوگی۔"

یہودی نے دوسرے دن وہ تمام چیزیں شہزادے کو لا دیں جن کی اُس نے فرمائش کی تھی۔ ان چیزوں سے شہزادے نے ایک انتہائی خوبصورت چٹائی تیار کی۔ اس کی بناوٹ اور نقش ایسے تھے کہ شہزادے نے اس میں اپنی اور دوسرے لوگوں کی گرفتاری کا تمام حال لکھ دیا تھا۔ جب چٹائی تیار ہو گئی اور یہودی شہزادے کے پاس آیا تو شہزادے نے وہ چٹائی لپیٹ کر یہودی کو دے دی اور کہا:

"یہ چٹائی صرف خلیفہ کے سامنے ہی کھولنا، کیوں کہ بار بار کھولنے اور لپیٹنے سے یہ خراب ہو جائے گی پھر ہو سکتا ہے کہ خلیفہ کو پسند نہ آئے اور وہ تمھیں انعام دینے کے بجائے اس بات پر کوئی سزا دے دے کہ تم نے ایک خراب چیز اُسے پیش کی۔ اگر تم نے اسے راستے میں نہ کھولا اور صرف خلیفہ کے سامنے ہی کھولا تو اُسے یہ ضرور پسند آئے گی۔"

شہزادے کی بات یہودی کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ چٹائی لے کر سیدھا خلیفہ کے پاس پہنچا۔ پھر جب اُسے خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس نے وہ چٹائی کھولی۔ خلیفہ اس چٹائی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے اس چٹائی میں لکھی ہوئی شہزادے کی گرفتاری کے متعلق سب باتیں پڑھ لیں تب اس نے یہودی سے پوچھا: "یہ چٹائی کس نے بنائی ہے؟"

"میرا ایک غلام ایران گیا تھا وہاں سے وہ اسے لایا ہے۔" یہودی نے جھوٹ بولا۔

"ہم تمھارے اس غلام سے ملنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم کریں کہ کیا ایسی اور چٹائیاں بھی ہمیں مل سکتی ہیں اور انھیں حاصل کرنے میں کتنے دن لگیں گے؟" بادشاہ نے کہا۔

یہودی نے کہا کہ وہ فوراً اپنے غلام کو بلا لائے گا، لیکن خلیفہ نے کہا کہ یہودی کا جانا کچھ ٹھیک نہیں۔ اس لیے کسی آدمی کو یہودی کے گھر بھیج کر اس غلام کو بلا لیا جائے۔ اب تو یہودی بہت پریشان ہوا کہ اس طرح تو خلیفہ کو اس کے قیدیوں کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا۔ لیکن جب خلیفہ نے مجبور کیا تو اُسے اپنے گھر کا پتا بتانا پڑا۔ پتا معلوم کر کے خلیفہ نے چپکے سے اپنے وزیر کو اشارہ کیا کہ وہ آدمی بھیج کر یہودی کے گھر کے تمام آدمیوں کو یہاں لے آئیں۔

خلیفہ کے سپاہی یہودی کے گھر پہنچے تو پہلے تو اس کے غلاموں نے کوشش کی کہ اُس کنوئیں کے متعلق کچھ نہ بتائیں جس میں سارے قیدی موجود تھے، لیکن جب اُن پر مار پڑی تو انھیں سب کچھ بتانا پڑا۔ اس کے بعد خلیفہ کے سپاہیوں نے اُن غلاموں کو بھی گرفتار کر لیا اور شہزادے سمیت تمام قیدیوں کو لے کر خلیفہ کے پاس پہنچے۔ خلیفہ نے تمام قیدیوں کے بیان سُنے اور ظالم یہودی کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اُس نے شہزادے کو بڑی عزت سے اپنا مہمان بنایا۔ اس طرح شہزادے نے اپنے ہنر کے ذریعہ سے نہ صرف اپنی بلکہ بہت سے انسانوں کی جان بچائی۔ کچھ دن بعد وہ خلیفہ سے اجازت لے کر اپنے وطن کرمان پہنچا جہاں بادشاہ نے اس کی شادی کر دی اور کچھ دن بعد حکومت بھی اسے سونپ دی۔

(اُردو کے کلاسیکی ادب کی ایک کتاب "جامع الحکایاتِ ہندی" کی ایک کہانی کا خلاصہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ)

[illegible]رت پوری

"گڑیا کی رخصتی"

مری پیاری پیاری صدف نازنین
کوئی تجھ سی دنیا میں گڑیا نہیں
نظر تیرے جلووں سے سرشار ہے
مرے دل میں تیرا بہت پیار ہے
بہت فکر تھی کوئی رشتہ ملے
ترے واسطے کوئی گڈا ملے
جو تجھ کو سدا ان گنت پیار دے
ادا پر تری جان و دل وار دے
تری ہی محبت کے ساغر پیے
تجھے دیکھ کر جو ہمیشہ جیے
وہ گڈا وہاں آخرش مل گیا
مری آرزو کا کنول کھل گیا
یہ جوڑی نہایت طرحدار ہے
صدف تو ہے وہ دُرِ شہوار ہے
تمنا نہ حسرت نہ کوئی غرض
زمیں اور زر سے نہیں کچھ غرض
مساوات ہے تم میں، جھگڑا نہیں
کوئی بھی بڑا اور چھوٹا نہیں
جہیز اور ساماں کا لالچ نہیں
ترا گڈا انساں ہے اعلا ترین
تو جائے گی اس گھر سے لیکن بتا
تجھے دل سے کیسے کروں گی جُدا
سہیلی کوئی ملنے جب آئے گی
مجھے یاد فوراً تو آ جائے گی
خدا ہو نگہباں سدھارو صدف
نئی زندگی کو سنوارو صدف

۴۳، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

دو شکاری

(قسط ۱۲)

ۃ الرحمٰن محسنی

ہم جھاڑیوں کے پیچھے گھاس پر اندھیرا ہونے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ آسمان پر پیلا سرمئی دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ ہمارے پیچھے جنگل میں درختوں کے درمیان سائے کالے ہوتے جا رہے تھے۔

ابو کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ ان کا ہاتھ میرے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا وہ کہہ رہے تھے۔

دانی! ہم نے سب سے مشکل کام عمدگی سے انجام دے لیا ہے۔ کیا اس وقت تمہارا دل خوش نہیں ہے؟

ابو مجھے بہت خوشی ہے۔ مگر یہ کام ڈراونا بھی بہت ہے میں نے کہا۔

پوچنگ میں یہی تو بات ہے کہ اس میں تفریح بھی بہت ہے اور یہ ہمیں پورے وقت ڈرائے سہمائے بھی رکھتا ہے۔ مگر بہت مزے دار ہوتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے ابو! یہ سونے کی گولیاں کتنی دیر میں اثر کرتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

اس بارے میں ٹھیک سے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ابو نے کہا۔ اندازاً آدھ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیتروں پر اس کا اثر زیادہ دیر میں ہو۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ خیر چوکیداروں کے جانے تک تو ہمیں انتظار کرنا ہی ہوگا۔ یہ لو امرود کھاؤ! ابو نے ایک امرود مجھے دیتے ہوئے کہا۔ میں چلتے وقت دو امرود جیب میں رکھ لایا تھا۔

اُف ہو! کتنا بڑا اور میٹھا ہے۔ میں نے مسکرا کر لیتے ہوئے کہا۔ یہ بہت میٹھا ہے۔ ہمارے درخت کا ہوتا ہی میٹھا ہے۔

سامنے دیکھو! انھوں نے سرگوشی میں کہا۔ کوئی آ رہا ہے۔

شام کے جھٹپٹے میں ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ اور خاموشی سے ابو کے بالکل قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک دوسرا چوکیدار ہے انھوں نے منہ ہی منہ میں مجھے بتایا۔ بالکل چپ سادھے بیٹھے رہنا۔ ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا۔

اس کی بغل میں بھی ایک ڈبل بیرل شکاری بندوق دبی ہوئی تھی اور برابر میں ایک کتا بھی تھا۔ وہ اور اس کا کتا ہم سے چند قدم کے فاصلہ پر کھڑے تھے۔

ابو نے بڑے شائستہ دوستانہ انداز میں اسے آداب کیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ چوکیدار دبلا اور کافی لمبا ہے۔ سخت آنکھیں اور درشت چہرہ اور خطرناک حد تک مضبوط لمبے ہاتھ تھے۔

وہ اور قریب آکر بولا۔ میں تم دونوں کو پہچانتا ہوں۔ ابو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

تم پیٹرول پمپ والے ہو نا۔ اور لڑکا بھی تمہارا ہی ہے اور تم اس گندے لکڑی کے گھر میں رہتے ہو۔ کیوں؟ یہ سب بیسیوں سوالات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابو نے کہا۔

چوکیدار نے ایک بڑا سا تھوک کا بچاکا اوپر منہ کر کے ہوا میں اچھال دیا۔ جو ابو کی پلاسٹر والی ٹانگ کے بالکل برابر آکر گرا۔ اس نے دیکھ کر کہا۔ اسے رگڑ ڈالو اور پھر یہاں سے چل دو۔

ابو بہت ملائمیت سے بولے۔ یہ ایک پبلک فٹ پاتھ ہے۔ ہمیں پریشان نہ کرو۔

چوکیدار نے بائیں بغل سے بندوق نکال کر دائیں میں دبائی اور کہا۔ آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو اور وہ بھی خراب نیت

مسکن دودھ پور۔ علی گڑھ

ہے میں تم کو بند بھی کرا سکتا ہوں۔ ارے نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے ابو نے دھیمے لہجہ میں کہا۔ گھبراہٹ کی وجہ سے میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ کہ وہ آدمی پھر بولا۔ میں دیکھ رہا ہوں تم نے اپنا پیر بھی اتفاق سے کسی کھائی میں گر کر توڑ لیا ہے۔ کیوں ایسا ہی ہوا تھا نا؟

ابو نے اس کی بات ان سنی کر کے میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ دانی چلو ہمارے کھانے کا وقت ہو رہا ہے گھر چلیں۔ آج کی ٹہل بہت اچھی رہی۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساتھ ہی میں بھی۔

ہم چوکیدار کو وہیں کھڑا چھوڑ کر جس طرف سے آئے تھے۔ کچی سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ یہاں تک وہ شام کے جھٹپٹے میں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ابو نے کہا یہ چوکیداروں کا مکھیا ہے۔ اس کا نام شیر خان ہے۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ ابو کیا ہم کو گھر جانا چاہیے؟

گھر؟ نہیں دانی پیارے! انھوں نے کہا۔ ابھی تو ہمارا اصلی کام شروع ہوگا۔ آؤ ادھر آؤ۔ سامنے ہی ایک گیٹ تھا۔ ہم دونوں اس پر سے اتر کر دوسری طرف ایک میدان میں آ گئے۔ اور ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ گئے۔ ابو نے کہا۔ تم شیرو کو دیکھ کر گھبرا گئے ہو۔ وہ تو اب چلا جائے گا۔ اس کے گھر جانے اور کھانا کھانے کا وقت بھی تو ہو گیا ہے۔ ہم چپ چاپ اس کے چلے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ آسمان پر خوب گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ دو چار تارے بھی نظر آنے لگے تھے۔ سامنے کے ٹیلوں کی پشت سے چاند بھی ابھرنے لگا تھا۔

ابو نے کہا۔ ہم کو شیر کے کتے سے بھی ہوشیار رہنا ہے۔ جب وہ یہاں سے گذریں تو تم دم سادھے بیٹھے رہنا۔ ہلنا جلنا بالکل نہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد شیر خاں کتے کو لیے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ میں نے اپنا سانس اندر گھونٹ لیا اور اس وقت تک باہر نہیں نکالا جب تک کہ وہ کافی دور نہیں چلے گئے۔ ابو کہنے لگے اس وقت ہوا بند ہے۔ ہماری بو کتے تک نہیں پہنچی نہیں تو وہ ضرور ہماری طرف آتا۔ ابو اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ وہ صبح سے پہلے نہیں آئے گا۔

سچ ابو! اب وہ نہیں آئے گا؟ میں نے پوچھا۔ ہاں مجھے یقین ہے کہ وہ نہیں آئے گا۔ دانی! ابو نے مجھے تسلی دی۔ اور وہ دوسرا والا جس کو ہم نے اندر کھڑا دیکھا تھا۔ وہ بھی چلا گیا ہوگا۔ یہاں سے نکلنے کے یہ لوگ بیسوں راستے جانتے ہیں۔ ہم احتیاطاً چند منٹ جھاڑیوں کے پیچھے ہی رکے رہے۔ ابو کہہ رہے تھے۔ دانی یہ سوچ کر کیسی خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے کہ ان درختوں کے اوپر بسیرا لینے والے تیز نیند کے نشے میں جھوم رہے ہوں گے۔ اور جلدی ہی شاخوں پر سے ایسے گریں گے۔ جیسے کہ بارش کی بوندیں۔

ہم جھاڑیوں سے نکل کر گیٹ پر سے گزرنے کے لیے جا رہے تھے۔ تو ہم نے دیکھا کہ سامنے کے ٹیلوں کے پیچھے سے تین چوتھائی چاند نمودار ہو چکا تھا۔ اور آسمان تاروں سے جگمگا رہا تھا۔ (جاری)

”جھوٹ کا انجام“

رفیق عابد (زاہدی)

گڈریے کے ایک لڑکے نے صدا دی ہائے ہائے
آ گیا ہے بھیڑیا، آ کر کوئی مجھ کو بچائے
بھیڑ یا بکری کو یا مجھ کو ابھی کھا جائے گا
رحم ہم دونوں پہ ظالم کو نہ ہرگز آئے گا
گاؤں والے سن کے یہ فریاد دوڑے گاؤں سے
جھوٹ پر اپنے ہنسا لڑکا تو سب نادم ہوئے
کچھ دنوں کے بعد اس نے پھر اچانک دی صدا
پھر وہاں چھوٹے بڑے کا ایک مجمع ہو گیا
آ گئی لڑکے کو پھر اپنی شرارت پر ہنسی
گالیاں دیں آنے والوں نے، پھر اپنی راہ لی
اب کوئی اس کی شرارت پر نہیں دھرتا تھا کان
اب کسی کو بھی نہ آتا تھا وہاں جانے کا دھیان
واقعی اک روز ظالم بھیڑیا آ ہی گیا
یہ مصیبت دیکھ کر لڑکا تو گھبرا ہی گیا
خوب چیخا خوب چلایا کوئی آیا نہیں
کوئی بھی اس کی مدد کے واسطے پہنچا نہیں
بھیڑ یا بکری کو اور لڑکے کو لے کر چل دیا
جو نتیجہ جھوٹ کا ملنا تھا وہ مل کر رہا

اِرم وجاہت
(درجہ سوم)

درس گاہ

(عبداللہ نرسری علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سالانہ جلسے میں سُنائی گئی)

یہ رحمتوں کی بزم ہے — خلوص کا گگن ہے یہ
نصیحتوں کی بزم ہے — گلاب کا چمن ہے یہ
یہ نکہتوں کی بزم ہے — عروسِ علم وفن ہے یہ
صداقتوں کی بزم ہے — ادب کی انجمن ہے یہ

یہ رشکِ مہر و ماہ ہے — مقامِ عزّ و جاہ ہے
ہماری درس گاہ ہے — ہماری درس گاہ ہے

عجیب گلستاں ہے یہ — ہیں سے دھان پان تھے
بہارِ بے خزاں ہے یہ — اُبھر کے اس کی خاک سے
نگارِ کہکشاں ہے یہ — جو چاند پر پہنچ گئے
عروج کا نشاں ہے یہ — ہیں تیر اِسی کمان کے

بلندیوں کی راہ ہے — ارم خُدا گواہ ہے
ہماری درس گاہ ہے — یہی وہ بارگاہ ہے

ہماری درس گاہ ہے
ہماری درس گاہ ہے

معرفت مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
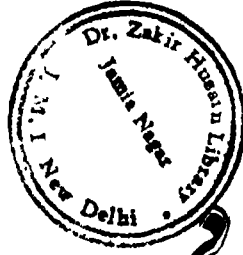
کیلاش ناتھ کول
ترجمہ: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

مونگ پھلی

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ایک گاؤں کی لڑکی کے دماغ میں بہت سویرے اٹھ کر یہ خیال آیا۔ کیوں نہ کھیت کی سیر کی جائے۔ اس کے گھر کے چاروں طرف کھیت تھے اس نے ایک پگڈنڈی کا سہارا لے کر کھیتوں کے بیچ میں سے چلنا شروع کیا۔ چلتے چلتے ایک کھیت میں اس نے مونگ پھلی کے پودے لگے دیکھے۔ ان میں پیلے پیلے پھول آرہے تھے اور بہت سے پھول پک چکے تھے اور زمین کی طرف ان کی پھلیاں جھک کر اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ابھی فصل تیار نہیں ہوئی تھی لڑکی نے سوچا کہ بہت سی پھلیاں ضرور زمین کے اندر گھس گئی ہوں گی اور وہ اگر پکی نہیں ہوں گی تو دودھیا کھانے کے قابل تو ضرور ہوگئی ہوں گی۔ اس نے ایک سب سے بڑے پودے کی جڑ کے پاس کھودنا شروع کیا اور زمین میں دبی مونگ پھلی توڑ کر نکالی۔ اس کو چھیلا اور اندر سے ایک آدھ پکا دانہ نکال کر کھانے کے لیے منہ میں ڈالا اور اس کو دانتوں کے نیچے دبا کر کھانے کی کوشش کی۔ جیسے ہی مونگ پھلی کا دانہ دانتوں کے نیچے دیا لڑکی کو ایک چیخ سنائی دی۔ لڑکی نے فوراً منہ سے دانہ نکال لیا اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ یہ آواز کہاں سے آئی وہ سوچ میں پڑگئی۔

تھوڑی دیر بعد مونگ پھلی کے دانے نے لڑکی سے کہا کہ بہن معاف کرنا چیخ نکل گئی۔ جیسے تم زندہ ہو ویسے ہی میں بھی زندہ ہوں۔ زندہ چیز جب دبتی ہے اور کمزور ہوتی ہے تو صرف چیخنے کے علاوہ وہ کیا کرسکتی ہے۔ مجھے معلوم ہے تم مجھے کھالو گی۔ میں کچھ بھی نہیں کرسکتی ہوں۔ تم اتنا غور سے مجھے کیوں دیکھ رہی ہو۔ کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ میں کون ہوں؟ پھر میں تمھیں خود ہی بتا دوں۔ میں تمھارے ملک کی رہنے والی نہیں تھی۔ ہم تو جنوبی امریکہ کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے خاندان والوں نے وہاں بڑی ترقی کی تھی۔ بڑے بڑے درخت بنائے اور طرح طرح کے پھول پیدا کیے اور ہماری آبادی بڑھ کر بڑے بڑے جنگلوں میں پھیل گئی۔ آبادی پھیلنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو بعد میں پیدا ہوئے ان کو درختوں کے سائے کی وجہ سے ٹھیک روشنی نہیں مل سکتی تھی اور زمین میں بڑے بڑے درختوں کی جڑوں سے پانی اور کھانا حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے بعد کی نسلوں کے تنوں کا جسم پتلا پڑگیا تھا وہ سیدھے نہیں اگ سکتے تھے کیونکہ جسم میں کمزوری آگئی تھی۔ تو انھوں نے درختوں کی طاقت کا فائدہ اٹھایا۔ اور ان کے تنوں پر لپٹ لپٹ کر روشنی اور ہوا کے لیے درختوں کی اونچی شاخوں کی طرف جانے کے لیے اپنے طرح طرح کے روپ بدلے۔ یہ بیلیں سارے جنگل میں پھیلتی چلی گئیں۔ اس نسل کے بعد ہمارے خاندان

۵۰/۶ بلدار روڈ۔ نشاط گنج۔ لکھنؤ۔

میں جو بچے پیدا ہوئے وہ بیلوں سے بھی کمزور تھے اس لیے وہ روشنی ہوا اور زمین میں خوراک نہ ملنے کی وجہ سے مرگئے ۔ تھوڑے سے بیج جو ہوا کے جھونکوں سے جنگل کے باہر چلے گئے صرف وہی بچے لیکن انھوں نے دیکھا کہ جنگل میں سب پیڑوں اور پودوں نے زرخیز زمین پر قبضہ جما رکھا ہے ۔ جہاں جنگل نہیں تھے اور ندیوں کے کٹاؤ کی وجہ سے ریت جمع ہوگئی تھی ۔ ہمارے پرکھوں نے اسی میں اپنا ڈیرا جمالیا اور زندہ رہنے کے لیے ایک راستہ نکال لیا ۔

بالو میں پودوں کے کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا ۔ تھوڑی مدد جڑوں کے پھیلانے کے لیے ضرور مل جاتی ہے جس سے پانی دستیاب ہوجاتا ہے لیکن روشنی اچھی طرح مل جاتی ہے ۔ ایسی زمین میں صرف بے حیا پودے ہی زندہ رہ سکتے ہیں ۔ رات کی اوس کو بالو جذب کرلیتی ہے اور پودے کی جڑیں چوس لیتی ہیں ۔ پانی میں تھوڑے سے معدنیات ہمیشہ گھلے رہتے ہیں وہ پودوں کے لیے کار آمد ثابت ہوتے ہیں ۔ ہمارے پرکھوں کے سامنے بڑے اہم مسائل تھے بیج جتنے تھے اور پودے کے روپ میں آتے ہی جاتے تھے ۔

اس طرح کافی عرصے تک بالو میں رہتے رہتے ہمارے پرکھے سخت جان ہوگئے ۔ بہن زندگی عجیب شے ہے آہستہ آہستہ حرکت کرنے کے لیے طرح طرح کی شکلیں بدلتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ کھانے پینے کا ڈھنگ بدلتا رہتا ہے ۔

ایک وقت ہمارے پرکھوں نے ایسا محسوس کیا کہ بالو میں ایک قسم کے چھوٹے اور بڑے عجیب سخت جان جاندار رہتے ہیں جو ہوا سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں ۔ ہمارے بزرگوں نے ان سے دوستی کی انھوں نے کہا کہ ہم ہوا کے ذریعے اپنا کھانا تو تیار کرلیتے ہیں لیکن ہمارے سامنے ایک مسئلہ ایسا ہے جو ہم کو زیادہ بڑھنے نہیں دیتا ہے ۔ ہمارے جسم میں وہ مادہ جو تمھاری پتیوں میں ہوتا ہے نہیں ہوتا ۔ تمھاری پتیوں کو زمین سے ٹھیک مقدار میں اگر خوراک ملے تو سورج کی روشنی کی مدد سے میدا جیسی چیز تیار کرسکتی ہیں اور شکر جیسی چیز بھی تیار کرسکتی ہیں اور پھر جسم کی ہر ایک چیز جو زندگی کے لیے ضروری ہے تیار کرسکتی ہیں ۔ یہ سب کے لیے تیار کرکے اپنی عمر بڑھا سکتی ہیں اور اپنے خاندان کو ترقی کے راستے پر لے جاسکتی ہیں

ہمارے بزرگوں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے ۔ تو کچھ چیزیں تمھارے پاس ہیں ۔ اور کچھ ہمارے پاس اگر ہم دونوں مل کر رہیں تو اس میں دونوں کا ہی فائدہ ہے ہمارے پرکھوں نے جڑوں میں چھوٹے چھوٹے کمرے بنائے اور ان کمروں میں ان چھوٹے چھوٹے زندہ رہنے والے جانداروں کو رکھا ۔ اب کیا تھا ۔ ہمارے پرکھوں نے بالو میں رہنا سیکھ لیا اور اپنی نسل بڑھانے اور ترقی کرنے کا راستہ تلاش کرلیا ۔

ہماری نسل میں ایک بڑی خرابی ہے کہ ہم کو نسل بڑھانے کے لیے پھلیاں بنانی پڑتی ہیں ۔ ان پھلیوں کو جانور کھا جاتے تھے ۔ یہ ایک نیا مسئلہ تھا ۔ لیکن بہن خدا کی دنیا میں ہر ایک مسئلہ کا حل ہوتا ہے ۔ صرف اس کی کھوج ضروری ہے ۔ ہمارے بزرگ جو باہر پھول پیدا کرتے تھے ۔ اور پھلیاں تیار کرتے تھے ۔ اب یہ کرنے لگے کہ پھول کی ڈالی کو چھوٹی پھلی بنتے ہی زمین کی طرف جھکا دیتے تھے ۔ اور بالو میں تو گھسنا آسان ہوتا ہے ۔ اور اس کو گھوما گھوما کر بالو میں پہنچا دیتے تھے ۔ تاکہ کسی کو پھلی نظر نہ آئے اور نہ کسی کا دل للچائے اور ہم نہ مارے جائیں ۔

بہن زندگی کا یہ بھی ایک بڑا راز ہے جو اپنے کو دکھانا چاہتا ہے ۔ مارا جاتا ہے اور جو نہیں

وہ اپنی دولت، اپنی طاقت، اپنا علم اپنے تک
ہی چھپا کر رکھتا ہے وہ کسی سے دشمنی نہیں پیدا کرتا
ہے۔

بہن دنیا میں مسائل ہی مسائل ہیں۔ ایک
حل کرو تو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے ہمارے بزرگوں
نے اپنی پھلیوں کو بالو میں بچا لیا لیکن بالو دن
کی دھوپ میں گرم ہو جاتی ہے اور نازک پھلیوں
کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ اس کا حل ہمارے
پرکھوں نے یہ نکالا کہ پھلیوں کو پھلا دیا اور باہر
کی بالو اور بیج میں جو کلی کا چھلکا تھا ۔ اس کو بھی پھلایا
اور اس میں چھوٹے چھوٹے کمرے بنا دیے جس میں
ہوا بھر دی ۔ ہوا میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر وہ خشک
ہو تو گرمی اندر نہیں آسکتی ہے اور اندر کی گرمی باہر
نہیں جا سکتی ہے ۔ بہن جب تم نے میری پھلی کا چھلکا
توڑ کر مجھے نکالا تھا تو چھلکے میں چھوٹے چھوٹے کمرے
نظر آئے ہوں گے ۔ ان میں جو ہوا بند رہتی ہے وہ
بالو کی گرمی کو اندر نہیں گھسنے دیتی جس سے کہ ہم جیسے
نازک بیج بچ جاتے ہیں اور پتوں سے کھانا پہنچنے پر
موٹے اور تندرست ہوتے رہتے ہیں ۔ باہر کی گرمی
سے بچنے کے لیے ہمارے پرکھوں نے ہمارے اوپر
لال چھلکا لپیٹ دیا یہ چھلکا بھی ہم کو بالو کی گرمی
سے بچاتا ہے ۔ بہن تم بھی تجربہ کر کے دیکھ لو کہ
ایک کالے رنگ کی ساڑی دھوپ میں پہن کر بیٹھو
اور اس کو اتار کر لال ساڑی پہنو ۔ تمھیں خود معلوم
ہو جائے گا کہ لال رنگ اور دوسرے رنگوں میں
کیا فرق ہے ۔

ایک مسئلہ اور اٹھ کھڑا ہوا کہ جب بارش ہوتی
ہے تو بالو میں پانی بھر جاتا ہے اور پانی کی وجہ
سے بالو میں دبی ہوئی چیزیں سڑ جاتی ہیں ۔ تو
ہمارے پرکھوں نے اس کا بھی حل نکال لیا ہے ۔
ہمارے بچوں کو بچانے کے لیے دو داتوں کے ڈبے
ہوتے ہیں ان میں تیل بھر دیا تاکہ وہ چھوٹا سا بچہ
گلنے سڑنے نہ پائے ۔ بہن تم بھی بارش کے موسم میں
تیل کی مالش کرو تو تمھیں کھال کی بیماریاں نہیں
لگیں گی ۔ اس طرح ہمارے پرکھوں نے اپنے بچوں
کی جان بچا کر بالو والی زمینوں میں اپنی نسل بڑھانا
شروع کیا ۔

بالو رات میں بہت ٹھنڈی ہو جاتی ہے ۔ جس
کی وجہ سے جڑوں کے پانی چوسنے کے منہ بند ہو جاتے
ہیں ۔ جب پانی نہیں جائے گا تو اوپر کا حصہ سوکھ
جائے گا ۔ تو بہن اس کا بھی علاج ہمارے پرکھوں
نے سوچ نکالا ۔ بہن دیکھو ہمارے کھیت میں اس
وقت ہماری پتیاں سب پھیلی ہوئی ہیں ۔ تاکہ زیادہ
سے دھوپ ان پر پڑ سکے اور زیادہ سے زیادہ شکر
وہ بنا سکیں ۔ پھر وہ شکر سے میدا بنا دیتی ہیں ۔ اور
شام ہونے سے پہلے یعنی سورج غروب ہونے سے پہلے
یہ سب اوپر جا کر مل کر اپنے سوراخوں کو بند کر دیتی
ہیں تاکہ جسم کا پانی باہر کی ہوا میں نہ جا سکے ۔

بہن ہمارے پرکھے بہت عقلمند تھے انھوں
نے بڑی بڑی مشکلیں اٹھائیں اور جنوبی امریکہ کے
میدانوں میں بلوی زمینوں میں اپنے خاندان کو زندہ
رکھا اور اپنی نسل کو مٹنے نہیں دیا لیکن ایک مصیبت
ایسی آئی جس کا مقابلہ ہمارے بزرگ نہیں کر سکے ۔
وہ یہ تھی کہ آدمی کو پتا چل گیا کہ ہماری پھلیوں میں
جو بیج ہوتے ہیں ۔ ان میں بڑی مقدار میں تیل
ہوتا ہے اور جسم کو نشو و نما دینے والے مادے بھی
ہوتے ہیں ۔ آدمی کھود کھود کر ہماری پھلیوں
سے بیج نکال کر کھانے لگا اور ہم یہ سمجھے کہ اب
ہماری خیریت نہیں ۔ لیکن آدمی سے کیسے جنگ کرتے
ہم نے سوچا ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا ۔ لیکن
کچھ دنوں بعد ہم نے دیکھا کہ آدمی ہم کو کھاتا تو
ہے لیکن جنگل صاف کر کے اچھی زمینوں میں ہماری

کھیتی بھی کرتا ہے اور بہت اچھی کھادیں بھی ڈالتا
ہے۔ جنگلی حالت میں ہمارے بیج بہت چھوٹے
ہوتے تھے۔ اور ہماری پھلیاں چھوٹی ہوتی
تھیں اور اکثر جنگلی جانور اور چڑیاں ہم کو کھود
کر کھا جاتی تھیں۔ لیکن کسی جانور نے ہم کو اچھی
زمین میں نہیں اگایا۔

آدمیوں نے کھیتی کرکے ہماری اچھی قسمیں
پیدا کیں اور پھر مغربی امریکہ سے ہم کو نکال کر
ساری دنیا میں جہاں زیادہ سردی نہیں پڑتی ہے
لگانا شروع کیا۔ ہمارے بہت سے خاندان پیدا
ہوگئے ہیں اور ہم پوری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔
ہم نے انسانی سماج میں ایک خاص عزت پائی۔
کروڑوں روپیا خرچ کرکے آدمی نے ہم کو اپنی
تہذیب کا ایک حصہ بنا لیا۔

ہم کو اپنا گھر چھوڑنے کا رنج تھا۔ ہم کو
اپنی نسل مٹ جانے کا ڈر تھا۔ لیکن یہ سب
اب ختم ہوگیا اور ایک راز بہن کسی کو بتانا نہیں
میں بتاتی ہوں۔ یہ بات بہت نصیحت آمیز ہے
جو پیدا ہوا اس کو موت سے کوئی نہیں بچا سکتا
ہے۔ لیکن خدا نے ہم کو بچانے کے لیے آدمی
کو پیدا کیا۔ جب بہن تم مجھے کھاؤ گی میں اس
وقت تو ناچیز پودے کا دانہ ہوں لیکن تمھارے
جسم میں جاکر تمھارے خون میں مل جاؤں گی۔
اور تمھارے جسم میں گھومتے گھومتے جسم کا ایک
حصہ بن جاؤں گی اور پھر دماغ میں پہنچ جاؤں گی
تم نے جو ایک مونگ پھلی کا دانہ کھایا تھا۔ وہ
دماغ میں پہنچ کر تمھارے خیالات کو اپنے ذریعہ
سے اپنے فائدہ کے لیے اس نسل کے فائدے
کے لیے متاثر کر رہا ہے۔ آج ساری دنیا ہمارے خاندان
کی خدمت کرتی ہے۔ ہم کو بیماریوں سے بچانے
کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرتی ہے۔ ہم کو اب
کوئی فکر نہیں۔ ہم نے ایک علم کا منتر سیکھا ہے۔
کہ دوسروں کی خدمت میں اپنے آپ کو لگادینے سے
انسان جاوداں ہو جاتا ہے بہن اب تم مجھے کھا لو

نو اکلوتے

واثقہ ولی

(ایک کوریائی کہانی)

بہت زمانے کی بات ہے ایک لڑکا اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ نو پیڑھیوں سے اس کے خاندان میں ایک ہی اولاد ہوتی آئی تھی۔ کسی کی ایسی بد دعا کا اثر تھا کہ ان کی اولاد شیر کا لقمہ بن جاتی تھی۔ اتفاق ایسا کہ یہ حادثہ ہمیشہ بارہ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد ایک ہی مہینے ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں ہوتا تھا۔ ایک دن یہ لڑکا ایک جیوتشی کے پاس گیا۔ بدقسمتی سے جیوتشی نے بتایا کہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس کے خاندان والوں کا ہوا اور وہ بھی بارہ سال کی عمر کو پہنچ کر شیر کے منہ کا نوالہ بن جائے گا۔

وہ ان حالات سے پریشان تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اپنی موت کا انتظار کرے اس لیے جب وہ بارہ سال کا ہونے کو آیا تو اپنی ماں کو روتا چھوڑ کر سیر کرنے کے لیے نکل پڑا۔ ملک بھر میں مارا مارا پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ سیول آگیا یہاں اسے ایک مشہور جیوتشی کا پتا لگا۔ اس نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی اس کے پاس ایک سو یانگ ۔ "کوریا کا ایک سکہ" تھے۔ اس نے آدھی رقم اپنے لیے رکھی اور آدھی جیوتشی کو دے کر کہا کہ وہ اس کی قسمت کا حال بتائے۔ جیوتشی راضی ہوگیا۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ موت اس لڑکے کے پیچھے پیچھے ہے وہ بہت دیر تک سوچتا رہا پھر بولا کہ "تمہارے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اگر تم اپنے موت کے دن "جم" نامی وزیر کی لڑکی کے کمرے میں پناہ لے سکو تو یہ دن ٹل جائے گا"۔ لڑکا پھرتا پھراتا وزیر کے محل تک تو پہنچا لیکن اندر جانے کا کوئی راستہ نہ ملا اس کی قسمت اچھی تھی کہ محل کے قریب ہی اسے ایک چھوٹا سا گھر نظر آیا جہاں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔ اسے کچھ رقم دے کر اس کے یہاں رہنے کی جگہ مانگی۔ بوڑھی عورت راضی ہوگئی۔ اب اس نے بڑھیا کو بتایا کہ کس طرح اس کے خاندان کے نو پرکھوں کو ایک ہی طرح موت کا سامنا ہوا ہے بڑھیا کو یہ کہانی سن کر اس پر ترس آیا اس نے کہا کہ وہ وزیر کی لڑکی کے یہاں پہنچانے میں اس کی مدد کرے گی۔ اس لیے کہ وزیر کی لڑکی اس کی بھتیجی ہوتی تھی۔

اس شام بڑھیا نے بہت عمدہ عمدہ کھانے پکائے اور وزیر کے محل کے بارہ دروازوں کے چوکیداروں کی دعوت کی۔ جب چوکیدار نشے میں مدہوش ہوگئے تو لڑکے کو ساتھ لے کر وزیرزادی کے کمرے میں آئی۔ وزیرزادی اس وقت نہیں تھی کھانا کھانے گئی تھی۔ بڑھیا نے لڑکے کو پردے کے پیچھے چھپا دیا۔ اتنے میں وزیرزادی بھی آگئی۔ بڑھیا نے اس سے کہا: "کہ میں خاص طور سے تمہارے لیے بہت عمدہ مٹھائی بنا کر لائی ہوں۔ ابھی تو تم کھانا کھا کر

آدم و ہوا اسکول طلبہ ہاؤس نئی دہلی ۲۵

آئی ہو، میں یہ مٹھائی پردے کے پیچھے رکھے جا رہی ہوں۔ جب خواہش ہو کھا لینا۔" مٹھائی رکھ کر بڑھیا چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وزیر زادی کو بھوک لگی تو گئی اور وہ پردے کے پیچھے مٹھائی لینے گئی۔ پردہ ہٹاتے ہی اس نے چھپے ہوئے لڑکے کو دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ وہ کوئی شیطان ہے اس نے مقدس کتاب میں سے منتر پڑھنا شروع کر دیا لیکن لڑکا غائب نہیں ہوا بلکہ اس کے سامنے بہت رنجیدہ چہرے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "تم کیا ہو؟ انسان یا شیطان؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" وزیر زادی نے سوال کیا۔ لڑکے نے اپنی ساری رام کہانی سنا دی یہ سن کر اسے بڑا ترس آیا اور موت سے بچانے کے لیے اس نے پھر وہیں چھپا دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک دوسرے وزیر کی لڑکی جو اس کی سہیلی تھی آ گئی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وزیر زادی نے اس سے پوچھا "اگر کوئی بہت پریشان حال آدمی یہاں آئے اور مدد کا طالب ہو تو تم کیا کرو گی" سہیلی نے جواب دیا "میں اس کو ہر قسم کی مدد جو میرے بس میں ہو گی دوں گی" یہ سن کر وزیر زادی پردے کے پیچھے گئی اور لڑکے کو باہر لائی اس کی کہانی سنا کر کہا کہ اس کی جان بچانے کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہو گا اور پھر سے اس لڑکے کو چھپا دیا۔

آدھی رات گیے ایک بڑا شیر محل میں آیا اور اس کمرے کے اردگرد ٹہلنے لگا اور خوشامد کرنے لگا کہ جو لڑکا تم نے چھپایا ہے میرے حوالے کر دو۔" لڑکیاں غصے میں بھر گئیں اور بہت سختی سے کہا تم جیسے خونی حیوان ہو؟ وزیر کے گھر میں بغیر اجازت کوئی نہیں آسکتا۔ تم کیسے آ گیے ہم اندر نہیں آنے دیں گے اور تمھارا جرم آدمی کو مارنا اور کھانا ناقابل معافی ہے تم کو اس کی سزا ملے گی۔" شیر نے کہا "اب تک میں ننانوے اکلوتے بیٹوں کو کھا چکا ہوں۔ اگر آج اس لڑکے کو بھی کھا لیا تو میں آدمی بن جاؤں گا۔ مہربانی کر کے اسے میرے حوالے کر دو۔" لیکن دونوں لڑکیوں پر اس التجا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور وہ مقدس کتاب میں سے منتر پڑھنے لگیں۔ شیر تمام رات محل کے چاروں طرف غرّاتا رہا لیکن جیسے ہی مرغ کی آواز سنی وہاں سے چلا گیا۔ اب لڑکیوں نے لڑکے کو باہر نکالا جو خوف سے قریب بے ہوش ہو گیا تھا۔ انھوں نے اس کو چاول کا دلیا کھلایا۔ تھوڑی دیر میں لڑکا ٹھیک ہو گیا اور ان کی اس عنایت کا بہت بہت شکریہ ادا کرنے لگا۔ لڑکے کی باتیں سن کر لڑکیوں نے اندازہ لگایا کہ یہ شاعری بھی کر سکتا ہے چنانچہ انھوں نے اسے مشورہ دیا کہ کل شاہی ملازمت کے امتحان کا دن ہے۔ تم اس میں شرکت کرو۔ ان لڑکیوں نے ایک اچھی سی نظم لکھ دی اور اسے زبانی یاد کرا دی۔

اگلے دن امتحان لینے والے دونوں وہی وزیر تھے جن کی وہ دونوں لڑکیاں تھیں۔ جب انھوں نے لڑکے کی نظم سنی تو اس کی ذہانت پر بہت خوش ہوئے اور لڑکے کو زیادہ سے زیادہ نمبروں سے پاس کر دیا اور ہر وزیر نے اس کو اپنا داماد بنانا چاہا چونکہ لڑکا دونوں وزیر زادیوں کا ممنون تھا اس لیے انکار نہ کر سکا اور دونوں ہی سے شادی کر لی بعد میں اپنی دونوں بیویوں کو لے کر اپنی ماں کے پاس گیا اور سب ہی ہنسی خوشی رہنے لگے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اندھیری رات میں حضرت عمرؓ کے گھر کی طرف چلا۔ جب میں آدھے راستے پر پہنچا تو ایک اعرابی نے میرا دامن پکڑ کھینچا اور بولا۔ "عباس میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے جو غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو امیرالمومنین حضرت عمرؓ ہیں۔ وہ بھیس بدلے ہوئے تھے۔ میں اُن کی طرف بڑھا۔ سلام کیا اور کہا۔

"یا امیرالمومنین، کہاں کا قصد ہے؟"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا، "آج رات میں عرب قبیلوں کے حالات دیکھنا چاہتا ہوں اور جائزہ لینا چاہتا ہوں کہ وہ کس حال میں ہیں۔"

چناں چہ حضرت عمرؓ آگے آگے چلے اور میں اُن کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ آپ ایک ایک گھر اور ایک ایک خیمے کا چکّر کاٹنے لگے۔ جب جائزہ تقریباً ختم ہو گیا تو ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔ اتنے میں ہم نے خیمے میں ایک بوڑھی عورت کو بیٹھے دیکھا۔ اُس کے چاروں طرف کچھ بچّے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے چولھے پر ایک ہانڈی چڑھی تھی۔ اور وہ بوڑھی عورت بچّوں سے کہہ رہی تھی۔

"بس ابھی کھانا پکا جاتا ہے، پھر کھانا۔"

"ہم وہاں بڑی دیر تک کھڑے رہے۔ حضرت عمرؓ کبھی بوڑھی عورت کو دیکھتے، کبھی بچّوں کو۔ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا: "یا امیرالمومنین آپ یہاں کیوں رُک گئے ہیں۔ اب تشریف لے چلیے۔"

حضرت عمرؓ نے کہا: "خدا کی قسم میں یہاں سے اُس وقت تک نہیں ہلوں گا جب تک یہ بچّے پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھائیں گے۔"

ہم ٹھہر گئے۔ بڑی دیر ہو گئی مگر کھانا تیّار نہ ہوا۔ ادھر بچّے زور زور سے رو رہے تھے۔ بڑھیا انھیں تسلّیاں دیتی جا رہی تھی۔

"بس بیٹا، ذرا دیر اور صبر کر لو۔ ابھی کھانا تیّار ہوا جاتا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا: "آؤ اُس بڑھیا کے پاس چلیں۔"

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ خیمے کے اندر چلے گئے۔ میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ حضرت عمرؓ نے بڑھیا کو سلام کیا۔ بڑھیا نے سلام کا جواب دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا "یہ بچّے کیوں رو رہے ہیں؟" بڑھیا بولی:

"بھوک سے پریشان ہیں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: "تو پھر ہانڈی میں جو کچھ ہے، وہ کھلا کیوں نہیں دیتیں۔" بڑھیا بولی۔

"ہانڈی میں ہے کیا؟ چند کنکریاں ہیں کیا وہ کھلا دوں؟"

حضرت عمرؓ آگے بڑھے، اُنھوں نے ہانڈی کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ پانی اُبل رہا ہے اور کنکریاں پک رہی ہیں۔ وہ بولے آخر اِس کا کیا مطلب

ہے؟" بڑھیا بولی: "کیا کروں، بچّوں کو بہلا رہی ہوں۔" حضرت عمرؓ نے دریافت کیا: "تمھاری یہ حالت کیوں ہے؟"

وہ بولی "کیوں نہ ہو، نہ باپ نہ بھائی نہ شوہر اور نہ کوئی عزیز۔ پھر مجھے کون پوچھے۔" حضرت عمرؓ بولے "تم نے امیر المومنین عمر بن خطّاب کو اپنے حالات کیوں نہ بتائے۔ وہ تمھارے لیے بیت المال سے کچھ مقرر کر دیتے۔"

یہ سن کر بڑھیا نے کہا: "خدا عمرؓ کو غارت کرے۔ خدا کی قسم اس نے مجھ پر ظلم کیا۔"

یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کانپنے لگے۔ مگر بڑھیا سے بڑی نرمی سے کہا "عمرؓ نے تم پر کیا ظلم کیا؟"

بڑھیا بولی: "راعی (حاکم) کا فرض ہے کہ وہ رعایا کے حال سے باخبر رہے۔ نہ جانے اور کون میری طرح تنگ دست اور بچّوں والا بے یار و مددگار ہے۔ خلیفہ کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کی خبر گیری کرے، اور بیت المال سے اُن کے لیے حسبِ ضرورت رقم مقرر کرے۔"

اس پر حضرت عمرؓ بولے: "اچھا میں ابھی آیا۔"

عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ باہر نکل آئے میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ چلا۔ اب رات کا آخری حصّہ باقی رہ گیا تھا۔ ہم چلتے جا رہے تھے اور راستے کے کتّے ہم پر بھونکتے جا رہے تھے۔

آخر کار ہم بیت المال تک پہنچ گئے۔ حضرت عمرؓ نے خود دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ بیت المال کے اندر پہنچ کر حضرت عمرؓ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ پھر انھوں نے ایک بہت بڑی آٹے کی بوری اُٹھائی اور مجھ سے کہا۔

"عباس، میرے کندھے پر رکھ دے۔"

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر فرمایا "تم یہ گھی کا برتن اُٹھا لو۔"

میں نے اِس حکم کی بھی تعمیل کی۔ پھر حضرت عمرؓ نے دروازہ بند کیا اور ہم چل کھڑے ہوئے۔ آٹے کے ذرّے حضرت عمرؓ کی داڑھی پر، آنکھوں پر اور پیشانی پر گرتے جا رہے تھے، مگر آپ برابر چلے جا رہے تھے۔ فاصلہ کافی تھا۔ لہٰذا آپ تھک گئے تھے۔ چناں چہ میں نے اس بوجھ کے اُٹھانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے کہا: "یا امیر المومنین، میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ لائیے میں اسے اُٹھا کے چلوں۔"

اِس پر حضرت عمرؓ بولے "خدا کی قسم قیامت کے دن تم میرے ظلم اور جرم کا بوجھ نہیں اُٹھا سکو گے۔ اے عباس، جان لو کہ لوہے کے پہاڑ کا بوجھ اُٹھا لینا آسان ہے لیکن ظلم کا بوجھ اُٹھانا بہت مشکل ہے۔ خواہ وہ ظلم چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور خاص طور پر اِس بڑھیا کا جو کنکریاں اُبال کر اپنے بچّوں کو بہلا رہی ہے۔ اللہ کے نزدیک کیا اس سے بھی بڑا کوئی ظلم ہو سکتا ہے۔ اے عباس، جلدی چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو بچّے روتے روتے ہلکان ہو جائیں۔"

اب حضرت عمرؓ اور زیادہ تیز چلنے لگے۔ آپ تھک کے چور چور ہو چکے تھے کہ ہم بڑھیا کے خیمے تک پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے کندھے سے آٹے کی بوری اُتاری۔ میں نے گھی کا برتن سامنے رکھ دیا۔ حضرت عمرؓ آگے بڑھے۔ ہانڈی کے اندر جو کچھ تھا اُسے پھینک دیا اور ہانڈی کو دھو کر اُس میں گھی ڈالا۔ پھر آٹا گوندھنے لگے۔ چولھے پر جو نظر پڑی تو دیکھا کہ آگ بجھتی جا رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے بڑھیا سے پوچھا "کیا تمھارے پاس لکڑیاں ہیں؟" وہ بولی: "ہاں بیٹے ہیں۔ وہ رہیں۔"

حضرت عمرؓ اُٹھے اور لکڑیاں لے آئے۔ لیکن لکڑیاں گیلی تھیں۔ چناں چہ حضرت عمرؓ نے ہانڈی چولھے پر رکھ کر منھ نیچا کیا اور پھونکنے لگے تاکہ لکڑیاں آگ پکڑ لیں۔ خدا کی قسم میں نے دیکھا کہ چولھے سے نکلتا ہوا دھواں حضرت عمرؓ کی داڑھی کے اندر سے ہو کر گزر رہا ہے۔ آخر کار بڑی دیر کے بعد آگ سلگ گئی۔ گھی

پگھلنے لگا اور کڑکڑانے لگا۔ حضرت عمرؓ ایک لکڑی لے کر اُسے دیگچی میں چلانے لگے۔

بچے برابر چیختے جا رہے تھے اور رو رہے تھے۔ آخر کار کھانا تیار ہو گیا اور بچوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ تھوڑی دیر بعد بچے کھیلتے کھیلتے سو گئے۔

اب حضرت عمرؓ بڑھیا کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے "میں امیر المومنین کا قرابت دار ہوں۔ اُن سے تمھارا حال بیان کروں گا۔ لہٰذا تم سویرے اُن کے پاس پہنچ جانا۔ میں بھی وہاں ملوں گا۔ شاید خدا تمھارے لیے کوئی بہتری کی صورت پیدا کردے۔" یہ کہہ کر حضرت عمرؓ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں بھی ساتھ ساتھ تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: "اے عباس، جب میں نے دیکھا کہ بڑھیا کنکریاں اُبال کر بچوں کو بہلا رہی ہے تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے پہاڑ لرز رہے ہوں اور میری پیٹھ پر گر رہے ہوں۔ یہاں تک کہ میں اناج لایا اور اُن کے لیے کھانا پکایا۔ پھر وہ بچے پیٹ بھر کر خوش خوش کھیلتے کھیلتے سو گئے۔ اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے وہ پہاڑ میری پیٹھ سے اُتر گئے ہیں۔

پھر ہم دونوں حضرت عمرؓ کے گھر پہنچے۔ میں نے بھی رات کا بقیہ حصہ وہیں گزارا۔ جب صبح ہوئی تو وہ بڑھیا آئی۔ حضرت عمرؓ کو پہچان کر ڈر گئی۔ حضرت عمرؓ نے اُسے تسلّی دی اور بیت المال سے اُس کا اور اُس کے بچوں کا مستقل وظیفہ مقرر کر دیا جو پابندی سے ماہ بہ ماہ اُسے ملنے لگا۔

(بشکریہ نونہال کراچی)

محنت میں برکت ہے

* مولانا آزاد روزانہ صبح کو چار بجے اٹھتے تھے اور یہ عادت انھوں نے بچپن سے ہی اپنا رکھی تھی۔ بچپن میں نیند عام طور پر سوار رہتی ہے۔ مگر مولانا آزاد ہمیشہ اس سے لڑتے رہے وہ صبح کو اندھیرے منہ اٹھتے اور شمع دان جلا کر اپنا سبق یاد کرتے بہنوں سے منتیں کرتے کہ صبح کو آنکھ کھلے تو فوراً جگا دینا۔ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی دن بھر اداس رہتے اور افسوس کرتے۔

* ابراہیم لنکن کے والدین بے حد غریب تھے اسی وجہ سے وہ چراغ کا کام آگ سے لیا کرتے، کوئلے سے سیاہی کا اور پتھر سے سلیٹ کا کام لیتے تھے لیکن جب بڑے ہوئے تو اسی غریبی کی حالت میں ملک کا قانون پڑھا۔ صدر بننے سے پہلے کہیں تقریر کرنے جاتے تو پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتے آخر ترقی کرتے کرتے ایک دن امریکہ کے صدر بن گئے۔

* لال بہادر شاستری کی پیدائش ایک چھوٹے اور غریب خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے والد معمولی اسکول ماسٹر تھے۔ ایک بار شاستری جی اپنے دوستوں کے ساتھ گنگا پار کے میلے میں گئے، وہاں سے واپس لوٹنے کے لیے ان کے پاس کرایہ نہیں تھا، اس وجہ سے انھوں نے گنگا کو تیر کر پار کیا۔ بڑی محنت اور جدوجہد کر کے آخر ایک دن اتنے بڑے ملک ہندستان کے وزیر اعظم بنے۔

* ولیم کوبٹ کو انگریزی قواعد سیکھنے کی بہت زیادہ خواہش تھی وہ فوج میں معمولی سپاہی تھے وہ اس حد تک غریب تھے کہ ایک بار چار پیسے کھو جانے پر وہ رو پڑے تھے لیکن وہ اپنی دھن میں لگے رہے اور آخر ایک دن انھوں نے انگریزی قواعد کی معلومات حاصل کر لی اور اپنی محنت میں کامیاب ہوئے۔

* اٹلی کے "ٹان شا" کے باپ معمولی لوہار تھے ایک بار انھیں نیوٹن کی ایک کتاب کی ضرورت پڑی۔ غریب ہونے کی وجہ سے وہ اسے خرید نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست سے کتاب ادھار مانگی اور پوری کی پوری اپنے ہاتھ سے نقل کر لی اور اس طرح اپنا کام پورا کر لیا۔ یہ بچپن میں پھٹے پرانے کپڑے میں پیوند لگا کر کام چلاتے تھے اور یہ ترقی کرتے کرتے امریکہ کے "منسٹر" ہوئے۔

* شیکسپیر جو انگلستان کا مشہور ترین ڈراما نویس تھا، بچپن میں اون صاف کیا کرتا تھا۔

* کولمبس جس نے امریکہ دریافت کیا تھا، ایک غریب جولاہے کا بیٹا تھا۔

* ہنس اینڈرسن، جس نے انگریزی میں بہت سی سبق آموز کہانیاں لکھی ہیں، ایک موچی کا بیٹا تھا۔

* نپولین بوناپارٹ جو فرانس کا ممتاز شہنشاہ ہوا، فوج کا ایک معمولی سپاہی تھا۔

* لارڈ کلائیو ۱۸ سال کی عمر میں بنگال میں ایک معمولی کلرک تھا وہ ترقی اور محنت کر کے گورنر کے عہدے پر فائز ہو گیا اس کو "آرکاٹ کا بہادر" کے لقب سے نوازا گیا۔

* مسولینی جو اٹلی کا ڈکٹیٹر ہوا، یہ ایک غریب لوہار کا بیٹا تھا۔

* قطب الدین ایبک، جس نے قطب مینار کو مکمل کیا، نیشاپور کے قاضی اعظم کے ہاں غلام تھا۔

* ہولڈ شروع میں ایک بھکاری تھا، لیکن جان توڑ محنت نے اسے یورپ کا بہترین شاعر بنا دیا۔

* بیربل، اکبر بادشاہ کے دربار کا رتن، رسیاں بٹنے والا غلام تھا۔

شاہ نواز قطب الدین نداف

انصاف

آیئے ! آج میں آپ کو ایک سچّا تاریخی واقعہ سناؤں۔
آج سے تقریباً پچاس سال قبل فرانس کے صدر مقام پیرس میں جسے دنیا کی جنت کہا جاتا ہے ایک آرٹ گیلری کی نمائش میں پھلوں، پھولوں، جھاڑیوں اور زرعی پیداوار کی فصلوں کی نقاشی بڑے ہی اعلا پیمانے پر پیش کی گئی تھی۔ لاکھوں شایقین نے اسے سیکڑوں بار دیکھا اور ہر نقش و نگار کی بڑی تعریف کی۔
یہ نمایش مہینوں چلتی رہی اس نمایش میں ایک یکا و تنہا جوار کا پودا اس خوبصورتی کے ساتھ نقش کیا گیا تھا کہ اسے قدرتی سمجھ کر چھوٹی چھوٹی چڑیاں اس کے بھٹّے کے دانے کھانے کے لیے اس پر منہ مارا کرتی تھیں۔ یہ پودا حقیقت سے اس قدر قریب تھا اور اس قدر قدرتی معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں شایقین کے قدم یہاں رک جاتے تھے۔ انھیں یہ باور کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہ صرف آرٹ کا بہترین نمونہ ہے حقیقی پودا نہیں۔ آخر نمایش کے خاتمے کے دن ایک بہت بڑے مجمعے میں اس پودے کے فن کار کو اوّل درجے کے انعام سے نوازا گیا۔
اس کے بعد دوسرا اور تیسرا انعام بھی آرٹ کے مختلف نمونوں کو دیا گیا۔ لیکن جب اس انعام یافتہ شہ پارے پر تنقید کے لیے کہا گیا تو ایک نقاد نے صرف چند جملوں میں اس پر تنقید کی کہ سننے والے اس مُدلّل تنقید کو سن کر دنگ رہ گئے۔ اس نے اپنی تنقید میں کہا کہ یقیناً یہ فن کار کی بہترین کاوشوں میں فن کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ وہ بھی ایک ایسا عجیب نمونہ جس کو اصلی سمجھ کر اس پر پرندے منہ مارا کرتے تھے۔ لیکن انسان بہر حال انسان ہے۔ اُس نے اس کی ایک قدرتی خامی کو نظر انداز کر دیا۔

جناح چوک ٹلیک روڈ سکندر دی ۵۹۱۲۴۵

پودا بڑا ہی نازک تھا اُس کی پتّیاں بڑی پیاری تھیں۔ لیکن اس کے دانوں کا سرتاج ضرورت سے زیادہ بڑا تھا۔ یہ بھی فطری بات تھی۔ لیکن اس قدر نازک اور سُبک پودا اپنے دانوں کے سرتاج کی وجہ سے تھوڑا سا جھکا ہوا نہیں تھا۔ جو یقیناً غیر فطری اور غیر قدرتی تھا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے پرندے دھوکا کھا سکتے ہیں لیکن انسان نہیں۔
اس قدر صحیح تنقید کو سن کر شایقین کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے اور فن کار نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اسے بامقصد تنقید کہتے ہیں۔ یہ تنقید برائے تنقید نہیں ہے۔ یہ تنقید برائے زندگی ہے یا یوں کہیے کہ تنقید برائے فطرت ہے۔
بچو! ایسی صحیح پرکھ ہوتی تھی اُس زمانے میں، اور حق دار کو اُس کا صحیح حق ملا کرتا تھا۔

سلطان احمد ساحل

دُنیا کا قیمتی اور نایاب ڈاک ٹکٹ

کئی سال ہوئے جنوری کے آخری ہفتے میں (۲۵ جنوری سے ۳ فروری تک) دہلی میں ہوئی بین الاقوامی ڈاک ٹکٹ کی نمایش کے متعلق شاید بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ڈاک ٹکٹوں کی عظیم نمایش میں برٹش گویانا کا صرف ایک سینٹ کی قیمت کا ایک ایسا ڈاک ٹکٹ بھی نمایش کے لیے رکھا گیا جس کی قیمت آج دُنیا کے بازار میں ایک ملین ڈالر یعنی ۷۶ لاکھ روپیہ ہے یعنی اصل قیمت سے نو کروڑ گنا زیادہ۔

۱۸۵۶ء میں برٹش گویانا کے پوسٹ ماسٹر نے ڈاک ٹکٹوں کا اسٹاک ختم ہونے کی اطلاع ملتے ہی حکم دیا کہ نئے اسٹاک کے وقت پر نہ پہنچنے کی صورت میں کچھ ڈاک ٹکٹ مقامی طور پر چھاپ لیے جائیں اور جعلی ٹکٹوں کو روکنے کے لیے ڈاک حکام سے کہا گیا کہ وہ جاری کیے گئے ٹکٹوں پر اپنے دستخط کر دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اِس قسم کے تقریبًا ۵۰ ڈاک ٹکٹ چھاپے گئے۔

تقریبًا ۱۷ برس بعد ۱۸۷۳ء میں ایک ڈاک ٹکٹ سب سے پہلے برٹش گویانا کے ایک اسکول لڑکے کو ملا جو ڈاک ٹکٹ کا شوقین تھا۔ لیکن اُسے اس ڈاک ٹکٹ کی بناوٹ پسند نہیں آئی اور اُس نے ایک مقامی دوست کو ۹ شیلنگ میں فروخت کر دیا جو بذاتِ خود بھی ٹکٹوں میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ٹکٹ خریدنے والے دوست نے اُس ڈاک ٹکٹ کی خاصیت کو سمجھتے ہوئے چپ چاپ اپنے پاس محفوظ رکھ لیا۔ کچھ برسوں بعد اُس نے یہ ڈاک ٹکٹ لیورپول کے اسٹامپ ڈیلر تھامس ریڈ پاتھ کو پانچ سو ڈالر میں بیچ دیا۔ تھامس نے فوراً اُسے آسٹریلیا کے ایک شخص کاؤنٹ فلپ وان فریری کے ہاتھ فروخت کر دیا جو فرانس میں رہتا تھا۔ فریری کی موت ۱۹۱۷ء میں ہوئی اُس نے اُس ڈاک ٹکٹ کو اپنے ڈاک ٹکٹ کے البم کے ساتھ برلن ڈاک ٹکٹ میوزیم کے نام ودلعیت کر دیا۔ لیکن فرانس کی حکومت نے پہلی عالمگیر جنگ کے فوراً بعد فریری کو دشمن قرار دے دیا اور اُس کے ڈاک ٹکٹ البم کو ضبط کر لیا۔ اس کے بعد فرانسیسی حکومت نے ۱۹۲۳ء میں فریری ڈاک ٹکٹ البم کو نیلام کروا دیا۔ برٹش گویانا کے اُس خاص ڈاک ٹکٹ کو ۳۲٫۵۰۰ ڈالر میں امریکہ کے آرتھر ہند نے خرید لیا۔ آرتھر ہند کی موت کے بعد حسبِ دستور ٹکٹ پھر نیلام کیا گیا اور اس بار نیلامی میں وہ ٹکٹ ۴۲٫۰۰۰ ہزار ڈالر کی قیمت میں فروخت کیا گیا۔ تقریبًا تیس ۳۰ برسوں تک اس خریدار کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۹۷۰ء میں پھر اس ڈاک ٹکٹ کو نیلام کے لیے رکھا گیا تو اُس وقت اُس کے خریدار کا نام معلوم ہو گیا۔ یہ ایک آسٹریلین تھا جو فلوریڈا کے لاڈرڈیل میں رہتا تھا اور اس کا نام فریڈریک اسمال تھا۔ اِس مرتبہ نیلامی میں اس ڈاک ٹکٹ کی قیمت اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ سبھی حیرت زدہ رہ گئے۔ امریکہ کے ایک ڈاک ٹکٹ کے شوقین ڈنوپن بین بارگ نے اپنے ایک حصّہ دار کے لیے اس ٹکٹ کو ۲۸۰ ہزار ڈالر میں خریدا۔ مستقبل میں اس ڈاک ٹکٹ کے بیمہ کی قیمت ایک ملین ڈالر ہو گئی — جو ہندستانی رقم کے حساب سے تقریبًا ۷۶ لاکھ روپیہ ہوتی ہے۔ یہ ڈاک ٹکٹ نہ صرف اپنے روپ اور سائز کے لیے مشہور رہے بلکہ دُنیا کا سب سے مہنگا اور نایاب ڈاک ٹکٹ مانا جاتا ہے۔

ادھر ادھر سے

مظہر الاسلام سیکنڈری اسکول فراشخانہ

امروہہ، ۱۰ جنوری۔ انجمن سیرت النبی امروہہ کے زیر اہتمام ۵، ۶ جنوری کو منعقد ہوئے آل انڈیا تحریری و تقریری اور قرآن پاک کی تلاوت کے مقابلوں میں مظہر الاسلام سیکنڈری اسکول فراشخانہ دہلی کے طلبہ نے ۳ فرسٹ اور ۲ سیکنڈ انعام حاصل کیے۔ عشرت کفیل نے ایک مقابلے میں فرسٹ اور دوسرے مقابلے میں سیکنڈ انعام حاصل کیا ہے۔

تقریری مقابلے میں عشرت کفیل (ہائی اسکول گریڈ) فرسٹ، سید مسعود احمد زیدی (مڈل گریڈ) فرسٹ اور سید محمد شعیب زیدی (پرائمری گریڈ) نے سکنڈ انعام حاصل کیا۔

تحریری مقابلے میں عشرت کفیل (عام گریڈ) اور محمد ساجد صدیقی (ہائی اسکول گریڈ) نے فرسٹ انعام حاصل کیا۔

عشرت کفیل

جمہور ہائی اسکول مالیگاؤں

خدا کا شکر ہے کہ جمہور ہائی اسکول مالیگاؤں کے طالب علم شیخ بسم اللہ نے ڈسٹرکٹ سی اسپورٹس کے مقابلوں میں ۱۰۰ میٹر اور ۴۰۰ میٹر کی دوڑ میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ اسی طرح شیخ بسم اللہ نے تھالی پھینک مقابلے میں بھی سکنڈ پوزیشن حاصل کی اور اپنے اسکول اور شہر کا نام روشن کیا۔ جمہور ہائی اسکول کے ہی طالب علم شیخ سلیم کو والی بال کے مقابلے میں بہترین کھلاڑی منتخب کیا گیا تھا۔

بولنے والا ہاتھی:

ماسکو کے علاقہ قازقستان کے ایک چڑیا گھر میں ایک ۱۲ سالہ ہاتھی "بطاتر" نامی کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ بات کرنا چاہتا ہے اور بھونڈی مردانہ آواز میں یہ کہہ سکتا ہے کہ "میں بطاتر ہوں۔ بطاتر کو کوئی چیز پینے کے لیے دو۔" ہاتھیوں کے ایک ماہر دی گارگٹ کا کہنا ہے کہ یہ بات حیرت انگیز ہے۔

ایشیا کی سب سے بلند بلڈنگ:

کوریا میں ایک بیمہ کمپنی کی عمارت ایشیا کی سب سے بلند عمارت ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے ۲۵۰ میٹر ہے۔ جس میں ۶۰ منزلیں ہیں۔ دنیا کی اونچی عمارتوں میں اس کا ۱۲ واں نمبر ہے اور ایشیا میں پہلا۔

گوولکوٹ اردو اسکول میں جشن میلاد النبیؐ

گوولکوٹ چپلون: گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی جشن میلاد النبی مولانا عبید اللہ صاحب کی زیر صدارت منایا گیا۔ جلسے کا آغاز سلیم قاسم کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد اسکول کے طلبہ و طالبات نے سیرت النبیؐ کے موضوع پر تقریریں کیں بعد میں صدر جلسہ نے طلبہ و طالبات کو انعامات تقسیم کیے۔

انگوٹھی پر آیت الکرسی

پاک پٹن شریف: یہاں کے غلام مرتضیٰ طور نامی ایک زرگر نے چاندی کی ایک انگوٹھی پر مکمل آیت الکرسی لکھی ہے جسے فن کا بہترین نمونہ کہا جا رہا ہے۔ جس حصے پر آیت الکرسی لکھی گئی ہے وہ ۱۹ ملی میٹر لمبا اور ۱۵ ملی میٹر چوڑا ہے۔ اس انگوٹھی پر انہیں ایک ماہ چار دن مسلسل محنت کرنا پڑی اور چار سو روپے کی لاگت آئی۔

استاد (شاگرد سے) مرحوم کسے کہتے ہیں؟
شاگرد: مرہم بنانے والے کو۔

● آفتاب احمد، ڈوڈیکر پورہ (اے۔پی)

(استاد لڑکے سے) اکبر بادشاہ کو کس نے مارا؟
لڑکا: اللہ کی قسم میں نے نہیں مارا۔

● محمد فہیم (ناندورا)

لڑکا: (امی سے) امی کیا ہم لوگ مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔
امی ہاں کیوں؟
لڑکا: اگر مٹی کے ہیں تو پانی پینے سے کیچڑ نہ ہو جاتے۔

● نواب عتیق اطہر (اھدی)

سرکس کے پنجرے سے جب شیر بھاگ نکلا تو سرکس دیکھنے والوں میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ محفوظ جگہ کی تلاش کرنے لگے۔ ایک صاحب حاضر دماغی سے کام لے کر، شیر کے پنجرے میں گھس گئے اور اندر سے پنجرہ بند کر لیا۔

● محمد عبد الجلیل مومن پورہ

ایک گیدڑ نے دوسرے گیدڑوں کو خربوزہ کھانے کی دعوت اس طرح دی "دوستوں میں نے خربوزے کھانے کا پرمٹ حاصل کیا ہے تم کھیت پر ٹوٹ پڑو۔" یہ سن کر تمام گیدڑ کھیت پر ٹوٹ پڑے۔ شکاری کتوں کو جب دیکھا تو دوڑ پڑے۔ ایک نے لیڈر گیدڑ سے بھاگتے ہوئے کہا کہ "انھیں تم پرمٹ کیوں نہیں دکھا دیتے" (کتوں کو) گیدڑ نے کہا "تیز بھاگو کم بخت یہ کتے ان پڑھ ہیں"

نام: عبدالعزیز دین محمد انصاری عمر: ۱۴ سال
مشغلہ: کرکٹ کھیلنا، ادبی کتابوں کا مطالعہ کرنا
پتا: بیت کی چال نمبر ۲ روم نمبر ۵ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

نام: محمد توثیق دیوان عمر ۱۴ سال
مشغلہ: پیام تعلیم پڑھنا، فٹ بال کھیلنا۔ خط کے جواب دینا۔
پتا: شیخ چھوٹو مستری محلہ بارا بھائی گھرنمبر ۲
ضلع۔ ایوت محل (مہاراشٹر)

نام: سلیم صدیقی
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا، نماز پڑھنا،
محلہ رادھا کرشن، خورجہ پن کوڈ ۲۰۳۱۳۱ (یوپی) بھارت

نام: توحیدہ خاتون (لاڈلی) عمر: ۱۲ سال
مشغلہ: دینی کتب کا مطالعہ کرنا، قلمی دوستی کرنا،
پتا: معرفت غیاث الدین تاج پتیانہ محلہ کلٹی ضلع بردوان

نام: تنویر احمد
مشغلہ: رسائل پڑھنا، قلمی دوستی کرنا۔
پتا: مکان ۵۶۵ محلہ کچہ کوٹ، مالیر کوٹلہ ۱۴۸۰۲۳

شگفتہ جاوید عمر ۸ سال
مشغلہ: نماز پڑھنا۔ پیام تعلیم پڑھنا۔ امی کا ہاتھ بٹانا۔
پتا: ۱۸۴/۴۵ لکڑ خندق ڈالی گنج لکھنؤ۔

نام: ابو طارق عمر: ۸ سال
مشغلہ: پیام تعلیم پڑھنا، نماز پڑھنا، اسکول جانا۔
پتا: لوہرسن بازار۔ لوہرسن بستی۔ (یوپی)

سائنسی ایجادات

برار مسلم ایجوکیشن کانفرنس امراوتی کے زیرِ اہتمام، مباحثہ "سائنس امن وسکون کی دوست یا دشمن" ضلع پریشد پرائمری اسکول ایوت محل میں منعقد کیا گیا تھا۔ ۱۵ اسکولوں کے طلباء نے دو دو کے گروپ نے حصّہ لیا۔ وسنت راؤ نائک اردو ہائی سکول کل گاؤں ضلع ایوت محل کے جانب سے دونوں بھائیوں نے حصّہ لیا۔

(۱) سلیم احمد خاں اسد اللہ خاں درجہ ہفتم (موافقت)
(۲) نظیر احمد خاں اسد اللہ خاں درجہ ششم (مخالفت) نے مقابلے میں تیسرا نمبر حاصل کیا۔

سائنسی ایجادات دوست

جنابِ صدر، حاضرین جلسہ میرے پیارے بھائیو اور بہنو میں آپ کو "سائنسی ایجادات ہمارے امن وسکون کے دشمن نہیں ہیں" پر میں کچھ سناؤں گا۔ امید ہے کہ آپ غور سے سنیں گے۔

میرے ساتھیوں نے کئی بار ثابت کیا ہے کہ انسانی ترقی کے مدارج سائنسی ایجادات کے مرہونِ منت ہیں۔ اس کا مطلب تو یہی ہوگا کہ سائنسی ایجادات ہمارے امن وسکون کے دشمن نہیں ہیں۔ اس پر بھی اگر آپ ماننے کو تیار نہیں ہیں تو آیئے سائنسی ایجادات کا مختصر جائزہ لیں۔

انسانی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ اس کی ترقی کی ابتدا ہی سائنس ہے۔ اسی ہتھیار نے انسان کو تہذیب دی، اس کے تمدن کو اُجلایا اور اس کی معاشرت کو بامِ فلک تک پہنچایا۔ چاند ستاروں کی سیر کرائی۔ آسمانوں کے رازوں کو افشا کرایا۔

دیکھیے سائنسی ایجادات ہماری کس طرح دوست ہیں آپ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کے اثرات سنے لیکن یہ معلوم بھی ہے کہ سائنس دانوں نے ایٹم بم کے بنانے کا فارمولا کس لیے بنایا تھا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ انسانی زندگی کو امن وسکون ملے۔ اس ایٹم بم سے وہ بجلی کی پیداوار میں مزید اضافہ کرکے فراوانی پیدا کرے۔ اناج کی پیداوار میں اضافہ ہو اور اہم مقاصد اس کی ایجاد کے تھے۔

لیکن انسانوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور دنیا پر اپنی دھاک جمانے کے لیے ہیروشیما اور ناگاساکی پر استعمال کرلیا۔ قصور سائنس کی ایجاد کا نہیں ہوا۔ بلکہ استعمال کرنے والوں کا تھا۔ اگر درست استعمال کیا جاتا تو نتیجہ اچھا انسانوں کو ہی ملتا۔ اب بتایئے کہ کیا یہ ایجادات ہماری دشمن ہیں — جواب ہوگا نہیں۔

میری آواز آپ کے سامنے ہے بتایئے میری آواز آپ تک پہنچ رہی ہے یا نہیں۔ آپ کا جواب ہوگا ہاں۔ یہ بھی سائنس کی ایجاد کا ایک معمولی کرشمہ ہے۔ آج کل آپ گھر بیٹھے تقریر کرنے والے کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے ذریعے بتایئے کیا آپ کو پسند نہیں کہ آپ دونوں چیزیں ایک جگہ دیکھ سکیں۔

ٹیلی فون اور ٹیلی گرام کا نام آپ نے سنا ہے۔ آپ ہزاروں میل کے کسی رشتہ دار سے بات کر سکتے ہیں۔ اسے بری خبر دے سکتے ہیں گھنٹوں اور مہینوں کی بات لمحوں میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ یہ سب آسانیاں انسان کو کس نے دیں؟ پتا چلے گا کہ سائنسی ایجادات کا کرشمہ ہے۔

قدیم زمانے میں انسان پیدل سفر کرتے تھے۔ اس سفر میں لوٹے جانے، جنگلی جانوروں سے مارے جانے کا ڈر تھا۔ لیکن سائنسی ایجادات نے انسان کے لیے سہولتیں فراہم کر دیں ریل بنی اور موٹر بنی اور اس سے بھی سوا ہوائی جہاز بنے۔ مہینوں اور گھنٹوں کا سفر لمحوں میں طے ہو سکتا ہے۔

میں جو بات آپ کے سامنے کر رہا ہوں۔ اگر اس آواز کو ٹیپ کر لیا جائے تو یہ آواز آنے والی نسلوں تک پہنچتی رہے گی۔ یہ سب آسانیاں اور سہولتیں انسان کو کس نے دیں۔ پتا چلے گا سائنسی ایجادات نے۔ پھر کیا یہ ایجادات ہمارے امن وسکون کے دشمن ہیں۔

● سلیم احمد خاں درجہ ہفتم

سائنسی ایجادات دشمن

میں آپ سے "سائنسی ایجادات امن وسکون کی دشمن ہیں" اس عنوان پر کچھ کہوں گا۔ امید ہے کہ آپ غور وفکر سے سنیں گے اور یہ فیصلہ دیں گے کہ واقعی دشمن ہیں یا نہیں ہیں۔ دنیا کی ترقی کا مدار سائنس پر ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے۔ اور یہ کسی حد تک درست بھی ہے۔ انسانی ترقی کے مدارج پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ترقی کے مدارج سائنسی ایجادات کے مرہون منت ہیں۔ لیکن ان ایجادات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جہاں سائنس نے ترقی کی ہے وہیں تنزل کے غار میں انسان کو اتار دیا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال دے رہا ہوں الیکٹرک (بجلی) آج کل ہر گھر کے لیے ضرورت بن گئی ہے جو گھر کو روشن بنا دیتی ہے۔ لیکن ذرا سی غلطی اس گھر کے افراد کی زندگی کی روشنی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل کر دیتی ہے۔ ہزاروں واقعات پڑھے اور سننے کو ملتے ہیں کہ فلاں شخص کی موت بجلی کے کرنٹ لگ جانے سے ہوئی۔

گیس کے چولہے بھی سائنس کی ایجاد میں سے ایک ہیں یہ ضرور ہے کہ کھانا پکانے میں وقت نہیں لگتا، فوراً تیار ہو جاتا ہے لیکن اگر ڈسپوٹ ہو جاتے تو کھانے والوں کا لقمہ بنا لیتا ہے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ تو چھوٹے پیمانے کی ایجادات کا ذکر ہوا۔ اگر وسیع پیمانے پر غور کریں تو جنگ عظیم دوم کا مطالعہ از بس کافی ہے کہ سائنسی ایجادات ہمارے امن وسکون کی واقعی دشمن ہیں کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں ایٹم بم سائنس کی ایجادات کا شاہکار تھا۔ یعنی انسان کی ترقی کی معراج تھی۔ لیکن اس معراج نے کیا کیا؟ یہ تو ہیروشیما اور ناگاساکی جاکر ہی پتا چلے گا کہ یہ کس قسم کی ایجاد تھی جس نے ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی ہنستی بولتی زندگیوں کو لمحہ بھر میں لقمۂ اجل بنا دیا اور جو بچ رہے ان کا حال ایسا ہے کہ تصور کو پر لگ جائیں تو آج کے سائنس زدہ انسان کی پہنچ سے باہر ہے۔ کہا جاتا ہے ان دونوں مقامات میں ہری گھاس نہیں اگ سکتی اور جو جاندار زندہ بچ گئے ہیں وہ بے حس گوشت کا لوتھڑا رہ گئے ہیں۔ اور اب جو بچے وہاں پیدا ہو رہے ہیں وہ عجیب وغریب شکل وشباہت رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ اثرات کب تک وہاں کے لوگوں پر اثر انداز رہیں گے۔ کیا یہ ایجادات ہمارے امن وسکون کے دشمن نہیں ہیں

اگر اس پر بھی ہماری تشفی نہ ہو پائی ہو تو آئیے اور دیکھیے کہ ان ایجادات کے کیا کیا اثرات ہماری زندگی کے دشمن بنتے جا رہے ہیں۔

ہوائے بسیط کا مطالعہ سائنس دانوں نے خود ہی کیا جو خود ہی سائنسی ایجادات کے بانی ہیں۔ ان ہی کی رپورٹ کے مطابق کہا گیا ہے کہ سائنس کے مہلک ایجادات اور تجربات کی وجہ سے فضا آلودہ ہو چکی ہے۔ جس کی وجہ سے انسانی زندگی ہزاروں قسم کے امراض سے دوچار ہے۔

اور اب سائنس کے پاس ان امراض کا علاج اس لیے نہیں ہے کہ فضا ہی آلودگی سے دوچار ہے۔ کیا یہ انسانی زندگی کے امن وسکون سے دوستی ہے۔ اگر یہی دوستی ہے تو ایسی دوستی کو ہزاروں سلام۔

● نظیر احمد خاں درجہ ہفتم

رحم کا پھل

انوار کے باپ انوار کے بچپن میں ہی اس دنیا سے چل بسے تھے۔ اس کی ماں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے لڑکے کا پیٹ پالتی تھی۔ انوار بچپن سے ہی رحم دل اور خوش اخلاق تھا وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بہت ہی محبت سے پیش آتا تھا۔ جب انوار پندرہ سال کا ہوا تو اپنی ماں کا سہارا بن گیا۔ وہ روز صبح سویرے اٹھتا اور جنگل جاتا تھا اور شام کے وقت لکڑیاں لے کر گھر آتا اس کی ماں انھیں بیچ کر چاول اور دوسری چیزیں خرید لاتی۔ وہ جنگل جاتے وقت اپنے ساتھ روٹی لے جاتا اور دوپہر کو روٹی کھا کر پانی پیتا اور پھر سے کام میں لگ جاتا۔

ایک روز ہمیشہ کی طرح انوار جنگل گیا کچھ لکڑیاں کاٹ کر بیٹھ گیا بیٹھتے ہی آنکھ لگ گئی وہ نیند سے بیدار ہو کر جب کھانے بیٹھا اتنے میں جھاڑی سے ایک بوڑھا آدمی باہر نکلا اور انوار کے پاس آکر کہنے لگا "بیٹا مجھے بے حد بھوک لگی ہے مجھے بھی تھوڑی سی روٹی دے دو خدا تیرا بھلا کرے گا۔" بوڑھے کی بات سن کر انوار کو اس بوڑھے پر رحم آ گیا اس نے روٹی اور چٹنی اس بوڑھے کو دے دی۔ بوڑھا روٹی کھا کر بہت خوش ہوا۔ جاتے وقت اس بوڑھے نے انوار سے کہا "بیٹا تو اب جو درخت کاٹے گا اس میں تجھے ایک چیز ملے گی اور تو امیر ہو جائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ بوڑھا وہاں سے چلا گیا وہ ایک سوکھا پیڑ کاٹ رہا تھا کہ اتنے میں اس کو درخت کی کھوہ میں ایک ہار نظر آیا۔ انوار نے ہار باہر نکال کر دیکھا تو وہ اصلی ہیروں کا تھا۔

انوار وہ ہار لے کر سیدھا گھر آیا اور ہار بیچ کر وہ ایک بڑا امیر آدمی بن گیا۔ اس نے اپنے لیے ایک گھر بنوایا اور گاؤں میں ایک مسجد بھی۔ پھر اسی گاؤں میں وہ اپنی والدہ کے ساتھ خوشی سے رہنے لگا۔

● سید قمر العارفین رضوی
(ہسپورہ۔ ضلع اورنگ آباد)

ہمیشہ سچ بولو

بچو! آپ نے گیارہویں شریف کی نیاز ضرور دیکھی ہوگی۔ غوثِ پاک کا نام بھی سنا ہوگا۔ آپ بغداد میں رہتے تھے۔ پوری دنیا کے مسلمان آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ کے بچپن کا ایک واقعہ سنیے!

غوثِ پاک کی عمر ابھی دس سال کی تھی۔ آپ کی اماں جی نے آپ کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا اور چلتے وقت فرمایا کہ ہمیشہ سچ بولنا۔ آپ کو ایک قافلہ کے ساتھ کر دیا۔ خرچ کے لیے چالیس دینار آپ کے کرتہ کی بغل میں سی دیے۔ قافلہ روانہ ہوا۔ چلتے چلتے ایک جنگل سے گزرنا پڑا۔ اس جنگل میں ڈاکوؤں کا اڈا تھا۔ ڈاکوؤں نے قافلہ پر حملہ کر دیا۔ سب مال اسباب اور دولت لوٹ لی۔ قافلہ والوں کو گرفتار کر لیا۔ ایک ڈاکو آپ کے پاس بھی آیا اور پوچھا "میاں لڑکے تمھارے پاس بھی کچھ روپیہ ہے؟" آپ نے فرمایا "ہاں ہے"۔ "چالیس دینار"۔ ڈاکو ہنسا اس کو یقین نہیں آیا۔ چالیس دینار۔ اس وقت کے حساب سے بڑی رقم تھی۔ اور چلا گیا۔ اور اپنے سردار سے کہا کہ سردار سردار! ایک لڑکا ہے اور کہتا ہے۔ اس کے پاس چالیس دینار ہیں۔ سردار نے آپ کو بلایا اور پوچھا "میاں لڑکے تمھارے پاس کتنی رقم ہے؟" آپ نے فرمایا "چالیس دینار" پوچھا "کہاں ہیں؟" آپ نے فرمایا "میرے کرتے کے بغل میں سلے ہوئے ہیں" دیکھا تو واقعی چالیس دینار سلے ہوئے تھے۔ سردار اور تمام ڈاکو حیرت میں پڑ گئے۔ بولے تمھاری رقم تو چھپی ہوئی تھی تم نے ہم کو کیوں بتا دی۔ آپ نے

فرمایا چلتے وقت میری ماں نے نصیحت کی تھی کہ بیٹا! ہمیشہ
سچ بولنا۔ پھر میں کیونکر جھوٹ بولتا۔" اس بات سے
ڈاکوؤں کے سردار پر بڑا اثر پڑا۔ اور بولا۔ "تم اتنے کم عمر
بچے ہو اور تم کو اپنی ماں کی بات کا اتنا پاس ہے کہ اپنی رقم جانے
کا بھی خیال نہ کیا۔ اور ہم خدا اور اس کے رسول کی باتوں کو
تو بھلا کر برے کاموں میں پھنسے ہوئے ہیں"۔ فوراً لوٹ
کا مال واپس کیا اور آئندہ سے برے کاموں سے توبہ کر لی
اور ہمیشہ کے لیے نیک ہو گیا۔

● محمد امین (بمبئی)

لالچ کا بدلہ

رام پور گاؤں میں رامو نام کا ایک غریب کسان تھا
اس کے پاس بہت تھوڑی سی زمین تھی۔ جس پر کسی طرح
سے وہ اپنی گزر اوقات کر لیا کرتا تھا۔ گھر میں دو بچے
تھے۔ بڑی ہنسی خوشی سے زندگی گزار رہے تھے۔ اچانک
ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ گاؤں کے تمام لوگ پریشان
ہو گئے۔ جن کے پاس زیادہ غلہ موجود تھا وہ زیادہ داموں
سے فروخت کر کے نفع کمانے لگے تھے۔ رامو بیچارہ بہت
پریشان ہو گیا۔ اس کے گھر کا تمام اناج اور اثاثہ ختم
ہو گیا تھا۔ صرف ایک گائے کا بچہ رہ گیا تھا۔ اس نے
سوچا چلو اسے فروخت کر دیں گے تاکہ کچھ دنوں کا گزارا
ہو جائے۔ رامو بیچارہ بڑا ہی نیک آدمی تھا۔ سب گاؤں
والے اس کی عزت کرتے تھے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا
کہ اس کے پاس ایک گائے کا بچہ ہی رہ گیا ہے اور وہ
اسے فروخت کرنا چاہتا ہے تو سب لوگوں کو افسوس ہوا۔
وہ گائے کا بچہ لے کر جب بازار جا رہا تھا تو راستے میں
اسے ایک بوڑھا ملا۔ اس نے رامو کے حالات سنے۔
اور پھر ایک طلسماتی عصا جسے دکھا کر کہا "اسے لے جاؤ
اور اسے زمین پر رگڑنا۔ دو آدمی نمودار ہوں گے۔ ان سے
کہنا کہ اپنا کام کرو۔ وہ تمہاری خدمت کریں گے۔ رامو
عصا لے کر جلدی جلدی گھر آیا اور زمین پر رگڑنے لگا۔
تھوڑی ہی دیر میں دو مضبوط جسم والے نوجوان نمودار ہوئے۔
اور ادب سے کھڑے ہو گئے۔ رامو نے کہا "جاؤ اپنا کام کرو"
انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رامو کے
گھر کی حالت بدل گئی۔ اور سونے چاندی کے برتنوں میں
کھانا انھوں نے اس کے سامنے پیش کیا اور پھر غائب
ہو گئے۔ رامو خوشی سے اپنا گزارا کرنے لگا۔

گاؤں والے اس کی اس تبدیلی کو دیکھ کر بہت خوش
ہوئے مگر گاؤں کے زمین دار کو بڑی جلن ہوئی۔ اس نے
رامو کو بلایا اور تمام حال سنا۔ اس نے رامو پر دباؤ ڈال کر
کہا۔ کہ وہ عصا مجھے دے دو ورنہ میں تمھیں جان سے مار
ڈالوں گا۔ ڈر کے مارے رامو نے عصا اسے دے دیا۔
کچھ دنوں کے بعد پھر رامو غریب ہو گیا۔ اس کی حالت پھر
خراب ہو گئی۔ آخر میں پھر اس کے پاس ایک گائے کا بچہ
رہ گیا۔ اسے فروخت کرنے کے لئے بازار جانے لگا دوبارہ
اسے وہ بوڑھا ملا۔ رامو نے اسے تمام باتیں سنائیں تو اس
نے دوبارہ اسے ایک دوسرا عصا دیا۔ رامو اپنے گھر
جانے لگا تھا کہ راستے میں اسے زمین دار مل گیا۔ رامو
کے ہاتھ میں دوسرا عصا دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
اس نے رامو سے وہ عصا بھی چھین لیا اور زمین پر رگڑنے
لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس میں سے دو شیطان نکلے اور
زمین دار کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ زمین پر بے ہوش ہو گیا۔
دونوں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی اور پہلا عصا رامو کے
حوالے کر کے غائب ہو گئے۔ رامو خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ
آیا۔ آج بھی وہ گاؤں کا سب سے امیر آدمی ہے۔

● عارف احمد عثمانی۔ جام نیر

شوق

مجھ میں اور رفیق میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ہم دونوں
ایک ساتھ ہی اسکول جاتے ساتھ ہی کھیلتے کودتے اور کبھی کبھی یوں
ہی کسی بات پر ایک آدھ گھونسوں کا تبادلہ بھی کر لیتے۔
ہمیں کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ خاص

کو سیّاحوں اور مہم جوؤں کی سمندری سفر کی کہانیاں ـــ
ہمارے پاس بہت سی ایسی کتابیں تھیں جن میں سیّاحوں
کی سمندری سفر کی حیرت انگیز اور دلچسپ کہانیاں تھیں
ان کتابوں کو ہم اپنے نصاب کی کتابوں میں چھپا کر اسکول
بھی لے جاتے اور ماسٹر صاحب کی نظروں سے بچا کر پڑھا کرتے
تھے۔ (یہ اور بات ہے کہ ان کتابوں کی بدولت
ہم دونوں ایک بار امتحان میں فیل بھی ہو چکے ہیں) ان
کہانیوں کو پڑھ کر ہمارے دلوں میں بھی سمندری سفر سے
لطف اندوز ہونے کا شوق پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ یہ
شوق بھوت بن کر ہمارے سروں پر سوار ہو گیا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں اور فیض سفر کے
متعلق باتیں کرتے ہوتے اپنے باغ میں چلے آتے اور
ایک درخت کے نیچے گھاس پر لیٹ گئے۔ موسم خوشگوار
تھا اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اسی لیے جلدی فیض
کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن میں اپنے خیالوں میں مگن تھا۔

سفر کے متعلق ہم نے سارا انتظام مکمل کر لیا تھا۔
اب ہمیں اس دن کا شدّت سے انتظار تھا جب ہمیں جہاز
پر سوار ہونا تھا۔

خدا خدا کرکے وہ دن آگیا۔ ہم اور فیض جہاز پر
سوار ہو گئے۔ ہمارا جہاز سمندر کے سینے پر تیرنے لگا۔ اب
ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش
تھا۔

لیکن ہمارا جہاز ابھی تھوڑی دور ہی چلا ہوگا کہ یکایک
آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے۔ چاروں طرف اندھیرا
چھا گیا۔ جہاز کے مسافر بدحواس ہو کر ادھر ادھر دوڑنے
لگے۔ بادبان اتارے جانے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں طوفان
نے ہمیں آگھیرا۔ سمندر بھی بپھرا ہوا نظر آنے لگا۔ جہاز
ہچکولے کھانے لگا۔ سمندر کی موجوں نے اسے ادھر ادھر
دھکیلنا شروع کر دیا۔ ہماری حالت غیر ہو رہی تھی ـــ
اچانک جہاز کو ایک زبردست دھکا لگا۔ سبھی مسافر گر پڑے۔
جہاز ایک سمندری چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ چکا تھا۔ سبھی
مسافر ڈوبنے لگے۔ خوش قسمتی سے جہاز کا ایک ٹوٹا ہوا تختہ
میرے ہاتھ آگیا۔ میں نے تختے کو مضبوطی سے پکڑ لیا کیونکہ
اس کے سہارے میں زندہ ساحل پر پہنچ سکتا تھا۔ سمندر
کی طوفانی موجیں مجھے تیزی سے بہائے لیے جا رہی تھیں کہ
دفعتاً میرا سر ایک سمندری چٹان سے ٹکرا گیا۔

ایک بھیانک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی ـــ
میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے فیض بیٹھا اپنی گردن
سہلا رہا تھا اور غصّے سے مجھے گھور رہا تھا۔

ـــ "تم نیند میں میرا گلا کیوں دبا رہے تھے؟" اس نے
اپنی گردن سہلاتے ہوئے غصّے سے کہا۔

مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی اور ہنسی بھی آرہی تھی۔
میں نے اپنے خواب کا واقعہ سنا دیا۔

بات یہ تھی کہ میں خواب میں جس چیز کو جہاز کا
تختہ سمجھ کر مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا وہ دراصل
ہمارے فیض کی گردن تھی۔ اس نے نیند میں جب اپنی
گردن پر دباؤ محسوس کیا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ پھر اس
نے میرے ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش۔ چونکہ
میں نے اس کی گردن کو پوری قوت سے پکڑ رکھا تھا۔
اس لیے وہ چھڑا نہیں پایا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں کسی
صورت سے اس کی گردن نہیں چھوڑ رہا ہوں تو اس نے
ایک گھونسا میری کنپٹی پر مارا اور ـــ ایک بھیانک چیخ کے
ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔

فیض کی سمجھ میں پوری بات آگئی تھی۔ اس کا غصّہ
مسکراہٹ میں بدل گیا تھا۔

ـــ "چلو اب گھر چلتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے
کہا اور ہم لوگ باغ سے باہر آگئے۔

سہیل ارشد
۱۲/۸ کولونی، انڈال ضلع بردوان (مغربی بنگال)

پیامی ادبی معما نمبر ۲ کا شاندار نتیجہ

بمبئی اور مالیگاؤں کے پیامیوں نے کمپائلر کو شکست دے دی

صحیح حل (۱) کتاب کا نام۔ جن حسن عبدالرحمٰن (حصہ اوّل) صفحہ نمبر ۱۰۹

۲۔ سوچ " آؤ ڈراما کریں " ۲۲
۳۔ خوفناک " میاں ڈھینچوں کے بچے " ۱۱
۴۔ مزاج " جوہر قابل " ۳۵
۵۔ موٹے " بی مینڈکی اور کوا " ۲۳
۶۔ کھنچاؤ " گاندھی بابا کی کہانی " ۱۸
۷۔ قابل " مچھرا اور اس کی بیوی " ۳۷

صحیح حل: پہلا انعام پانے والے ۳ خوش نصیب پیامی۔ فی کس بیس روپے تقسیم کیے گئے

۱۔ برجیس قدر۔ HE/WR-291-گراؤنڈ فلور، بہرام نگر روڈ باندرا ایسٹ بمبئی ۵۱

۲۔ ایم، ایس، انصاری۔ معرفت اطفال بک ڈپو۔ ۱۴۱ محمد علی روڈ۔ مالیگاؤں (ناسک)

۳۔ نیاز سلطان پوری، سکریٹری عوامی اردو لائبریری۔ بھٹی چرولی۔ کٹیا والی، سلطان پور

ایک غلطی: دوسرا انعام پانے والے چھ خوش نصیب پیامی فی کس سات روپے تقسیم کیے گئے

(۱) جلیس احسن، بمبئی ۵۱ (۲) صابرہ شیخ، بمبئی ۵۱ (۳) ایف، ڈی انصاری مالیگاؤں (۴) ملک عنبر ہمدانی، مالیگاؤں (۵) گل صنوبر، مالیگاؤں۔ (۶) امتیاز احمد انصاری، سلطان پوری۔

نوٹ: یاد رکھیے ایسے حل مقابلے میں شریک نہیں کیے جا سکیں گے جن کے ساتھ "ٹوکن" نہیں ہوگا۔
۲۔ جس لفافے میں معما روانہ کریں اس میں مضمون وغیرہ ہرگز نہ رکھیں۔ معمے کے لفافے مقررہ تاریخ کو ہی کھولے جاتے ہیں۔
۳۔ ٹوکن کے علاوہ اپنا پورا پتا صاف صاف علاحدہ کاغذ پر بھی لکھیں اور اگر ممکن ہو تو انگریزی میں بھی لکھیے۔

پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 4

دفتر پیام تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ
20 مارچ ۱۹۸۴ء

ایک سَو روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ کچھ نہیں. آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں. لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

پہلا انعام : بالکل صحیح حل پر مبلغ ساٹھ روپے۔ دوسرا انعام : ایک غلطی والے حل پر مبلغ چالیس روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبروار لکھیے

1 - اس نے، اس کی گردن سے رسّی کا پھندہ —— کیا. (الگ / دُور)
2 - خرگوش اور بہت سے —— اس کے دوست ہو گئے تھے. (چرند / پرند)
3 - ان خوبیوں کے علاوہ —— ایک صاف ستھرا اخبار بھی تھا. (الہلال / اجمل / ادیب / ہمدرد)
4 - ابھی آپ نے اصلی —— کہاں دیکھی ہے. (محبت / مروّت / مصیبت)
5 - کہیں نزدیک ہی ایک خونخوار —— رہتا تھا. (درندہ / شیر)
6 - دیو نے اِسے —— سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا (پیار / غصہ)
7 - ایک بہن —— ہوئی اس کے پاس گئیں (گھبرائی / بڑ بڑاتی)
8 - —— سونگھنے والی اسکیم بے طرح فیل ہو گئی (پھول / عطر / جوتے)

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں. صحیح جواب صفحہ 23 کی کتابوں میں ہی ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا : (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں. البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے. (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے. مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے. (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا. (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا. بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی. (۵) معمے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا.

ٹوکن پیامی ادبی معمّا نمبر 4

میں اڈیٹر پیام تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام ....

پتا ....

(اپنے حل اس پتے پر بھیجیے)

پیامی ادبی معمّا نمبر 4 ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

بیس نکات کا
پیغام یہ ہے
کہ مُلک صحت مند
اور تعلیم یافتہ ہو۔
83/407

یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی
ہو چکے ہیں۔
قیمت : ۲/۲۵
گاندھی باباکی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی
کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز
پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت: ۲/۰۰
اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن
صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے،
یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار
کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت
بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ
بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت : ۲/۰۰
جب اور اب
(آصف مجیب)
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال پہلے کی
باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔
عصمت چغتائی
بلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی
ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان
قیمت ۳/-
ترجمہ:
قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمٰن
الٰہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی، لیکن اب تو
اُس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال
ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی
قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اوّل ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(سیفی پریمی)
کہاوت اور کہانی
روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور
کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے
کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت: ۲/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا
بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں
سرکس کی ڈھیر ساری تصویریں بنی ہیں
جن میں بچے شوق سے رنگ
بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰
دہلی
بمبئی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd. No. D(SE)-043 February, 1984
PAYAM-I-TALEEM
NEW DELHI-110025

بچوں کی مذہبی کتابیں

ہمارا دین (اول، دوم، سوم)	سید شہاب الدین دسنوی (فی حصہ)	۶/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول دوم)	عبدالواحد سندھی (فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امیر البحر	" "	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اول، دوم)	" " (فی حصہ)	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	" "	۳/۰۰
اسلام کیسے شروع ہوا؟	" "	۴/۵۰
رسولؐ پاک	" "	۳/۵۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۳/۰۰
رسولؐ پاک کے اخلاق	" "	۳/۰
اللہ کے خلیل	" "	۲/۵۰
تحسین القرآن	تالیف۔ خدیجہ سید طاہر سیف الدین	۴/۵۰
مصباح القرآن	" "	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
عقائد اسلام	" "	۱/۵۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
آں حضرت	" "	۱/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحی فاروقی	۳/۷۵
نبیوں کے قصے	" "	۲/۲۵
ہمارے رسولؐ	" "	۳/۰۰
مسلمان ...	اعجاز الحق قدوسی	۳/۰۰
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی	۱/۵۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان	۳/۰۰

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

پیام تعلیم

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی ۲۵

مارچ ۱۹۸۴ء | جلد: ۲۱ | شمارہ ۳

ایڈیٹر : ولی شاہجہانپوری

قیمت: ۲/۵۰ روپے / سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

ہمیں افسوس ہے کہ راقم الحروف کی علالت کی وجہ سے یہ شمارہ آپ تک وقت پر نہ پہنچ سکا اور آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر قنبر احمد رضوی کا دلچسپ مضمون سفید ریگستان کی قسط بھی اس بار شائع نہ ہو سکی۔ اس کے لیے میں آپ سے اور قنبر صاحب سے معذرت کا طالب ہوں۔

ہمیں اعتراف ہے کہ اس شمارے کی ترتیب میں بھی آپ کو خامیاں نظر آ سکتی ہیں اس کی وجہ بھی میری علالت ہی ہے۔

"آدھی ملاقات" کا صفحہ بھی اس بار غائب ہے لیکن اس کے ذمہ دار تو آپ ہی لوگ ہیں معلوم نہیں کہ آپ لوگ اتنے بخل سے کیوں کام لیتے ہیں۔ حالانکہ اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے مضمون نگار کی ہمت افزائی ہوتی ہے اس سے پڑھنے والوں کی پسند یا ناپسند کا پتا چلتا ہے۔ دوسرے پڑھنے والوں کو آپکے خیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ کرتے رہیں

اس شمارے میں مرزا ادیب کی کہانی "آپ کون ہیں" رئیس احمد صدیقی کا سوانحی مضمون "بچوں کے نیر صاحب" اسد علی صاحب کا خود کفالتی کی جیت اور رحمٰن حمیدی صاحب کا لالچ کا انجام آپ کو پسند آئے گا۔ نظموں میں ناوک حمزہ پوری کا "گنگا کا پیغام" اور قاضی انصار کی "روشنی" بھی پڑھنے کے لائق ہے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

بچوں کی ممتاز ادیبہ

بیگم آصفہ مجیب

Shakil

مصوّر: شکیل اعجاز

جناب مرزا ادیب

آپ کون ہیں

یوسف ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ہونہار، محنتی اور کم گو لڑکا۔ ہر کام وقت پر کرنے کا عادی۔ گرمیوں میں صبح سویرے جاگ کر اسکول جانے کی تیاری کرتا تھا اور سردیوں میں اس وقت اپنی کلاس میں پہنچ جاتا تھا جب اس کے سوا اور کوئی لڑکا وہاں نہیں ہوتا تھا۔ اس کا اسکول گھر سے ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اسکول جاتے ہوئے وہ کبھی کبھی ایک کمبل پوش اجنبی شخص کو دیکھا کرتا تھا، جو چپ چاپ اس کے قریب سے گزر جاتا۔ اس اجنبی شخص سے اس کی کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ دونوں اپنے اپنے راستے پر چلتے رہتے تھے، مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ یوسف جب بھی اس کے سامنے سے گزرتا اس کا دل بے اختیار چاہتا کہ اس سے پوچھے، "آپ کون ہیں؟" مگر ایسا موقع اسے کبھی نہیں ملا تھا۔

ایک روز جب یوسف اسکول جا رہا تھا، اسے توقع تھی کہ سارے لڑکے جماعت میں پہنچ چکے ہوں گے۔ اپنے اسکول دیر سے پہنچنے پر اُسے افسوس ہو رہا تھا اور وہ جلدی جلدی قدم اُٹھا رہا تھا۔ اچانک اس کے کان میں ایک ایک آواز آئی،

"بیٹا! ذرا ٹھہرو۔"

اس نے دائیں جانب دیکھا، اجنبی اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔

"تمہارا قلم بستے سے نکل کر نیچے گِر پڑا تھا، تمہیں اس کی خبر نہیں ہوئی۔ یہ لو۔"

یوسف نے قلم لے لیا۔ قلم یوسف کے حوالے کرکے اجنبی ایک لمحے بھی وہاں نہ ٹھہرا اور یوسف اس سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ اس روز یوسف گھر آیا تو ماں کو یہ واقعہ سنا دیا۔ ماں نے پوچھا:

"یوسف بیٹا! تم نے اس آدمی کا شکریہ ادا کر دیا تھا؟"

یوسف تو اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا، اجنبی وہاں رکا ہی نہیں تھا۔ اپنی امّی سے اس نے کہہ دیا، "امّی! میں تو اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کون ہیں؟ وہ اگر ٹھہرتا تو میں اس سے یہ سوال ضرور کرتا اور شکریہ بھی ادا کرتا۔"

یوسف کی امّی نے اسے بتایا، "تمہارا فرض تھا

شکریہ ادا کرنا تھا۔ وہ کوئی بھی ہو۔ تمہیں اس سے کیا غرض۔"

اس کی ماں نے اگرچہ اُسے ایسا سوال کرنے سے منع کر دیا تھا تاہم یوسف کے دل میں اجنبی سے اس کا اتا پتا پوچھنے کی خواہش بڑھ گئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد یہ معلوم کرلے کہ وہ اجنبی کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے؟ ادھر اس کی امّی نے اسے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس کا شکریہ ضرور ادا کرے ورنہ اپنے فرض سے غفلت برتے گا۔

کئی دن گزر گئے وہ اجنبی دکھائی نہ دیا اور ایک دن جس وقت وہ نہر کے پُل پر سے گزر رہا تھا وہ اجنبی نظر آگیا۔ وہ اس سے کچھ دور آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ یوسف سے نہ رہا گیا۔ جلدی جلدی قدم اُٹھا کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

"جناب! سنیے!"

اجنبی رک گیا تھا اور اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"جناب! آپ کون ہیں؟"

اجنبی نے یہ لفظ سنے تو ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور پھر دور ہو گئی۔ وہ چل پڑا۔ یوسف اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے دل میں سوچا، "کتنی بے ہودہ حرکت کی ہے میں نے۔ امّی نے تو مجھ سے صرف یہ کہا تھا کہ وہ جہاں کہیں ملے اس کا شکریہ ادا کرنا، نہ کہ اس سے یہ پوچھنا کہ آپ کون ہیں؟"

یوسف کو افسوس ہوا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

اجنبی دور نکل گیا تھا۔ یوسف کا اسکول سامنے نظر آرہا تھا۔ وہ اسکول کے اندر چلا گیا، مگر سارا دن اُسے افسوس ہوتا رہا۔ اس نے اجنبی سے ایسا سوال کرکے شاید اسے تکلیف پہنچائی ہے۔ اس کی امّی نے بھی تو کہا تھا کہ تمہارا فرض تو اس کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ وہ کوئی بھی ہو تمہیں اس سے کیا غرض۔

وہ دن جمعہ کا تھا اور اسکول بند تھا۔ یوسف یونہی گھر سے نکل پڑا تھا اور اُس راستے پر چلا جا رہا تھا۔ جو اس کے اسکول کی طرف جاتا تھا۔ اس نے اپنی امّی سے تو یہ کہہ کر باہر گھومنے کی اجازت لے لی تھی کہ وہ ذرا سیر کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کا اصل ارادہ تو اُسی اجنبی کی تلاش تھی۔

اجنبی مل گیا۔ وہ اسی جگہ چلا جا رہا تھا جہاں چند روز پہلے یوسف اُسے ملا تھا۔

"جناب! میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں!" اس نے اجنبی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا تو تم اس بات کا شکریا ادا کر رہے ہو کہ میں نے تمہارا گرا ہوا قلم اُٹھا کر تمھیں دے دیا تھا؟"

یوسف نے سر ہلا کر تائید کی۔

"یہ تو کوئی ایسی بات نہیں، میری جگہ تم ہوتے تو یہی کام کرتے۔ خدا حافظ۔"

اور وہ چلا گیا۔ یوسف وہیں کھڑا کا کھڑا رہا۔

تھوڑی دور آگے جا کر۔ اجنبی مُڑ گیا اور یوسف کی طرف رُخ پھیر کر ایسا اشارا کیا جیسے وہ اسے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ یوسف اس کی طرف جانے لگا۔ اجنبی نے اب کے بھی کچھ نہ کہا، صرف ہاتھ کے اشارے سے اُسے ساتھ چلنے کے لیے کہا اور حسبِ معمول آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگا۔

صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت بڑھتی جارہی تھی۔ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں ڈوبا چلا جارہا تھا اور یوسف اس اجنبی کے پیچھے چلتا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے گا اور یہ اجنبی اسے کہاں لے جاکر چھوڑ دے گا۔ ایک کھیت سے کچھ فاصلے پر ایک مکان دکھائی دے رہا تھا۔ اجنبی نے یوسف کو باہر ٹھہرنے کے لیے کہا اور خود اندر چلا گیا۔ پانچ سات منٹ بعد وہ واپس آگیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جس کے اندر رومال میں چھپی ہوئی کوئی چیز پڑی تھی۔ اجنبی نے اس سے کچھ کہا اور ایک طرف چلنے لگا اور یوسف بھی اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔

اب سورج چمکنے لگا تھا اور ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی تھی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اجنبی ایک دروازے پر رک گیا۔ اس پر دستک دی۔ ایک بوڑھی عورت دروازے پر آئی۔

"یہ لیجیے اماں! ناشتا۔"

عورت نے ٹوکری پکڑلی اور احسان مندانہ نظروں سے اجنبی کو دیکھنے لگی۔

"آپ بڑی تکلیف کرتے ہیں، کس طرح شکریہ ادا کروں؟" عورت کی آواز جذبے کی شدّت سے کانپ رہی تھی۔

"کسی طرح بھی نہیں اماں، کسی طرح بھی نہیں۔"

اور اجنبی نے خالی ٹوکری اٹھالی اور چلنے لگا۔ دونوں خاموش تھے۔ اجنبی ایک دکان پر جاکر رک گیا۔ اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ دکان دار کی طرف بڑھایا۔ دکان دار نے ایک لفافے میں طرح طرح کی کچھ ٹکیاں اور شربت سے بھری ہوی ایک بوتل ڈال کر اجنبی کے حوالے یہ لفافہ کردیا اور دونوں کے بل بنانے لگا۔ اجنبی نے بل پر ایک نگاہ ڈالی اور جیب سے چند نوٹ نکالے۔ انھیں گنا اور دکان دار کو دے دیے۔ پھر دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔

ایک بازار میں سے گزر کر اجنبی ایک دروازے پر دستک دینے لگا۔ جب اس نے تیسری بار دستک دی تو ایک نوجوان شخص دروازے پر آیا۔ وہ بیمار معلوم ہوتا تھا۔

"کیا حال ہے؟" اجنبی نے پوچھا۔

"پہلے سے بہتر ہوں" بیمار آدمی نے جواب دیا۔

"دوا استعمال کرتے ہیں۔ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے، ان شاءاللہ۔"

بیمار آدمی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"نہیں نہیں، تمھیں رونا نہیں چاہیے!"

"میں روتا نہیں ہوں۔ یہ میرے شکریے کے آنسو ہیں۔"

"نہیں بیٹا، نہیں!" اجنبی نے اس کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دروازے سے ہٹ گیا۔

"تم تھک گئے ہو گے، اپنے گھر جاؤ۔" اجنبی نے یوسف کی طرف دیکھ کر کہا۔

مگر یوسف اجنبی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کون ہیں؟ اس سوال کا جواب اجنبی نے نہیں دیا تھا اور دینا چاہتا بھی نہیں تھا، کیوں کہ وہ ایک طرف جا رہا تھا۔ یوسف کے لیے گھر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ گھر چلا گیا اور سارے راستے یہ سوچتا رہا کہ آخر یہ اجنبی ہے کون؟

کئی ہفتے گزر گئے۔ اجنبی یوسف کو کہیں بھی نظر نہ آیا۔

یہ شخص کہاں غائب ہو گیا ہے۔ کہیں اس شخص سے میری ملاقات میرے وہم کا نتیجہ تو نہیں تھی، مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے بارہا دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ گھوما پھرا تھا۔ ایسے خیالات یوسف کے ذہن میں اکثر آجاتے تھے اور وہ کوئی نہ کوئی کام کرتے ہوئے بھی ان خیالات کو ذہن

سے نہیں نکال سکتا تھا۔

یوسف آٹھویں جماعت میں پاس ہوا۔ جماعت میں اوّل آنے پر اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی طرف سے بہ طور انعام کتابوں کا ایک بنڈل بھی ملا۔ گھر کے سب افراد اس کی نمایاں کامیابی پر بہت خوش تھے۔ یوسف بھی بہت خوش تھا، لیکن اس کی خوشی زیادہ دن قائم نہ رہ سکی۔ وہ ایک شام بیمار ہو گیا اور ایک ہفتے کے بعد اس کا بخار تیز ہو گیا۔

دوسرا ہفتہ بیتنے میں ابھی ایک دن باقی تھا کہ اس کا بخار ٹوٹ گیا۔ گھر کے سارے لوگوں نے خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ یوسف نے ایک خطرناک بیماری سے نجات پائی تھی۔ وہ خاصا کم زور ہو گیا تھا تاہم آہستہ آہستہ چل کر گھر کے باہر ایک چھوٹے سے باغ میں جا بیٹھتا تھا۔ دل بہلانے کے لیے کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا تھا اور دو تین گھنٹوں کے بعد واپس گھر آکر پلنگ پر لیٹ جاتا تھا۔ اس کی صحت بحال ہو رہی تھی، مگر ابھی اسکول جانے کے قابل نہیں ہوا تھا اور نہ اجنبی کا خیال اس کے ذہن سے نکلا تھا۔ اس کا دل اجنبی سے یہ سوال کرنے کے لیے بڑی طرح بے تاب تھا کہ آپ کون ہیں؟

مگر اجنبی تو جیسے غائب ہی ہو گیا تھا۔

ایک دوپہر وہ تنہا باغ میں بیٹھا تھا۔ جنوری کا مہینا تھا۔ دھوپ کی حدّت سے اس کے جسم کو بڑی راحت مل رہی تھی۔ اس نے سَر اٹھایا تو اپنے سامنے اجنبی کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں پھلوں سے بھرا ہوا ایک لفافہ بھی تھا۔

"مبارک ہو بیٹا! تم صحت یاب ہو گئے ہو۔ یہ پھل میری طرف سے قبول کرو!" اور اجنبی نے لفافہ اس کے پاس رکھ دیا۔ جب مُڑ کر جانے لگا تو یوسف اٹھ بیٹھا۔

"آپ؟" یوسف اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا

"میں کیا؟" اجنبی نے پوچھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ، مگر"

"مگر کیا۔ کیا وہی سوال پوچھنا چاہتے ہو جو بار بار تمھارے ذہن میں آجاتا ہے؟"

"ہاں!"

اجنبی ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا

"تم نے اس روز دیکھا تھا کہ میں نے کیا کیا تھا اس سے تم کیا سمجھ سکے ہو؟" اجنبی نے پوچھا۔

"آپ ایک نیک آدمی ہیں۔ نیکی کے کام کرتے ہیں۔"

اجنبی نے اپنا دایاں ہاتھ یوسف کے کندھے پر رکھ دیا اور دھیمے لہجے میں کہنے لگا،

"یوسف بیٹا! میں ہمیشہ سے ہوں۔ اس وقت سے جب انسان نے اس دنیا میں سکونت اختیار کی تھی۔ میں ہمیشہ رہوں گا، جب تک یہ دنیا آباد ہے۔ میں ایک سچا انسان ہوں، مجھے سمجھنا چاہتے ہو تو نیکی کہہ کر پکار سکتے ہو، گویا میں انسانی روپ میں انسانی نیکی ہوں۔ میں ہر اس شخص کا دوست ہوں جسے انسانوں سے محبت ہے۔ جو اپنی کوششوں سے انسانوں کا دکھ درد دور کرنا چاہتا ہے۔ میں دنیا کے ہر ملک، ہر شہر، ہر گلی ہر محلّے میں ہوں۔ میں ہر شخص کے قریب ہوں۔ بلکہ

اس کے دل میں ہوں، مگر جب وہ لوگوں کو ستانے لگتا ہے۔ خود غرض، لالچی اور حریص ہو جاتا ہے تو میں اس سے دور ہو جاتا ہوں اور دور ہوتا رہتا ہوں۔ پھر بھی میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ کبھی کبھی اس کے پاس چلا جاتا ہوں، مگر جب وہ مجھے نہیں پہچانتا تو میں اس سے الگ ہو جاتا ہوں۔"

یوسف کو معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اجنبی نے کب اپنا ہاتھ اس کے کندھے سے اٹھایا اور کب اس کی نظروں سے دور ہو گیا۔

اب اس کے سامنے وہ اجنبی نہیں تھا، بلکہ ایک پودے پر گلاب کا پھول تیز دھوپ میں اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ (بہ شکریہ نونہال۔ کراچی)

تعویذ

مرغوب ماں

ہمارے شہر کے پچھواڑے
دھونی رماتے ندی کے تیر
ایک کلیگی فقیر
تعویذوں کے زرماتا ہوں
جدید دور کے خدا ہیں
پرسوں شام ان کے پاس ایک لڑکا آیا
اس نے روتے روتے بتلایا
دماغ کا نکل گیا ہے تیل
تین سال سے بی۔ اے میں ہو رہا ہوں فیل
کوئی تعویذ دلوائیے۔
بی۔ اے میں پاس کروائیے۔
فقیر نے کہا:
دماغ کی تیزی کے لیے دودھ پیا کرو
ذرا ڈھنگ سے جیا کرو۔
لڑکے نے کہا:
دودھ؟
دودھ تو گھر کی کھیتی ہے۔
گائے ہے پر تین سال سے دودھ نہیں دیتی ہے۔
فقیر نے کہا: میرے عزیز!
یہ لے جاؤ دو تعویذ
ایک اپنے گلے میں اور
ایک گائے کے گلے میں ڈالنا
اتفاق کی بات
تعویذ اَدل بدل گیا
لڑکے کا گائے کے گلے میں
اور گائے کا لڑکے کے گلے میں
یہی بھول لڑکے کا ستیاناس کر گئی
گائے تو بی۔ اے پاس کر گئی
لڑکا آج تک رو رہا ہے!

قاسمی منزل۔ مدھوبنی۔ ضلع پورنیہ

اسد علی چاند پوری

خود کفالتی کی جیت

(ایک سبق آموز سچی کہانی)

۱۸۶۵ء کی بات ہے۔ بنگال کا سرسبز و شاداب علاقہ قحط کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ دانے دانے سے محتاج لوگ اپنی بھوک مٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی غرض سے دوڑ دھوپ کر رہے تھے اور جو کچھ بھی میسر آرہا تھا اسی سے اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔

ان ہی دنوں میں ایشور چندر ودیا ساگر کہیں جانے کے لیے بردوان کے بس اڈے پر کھڑے تھے۔ تبھی ایک مصیبت زدہ لڑکے نے ان کے سامنے آکر بھیک کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ وہ بھوک سے بے حال تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا اپنی زندگی بچانے کے لیے مجبور ہو کر بھیک مانگنے نکل پڑا تھا۔

ایشور چند نے اس سے بڑی محبت کے ساتھ پوچھا۔ "بیٹا تم ایک پیسا مانگ رہے ہو اگر میں تم کو ایک کی بجائے چار پیسے دے دوں تو تم اُن کا کیا کرو گے؟" لڑکے کے چہرہ پر خوشی کی لہر دوڑ گئی وہ بہت ہی ملتجیانہ انداز میں بولا۔ "جناب عالی اس بُرے وقت میں آپ میری ہنسی نہ اڑائیے۔ میں اس وقت بہت مصیبت میں ہوں۔ نہیں تو۔"

"نہیں بھائی نہیں۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمھارا مذاق نہیں اُڑا رہا ہوں۔ اور اڑانا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے تو صرف اتنا بتا دو کہ تم اِن چار پیسوں کو لے کر کیا کرو گے؟"

"کروں گا کیا؟ دو پیسے کا کچھ کھانے کا سامان خریدوں گا۔ اور دو پیسے اپنی والدہ کو لے جا کر دوں گا تاکہ وہ کسی آڑے وقت میں کام دیں۔" لڑکے نے بے باکی کے ساتھ جواب دیا۔

ودیا ساگر نے پھر دریافت کیا "اور اگر میں تمھیں دو آنے دے دوں تو؟" "اگر مگر کیا؟" کہتا ہوا وہ لڑکا منہ پھیر کر وہاں سے چلنے لگا تو ودیا ساگر نے اُس کی آستین پکڑ لی۔ اور بڑے پیار سے اُس سے پوچھنے لگے "بتاؤ تو بھائی اگر دو آنے دے دوں تو تم ان کا کیا کرو گے؟" بے بسی کی اس حالت میں لڑکے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے وہ سسکتے ہوئے بولا "آپ سچ مانیے میں ان میں ایک پیسا بھی بے کار خرچ نہیں کروں گا۔ کچھ پیسوں سے چاول خرید لوں گا اور باقی اماں کو دے دوں گا۔ اب آپ مجھے جانے دیجیے۔ آپ کیوں اس طرح میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟"

ودیا ساگر افسردہ ہوگئے۔ ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ بہت ہی اپنائیت سے بولے "بھیا! میں کہہ ہی چکا ہوں میں تمھارا مذاق کیوں اڑاؤں گا؟ بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ میں تمھاری کیا مدد کروں؟ اچھا اب ذرا یہ بتاؤ کہ اگر میں تمھیں چار آنے اسی وقت دے دوں تو تم انھیں کس طرح استعمال میں لاؤ گے؟"

لڑکے کو کچھ امید بندھی۔ خوشی کی ایک لہر اُس کے چہرے پر اُبھری اور پھیل گئی۔ وہ بولا "جناب عالی! میں دو آنے کا تو سامان خرید لوں گا۔ تاکہ ایک دو دن کے کھانے کی پریشانی سے ہمیں چھٹکارا ملے۔ باقی پیسوں سے پھل یا کچھ اور خرید کر انھیں بیچنے لگوں گا۔ تاکہ اُن سے

بی-۲ صفدر جنگ انکلیو۔ نئی دہلی ۲۹

حاصل پیسوں سے پھر پھل یا کوئی دوسرا سامان خرید کر آگے کو کام چلاتا رہوں۔

لڑکے کی یہ بات سنتے ہی ودیا ساگر نے فوراً کرتے کی جیب سے ایک روپیا نکالا اور اُس لڑکے کی ہتھیلی پر رکھ کر بولے "بھیا! جو بھی کرنا چاہو کر لینا۔ ویسے تمھاری طرح اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی خواہش دل میں رکھنے والے شخص سے میں کیا کہوں؟ جاؤ زندگی کی اس جنگ میں تمھاری فتح ہوگی۔" لڑکے نے اُن کے پیر چھوئے اور گھر کی طرف چل دیا۔

بردوان کے اسی مقام پر تین سال بعد ودیا ساگر کو پھر جانے کا اتفاق ہوا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان ہانپتا کانپتا دوڑا ہوا اُن کے پاس آیا اور ان کے پیر چھو کر بولا۔ "جناب عالی! میں آپ کا بے انتہا شکر گزار ہوں۔ مہربانی کر کے میری چھوٹی سی دکان پر چل کر کچھ دیر بیٹھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔"

ودیا ساگر جی حیران تھے۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ اسے نہیں پہچان رہے تھے۔ اس لیے کہنے لگے! "بھیا! میں تو تمھیں بالکل بھی نہیں پہچان پا رہا ہوں — اس لیے مجھے ذرا ہچکچاہٹ . . . ."

لڑکا یہ سن کر رو پڑا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے آنسو تھمے تو اس نے وہ سارا واقعہ سنایا اور بولا "مجھے تو آج پتا لگا کہ اس مصیبت کے وقت میری مدد کرنے والے ایشور چند ودیا ساگر ہی تھے۔"

ودیا ساگر بہت خوش ہوئے اور خوشی سے دُکان پر گئے۔ نوجوان کی انھوں نے بہت تعریف کی اور بولے "بھیا! اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے والوں کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ تم نے اپنی محنت سے یہ کام کر کے میرے اس یقین کو تقویت پہنچائی ہے۔ تم سدا پھلو پھولو اور ساتھیوں میں بھی دل لگا کر کام کرنے کا شوق پیدا کر دو۔" یہ دعا دے کر وہ وہاں سے چل دیے۔

لوگوں نے ودیا ساگر کو اس لڑکے سے اتنی اپنائیت کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر بڑی حیرانی ظاہر کی لیکن ودیا ساگر محنت کی اس مجسم تصویر کی تعریف کرتے نہیں تھک رہے تھے۔

قاضی انصار

روشنی

فقط اتوار کا دن چھوڑ کر اسکول جاتا ہوں
زمانے بھر کی معلومات میں ہر روز پاتا ہوں

ہیں میرے دوست کچھ اچھے کھلاڑی کچھ پڑھاکو ہیں
بہت سیدھے ہیں کچھ احباب میرے کچھ لڑاکو ہیں

یہ ہفتے بھر کی ہے مصروفیت کچھ اس طرح میری
پڑھائی سے ہے دلچسپی، نظر ہر کھیل پر گہری

میں صبح پیر کے دن دس بجے اسکول جاتا ہوں
اور اپنے ساتھیوں کو منتظر جب اپنا پاتا ہوں

یہ منظر دیکھ کر خوشیوں سے دل لبریز ہوتا ہے
پڑھائی اور لکھائی کا سفر پھر تیز ہوتا ہے

کبھی جغرافیہ، تاریخ کی دنیا میں کھوتا ہوں
کبھی استاد کی تقریر میں محو ہوتا ہوں

مجھے سائنس در سائنس کی پرتیں الٹنا ہے
مجھے آگے ابھی اردو ادب میں اور پڑھنا ہے

یہ ہے اک روشنی انصار جو مدھم نہیں ہوتی
کبھی اشعار کے پھولوں کی رونق کم نہیں ہوتی

قاضی پورہ کھنڈوہ۔ ایم۔ پی

از: رئیس صدّیقی

بچّوں کے نیّر صاحب

جنت مکانی محمد شفیع الدین نیّر صاحب سے میں نے ۱۹۷۷ء میں ایک ملاقات کر کے انٹرویو لیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اس کے شائع ہونے سے قبل ہی وہ انتقال فرما گئے۔ نیّر صاحب کی زندگی ایک مثالی زندگی ہے۔ بچے ان کی زندگی سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ انٹرویو پیش خدمت ہے

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو زبان میں جتنے بڑے بڑے لکھنے والے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ان میں سے زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں نے شروع شروع میں بچوں کے لیے نظمیں کہیں اور کہانیاں لکھی ہیں۔ آج بھی بہت سے اردو کے ادیب اور شاعر بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ پیش کرتے رہتے ہیں۔

لیکن اگر یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون ایسا ادیب یا شاعر ہے جو صرف بچوں کا ادیب ہو، صرف بچوں کا شاعر ہو اور جس نے اپنی ساری عمر صرف بچوں کے لیے تخلیقات پیش کرنے میں صرف کر دی ہو، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک نام آتا ہے اور وہ ہے جناب محمد شفیع الدین نیّر کا نام۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ کہ نیّر مرحوم نے بچوں کے ادب کو نئی راہ نئی زندگی بخشی۔ آپ نے بچوں کے ادب کو بھوت پریت، جنوں اور پریوں کے دائرے سے نکالا اور اخلاقی و تربیتی نیز تعلیمی چیزیں لکھی ہیں۔ اسی وجہ سے آپ ہند و پاک کے بچوں میں بے حد مقبول ہوئے۔

میں نے بھی بچپن سے آج تک نیّر صاحب کی بہت سی کہانیاں، نظمیں اور کتابیں پڑھیں اور پڑھائیں اسی دوران میرے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ نیّر صاحب سے ملاقات کروں اور بچوں کے لیے ایک انٹرویو لوں ـــ آخر کار ایک دن یہ میری خواہش پوری ہوئی اور میں نے نیّر صاحب سے ایک انٹرویو لیا۔

نیّر صاحب کی نجی زندگی کے متعلق میرے ذہن میں کئی سوال کلبلائے اور پھر زبان تک آگئے۔ نیّر صاحب نے میرے ابتدائی سوالوں کا جواب کافی تفصیل سے دیا ـــ انھوں نے کہا۔

میرا پورا نام محمد شفیع الدین ہے اور نیّر میرا تخلص ہے۔ ہمارا خاندان اب سے آٹھ پشت پہلے مسلمان ہوا تھا، مورثِ اعلا کوئی بھٹنا گر کائستھ بیان کیے جاتے ہیں۔ خود میں نے بھی اپنے خاندان کے بعض ہندو بزرگوں کو دیکھا ہے۔ میری تاریخ پیدائش ۸ /اگست ۱۹۰۴ء ہے۔ میرا اصل وطن قصبہ اترولی ہے جو علی گڑھ ضلع میں واقع ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا ـــ ابتدائی تعلیم ایک دینی مکتب میں حاصل کی۔ چار سال کی عمر میں قاعدہ پڑھ لیا تھا۔ مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد مدرسہ مصباح العلوم میں داخلہ لیا۔ اور گلزار دبستاں، حضرت سعدی کی گلستاں و بوستاں اور دیگر فارسی کتابیں پڑھیں۔

میرا تعلیمی سلسلہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں ایک بڑے حادثے سے دوچار ہوا۔ میرے والد محترم حکیم الدین صاحب جو کہ پولیس کانسٹبل تھے، ۱۹۱۰ء میں انتقال کر گئے۔ مگر یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میری والدہ ان پڑھ

ہونے کے باوجود ایک تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بڑی علم دوست اور دور اندیش تھیں۔ خود محنت مزدوری سے زندگی بسر کرتی تھیں مگر چاہتی تھیں کہ میں پڑھ لکھ جاؤں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے رشتے کے نانا مولانا لطف اللہ صاحب کے یہاں علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں گھر کا ماحول اچھا تھا۔ لہٰذا ادب اور سلیقے کی باتیں سیکھیں اور وہیں رہ کر میرے اندر شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا لیکن چونکہ میرے دل میں تعلیم حاصل کرنے کی امنگ تھی جو وہاں رہ کر پوری نہیں ہوسکتی تھی اس لیے میں اپنی والدہ ماجدہ سے اجازت لے کر ۳/اپریل ۱۹۱۵ء کو دہلی آگیا۔ اس وقت میرے پاس صرف پانچ پیسے اور ایک جوڑا کپڑا تھا۔ میں دہلی میں اپنا خرچ نکالنے کے لیے کچھ محنت مزدوری کرلیتا اور کچھ اخبار بیچ لیتا تھا۔"

نیّر صاحب نے پہلو بدلا اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "میں یہاں منشی عبدالغنی صاحب کاتب کے یہاں رہ کر کتابت سیکھنے لگا۔ دن بھر کتابت سیکھتا اور صبح کے وقت گھر گھر اخبار بیچتا۔ ایک دن جامع مسجد کے امام شمس العلماء سید احمد صاحب نے، جن سے میری ایک ہاکر کی حیثیت سے جان پہچان ہوتی تھی، روک کر پوچھا کیا تم پڑھنا چاہتے ہو۔ میں نے فوراً جواب دیا۔ جی ہاں۔

تین چار مہینے نجی طور پر پڑھا کر سید صاحب نے اینگلو عربک اسلامک دہلی کی ایک شاخ میں پانچویں درجے میں داخل کرا دیا اور میرا اخبار فروشی کا کام چھڑوا کر اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اور اپنی اولاد کی طرح پڑھوانے لگے۔ خدا کے فضل و کرم سے میں اپنے درجہ کے تمام لڑکوں میں پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت میں فرسٹ آیا جس کے نتیجہ میں فیس معاف ہوگئی اور اسکالر شپ ملنے لگا ——— لیکن جب میں ساتویں جماعت میں آیا تو مجھ پر ایک نئی مصیبت آگئی کہ اب میں بڑا ہوگیا تھا۔ لہٰذا سید صاحب کے گھر کی عورتیں پردہ کرنے لگی تھیں۔ اور جب میں بالغ ہوگیا تو پردہ کی وجہ سے سید صاحب نے یتیم خانہ میں رکھوانے کا فیصلہ کیا لیکن کچھ لوگوں نے ان کو ایسا کرنے سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور میں یتیم خانہ میں داخل ہونے سے بچ گیا۔

اس کے بعد میں کچھ دنوں تک ایک دوسرے محسن اصغر علی صاحب کے ساتھ رہا۔ مولوی فضل الدین پرنسپل صاحب نے مجھے اپنے یہاں رہنے کی جگہ دی اور کھانے کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس زمانے میں میں نے ٹیوشن کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اور کچھ پیسے امی جان کو بھیج دیا کرتا تھا۔

چونکہ میں اپنے کلاس کا مانیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا مقرر بھی تھا اور سیاسی جماعتوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس لیے جب نویں جماعت میں آیا اور عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو میں نے اس سے متاثر ہو کر سرکاری وظیفہ اور اسکول چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے ملحق اسکول "آزاد قومی درس گاہ" میں داخلہ لے لیا۔ بعد میں مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے استادوں کا کہنا نہ مان کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ کیونکہ اسکالر شپ اور دوسری سہولتیں ختم ہوجانے کی وجہ سے میری پریشانیاں بے حد بڑھ گئیں اور ایک دن اسکول چھوڑ دینا پڑا۔ ۱۹۲۲ء میں جامعہ جونیر (مساوی میٹرک) کا امتحان دیا اور علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ لیکن چار ماہ بعد مالی پریشانیوں سے تنگ آکر علی گڑھ چھوڑ دیا۔ اور پھر دہلی آگیا اور بچوں کو پڑھانا ذریعہ معاش بنایا۔

اسی درمیان پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی (فارسی) ادیب عالم و فاضل (اردو) کے امتحانات اوّل نمبر سے پاس کیے اور انگریزی میں ایف۔ اے کیا۔ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ سے اردو میں ایم اے اوّل درجہ میں پاس کیا۔

میرا پیشہ معلمی رہا۔ ماڈرن ہائی اسکول دہلی میں اٹھارہ

سال سے زیادہ اردو فارسی پڑھائی ۔ ۱۹۴۵ء میں جناب ذاکر حسین صاحب کی فرمائش پر جامعہ ملیہ آ گیا۔ صرف ۷۵ روپے میں آٹھ سال تک بیوی بچوں کے ساتھ گزارا کرتا رہا جبکہ ماڈرن اسکول میں ایم اے پاس سے زیادہ تنخواہ ملتی تھی ۔ جامعہ ملیہ سے ۶۵ سال کی عمر میں ۱۹۶۹ء میں سبکدوش ہوا۔"

جب وہ خاموش ہوئے تو میں بولا ـ" نیّر صاحب آپ کی آپ بیتی سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کوئی کہانی سن رہا ہوں ۔ بہر حال آپ کی زندگی ایک مثالی زندگی ہے ۔ آپ نے زندگی کے نشیب و فراز سے بہت کچھ حاصل کیا ہوگا اور اس کا فائدہ آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں پہنچا ہوگا کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ نے اپنے بچوں کو کس معیار کی تعلیم دلائی"۔ یہ میرا اگلا سوال تھا۔

"میں خوش نصیب ہوں کہ میرے آٹھ بچے ہیں چار لڑکے اور چار لڑکیاں ۔ بڑے لڑکے محمد صائغ نے کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ اور تین سال جرمنی میں رہنے کے بعد آج کل حیدرآباد میں ملازمت کر رہا ہے ۔ دوسرا لڑکا محمد طاہر ایم اے بی ایڈ ہے ۔ تیسرا لڑکا محمد طارق ایم ایس سی بی ایڈ ہے ۔ چوتھا لڑکا عزیز اختر ایم ایس سی ہے ۔ میری سب سے بڑی لڑکی فریدہ ایم اے بی ایڈ ہے اور آج کل دہلی یونیورسٹی میں لیکچرر ہے ۔ دوسری لڑکی سعیدہ بی اے بی ایڈ ہے اور ایک اسکول میں ٹیچر ہے ۔ تیسری لڑکی زاہدہ بی ایس سی بی ایڈ ہے اور جامعہ ملیہ اسکول میں ٹیچر ہے ۔ اور چوتھی لڑکی رافعہ ہے جس نے انگلش آنرس سے بی اے کیا ہے "

میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہند و پاک کے تمام بچوں کے رسائل میں آپ کی نظمیں اور کہانیاں چھپتی رہتی ہیں ۔ ریڈیو سے بھی آپ کی نظمیں نشر ہوتی رہیں ۔ بچوں کے لیے آپ کی لکھی ہوئی کہانیوں کی کئی کتابیں جامعہ اردو کے ابتدائی نصاب میں شامل ہیں اور "غالب کی کہانی" ادیب کے کورس میں شامل ہے ۔ غالب پر آپ کی کتاب تو بہت ہی عمدہ ہے ، بچوں کے لیے آپ کو یہ کتاب لکھنے کا خیال کیسے آیا؟"

نیّر صاحب نے میرے سوال کا جواب دیا ـــــ

" دراصل یہ کتاب میں نے ۱۹۶۹ء میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے حکم کی تعمیل میں لکھی تھی ۔ لیکن جس قدر اس کو پسند کیا گیا اس کی مجھے امید بھی نہیں تھی ۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ اس کا تیسرا ایڈیشن چھپنے والا ہے "

نیّر صاحب ! بلاشبہ آپ بچوں کے ایک بڑے ادیب اور شاعر ہیں ۔ لیکن ایسی کیا بات تھی کہ جس نے آپ کو بچوں ہی تک محدود رکھا؟ ـــ" کیا آپ بڑوں کے لیے بھی لکھتے ہیں؟" ـــ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے بچوں کی ادبی زندگی پر بھی ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں ۔

نیّر صاحب کہنے لگے ـــــ" بڑوں کے لیے میں نے صرف تین چار غزلیں ہی کہی ہیں اور "دہلی کے نئے ادیب و شاعر" کے عنوان سے چند تحقیقی اور تنقیدی مقالے لکھے ہیں ۔ لیکن میری زیادہ تر کوشش بچوں کے ادب کو عمدہ بنانے میں رہتی ہے ۔ بچوں سے بے حد محبت اور بچوں کی ذہنی تربیت اور علمی ترقی سے خاص دلچسپی کی وجہ سے میں نے دوسری چیزیں چھوڑ دیں ۔ اور بچوں کی باتوں ہی کو اپنا موضوع بنایا ۔ اس کے علاوہ میری کتاب "بچوں کا تحفہ" چھپی تو لوگوں نے اسے بے حد پسند کیا اور مجھ سے مسلسل مطالبہ کیا جاتا رہا کہ میں بچوں کے لیے بچوں کی دلچسپی کی چیزیں لکھوں ۔ لوگوں کی اس خواہش سے بھی مجبور ہو کر صرف بچوں ہی کے لیے لکھنے لگا "

رہی شاعری کی بات تو اصل میں والد صاحب کے انتقال کے بعد جب میں علی گڑھ میں لطف اللہ صاحب

کے یہاں رہنے لگا تھا۔ تبھی سے شاعری کی طرف طبیعت مائل ہونے لگی تھی۔ وہاں بڑا اچھا ادبی ماحول بھی تھا جس نے اندر ہی اندر اس قدر ذوق پیدا کر دیا تھا کہ میں نے کمسنی میں ایک بزرگ مولوی شفیع اللہ صاحب کے منظوم خط کا جواب نظم میں دیا تھا۔ پھر سولہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ نظم "صبح" رسالہ "ہونہار" میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد قریب قریب بچوں کے ہر رسالہ میں میری نظمیں شائع ہونے لگیں۔ البتہ خاص طور سے میں نے ۱۹۲۶ء سے بچوں کی طرف توجہ دی جس کے نتیجے میں اکتوبر ۱۹۲۷ء میں میری سب سے پہلی کتاب "بچوں کا تحفہ" حصہ اول پھر حصہ دوم چھپی۔

اب تک میں بچوں کے لیے قریب قریب ستّر کتابیں لکھ چکا ہوں۔ جن میں سے گیارہ تو نظموں کے مجموعے ہیں اور تیس کے قریب، طبع زاد کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ یہ سب چیزیں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں اور بقیہ چھپنے والی ہیں۔"

میں نے کہا — "نیر صاحب! جب آپ اپنی نجی زندگی کے بارے میں بتا رہے تھے تو میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ آپ کی زندگی سے ایک سبق حاصل کیا جا سکتا ہے کہ "اگر انسان محنت، لگن اور علم حاصل کرکے ایک اچھا اور کامیاب انسان بننا چاہے تو یہ کام مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں۔ ایک نہ ایک دن منزل مل جاتی ہے۔"

نیر صاحب! اگر آپ اپنی زندگی بچوں کے سامنے کہانی کے ذریعے پیش کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بچوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ کیا اس طرح کی آپ نے کوئی کوشش کی ہے؟ یہ میرا آخری سوال تھا۔

نیر صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا "آپ نے میری کتابیں "پیسہ کا صابن"، "مزدور کا بیٹا" پڑھی ہوں گی ان کہانیوں میں میری ہی زندگی کا عکس ہے!"

دو شکاری

(قسط ۱۲)

امۃ الرحمٰن حسنی

جنگل کے اندر جاکر معلوم ہوا کہ وہاں زیادہ اندھیرا نہیں ہے۔ درختوں میں سے چاندنی چھن کر آرہی تھی۔ اور منظر عجیب بھیانک اور ٹھنڈا لگ رہا تھا۔

ابو نے ایک فاؤنٹن پین جیسی ٹارچ میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔ یہ میں اپنے دونوں کے لیے لیتا آیا تھا کہ ضرورت ہوگی۔ میں نے اسے جلا کر دیکھا۔ اس کی پتلی لمبی روشنی کافی دور تک پہنچ رہی تھی۔ اسے بجھا کر ہم اس جگہ کی طرف چلنے لگے جہاں تیتروں نے کشمش کھائی تھیں۔

چلتے میں ابو کہہ رہے تھے۔ یہ دنیا کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہوگا کہ کسی نے بسیرا لیتے ہوئے تیتر پکڑنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی عجیب ہی بات ہے کہ بلا اس فکر کے کہ چوکیدار ہمیں دیکھ لے گا ہم شان سے یہاں گھوم پھر رہے ہیں۔

ابو! کیا آپ کو یقین ہے کہ شیر خان یہاں ہم کو دیکھنے نہیں آئے گا؟

ہاں مجھے پورا یقین ہے۔ وہ کھانا کھانے کے بعد گھر جا چکا ہے۔

میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر شیر خاں کی جگہ میں ہوتا اور جنگل کے آس پاس دو مشتبہ آدمیوں کو دیکھ لیتا تو میں یقیناً گھر جانے کے بجائے جنگل میں رہ کر اپنے قیمتی تیتروں کی نگرانی کرتا۔ شاید ابو نے میرے احساسات کو سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے دوبارہ میرا ہاتھ اپنی گرم مٹھی میں لے لیا تھا۔ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے درختوں کے درمیان سے گزر کر صاف جگہ کی طرف جارہے تھے۔ چند منٹوں میں ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہم نے کشمش ڈالی تھیں۔
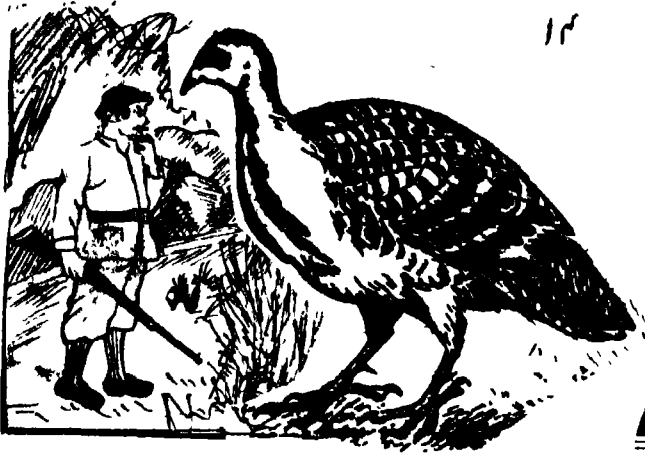
میں نے جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ پیلی دودھیا چاند کی روشنی اب اس جگہ پہنچ رہی تھی۔ اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

میں نے پوچھا۔ ابو نے کہا۔ بس اب تو یہاں بیٹھ کر دیکھنا ہے کہ کیا ہوتا ہے۔

میں نے ان کی ٹوپی کے چھجے کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ان کا چہرہ تمتا رہا تھا۔ ہونٹ سوکھ رہے تھے۔ لیکن آنکھیں خوب چمک رہی تھیں۔ میں نے سوال کیا۔ ابو! کیا سب چڑیاں بسیرا لینے چلی گئی ہوں گی۔

ہاں وہ ہمارے قریب ہی درختوں پر سونے چلی گئی ہیں۔

اگر میں اپنی ٹارچ کی روشنی درختوں پر ڈالوں تو وہ مجھے نظر آجائیں گی۔

نہیں! ابو نے کہا۔ وہ کافی دور پتوں میں چھپی رہتی ہیں۔

ہم درختوں کے نیچے کھڑے ہوئے کسی ہونے والی بات کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آرہی تھی جنگل میں بالکل سناٹا تھا۔ ابو نے بات کا سلسلہ شروع کیا۔ دانی بڑی حیرت کی بات ہے کہ کوئی پرندہ سوتے میں کیسے شاخوں پر بیٹھا رہتا ہے؟ جی ہاں! میں نے کہا۔ یہ بات ہے تو بڑی عجیب لیکن چڑیوں کے پنجے لمبے جو ہوتے ہیں وہ ان ہی سے پکڑے رہتی ہیں۔

یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ دانی! لیکن پھر بھی کتنی حیرت ناک بات ہے کہ سوتے میں وہ شاخ پر جمی رہتی ہیں۔ اور جب انہیں سوتے میں شاخ پر جمے رہنے کی عادت ہے تو وہ دوا کھا کر بھی جمی رہیں گی۔

مسکن دودھ پور علی گڑھ

لیکن ابو یہ تو سوچیے کہ دوا کے بعد عام طرح کا سونا نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ ایک طرح کا بے خبر کرنے والا نشہ ہوگا۔ اگر ان پر دوا کا اثر ہوگیا ہوگا تو وہ یقیناً گریں گی۔

ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ ہمارے پیچھے سے ایک ہلکی سی تھپ کی آواز آئی۔ میں بے اختیار بول اٹھا۔ یہ کیا ہے؟

شس شس ابّو نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم کان لگا کر سننے لگے۔ ایک اور تھپ سنائی دی۔ ایک عجیب دبی دبی سی آواز تھی جیسے ریت زمین پر گری ہو۔ تھپ تھپ۔ ابو! میں نے کہا۔ یہ تو تیتر گر رہے ہیں۔ ٹھہرو! سنو! انھوں نے کہا۔

ابو۔ یہ ضرور تیتر ہی ہیں۔ تھپ تھپ پھر آواز آئی۔ ہاں دانی! تمھارا کہنا ٹھیک ہے۔ یہ تیتر ہی ہیں۔ ہم نے اپنی ٹارچوں کو جلایا۔ اور آواز کی طرف بھاگے۔ ابو نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ کہاں ہیں وہ؟

ابو دیکھیے وہ رہے دو! اسی طرف سے آواز آئی تھی۔ چلیے دیکھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں ہم کو گرے ہوئے دو تیتر نظر آ گئے تھے۔ جیسے ہی ہم ان کو اٹھانے کے لیے جھکے ابو نے کہا۔ لو یہ ایک اور رہا اور ان کے ہاتھ میں ایک عمدہ قسم کا نر تیتر تھا۔ ہم نے ان تینوں کا خوب اچھی طرح معائنہ کیا۔ ابو نے کہا۔ ان کو اتنا نشہ ہے ایک ہفتے تک تو یہ جاگیں گے نہیں۔

تھپ۔ لیجیے ایک اور گرا۔ تھپ تھپ دو اور۔

تھپ تھپ۔ تھپ اور پھر تو ہمارے چاروں طرف درختوں پر سے تیتر بوندوں کی طرح ٹپکنا شروع ہوگئے۔ اور ہم دیوانہ وار زمین پر اپنی ٹارچیں گھما گھما کر دیکھتے پھر رہے تھے۔ تھپ۔ تھپ تھپ۔ تھپ یہ جھنڈ تقریباً میرے سر کے اوپر سے گرا تھا۔ میرے بالکل سامنے آکر گرا تھا۔ وہ بالکل جلیبی اور گرم تھے اور بالکل غافل اور نرم۔ ابو میں ان کو کہاں رکھوں؟ میں نے چلا کر کہا۔ ان کو یہاں روشنی میں اکٹھا کرلو۔ انھوں نے کہا۔

میں نے دیکھا ابو صاف جگہ کے کنارے پر چاندنی میں نہائے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں تیتروں کے بڑے بڑے گچھے تھے۔ چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ آنکھیں حیرت خوشی اور فخر کی کیفیت میں کھلی ہوئی اور چمک رہی تھیں وہ بچوں کے سے

انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ جیسے پوری دنیا مٹھائی کی بن گئی ہو۔ تھپ۔ تھپ۔ تھپ۔ تھپ۔ تھپ تھپ افوہ! یہ تو گرتی ہی چلی جارہی ہیں۔ میں نے کہا۔

اور کیسی خوبصورت ہیں یہ! ابو نے اپنے ہاتھوں والی چڑیاں زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ اور دوسری چڑیاں لانے کے لیے بھاگے۔ اور پھر تو وہ ہر درخت کے نیچے دو تین پڑی مل رہی تھیں۔ میں نے ایک دم چھ اٹھالیں اور جاکر ڈھیر پر رکھتا رہا۔

ابو اس وقت انتہائی جوش میں ہر درخت کے نیچے ٹارچ ڈال کر دیکھتے اور ہلکا سا فتح اور خوشی کا جملہ کہتے اور دو تین تیتر اٹھا لیتے۔ اور آنے والی تھپ تھپ کی آواز پر بھاگتے۔ تھپ۔ تھپ۔ اے دانی! انھوں نے مجھ کو آواز دی۔

جی ابو! میں یہاں ہوں۔ کیا بات ہے؟

میں کہتا ہوں اگر وہ بڑے آدمی شہباز خاں صاحب یہ سب دیکھیں تو ان پر کیا بیتے!

ابو! اس وقت ایسی باتیں نہ کیجیے!

اس کے بعد دو تین منٹ تک اور تھپ۔ تھپ کی آواز آئی اور پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔

ابو نے کہا۔ دانی ذرا غور سے دیکھو ابھی زمین پر بہت ہوں گے۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ابو ہمیں یہاں سے جلدی ہی نکل جانا چاہیے کہیں ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ نہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اطمینان سے چلیں گے۔ انھوں نے جوش میں آکر کہا۔

ہم ہر درخت کے نیچے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اور تیتر چُن چُن کر ایک جگہ ڈھیر کرتے جاتے تھے۔ ابو اس ڈھیر کو ایک لمحہ تک کھڑے دیکھتے رہے پھر ایک عجیب بے خودی کے عالم میں ان کے منہ سے نکلا یہ خالص معجزہ ہے۔ میں نے کہا۔ کیوں نہ ہم اپنے ہر ہاتھ میں تین تین اس میں سے اٹھالیں اور جلدی سے جلدی یہاں سے نکل جائیں۔

ابو نے کہا۔ اور میں تو ان کے گننے کی فکر میں ہوں۔ نہیں ابو۔ اب نہیں۔

لیکن میں تو ان کو ضرور گنوں گا۔ انھوں نے کہا۔

کیا ہم ان کو بعد میں نہیں گن سکتے؟ مگر انھوں نے جواب

نہیں دیا اور گننا شروع کر دیا۔ انھوں نے ڈھیر پر سے اٹھا کر
کہا۔ ایک اور دوسری طرف رکھ دیا۔ دو تین چار اور دوسری
طرف رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ چاند نے اب خوب اونچا
ہو کر زمین کے صاف حصہ کو روشنی سے بھر دیا۔ ابو گننے میں پوری
طرح لگے ہوئے تھے۔ ایک سو سترہ۔ ایک سو اٹھارہ۔ ایک سو
انیس۔ ایک سو بیس۔ اُفوہ یہ تو نہ ٹوٹنے والا ریکارڈ ہے۔ میرے
ابا جو اس قدر مشہور تھے۔ پندرہ سے زیادہ کبھی نہیں پکڑ سکے اور
یہ تو دنیا کا قائم رہنے والا ریکارڈ ہوگا۔

اور دانی! یہ سب تمھارا کیا ہوا ہے۔ ترکیب تو تمھارے
ہی دماغ میں آئی تھی۔ اس کا سہرا تمھارے سر پر ہے۔

ابو! میں کیسے کر سکتا ہوں میرے لیے کرنا تو ممکن ہی
نہیں تھا۔

لیکن تو نے تو کر کے دکھا دیا۔ اور میرے پیارے تمھیں
معلوم ہے اس کام نے تمھیں کیا بنا دیا ہے؟ "چیمپین آف دی
ورلڈ" انھوں نے اپنا سوئیٹر الٹا۔ اور اپنی کمر سے دو سوتی تھیلے
کھولے ایک مجھے دیتے ہوئے بولے۔ لو یہ تمھارا ہے۔ اس میں
تم بھرو۔ میں نے کہا۔ ابو ذرا سوچیے تو وہ بھورے دانتوں والا
چوکیدار اگر یہاں آ جائے تو کیا ہوگا؟

دانی! کچھ نہیں ہوگا۔ اگر وہ کہیں ہے تو پیٹرول پر جائے
گا اور پکڑنے کے لیے وہاں ہمارا انتظار کرے گا۔

جب دونوں تھیلے بھرے جا چکے تو میں نے کہا۔ ابو! اتنے
بھاری تھیلے اتنی دور گھر تک ہم کیسے لے جائیں گے؟

نہیں ہم انھیں اٹھا کر نہیں لے جا سکیں گے۔ اس کام کے
لیے جنگل سے باہر ایک ٹیکسی ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس میں رکھ کر
لے جائیں گے۔ ٹیکسی؟ اور اس کا ڈرائیور کون ہے؟ میں نے
پوچھا۔

ڈرائیور میرا پرانا دوست بشیر ہے۔ جب میں نے اسے یہ
بات بتائی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور اپنی ٹیکسی لانے کے لیے تیار
ہو گیا۔

کیا وہ بھی پوچنگ کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟ میں نے
پوچھا۔ کیوں نہیں۔ کسی زمانے میں وہ تیتر پکڑنے میں سب سے
زیادہ مشہور تھا۔ ابو نے ایک تھیلا اٹھا کر اپنی کمر پر لادا۔ لیکن
میرے لیے اتنا بوجھ کمر پر لادنا ممکن نہیں تھا۔ ابو نے کہا۔ تم اسے
گھسیٹ کر لے چلو۔ میرے تھیلے میں ساٹھ چڑیاں تھیں اور مجھے
لگ رہا تھا کہ ان کا وزن ایک ٹن سے کم نہیں ہے۔ جنگل کے کنارے
آکر جھاڑیوں میں سے سر نکال کر ابو نے ہلکے سے آواز دی۔ بشیر
بھیا!

اور بشیر بھیا نے ٹیکسی کی کھڑکی سے سر نکال کر چاند
کی روشنی میں ہماری طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔

ہم نے اپنے تھیلے جھاڑیوں کے گیپ میں سے کھسکا کر
باہر نکالے تو بشیر بھیا نے ایک خوشی کا نعرہ لگایا۔ ارے۔ ارے
واہ۔ وا۔ یہ کیا سمیٹ لائے ہو۔ (باقی آئندہ)

ناوک حمزہ پوری

گنگا کا پیغام

گنگا کا پیغام آیا ہے　　سنو تمھارے نام آیا ہے
سارے جگ میں نام ہے میرا　　چلتے رہنا کام ہے میرا
ہر آفت سے میں ٹکرائی　　مشکل میں کب میں گھبرائی
توڑی ہے ہر ایک رکاوٹ　　اور بڑھی ہوں آگے جھٹ پٹ
موج میں اپنی میں چڑھتی ہوں　　منزل کی دُھن میں بڑھتی ہوں
اِٹھلاتی ہوں بل کھاتی ہوں　　بہتی ہوں بہتی جاتی ہوں
عزمِ مصمّم کر لو تم بھی　　راہ مقرّر کر لو اپنی
چل نکلو تو چلتے جاؤ　　بڑھ جاؤ تو بڑھتے جاؤ
رکنا اور ٹھہرنا کیسا　　کٹھنائی سے ڈرنا کیسا
منزل پا لوگے تم اپنی　　بچّو! ہے یہ بات یقینی

قومی اردو لائبریری، حمزہ پور، شیرگھاٹی، گیا (بہار)

شری پرساد

ترجمہ : شنو بنت ہنر

غلطی کی اصلاح

اس دن میں پڑھ کر آیا تو اچانک اماں بولیں کہ احمد کے ابو اسپتال میں بھرتی ہیں۔

احمد کے ابو اسپتال میں! مجھے جیسے کرنٹ لگ گیا۔ سچ مچ میں احمد کے ابو کو بہت چاہتا ہوں۔ وہ نیکر کا کام کرتے ہیں۔ تھوڑے پڑھے لکھے بھی ہیں پر شاعری سے بہت پیار کرتے ہیں۔ کبیر اور غالب کے تو پرستار ہیں۔ وہ اکثر مجھے کہا کرتے ہیں "رمیش، تم بھی میرے بیٹے ہی ہو۔ میرے دو بیٹے ہیں احمد اور رمیش!

میں بھی انھیں احمد کی طرح ابو ہی کہا کرتا ہوں اور ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ اماں سے اطلاع ملنے پر جیسے تیسے میں نے رات کاٹی اور صبح ہوتے ہی اسپتال پہنچ گیا۔

جب میں پانچویں منزل پر کمرہ نمبر دو کے بستر نمبر سترہ کے پاس پہنچا تو ابو آنکھیں بند کیے ہوئے غالب کا ہی ایک شعر گنگنا رہے تھے۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی، نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی، بخش دو گر خطا کرے کوئی۔

ابو کے دل میں درد تھا۔ میں نے ان کے پیروں کی طرف کھڑے ہو کر کہا،

"ابو جی، پرنام—"

ارے رمیش بیٹے تم! خوش رہو" انھوں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ بہت خوش ہوئے "بیٹھو، بیٹھو!"

انھوں نے کہا۔ احمد بھی ان کے پاس ہی کھڑا تھا۔ انھوں نے اسے حکم دیا "بیٹا رمیش کے بیٹھنے کے لیے اسٹول اٹھا لاؤ۔"

اسٹول آگیا۔ میں وہیں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ابو میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ میں ان کی تکلیف سمجھ رہا تھا۔ ان کے سر کے کافی حصے میں پٹی بندھی تھی۔ میں نے ان کی تکلیف کے بارے میں پوچھا "ابو جی، آپ کو کیا ہوا؟ یہ چوٹ کیسے لگی ہے؟"

ابو نے دھیرے دھیرے بتانا شروع کیا "بات یہ ہوئی کہ کل میں اپنے غسل خانے میں کھڑا ہو کر نہا رہا تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ کالونی کے پیچھے جو میدان ہے وہاں لڑکے اکثر کھیلا کرتے ہیں۔ کچھ لڑکے ادھر ادھر ڈھیلے بھی پھینکتے رہتے ہیں ایسے ہی کسی لڑکے نے غسل خانے میں لگے شیشے پر ایک ڈھیلا پھینکا۔ ڈھیلا اتنی طاقت سے پھینکا گیا تھا کہ وہ شیشے کو توڑ کر میرے سر میں آلگا۔ میں فوراً بے ہوش ہو کر وہیں بیٹھا رہ گیا۔ میرے سر سے خون بہنے لگا شیشا سر میں دھنس گیا تھا۔

....

اتنا کہ کر ابو ذرا رک کے پھر بولے "بیٹا، میں تو بری طرح چوٹ کھا گیا تھا۔ شیشے کے ٹوٹنے سے جو آواز ہوئی تو گھر کے سبھی لوگ دوڑ پڑے پہلے تو سب ہی نے یہی سوچا کہ بلی نے کوئی سامان گرایا ہوگا، اسی کی آواز

۳۸۵- شاہ گنج۔ الٰہ آباد

ہو گی میری طرف کسی کا بھی دھیان نہیں گیا تھا۔ وہ تو جب ننھا سلیم زور سے چلایا، "ابو کو چوٹ لگ گئی ہے کسی نے پتھر مار کر غسل خانہ کا شیشا توڑ دیا" تب سب کو پتا چلا۔

ساری باتیں سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے کہا، "جس لڑکے نے ڈھیلا مارا اگر وہ مجھے مل جائے تو ...."

لیکن ابو نے مجھے بیچ میں ہی ٹوک دیا، "نہیں بیٹا جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ چوٹ لگنی تھی، تو لگ گئی۔ اب لڑنا جھگڑنا ٹھیک نہیں ہے محلے کا ہی کوئی لڑکا ہو گا۔ اگر پتا چل جائے تو سمجھا دینا۔ کہ وہ پھر کبھی ایسا نہ کرے۔ تین دن پہلے ورما جی کے غسل خانہ کا بھی شیشا ٹوٹا تھا۔ پر اتفاق سے ان کے یہاں کسی کو چوٹ ووٹ نہیں لگی....."

جس وقت ابو یہ سب بتا رہے تھے میرا دھیان احمد پر گیا وہ میرے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر مجھے لگا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک میں ابو کے پاس بیٹھا رہا۔ اس بیچ انھوں نے مجھے ایک بڑا سا سنترا دیا اور ہم سب کے لیے چائے منگوائی۔

لوٹتے وقت انھوں نے احمد کو میرے ساتھ بھیجا "جاؤ، رمیش کو باہر تک چھوڑ آؤ۔" میں انھیں پرنام کر کے چلنے لگا تو انھوں نے دعائیں دیں۔

ہم دونوں اسپتال سے باہر نکلے تو احمد بولا، "یار، ابو کو چوٹ لگنے پر مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا۔"

"ہاں، چوٹ زیادہ لگی ہے میں نے ہی یہ کام کیا ہے، بڑا برا کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن" احمد نے کچھ کہنا چاہا۔

کیا بات ہے، بولو نا! میں نے اس کی ہمت بندھائی۔

تب اس نے ہمت کر کے کہا، "یہی غلطی میں کئی بار کر چکا ہوں، ورما جی کے غسل خانے کا شیشہ میں نے ہی توڑا تھا۔ میرے ڈھیلے سے بھی نہ جانے کس کو، کہاں چوٹ لگی ہو گی۔ ایک دفعہ تو بہت شور ہوا تھا پولیس والے بھی پتا لگانے آئے تھے۔ لیکن میں بچ گیا۔

احمد کو اپنے کیے پر بہت ندامت ہو رہی تھی "کوئی نہیں سوچ سکتا کہ میں بھی ڈھیلے پھینکتا رہا ہوں یہ سب میں نے صرف اپنی دل لگی کے لیے ہی کیا تھا۔ کسی کو چوٹ پہنچانے کی غرض سے نہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے کسی کو چوٹ بھی لگی ہو۔"

غلطی تو کر ہی چکے ہو، میں نے سمجھایا، اب کیا کر سکتے ہو، ہاں مستقبل میں ایسا مت کرنا۔ دیکھو ابو کی کیا حالت ہے کہیں اور زور سے پتھر لگ جاتا تو مشکل ہو جاتی۔"

میں سچ کہتا ہوں، اب ایسا نہیں کروں گا۔ احمد نے بہت افسوس کے ساتھ کہا۔

"ارے مجھے پورا یقین ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے" میں نے اسے اطمینان دلایا پھر سمجھایا، لیکن ورما جی تو پڑوسی ہیں، بھلے آدمی ہیں ان سے تمھیں معافی مانگ لینی چاہیے۔

تم بھی میرے ساتھ چلو میں معافی مانگ لوں گا۔" اس نے مجھ سے کہا

● ●

ہم لوگ تیسرے دن ورما جی کے گھر گئے۔ شام کا وقت تھا وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔

"نمستے چاچا جی،" پہلے احمد نے پھر میں نے کہا۔

آؤ بیٹا آؤ، بیٹھو! کہو کیا بات ہے؟" انھوں نے بہت پیار سے پوچھا ہم لوگ بیٹھ گئے اور تب احمد نے ہکلاتی ہوئی آواز میں پتھر پھینکنے اور شیشا توڑنے کی بات کہہ ڈالی آخر میں معافی بھی مانگی۔

ساری بات سن کر ورما جی بولے، "تم بہت اچھے لڑکے ہو غلطی تو ہو ہی جاتی ہے اور اس کو تسلیم کر لینا اور اچھی بات ہے تم نے اپنی غلطی کو ٹھیک کر لیا یہی کافی ہے۔"

اور جب ہم انھیں پرنام کر کے چلے تو احمد کا من ہلکا ہو گیا تھا۔ اپنی غلطی کو مان کر اس نے صحیح کام کیا تھا اس نے اپنے دل کا ٹوٹا ہوا شیشا جوڑ لیا تھا۔

رحمٰن حمیدی

لالچ کا انجام

یہ پرانے زمانے کی بات ہے۔ چانکیہ مہاراج چندر گپت کا وزیر تھا۔ وہ بہت عقل مند اور ہوشیار، ایماندار اور محنتی بھی تھا۔ پھوس کی معمولی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ اس کی زندگی بہت سادہ تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے لیے خود کھانا پکاتا تھا۔ روٹی اور سبزی پکانے کے لیے آگ بھی وہ خود ہی جلاتا تھا۔ وہ روٹی اپنے ہاتھوں سے بیلتا تھا۔ اس نے کبھی بھی نوکر کا سہارا نہیں لیا۔ اس کے پاس ایک بھی نوکر نہ تھا۔ وہ اپنا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ انسان رتبے کے اعتبار سے چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے ورنہ سبھی انسان برابر ہیں۔ انسان کو اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہیے۔ دوسروں کا سہارا اپاہج اور مجبور لیتے ہیں۔ اس کے دل میں جنتا کی سیوا کا شوق تھا۔ اُس نے بہت سے غریبوں کی مدد کی۔ وہ لوگوں کو ہمیشہ گیان کی باتیں سکھاتا تھا۔

راج دربار میں اس سے زیادہ عقل مند اور کوئی وزیر نہ تھا۔ مہاراج چندر گپت اُسے بہت مانتے تھے۔ اُس کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ رعایا کے اندر بھی وہ ہر دل عزیز تھا۔

چانکیہ ہر گانو کا دورہ کرتا تھا۔ وہاں کے لوگوں سے باتیں کرتا تھا۔ اُن کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اُن کے سُکھ دُکھ میں کام آتا تھا۔ وہ رعایا کے آرام کی فکر میں ہمیشہ رہتا۔ ایک بار وہ گانو کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ننگے پانو تھا۔ وہ گانو گیا اور گانو سے کدال لاکر کانٹے والی جھاڑی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا تاکہ اُس راہ سے آنے جانے والوں کے پانو میں کانٹا نہ چبھے۔ آس پاس جمع ہونے والوں نے تین باتیں سمجھائی تھیں۔
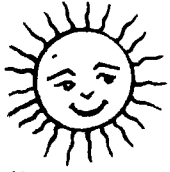
۱۔ تکلیف پہنچانے والی چیز کو جڑ سے ختم کر دینا چاہیے!

۲۔ دشمن پر کبھی بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے!

۳۔ اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہنی چاہیے۔

وہ گانو کے دورے سے واپس آیا تو اُسے نگر کے لالچی لوگوں کی خبر ملی جو اس کی دولت پر آنکھیں لگائے ہوئے تھے وہ لوگ سمجھ رہے تھے چانکیہ کے پاس قیمتی ہیرے جواہرات ہیں۔ اس نے ان لوگوں کو بلا کر اپنی جھونپڑی دکھلا دی۔ اُس کی جھونپڑی میں سونے کے لیے ایک بستر اور کھانا بنانے کے لیے صرف دو برتن تھے۔ تھوڑا سا راشن تھا اور ایک جوڑا کپڑا تھا۔ اپنا سب کچھ دکھلانے کے بعد اس نے کہا:

" لالچ بڑی بلا ہے۔ یہ انسان کو حیوان بنا دیتی ہے۔ میرے پاس کیا ہے۔ تم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میں نے دھن دولت جمع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

اُن لوگوں کو اُس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اُن لوگوں نے سمجھا۔ دولت کہیں چھپا کر رکھ دی گئی ہے، خالی جھونپڑی دکھلائی گئی ہے۔ لالچ نے اُن لوگوں کو اندھا کر دیا تھا۔ دولت کے لیے وہ لوگ چانکیہ کے دشمن ہو گئے۔ اُسے جان سے مار ڈالنے کی کوشش کرنے لگے۔ چانکیہ کو اس بات کی خبر ملی تو اُسے بہت دُکھ ہوا۔ اُس نے ایک بار اور اُن لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو گیا۔ لالچی

محلہ چھوا گودام، گموہ، دھنباد

لوگ اس پر ہنسنے لگے۔ اس کی باتوں کا مذاق اُڑانے لگے۔ وہ لوگ اس انداز سے باتیں کرتے جیسے کہہ رہے ہوں کہ چانکیہ کی دولت اُن لوگوں کی نگاہوں سے کبھی نہیں چھپ سکتی۔ چانکیہ اس طرح کی باتیں سُن کر خاموش ہوگیا۔ وہ اپنی جھونپڑی میں رہنے لگا۔

ایک مہینے کے بعد اُس نے ایک بڑھئی بلایا۔ اس سے لکڑی کا صندوق بنوایا پھر اُس نے سونار سے چاندی کا ایک چھوٹا سا بکس بنوایا۔ چاندی کے بکس میں اس نے ایک طرح کا پاؤڈر رکھ کر بند کیا۔ چاندی کے چھوٹے بکس کو لکڑی کے صندوق میں رکھ کر تالا بند کیا اور جھونپڑی کے پیچھے زمین کے اندر دفن کردیا۔ لالچی لوگ چھپ کر اُس کے سارے کاموں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ اندر ہی اندر بہت خوش تھے۔ ان کی نگاہ میں انسان سے زیادہ دولت کی قیمت تھی۔

وہ لوگ چانکیہ کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ رات کے وقت اُن لوگوں نے چانکیہ کی جھونپڑی گھیر لی۔ وہ اپنے بستر پر گہری نیند میں تھا۔ اُن لوگوں نے جھونپڑی میں چاروں طرف سے آگ لگادی جھونپڑی میں آگ پھیلنے لگی تو اس کی آنکھ کھلی اُس نے جھونپڑی سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ دشمنوں کی وجہ سے نکل نہ سکا۔ چانکیہ اُسی آگ میں جل کر مرگیا۔ اُس کی موت سے لالچی لوگ بہت خوش ہوئے۔ گھر کا سارا سامان جل چُکا تھا۔ انھیں جھونپڑی کے اندر کچھ بھی نہیں ملا تو وہ لوگ زمین کھودنے لگے۔ چند گز کی کھدائی کے بعد انھیں بکس ملا۔ لکڑی کا صندوق دیکھ کر وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے سمجھا کہ چانکیہ کا خزانہ مل گیا۔ لکڑی کے صندوق سے انھیں وہی چاندی کا چھوٹا سا بکس ملا۔ اُسے اُن لوگوں نے کھولا تو دیکھا کہ اُس میں پاؤڈر بھرا ہوا ہے۔ سبھی نے سمجھا کہ یہ کوئی قیمتی چیز ہے۔ سبھی پاؤڈر کی اصلیت جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ لوگ پاؤڈر کو زبان سے چکھنے اور سونگھنے لگے۔ وہ پاؤڈر بہت تیز زہر تھا۔ سونگھنے اور چکھنے کی وجہ سے وہیں گر پڑے اور چند سیکنڈوں میں موت کا شکار ہوگئے۔ لالچ کا انجام واقعی برا ہوتا ہے۔

سویرا

مصدق عبداللہ ٹھاکور

رات کی سیاہ چادر سے
خورشید اُبھر کر آیا ہے
سُرخی سے اُفق کی جھانکا تو
دنیا میں دھما اُجالا ہے
نسیم سحر جو چمن میں چلی
کلیوں نے چمن مہکایا ہے
مُرغوں کی بانگ، کوئل کی کوک
سُن سُن کے چمن لہرایا ہے
شبنم کی ننھی بوندوں نے
چڑیوں کو وضو کروایا ہے
بُلبُل نے خدا کی حمد کہی
مینا نے اسے سراہا ہے
ٹھاکور اب تم بھی اُٹھ جاؤ
ہونے کو اب سویرا ہے

ٹھاکور واڑی ہدیو گڑھ، سندھو دُرگ

محمد آصف زہری

چالاکی

بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ کسی راستے کے کنارے ایک تالاب تھا جس کے چاروں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اس میں ایک شیر اور اس کے تین دوست بھی رہتے تھے ایک دوست کوا دوسرا بھیڑیا اور تیسرا ایک گدھا تھا۔ شیر شکار کرکے کھاتا۔ اس کا بچا ہوا تینوں کھاتے تھے۔

ایک دفعہ ادھر سے قافلہ گزرا جس میں سے ایک اونٹ بچھڑ گیا۔ وہ گھومتے گھامتے جھاڑی کے قریب پہنچا شیر نے اسے دیکھا تو اس کی بڑی عزت کی اور پوچھا کہاں سے آئے ہو غرض کیا ہے۔ تب اونٹ نے بتایا کہ ایک قافلہ جو ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہا تھا میں بھی اس میں تھا مگر بچھڑ گیا ہوں۔ شیر نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اس کو امان دی اور کہا کہ تم کھاؤ پیو تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

کچھ دنوں کے بعد شیر ایک شکاری کے ہاتھوں بری طرح زخمی ہو گیا اور شکار کرنے کے قابل نہ رہا اس کے شکار نہ کرنے کی وجہ سے کوا بھیڑیا اور گدھا کو بھی کھانے کو نہیں ملتا تھا انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیوں نہ شیر سے کہا جائے کہ وہ اونٹ کا شکار کر لیں۔

کوا بھیڑیا اور گدھا تینوں شیر کے پاس پہنچے اور کہا حضور آپ کی طبیعت بہت خراب ہے اور کھانا نہ کھانے کی وجہ سے لاغر ہوتے جا رہے ہیں کیوں نہ اس گھاس خور اونٹ کا شکار کر لیتے۔ یہ سن کر شیر بہت غصہ ہوا کہا کہ جس کو میں نے امان دی اس کو مارنے کو کہہ رہے ہو۔ بھیڑیا یہ سن کر بولا حضور وہ خود ہی اپنے ہی آپ کو کھانے کے لیے پیش کرے تو شیر نے کہا وہ کیسے۔

بھیڑیے نے بتایا کہ ہم سب جب اکٹھا رہیں گے تب ہم سب اپنے آپ کو پیش کریں گے کہ آپ ہم کو کھائیں اور ہم سب اپنے اپنے گوشت کی تعریف کریں تو اونٹ بھی کرے گا۔ بس اس پر حملہ کر دیجیے گا۔ بادشاہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ میرا وعدہ بھی نہیں ٹوٹے گا اور کام بھی ہو جائے گا۔

شام کو جب چاروں شیر کے پاس جمع ہوئے تو کوا بولا "حضور والا بے شک ہم لوگ آپ کی وجہ سے زندہ ہیں اگر آپ نہ ہوتے تو ہم فنا ہو جاتے آپ کی صحت اس وقت ٹھیک نہیں ہے بادشاہ سلامت کو چاہیے کہ مجھ کو کھائیں میرا گوشت زخم کے لیے بے حد مفید ہے۔ گدھا بول اٹھا: بادشاہ سلامت آپ ہرگز اس کے گوشت کو نہ کھائیے اس کا گوشت نہایت بدبودار ہوتا ہے میں بھی آپ کی وجہ سے زندہ ہوں جب آپ بیمار ہیں تو میرے جینے سے کیا فائدہ۔ اس لیے آپ مجھ کو کھائیں۔ اب کوا اور گدھا اس بات پر جھگڑنے لگے کہ ہم کو کھائیے ہم کو کھائیے۔

تب بھیڑیا کھڑا ہوا اور بولا حضور والا دونوں کا گوشت

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

بہت خراب ہوتا ہے نقصان وہ بھی ہے اور ان دونوں پرندوں میں تو خالی بال ہی ہوتے ہیں گوشت تو ہوتا ہی نہیں میں نے بھی آپ کا نمک کھایا ہے آپ مجھ کو کھائیں۔

اونٹ جو بیٹھا یہ سب سن رہا تھا اس نے سوچا کہ اگر میں اپنے آپ کو نہ پیش کروں تو بری بات ہوگی اور شیر نے مجھے امان دی ہے اور اس نے کسی کا گوشت نہیں کھایا، میرا بھی نہیں کھائے گا وہ کھڑا ہوا اور کہا، "بادشاہ سلامت ان تینوں کا گوشت بدمزہ ہوتا ہے بدبو بھی آتی ہے۔ کیوں نہ آپ میرا گوشت کھا لیتے میرا گوشت بہت ہی لذیز اور عمدہ ہے!"

شیر جو حملہ کے لیے تیار بیٹھا تھا فوراً حملہ کر بیٹھا اور چاروں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔

محمد عبید اللہ شریف

کرامت چاہو

پرانے زمانہ میں ایک راجا راج کرتا تھا۔ اس کے دور میں پرجا بہت خوش اور مرفع الحال تھی۔

راجا کو صرف ایک ہی غم تھا۔ وہ جذام کا مریض تھا کئی حکیموں اور ویدوں نے علاج کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

ایک دن ایک غیر ملکی ڈاکٹر دربار میں حاضر ہوا۔ اور راجا سے عرض پرداز ہوا کہ مہاراج کا علاج میں کرسکتا ہوں چونکہ راجا علاج سے مایوس ہوگیا تھا۔ اس لیئے اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ مرض لاعلاج ہے اب یہ میرے مرنے کے بعد ہی ختم ہوگا۔

ڈاکٹر نے کہا میری بھی دوائیں آزمایئے۔ بالآخر راجا رضامند ہوگیا۔

دوائیں کام کرنے لگیں اور راجا کا مرض دور ہونے لگا اور کچھ دن کے علاج سے راجا اچھا ہوگیا۔

راجا ڈاکٹر سے بہت خوش ہوا اور اس کو اپنے دربار میں عہدہ دیدیا اور ہر معاملہ میں ڈاکٹر سے مشورہ دینے لگا

یہ بات وزیر کو بہت بری لگی وہ روزانہ راجا کے سامنے ڈاکٹر کی برائی کرنے لگا۔

ایک دن راجا کو بہت غصہ آیا اور ڈاکٹر کو سزائے موت دینے کا حکم دے دیا۔

ڈاکٹر نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی اور اس ایک ہفتہ میں ایک کتاب تیار کرکے راجا کو تحفہ میں دی۔ اور کہا کہ میرے مرنے کے بعد ہی کتاب کو کھولا جائے۔

ڈاکٹر کو سزائے موت دے دی گئی۔ راجا نے بڑے اشتیاق سے کتاب کو کھولنا چاہا لیکن ورق آسانی سے جدا نہیں ہو رہے تھے اس لیے راجا انگلی کو زبان سے تر کرکے ورق الٹنے لگا۔ ایک صفحہ پر لکھا تھا اور پانچ ورق ایسے پانچویں صفحہ پر لکھا تھا۔ آپ پانچ منٹ کے مہمان ہیں۔

راجا اس جملہ کو دوبارہ پڑھ رہا تھا کہ گر کر مر گیا سارے درباری پریشان ہو گئے اور اس معمہ کو حل کرنے کے لیے وزیر ورق الٹنے لگا۔ اور وہ بھی گر کر مر گیا کیوں کہ کتاب کے اوراق میں زہر لگا ہوا تھا۔

اس لیے کہتے ہیں کچھ کرنے سے پہلے غور کرنا چاہیے۔

فارم IV حسب قاعدہ

بابت "پیام تعلیم" نئی دہلی ۲۵

۱۔ مقام اشاعت: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۔ وقفۂ اشاعت: ماہنامہ

۳۔ پرنٹر کا نام: سید احمد ولی ہندستانی۔ پتا: جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

۴۔ پبلشر کا نام: " " " "

۵۔ اڈیٹر کا نام: " " " "

مالکان کے نام اور پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

چیرمین: پروفیسر محمد مجیب۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۱۔ ڈائریکٹر۔ کرنل بشیر حسین زیدی: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۔ " نواب افتخار محمد خاں۔ کف پریڈ کولابہ بمبئی ۵

۳۔ " سید مجتبیٰ حسین زیدی جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۴۔ " ضیاء الحسن فاروقی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۵۔ " مالک رام: بوبجہ، سی ۴۔۵۰ ڈفنس کالونی، نئی دہلی ۲۴

۶۔ " انور جمال قدوائی وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایے کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ اسلامی جیم خانہ کنیڈی سی فیس بمبئی ۷

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

۱۹۸۴ء　　سید ولی احمد

ہونہار طالب علم

محمدیہ ہائی اسکول کی جماعت ششم کے متعلق شیخ رضوان احمد کا انتخاب مہاراشٹر کی باسکٹ بال ٹیم کی قیادت کے لیے کیا گیا ہے۔

اس ہونہار طالب علم کی قیادت میں مہاراشٹر ٹیم نے آل انڈیا منی نیشنل باسکٹ بال چمپئین شپ منعقدہ بھلواڑہ راجستھان ۳ ر اکتوبر سے ۱۱ر اکتوبر تک شرکت کی۔ اور کھیل میں شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے تماشبینوں کو خوش کر دیا۔

ذکریا اگاڑی اردو ہائی کو انعام

عنایتیہ اردو ہائی اسکول ناندورہ میں پیر ۱۹ر دسمبر ۸۳ کو بعنوان "سیرت النبی" طلبہ طالبات نے تقریری انعامی مقابلے ہوئے۔ جس میں اس اسکول کے درجہ دہم کی طالبہ سروش انجم اور طالب علم محمد امین نے پہلا انعام (شیلڈ) حاصل کیا جناب ذبیح اللہ خان کے زیر نگرانی طلبہ تیار کیے گئے۔

اردو پرائمری اسکول نمبر ۲۸ مالیگاؤں کے ہفتم جماعت کے طالب علم مختار احمد ابیاض احمد نے مالیگاؤں میں منعقدہ سیرۃ النبی تقریری مقابلے میں جونیئر گروپ کے طلباء میں دوسرا انعام حاصل کیا۔

---

۱۵ جنوری ۸۴ء کو بھیونڈی میں ہونے والے آل مہاراشٹر سیرت النبی تقریری مقابلے میں، اردو پرائمری اسکول نمبر ۲۸ مالیگاؤں کے جماعت چہارم کے طالب علم عبدالماجد محمد الیاس نے جونیئر گروپ کے طلباء میں تیسرا انعام حاصل کیا۔

جج ملزم سے :۔ تمہیں شرم آنی چاہیئے کہ تم آٹھویں بار عدالت میں آئے ہو۔

ملزم : حضور گستاخی معاف۔ مجھ سے زیادہ آپ کو شرم آنی چاہیے کیوں کہ آپ روز آتے ہیں۔

ایم۔ امتیاز شبنم شفیق وانمباڑی

سلیم : میرے خاندان والوں نے کبھی کسی کی نوکری نہیں کی

بھولا : تو پھر کیا کرتے تھے

سلیم : بھیک مانگتے تھے۔

صداقت حسین ہپو ، رحمت نگر برہمپور

مہمان نے میزبان سے ازراہ مذاق کہا۔

"کیا بات ہے کہ جب میں کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تمہارا کتا مجھے گھورتا ہے۔"

میزبان نے جواب دیا

اپنی پلیٹ پہچانتا ہے۔

محمد فہیم

کرایہ دار : عجیب واہیات مکان ہے تمہارا۔ ساری رات چار چوہے آپس میں لڑتے دیکھے گئے۔

مالک مکان : (غصہ سے) تو کیا پچاس روپے میں تم ببر شیروں کی لڑائی دیکھنا چاہتے تھے۔

محمد فیض شافع ، بلقیہ ہاؤس جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

نام : محمد شہباز اشرف — عمر ۱۲ سال

مشغلہ : پیام تعلیم اور دوسری اچھی کتابیں اور رسالے پڑھنا، نماز پڑھنا کلاس کی کتابوں کو پڑھنا اور طرح طرح کے کھیل کھیلنا وغیرہ۔

پتا : معرفت محمد نعیم الدین اشرف، برنپور، آسنسول نمبر ۳ ئی۔ نیوٹاؤن روڈ نمبر ۳

نام : محمد ارشاد عالم اوگانوی — عمر ۱۴ سال

مشغلہ : کیرم کھیلنا، بچوں کے رسائل میں حصہ لینا، قلمی دوستی کرنا

پتا : معرفت، ساحل اوگانوی "عالم منزل" اوگانواں، نالندہ (بہار) ۸۱۱۱۰۲

نام : علیم الدین — عمر ۱۴ سال

مشغلہ : دوستوں کے خطوط کا جواب دینا، بڑوں کی عزت کرنا۔ پیام تعلیم پڑھنا، تبلیغی جماعت میں شرکت کرنا۔

پتا : فت فیاض الدین، نواب پورہ، اورنگ آباد، ۴۳۱۰۰۱

نام : محمد طارق — عمر ۱۴ سال

مشغلہ : کہانیاں پڑھنا، کرکٹ کی کمنٹری سننا، تاریخی مقامات کو دیکھنا۔

پتا : فت محمد علی، چودھریان، بلند شہر

نام : شیخ الانعام — عمر ۱۴ سال

مشغلہ : ہاکی کھیلنا، نماز پڑھنا، کہانیاں پڑھنا۔

پتا : محلہ کوٹ، اعظم گڑھ ۲۷۶۰۰۱

جا سکتا ہے اور تعمیری کاموں میں بھی۔
یہاں اس پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ ملک اور قوم کا فائدہ اسی میں ہے کہ طلبہ اپنی تمام تر صلاحیتیں تعمیری کاموں میں صرف کریں۔
حیدر علی۔ ۸۴۱ حویلی اعظم خاں چتلی قبر دہلی

وزیر کا ایمان

عرصہ ہوا کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا بادشاہ کا وزیر بڑا نیک تھا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے حادثہ کو خدا کی مرضی سمجھتا تھا۔ اس طرح سے وہ ہر بڑے حادثے کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ شکار کے لیے وزیر کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ جنگل میں بادشاہ کو ایک خوبصورت ہرن دکھائی دیا۔ بادشاہ نے ہرن کو زندہ پکڑنے کی خاطر اس کے پیچھے اپنا گھوڑا دوڑایا۔ وزیر بھی بادشاہ کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑے پر چلا آرہا تھا۔ یکایک بادشاہ گھوڑے پر سے گر پڑا گرتے وقت بادشاہ کا ہاتھ ایک تیز نوکدار کانٹے پر پڑا اور انگلی کا اوپری حصہ کٹ کر الگ ہوگیا۔ اتنے میں بادشاہ کا وزیر بھی وہاں آپہنچا اس نے دوا وغیرہ لگا کر خون کا بہاؤ روک دیا۔ بادشاہ کو اس اچانک حادثہ پر بڑا غصہ آیا اور برا بھلا کہنے لگا۔ وزیر نے کہا خدا کا ہر کام اچھائی کے لیے ہوتا ہے۔ وزیر کی یہ بات سن کر آگ بگولہ ہوگیا اور وزیر کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

واپسی پر وزیر ایک اونچے ٹیلے سے اتر رہا تھا۔ بادشاہ نے موقع غنیمت جانا اور وزیر کو نیچے ڈھکیل دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہوکر ایک طرف چل دیا۔ بادشاہ پگڈنڈی پر گھوڑا دوڑانے لگا۔ راستے میں اسے دو آدمی ملے انھوں نے گھوڑا روک کر بادشاہ کو پکڑ لیا۔ گھوڑے کو بھی وہ ساتھ لے کر چلنے لگے۔ پہلے تو بادشاہ نے سمجھا کہ وہ ڈاکوؤں کی گرفت میں ہے لیکن بادشاہ کو بعد میں پتا چلا کہ وہ لوگ اسے اپنے دیوتا کے لیے بھینٹ چڑھانے لے جارہے ہیں۔ آخر کار وہ بادشاہ کو لے کر اس جگہ پہنچے جہاں پر دوسرے کئی شخص تھے

بچوں کی کوششیں

آج کا طالب علم

آج کا طالب علم ڈاکٹر بن رہا ہے، انجینیر بن رہا ہے۔ بہادر سپاہی بن رہا ہے، ادیب بن رہا ہے۔ فن کار بن رہا ہے۔ اس کے علم و فن سے نہ صرف خود اس کی ذات کو فائدہ ہوگا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کو بھی فروغ حاصل ہوگا آج کی زندگی کا ایک پہلو طلبہ میں بڑھتی ہوئی بےچینی بھی ہے جو ہمارے سامنے مظاہروں ہڑتالوں اور دوسری صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان چیزوں کا اثر خود طالب علم کی اپنی زندگی اور مستقبل پر بھی پڑتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس صورت حال کے لیے صرف اکیلا طالب علم ذمہ دار ہے یا اس کے ساتھ پورا تعلیمی نظام۔ معاشرہ اور ارباب حکومت ذمہ دار ہیں۔ ان سوالات کا جواب اتنا آسان نہیں ہے کہ دو لفظوں میں بیان کر دیا جائے اور نہ یہاں اس کا کوئی موقع ہے۔ طالب علم کی بے چینی کسی نادانی کا سبب ہے یا ذہنی بیداری کا سبب۔ اس سوال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ کسی بھی مرض کو ختم کرنے کے لیے مرض کے علاج سے پہلے اس کے اسباب دریافت کرنا ضروری ہے۔
طالب علم سماج کا ایک نوجوان فرد ہے۔
جو امنگ، حوصلہ اور شوق سے بھرپور ہوتا ہے۔
اس کی ان صلاحیتوں کو تخریبی کاموں میں بھی لگایا

دراصل بات یہ تھی کہ وہ لوگ ایک دوسرے آدمی کو بھینٹ چڑھانے
کی غرض سے لائے تھے مگر وہ آدمی موقع پاکر فرار ہوگیا۔ اس کے
تلاش میں نکلے تو اس کے بجائے بادشاہ مل گیا چنانچہ وہ لوگ
بادشاہ کا قتل کرنا چاہتے تھے۔ بادشاہ نے ان لوگوں کی منت
سماجت کی، بڑے سے بڑے انعام کا لالچ دیا مگر وہ لوگ
راضی نہیں ہوئے۔ آخر کار بادشاہ کی موت کا وقت قریب
آگیا۔ ایک آدمی ہاتھ میں تلوار لیے آگے بڑھا بادشاہ نے
خوف سے آنکھیں بند کرلیں اچانک آدمی کی نظر بادشاہ
کی کٹی ہوئی انگلی پر پڑی اور اس نے تلوار کھینچ لی۔ بات
یہ تھی ان کے عقیدے کے مطابق عیب دار شخص کو دیوتا
کے بھینٹ کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں
نے بادشاہ کو رہا کردیا۔

بادشاہ کو جب پتا چلا کہ اس کی کٹی ہوئی انگلی اس کی
رہائی کا سبب بنی تو اسے احساس ہوا کہ واقعی وزیر کا
کہنا ٹھیک تھا اب اسے خیال ہوا کہ اس نے ناحق اپنے
وزیر کو ایک سچی بات بتانے پر سزا دی۔ اس نے سوچا کہ
پتا نہیں وزیر کا کیا انجام ہوا ہوگا وہ فوراً اس مقام پر
پہنچا جہاں وزیر کو گرایا تھا۔ وہاں پر کیا دیکھتا ہے کہ وزیر
زندہ ہے اور خدا کی عبادت میں مصروف ہے۔ جیسے ہی
وزیر عبادت سے فارغ ہوا بادشاہ نے اسے اپنے گلے
سے لگا لیا اور اپنے کیے کی معافی مانگی اور سارا حال سنایا
اور اس وقت بادشاہ نے بھی اعتراف کرلیا کہ "خدا کے ہر
کام میں کوئی نہ کوئی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔"

حسن جلیس دیوبندی

ماں

کیا آپ جانتے ہیں کہ ماں کسے کہتے ہیں؟ ماں اسے
کہتے ہیں جس کے پاؤں تلے جنت ہے۔ دنیا میں اگر کسی کے
پاس سب سے بڑی دولت ہے تو وہ ماں اور صرف ماں
ہے۔ لیکن دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اپنی ماں
کو کچھ بھی نہیں سمجھتے جس ماں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔
جس ماں کی گود میں پل کر بڑے ہوتے ہیں۔ بڑے ہونے
کے بعد اسی ماں کو گالیاں وغیرہ دینا شروع کرتے ہیں۔
وہ یہ نہیں سوچتے ہیں کہ ماں کا درجہ کتنا بلند ہے۔ اور یہ
نہیں سوچتے ہیں کہ ماں کی گود ہی انسان کی سب سے
اوّل درس گاہ ہے۔ ایسا سوچنے والے اور سمجھنے والے
اس دنیا میں بہت ہی کم اشخاص ہیں۔ اس دنیا میں
کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اپنی بیوی کی چغلی وغیرہ سن کر
ماں کو گالیاں دیتے ہیں اسے بے عزت کرتے ہیں۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ جو اشخاص ابھی
تک ماں جیسی چیز کو نہیں سمجھے ہیں اللہ انہیں سمجھنے کی
توفیق دے۔ آمین۔

سید یونس: لوہار لاین (دیوبند)

کچھ ملکوں کے قدیم نام

	موجودہ نام		قدیم نام
(۱)	ایتھوپیا	(۱)	ابی سینیا
(۲)	زائیر	(۲)	بلجیم کانگو
(۳)	گھانا	(۳)	گولڈ کوسٹ
(۴)	ریپبلک آف ملاگاسے	(۴)	مڈغاسکر
(۵)	ملاوی	(۵)	نیاسالینڈ
(۶)	زمبیا	(۶)	شمالی رہوڈیشیا
(۷)	زمبابوے	(۷)	جنوبی رہوڈیشیا
(۸)	ٹوگو	(۸)	ٹوگولینڈ
(۹)	نیدرلینڈس	(۹)	ڈچ ویسٹ

محمد عابد الحق، جماعت ہشتم، اسلام پیٹھ، وشاکھاپٹنم

سونے چاندی کے سکوں کی بارش

کسی زمانے کی بات ہے کہ ایک پہاڑی گانوں میں
ایک ننھی منی بچی رہا کرتی تھی۔ وہ بڑی نیک اور رحمدل
تھی۔

اس لڑکی کے ماں باپ دونوں مرچکے تھے۔ اس

دنیا میں اب وہ بالکل اکیلی تھی۔ اس کے پاس نہ تو رہنے کے لیے کوئی جگہ تھی نہ سونے کے لیے بستر، نہ پہننے کے لیے کپڑے اور نہ کھانے کے لیے اناج۔ سوائے خدا کے اس کا کوئی اور سہارا نہ تھا۔ اس لڑکی کی کل کائنات وہ کپڑے تھے جو اس کے بدن پر تھے یا ایک روٹی جو اس کے کوٹ کی جیب میں تھی اسے ایک مہربان آدمی نے دے دی تھی۔

گزر بسر کی جب کوئی صورت نہ رہی تو ننھی لڑکی نے گانو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور خدا کا نام لے کر شہر کی طرف چل پڑی تاکہ وہاں جاکر کوئی نوکری یا کام ڈھونڈے۔

اس نے سوچا' خدا سب کی مدد کرتا ہے، سب کو روزی دیتا ہے، سب کی خبر گیری کرتا ہے۔ وہی میری بھی خبر گیری کرے گا۔

ننھی لڑکی شہر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ راستے میں اُسے ایک بیمار بوڑھا آدمی ملا۔ اس آدمی نے لڑکی سے کہا:
"بیٹی میں بہت بھوکا ہوں۔ میری جان نکلی جا رہی ہے بھوک سے۔ خدا کے لیے مجھے کچھ کھانے کو دو" لڑکی نے جیب سے روٹی نکال کر بوڑھے آدمی کو دے دی اور کہا "بابا بس یہی ایک روٹی ہے میرے پاس۔" اس کے بعد لڑکی نے قریب ہی بہتے ہوئے چشمے سے ٹھنڈا پانی لاکر بوڑھے آدمی کو پلایا اور یہ کہہ کر وہاں سے چل دی کہ "خدا آپ کی مدد کرے۔"

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئی ہو گی کہ اسے ایک چھوٹا سا لڑکا روتا ہوا نظر آیا۔ لڑکی نے اس کے پاس جاکر پوچھا۔ "تم کیوں رو رہے ہو بھیا"؟

لڑکے نے جواب دیا "سردی کی وجہ سے میرا سر پھٹا جا رہا ہے مجھے بہت ٹھنڈ لگ رہی ہے خدا کے لیے مجھے کوئی گرم کپڑا دو تاکہ میں اپنا سر ڈھانک لوں۔ ورنہ میرا دم نکل جائے گا۔"

لڑکی نے اپنی گرم ٹوپی اور مفلر اتار کر اس لڑکے کو دے دیا اور آگے چل پڑی۔

کچھ دور چلنے کے بعد اُسے ایک دبلی پتلی لڑکی ملی جو سردی سے بری طرح کانپ رہی [illegible] کا جسم [illegible] وجہ سے نیلا ہو رہا تھا۔ ننھی بچی کو اس پر [illegible] ترس آیا۔ اس نے اپنا گرم کوٹ اتار کر اس لڑکی کے حوالے کر دیا اور خدا کا نام لے کر آگے بڑھ گئی۔

کچھ دور اور آگے بڑھنے پر ایک بچے نے اس کی قمیص مانگی، اس نے اپنی قمیص بھی اتار کر بچے کو دے دی اور خدا پر بھروسہ کر کے آگے چل دی۔

سورج ڈوبنے کے قریب وہ جنگل کے پاس پہنچی اب اندھیرا ہونے لگا اور تارے نظر آنے لگے۔ اسے جنگل سے لوٹتے ہوئے لکڑی کاٹنے والی ایک غریب لڑکی ملی۔ جس نے اس سے فلالین کا گرم سایا مانگا۔

اس رحمدل لڑکی نے سوچا اب رات تو ہونے ہی والی ہے۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا پھر کون دیکھے گا مجھے۔ گرم کپڑے نہ سہی۔ ذرا سی تکلیف ہی ہوگی اور کیا ہو گا۔ گزارنے کے لیے بنیائن اور جانگھیا کافی ہے اس نے اپنا فلالین کا گرم سایا بھی لکڑی کاٹنے والی لڑکی کو دے دیا۔ اب دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جسے وہ اپنی کہہ سکے۔ لڑکی نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک پیڑ کے پاس کھڑی ہو کر آسمان پر بکھرے تاروں کو دیکھنے لگی۔

اسے وہاں کھڑے ہوئے ابھی کچھ ہی پل گزرے تھے کہ چند چمکتے ہوئے ستارے آسمان سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آگرے۔

پھر اس کے کانوں میں آواز آئی۔ "ڈرو نہیں انھیں اٹھا لو۔ یہ خدا کی طرف سے تمہارا انعام ہے۔"

ننھی بچی نے جب ڈرتے ڈرتے انھیں اٹھایا تو اسے دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ یہ سونے چاندی کے چم چم چمکتے ہوئے قیمتی سکے ہیں۔ پاس ہی اسے ایک گٹھری بھی ملی جس میں فر کا نرم نرم کوٹ، عمدہ گرم فراک، خوبصورت سوئٹر، خوش رنگ موزے اور ایک آرام دہ ٹوپی تھی۔ یہ جوڑا اس جوڑے سے ہزار گنا بہتر تھا۔ جو اس نے بانٹے

بچی نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ان کپڑوں کو پہن لیا پھر سونے اور چاندی کے سکے اٹھا کر اس نے اپنی جیب میں بھر لیے اور خوشی خوشی اپنے گاؤں واپس لوٹ آئی۔

گاؤں میں اس نے اپنے لیے ایک چھوٹا سا گھر بنوالیا اس گھر میں ایک خوب صورت باغ تھا جس میں رنگ برنگے پھول کھلتے ان پھولوں کی خوشبو دور تک پھیلی رہتی۔ باغ میں ایک تالاب بھی تھا۔ جس میں سفید، سنہری، لال، ہری، نیلی ہر رنگ کی مچھلیاں تیرتی رہتیں۔ بچے آتے باغ میں کھیلتے اور مچھلیوں کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ (جرمنی کہانی)

محمد قاسم، اردو ہائی اسکول و اردو جونیئر کالج آف آرٹس، پوسد، ضلع ایوت محل

لالچ کا انجام

کسی گاؤں میں دو دوست رہتے تھے۔ دونوں ایک ہی مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایک کا نام احمد تھا۔ یہ بڑا نیک ایماندار اور ہوشیار تھا۔ دوسرے کا نام امجد تھا۔ یہ بڑا لالچی گھمنڈی اور اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتا تھا۔ اس کو اپنی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اپنے دوست احمد کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے احمد کو بہت دکھ ہوتا تھا۔

ایک روز احمد کی ماں بیمار ہو گئی۔ احمد نے خدا کے دربار میں جا کر دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد اپنی ماں کے صحت کے لیے دعا کرنے کے بعد جیسے ہی وہ مسجد سے باہر نکلا، ایک پرندے کو زخمی پڑا پایا۔ احمد اس پرندے کو فوراً اپنے ہاتھ میں اٹھا کر اپنے گھر لے گیا اور اس کی مرہم پٹی کی۔ چند دنوں بعد زخمی پرندہ صحت یاب ہو کر اڑ گیا۔

کچھ دنوں بعد پھر وہی پرندہ آکر احمد کے ہاتھ پر بیٹھتا ہے اور اس کے ہاتھ میں دو دانے رکھ کر اڑ جاتا ہے۔ احمد اس دانے کو بو دیتا ہے۔ چند دن بعد ان دانوں سے پیڑ اگ کر پھل دیتے لگتے ہیں۔ احمد کی ماں بہت غریب تھی وہ کسی کے گھر میں کام کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی تھی

ایک روز کام نہ ملنے کی وجہ سے احمد اور اس کی ماں اس درخت سے پھل توڑتے ہیں۔ احمد بسم اللہ کہہ کر اس پھل کو کاٹنا شروع کرتا ہے تاکہ اپنی بھوک کو مٹا سکے لیکن اس پھل میں انار کے دانے کی بجائے ہیرے اور موتی نکلنے شروع ہو گئے۔ دونوں نے خوش ہو کر خدا کا شکر ادا کیا اور موتیوں کو بازار میں فروخت کر کے خوب دولت حاصل کر لی۔ یہ قصہ اتنا پھیلا کہ امجد کو بھی پتہ چل گیا۔ تو امجد نے احمد سے دوستی بڑھا کر سارا ماجرہ حاصل کر لیا۔

ایک دن امجد اسکول سے گزر رہا تھا تو راستے میں ایک پرندہ بیٹھا ہوا تھا۔ امجد نے اس کو پتھر مار کر زخمی کر دیا اور اپنے گھر لے جا کر اس کی مرہم پٹی کی تاکہ اس کے ذریعے دولت حاصل کر سکے۔ اسی طرح وہ پرندہ بھی صحت یاب ہو کر اڑا اور چند دنوں بعد امجد کے ہاتھ میں دو دانے رکھ کر چلا گیا۔ امجد نے اس دانے کو بو دیا۔ چند دنوں کے بعد اس میں سے پیڑ اور پھل نکل آئے تو امجد نے خوشی خوشی سے اس پھل کو کاٹنا شروع کیا۔ دولت رہنے کے باوجود دولت مند بننے کی خواہش نے اس پھل میں ہیرے اور موتی نکلنے کی بجائے سانپ نکل آئے اور امجد کے ہاتھ کو ڈس لیا۔ امجد کو لالچ، غرور اور گھمنڈ کی سزا مل چکی اور وہ اسی وقت ٹھنڈا ہو گیا۔

ایم امتیاز/ ایس شفیق ۲-۱۰۰ نیو اسٹریٹ، وانمباڑی

اندھیرے کا چراغ

کسی گاؤں میں ایک اندھا بوڑھا آدمی اور اس کا چھوٹا لڑکا نعمان رہا کرتے تھے۔ بوڑھے کا نام شرافت علی تھا لیکن گاؤں کے سب بچے انھیں شرفو بابا کہتے تھے۔ شرفو بابا اپنے ہاتھ سے باندھ بنتے اور انھیں شہر میں بیچ آتے اور شام کو اندھیرے میں گھر واپس آتے تھے۔ جب وہ شہر سے واپس لوٹتے تو نعمان کے لیے سیب مزدور لے جاتے۔ شرفو بابا

حسبِ معمول ہاتھ میں لال ٹین لیے راستہ پار کرتے چلے جارہے
تھے۔ ابھی وہ اپنے گاؤں کے قریب ہی پہنچے تھے کہ سڑک پر
پڑے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ ان کے ہاتھ کے سارے
سیب بکھر گئے انھوں نے پھلوں کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش
کی لیکن سب سیب مل نہ سکے۔

سڑک کی دوسری طرف ایک لڑکا جا رہا تھا۔ شرفو بابا
نے پیروں کی آہٹ سنی تو بولے "بھائی صاحب میرے
پھل تلاش کر دیجیے۔" "ہٹ بڈھے میں تیرے پھل کیوں
ڈھونڈوں تیرے پاس لالٹین ہے اس سے ڈھونڈ لے"
وہ لڑکا بولا "شرفو بابا بولے "بھائی صاحب ناراض کیوں
ہوتے ہو، اگر میں تلاش کر پاتا تو آپ سے مدد کیوں مانگتا
میں تو اندھا ہوں۔" لڑکا بولا اندھے ہونے کے ساتھ
ساتھ تم بیوقوف بھی ہو۔ جب تم دیکھ نہیں سکتے تو اپنے
ساتھ لالٹین کیوں لیے جا رہے ہو۔" شرفو بابا نے ہنستے
ہوئے کہا" "یہ لالٹین میرے لیے نہیں تم جیسے لوگوں کے
لیے ہے"

"وہ کیسے" لڑکا نرم لہجے میں بولا۔

شرفو بابا بولے "جب لوگ میرے ہاتھ میں لالٹین
دیکھیں گے۔ تو وہ مجھ سے نہیں ٹکرائیں گے، ساتھ ہی ساتھ
یہ لالٹین اندھیرے میں تم جیسے لوگوں کو راستہ دکھائے گی۔"
یہ سن کر لڑکے کا دل پسیج گیا۔

وہ شرفو بابا کے پیروں پر گر پڑا اور اس نے شرفو بابا
کے سارے پھل اٹھا دیئے اور چلا گیا۔

سید منصور حسین رضوی ۱۰۳، ترین شاہجہاں پور

سچی کہانی رسول اللہؐ کی زبانی

ایک دن حضورؐ صحابہ کے ساتھ بیٹھے تھے، آپؐ نے فرمایا
کہ کوئی شخص کسی جنگل میں تھا کہ یکایک اس نے بدلی کی
یہ آواز سنی کہ فلاں شخص کے باغ کو پانی دے۔ اس آواز
کے ساتھ وہ بدلی چلی اور ایک کوہستان میں خوب پانی برسا۔
اور تمام پانی ایک نالے میں جمع ہو کر چلا۔ یہ آدمی اس
پانی کے پیچھے چلا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک آدمی اپنے باغ میں
کھڑا بیلچے سے پانی بھر رہا ہے۔ اس نے باغ والے سے
پوچھا کہ اے خدا کے بندے تیرا کیا نام ہے؟ اس نے
وہی نام بتایا جو اس نے بدلی سے سنا تھا۔ پھر باغ والے
نے دریافت کیا کہ اے نیک بخت آپ میرا نام کیوں
دریافت کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں نے اس بدلی میں
جس کا یہ پانی ہے ایک آواز سنی کہ تیرا نام لے کر کہا
کہ اس کے باغ کو پانی دے۔ تو ایسا کیا عمل کرتا ہے
کہ اس قدر مقبول ہے۔ اس نے کہا جب تو نے پوچھا
تو مجھے کہنا ہی پڑا۔ میں اس کی کل پیداوار کو دیکھتا
ہوں اور ایک تہائی خیرات کر دیتا ہوں۔ ایک تہائی
اپنے بال بچوں کے لیے رکھ لیتا ہوں اور ایک تہائی
پھر اس باغ میں لگا دیتا ہوں۔

سبحان اللہ جو خدا کی اطاعت کرتا ہے تو غیب
سے اس کا کام انجام پاجاتا ہے۔ یعنی جو خدا کا ہو گیا
تو خدا اس کا ہو گیا۔

ایم سیف الدین انصاری، شمع بک سٹال الہ آباد

بھلا آدمی

ایک تھے مرزا جیون شاہ جہاں آبادی رہتے تھے
لکھنؤ میں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ اپنے کچھ دوستوں
کے ساتھ اپنے مکان کے کوٹھے پر بیٹھے چوسر کھیل رہے
تھے۔ اتفاقاً اس دن مکان میں گنے کی گنڈیریوں اور
نارنگیوں کے بہت سے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ
کر مرزا جیون کے ایک بے تکلف دوست نے کہا۔

"مرزا جی آپ جیسے پاک صاف اور صفائی پسند
کے گھر میں یہ گندگی حیرت کی بات ہے"

مرزا جی کو بڑی شرمندگی ہوئی فوراً اپنے نوکر کو
بلا کر کہا۔

"ارے یہ کوڑا کچرا جھاڑ کر کوٹھے کے نیچے پھینک دے
لیکن ذرا بھلے آدمی کو دیکھ بھال کر پھینکنا۔"

"بہت بہتر صاحب" نوکر نے جواب دیا۔
یہ کہہ کر نوکر نے سارا کوڑا کچرا جھاڑ کر ایک ٹوکرے میں بھرا اور کوٹھے کے ایک کنارے پر آکر بیٹھ گیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کوٹھے کے نیچے سڑک پر کوئی بھلا آدمی آئے تو ٹوکرے میں بھرا ہوا کوڑا کچرا پھینکے، کیونکہ میاں صاحب نے کہا ہے کہ بھلے آدمی کو دیکھ کر پھینکنا
اتفاق یوں ہوا کہ ذرا دیر بعد ایک نہایت شریف آدمی دھلے دھلائے پاک صاف کپڑے پہنے ادھر سے گزرے تو نوکر نے جھٹ سے وہ ٹوکرا ان کے اوپر پھینک دیا۔ بے چارے آفت کے مارے راہ گیر کو بڑا غصہ آیا اور غضب ناک ہو کر بولا۔
"ابے او گدھے تو اندھا ہے جو بھلے آدمیوں پر کوڑا کچرا پھینک دیا"
راہ گیر کی بات سن کر وہ بے وقوف بولا۔
"بڑے صاحب میں کیا کروں مرزا صاحب کے کہنے سے میں نے پھینکا تھا۔"
نوکر کی یہ واہیات بات سن کر راہ گیر کو اور زیادہ غصہ آیا تڑخ کر بولا۔
"ابے تیرا کونسا مرزا ہے 'بلا تو سہی' کیا وہ ایسا سنکی پاگل ہے کہ بھلے آدمیوں پر کوڑا کچرا پھنکواتا ہے؟"
یہ سنتے ہی اس بے وقوف نوکر نے ہانک لگائی۔
"مرزا صاحب ذرا ادھر آئیے۔ آپ کو کوئی بھلا آدمی بلا رہا ہے"
مرزا جی دوڑے دوڑے آئے اور آکر دیکھا کہ کوٹھے کے نیچے سڑک پر ایک شریف آدمی کھڑا غصے سے لال پیلا ہو رہا ہے گنڈیری کے دو چار چھلکے اس کے سر پر پڑے ہیں۔
راہ گیر نے جو مرزا جی کو دیکھا تو تڑخ کر بولا۔
"او مرد آدمی! یہ کون سی آدمیت اور شرافت ہے کہ بھلے آدمیوں پر کوڑا کچرا پھنکواتا ہے۔"
راہ گیر کی یہ بات سن کر مرزا جی نے بے وقوف نوکر سے ڈپٹ کر کہا۔
"ابے مردود! میں نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ یہ کوڑا کچرا کسی شریف آدمی کے منہ پر پھینکنا؟"
نوکر جھٹ بولا: "میاں تم نے نہیں کہا تھا کہ بھلے آدمی کو دیکھ کر پھینکنا۔ سو ان سے بھلا آدمی کون ہو سکتا ہے"
راہ گیر یہ بات سن کر نوکر کی بے وقوفی کو بھانپ گیا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔
"خیر معلوم ہوا" مرزا جی نے ہاتھ جوڑ کر راہ گیر سے کہا۔
"حضرت سلامت: آپ اس وقت بھی غلام ناکام کو جو چاہے سو کہہ لیجیے اس لیے کہ یہ بے وقوف عقل سے معذور ہے اس کا کوئی قصور نہیں، قصور میرا ہی ہے۔"
مرزا جی کی یہ معافی سن کر بے چارہ وہ بھلا آدمی اپنے گھر چلا گیا۔

صابر عبدالرحمٰن، لکشمی بائی، تاڑدے چال۔ کرلا۔ بمبئی

چند معلومات

رفتار

تیز آندھی تقریباً	۱۰۰ میل فی گھنٹہ
آواز	۱۱۰۰ 〃 〃
کبوتر	۴۵ 〃 〃
آفتاب کی کرنوں کی رفتار	۵۰۰۰۰ میل فی گھنٹہ
انسان کی رگوں میں خون کی رفتار	۷ 〃 〃

ناہید سلطانہ، مکان نمبر ۱۲-۱-۶۰۴ محلہ علی گوڑہ حیدرآباد

کہانی اور تصاویر: جاوید نہال حشمی
او میاں، یہ کیا ہے؟؟
آم ہیں سرکار، بہت میٹھے ہیں، سستے بھی ہیں ـــ کہیے کتنا دوں؟
کیا کہا، آم؟؟ ـــ اتنا چھوٹا، ارے ہمارا ملک میں تو اتنا بڑا بڑا آم ملتا ہے ـــ اتنا بڑا۔
اور یہ کیا ہے؟
کیلے ہیں سرکار!!
کیا بولا، ـــ کیلا، اونہہ! ہمارا ملک میں تو اتنا لمبا لمبا کیلا ملتا ہے، کیا سمجھا؟
اور .... اور یہ کیا ہے؟؟
یہ تو انگور ہیں سرکار!!!
وہاٹ؟؟؟

پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 5

دفتر پیام تعلیم میں
حل وصول ہونے
کی آخری تاریخ
15 اپریل ۱۹۸۴ء

ایک سَو روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ کچھ نہیں۔
آپ جتنے حل چاہیں بھیج
سکتے ہیں۔ لیکن ہر حل
کے ساتھ ایک ٹوکن آنا
ضروری ہے۔

پہلا انعام: بالکل صحیح حل پر مبلغ ساٹھ روپے۔ دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر مبلغ چالیس روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبروار لکھیے

1. اسی ـــــــ سے عربوں نے اسلام کا پیغام پہنچایا (طرح / راستے)
2. میں تو کبھی آپ کی شکایت ـــــــ پر نہ لایا (زبان / منہ)
3. قریش نے دیکھا کہ مسلمان برابر چلے ـــــــ رہے ہیں (آ / جا)
4. بہت سے لوگ ـــــــ کر رونے لگتے ہیں (پھوٹ پھوٹ / چیخ چیخ)
5. کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے جو ـــــــ جانا نہ چاہے (قطب شمالی / قطب جنوبی)
6. اس واقعے سے متعلق ـــــــ باتوں کا جان لینا ضروری ہے (دو / چند / تین)
7. "واہ میں ـــــــ صورت کیوں بناؤں، تم بناؤ" (رونی / کھسیانی)
8. "کیسے ـــــــ فرمائی" (زحمت / تکلیف)

ادھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ صحیح جواب صفحہ 35 کی کتابوں میں ہی ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصّہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمّے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

ٹوکن پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 5

میں اڈیٹر پیام تعلیم کے فیصلے سے
متفق ہوں۔

نام ....

پتا ....

(اپنے حل اس پتے پر بھیجیے)

پیامی ادبی مُعمّا نمبر 5 ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پیامی ادبی معما نمبر ۳ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل ۱ - زردو - چنبیلی صفحہ ۸ - سطر نمبر ۱
۲ - کیتلی - نیلا ہیرا ۵۶ - سطر ۱۱
۳ - پریشان - نیلا ہیرا ۶۵ - سطر ۴
۴ - ٹھنڈے - صحت کی الف بے صفحہ ۳۰ - سطر ۷
۵ - امیر - جن حسن عبدالرحمٰن حصہ ا صفحہ ۱۲۱
۶ - سولہ - دس جنتی - صفحہ ۳۳ - سطر ۶
۷ - انگور - کہاوت اور کہانی - صفحہ ۱۶ - سطر ۱۳
۸ - تعلیمی - ہمارے محاورے صفحہ ۹۲ - سطر ۱۸

بالکل صحیح حل پر پہلا انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب

فی کس ۶ روپے تقسیم کیے گئے۔

۱ - خلیق احمد روم نمبر ۴۳۹ - اے ونگ - منسٹری آف لا شاستری بھون نئی دہلی
۲ - فرزانہ ناہید معرفت ناصرہ جلالی - سلطان پور - ویشالی - بہار
۳ - سیدہ عشرت فاطمہ ۱۳۵۰ - پہاڑی املی - ٹیامحل - دہلی ۶
۴ - صابر میاں HE/III - ۲۹۱ گراونڈ فلور بھیرا نگر روڈ باندرہ بمبئی
۵ - بے بی غزالہ " " " " " " " "
۶ - ماسٹر جلیس احسن " " " " " "
۷ - بے بی کڈی " " " " "
۸ - انصاری محمد شاہین ۲۶۸ - نیو وارڈ مالیگاؤں
۹ - رضیہ سلطان معرفت مکتبہ اطفال ۲۶۸ - نیو وارڈ مالیگاؤں
۱۰ - ہما خانم " " "
۱۱ - کلثوم محمد صابر - صمد سیٹھ سوت والے - پانچویں گلی - ولی پور - دھولیہ

ایک غلطی پر دوسرا انعام حاصل کرنے والے چھ خوش نصیب

فی کس سات روپے تقسیم کیے گئے۔

۱ - نجم السحر انصاری جی ۱۲/۲۶۸ نیو وارڈ - مالیگاؤں
۲ - گل صنوبر ۲۶۸ - نیو وارڈ - مالیگاؤں
۳ - نور افشاں " " "
۴ - ماسٹر برجیس قدر HE/III - ۲۹۱ گراونڈ فلور بھیرا نگر روڈ - باندرہ بمبئی
۵ - صابرہ شیخ " " "
۶ - اخلاق احمد - صمد سیٹھ سوت والے پانچویں گلی ولی پورہ - دھولیہ (مہاراشٹر)

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔

پیامی ادبی معما نمبر ۵ کا صحیح جواب
ذیل کی کتابوں میں ہی ملے گا

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت نظام الدین اولیاء	ادارہ	۲/۰۰
اللہ کے سفی	خلیل احمد جامی	۲/۰۰
رسول پاک	عبدالواحد سندھی	۶/۰۰
اسلام کیسے پھیلا (اول)	"	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا (دوم)	"	۴/۵۰
سرکار کا دربار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے		۳/۰۰
نیلا ہیرا	مظفر حنفی	۴/۵۰
ہمارے محاورے	سیفی پریمی	۷/۵۰
کہاوت اور کہانی	"	۶/۰۰
چنبیلی	محمد حسن حسان	۱/۲۰
صحت کی الف، بے۔	مسعود احمد برکاتی	۳/۰۰
مچھیرا اور اس کی بیوی	عبدالواحد سندھی	۲/۵۰
آؤ ڈراما کریں	پروفیسر محمد مجیب	۲/۰
جوہر قابل	مسعود احمد برکاتی	۳/۰
جن حسن عبدالرحمٰن (اول)	ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۲/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (دوم)	"	۲/۵۰
تین اناڑی	عصمت چغتائی	۳/۰
ہار کی تلاش	ریاض احمد خاں	۶/۰
دم کٹا سانپ	محمد قاسم صدیقی	۱/۰
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰

کتابیں حاصل کرنے کے پتے:

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵
۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

گاندھی بابا کی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت: ۲/۰۰
اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت: ۲/۰۰
جب اور اب
(آصف مجیب)
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال
باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔ قیمت:
عصمت چغتائی
تین نٹ کھٹ لڑکوں کی
ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان
قیمت ۳/۰۰
ترجمہ: قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمٰن
الٰہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی لیکن اب تو اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے عراق کی قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(سیفی پریمی)
کہاوت اور کہانی
روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت: ۲/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین جیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ہیں جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۰۰
بمبئی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd. No. D(SE)-043 MARCH, 1984.

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

بچوں کی مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
ہمارا دین (اول، دوم، سوم)	سید شہاب الدین دسنوی (فی حصہ)	۶/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول، دوم)	عبدالواحد سندھی (فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امیر البحر	" "	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اول، دوم)	" " (فی حصہ)	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	" "	۳/۰۰
اسلام کیسے شروع ہوا؟	" "	۴/۵۰
رسولؐ پاک	" "	۳/۵۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۳/۰
رسولؐ پاک کے اخلاق	" "	۳/۰۰
اللہ کے خلیل	" "	۲/۵۰
تحسین القرآن	تالیف: خدیجہ سید طاہر سیف الدین	۴/۵۰
منہاج القرآن	" "	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
عقائد اسلام	" "	۱/۵۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
آں حضرتؐ	" "	۱/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۲/۷۵
نبیوں کے قصے	" "	۲/۲۵
ہمارے رسولؐ	" "	۳/۰۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۳/۰۰
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی	۱/۵۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان	۳/۰۰

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز۔ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

پیام تعلیم

اپریل ۱۹۸۴ء　جلد: ۲۱　شمارہ ۴

ایڈیٹر ــ ولی شاہجہانپوری

قیمت: ۲/۵۰ روپے، سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

یہ لکھتے ہوئے سخت تکلیف ہوری ہے کہ ۱۰ مارچ کو پیام تعلیم کے سابق اڈیٹر، بچوں اور بڑوں کے ممتاز ادیب اور مخلص دوست ڈاکٹر اطہر پرویز کا علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون) پرویز صاحب نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک پیام تعلیم کی ادارت بڑی کامیابی سے کی تھی۔ وہ بے پناہ خوبیوں کے انسان تھے۔ بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کی وفات اردو ادب کا ایک المیہ ہے اور ہمارا ذاتی نقصان ہے اس صدمے میں ہم ان کی اہلیہ صدیقہ بیگم سیوہاروی اور بچوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔!

انشاء اللہ جلد ہی ہم پیام تعلیم کا ایک خصوصی نمبر شائع کرکے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔

مارچ کا مہینا اسکولوں میں امتحان کا مہینا ہوتا ہے ظاہر ہے اس زمانے میں آپ نے بھی کامیابی حاصل کرنے کے لیے جی توڑ محنت کی ہوگی۔ ہماری دعا ہے کہ اس کے پھل بھی شیریں ہوں۔

پچھلے مہینے ہم ڈاکٹر قنبر رضوی کے مضمون سفید ریگستان کے مسودے کی گمشدگی کا اعلان کیا تھا، خوش قسمتی سے وہ مسودہ مل گیا اور اس مرتبہ شریک اشاعت ہے، اس شمارے میں شمشاد ادیب، معین الدین اور عرفان نجف علیمی صاحبان کے رشحات قلم کہانیوں کی صورت میں پیش کر رہے ہیں امید ہے کہ یہ سب آپ کو پسند آئیں گی۔

پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی [illegible] سے شائع کیا
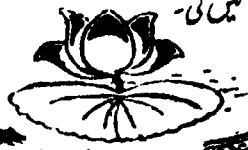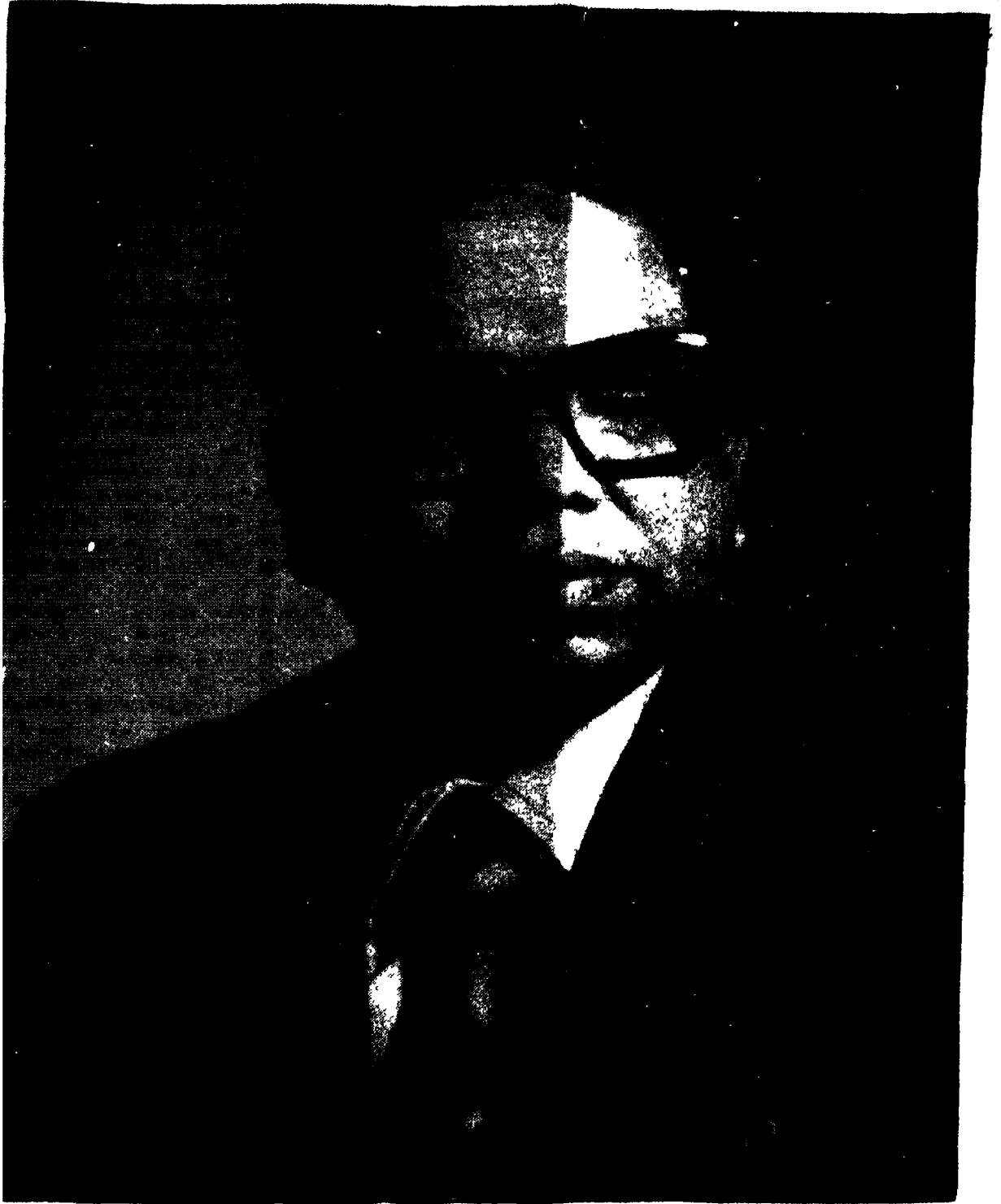
بچوں کے ممتاز ادیب
ڈاکٹر اطہر پرویز

موم کا گڈا چلنے لگا

معراج

ڈاکٹر اے۔ ڈی مرچی کے نام سے کون واقف نہیں۔ میرا مطلب مشہور سائنس داں علاءالدین سے ہے۔ جو ہر روز نئی نئی ایجادیں کرتا رہتا ہے۔ یہ جب بھی کوئی کارنامہ سرانجام دیتا ہے تو سیدھا اپنے دوست کرنل تیس مار خاں کے ہاں جاتا ہے۔

ایک دن شہر میں بین الاقوامی نمائش لگی۔ اس نمائش میں دنیا بھر کے ملکوں نے اپنے اپنے اسٹال لگائے۔ میلے میں جاپانی کمپنی نے ایک "موم خانہ" اسٹال لگایا ہوا تھا۔ اس موم خانہ میں دنیا بھر کے سائنس دانوں، امیروں، وزیروں اور دوسرے مشہور لوگوں کے موم کے گڈے (مجسمے) رکھے ہوئے تھے۔ کوئی شخص بھی معمولی سی قیمت ادا کرکے اپنا موم کا مجسمہ بنوا سکتا تھا۔

ڈاکٹر مرچی کو میلا دیکھنے کا شوق ہوا۔ وہ سیدھا اپنے دوست کرنل تیس مار خاں کے گھر پہنچا اور گھنٹی بجائی۔

ڈاکٹر مرچی کو دیکھ کر کرنل نے ایک چیخ سی ماری، "اخاہ، بھئی واللہ تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو اور سناؤ کیسے مزاج ہیں؟ کوئی اور نئی تازہ خبر؟"

ڈاکٹر مرچی نے کہا، "ذرا میلا دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا، سوچا کہ تمھیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔"

کرنل بولا، "او ہو ہو ہو۔ بھئی تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ کئی سال گزر گئے میں نے کوئی میلا ٹھیلا دیکھا ہی نہیں۔ میں ابھی دو منٹ میں آیا۔"

کرنل آدھے گھنٹے تک اپنی داڑھی کھرچتا رہا۔ بالوں میں تیل لگا کر انھیں چمکایا۔ پھر بہت دیر تک اپنی پینٹ پر استری رگڑتا رہا۔

ڈاکٹر مرچی کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا۔ وہ جھنجھلا کر بولا، "اے کرنل میاں، اب آ بھی جاؤ۔ میں تمھارا انتظار کرتے کرتے سوکھ گیا ہوں۔"

کرنل زور سے بولا، "ارے بھئی، ابھی دو منٹ میں آیا۔ بس ذرا جوتوں پر پالش کر لوں۔"

دس منٹ اور گزر گئے۔ ڈاکٹر بےزاری سے بولا، "اب کب تک ہمارے صبر کا امتحان لو گے؟"

کرنل زور سے بولا، "تم نے تو مجھے بوکھلا دیا ہے دو دفعہ پینٹ اُلٹی پہن چکا ہوں۔ ایک دفعہ دونوں پاؤں ایک ہی پائنچے میں ڈال دیے تھے۔ بس دو منٹ اور۔"

آخر خدا خدا کرکے کرنل اپنے کمرے سے باہر آیا۔ دونوں

دوست میلے میں پہنچے۔ وہ سیر کرتے کرتے موم خانہ کی طرف

جا پہنچے۔ ڈاکٹر مرنجی نے کہا،
"آیئے، یہ اسٹال بھی دیکھ لیں۔"
کرنل بولا، "مجھے ان بے جان گڈّے گڑیوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔"
ڈاکٹر مرنجی نے کہا، "تم میلے کی سیر کرو۔ میں یہ موم خانہ دیکھتا ہوں۔ جب تم سیر کر چکو تو مجھے اپنے ساتھ لے چلنا۔ میں تمھیں یہیں ملوں گا۔"
کرنل اپنے ساتھ چیونگم کا پیکٹ لایا تھا۔ اس نے پیکٹ پھاڑا اور مٹھی بھر چیونگم ڈاکٹر مرنجی کی جیب میں ٹھونس دیں۔ کرنل نے کہا:
"میاں بھول بھلکڑ، تم اِدھر اُدھر کی باتیں سوچنے کے بجائے چیونگم سے دل بہلاتے رہنا۔"
کرنل تو یہ کہہ کر چلا گیا۔ میلے میں اس کی دل چسپی کا بہت سامان تھا۔ نشانہ بازی کے کھیل تھے۔ کرنل کا نشانہ بہت پکّا تھا۔ وہ جہاں کھڑا ہو گیا وہاں سے انعام جیت کر نکلا۔ کرنل نے اتنے ڈھیروں انعام جیت لیے کہ انھیں لے جانے کے لیے چھکڑے کا انتظام کرنا پڑا۔
ادھر ڈاکٹر مرنجی کی سنیے۔ وہ موم خانے میں دنیا کے مشہور آدمیوں کے مجسّمے یعنی موم کے بت ہوئے بڑے بڑے گڈّے دیکھنے میں مصروف تھا۔ ان میں ڈاکٹر مرنجی اور کرنل تیس مار خاں کے موم کے گڈّے بھی تھے۔ کرنل کا گڈّا دیکھ کر ڈاکٹر مرنجی بھی دھوکا کھا گیا۔ اسے دیکھ کر بولا، "ارے؟ تم اتنی جلدی واپس بھی آ گئے؟ کیا تم میلا دیکھنے نہیں گئے تھے؟"
موم کا گڈّا چپ رہا۔ ڈاکٹر مرنجی اس کا شانہ ہلا کر بولے، "کیا بات ہے؟ تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ او ہو! میں اب سمجھ گیا۔ یہ اصل میں کرنل تیس مار خاں کا موم کا گڈّا ہے۔"
اب ڈاکٹر مرنجی سوچنے لگا کہ انسان اور اس موم کے گڈّے میں صرف یہ فرق ہے کہ یہ گڈّا بے جان ہے۔ آخر روح کیا چیز ہے؟ ہم بولتے کیوں کر ہیں؟
یہ سوچتے سوچتے ڈاکٹر خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ جب ڈاکٹر مرنجی پر سوچ بچار کا دورہ پڑتا تو اُسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اگر یہ دورہ زیادہ شدید ہوتا تو ڈاکٹر مرنجی کا جسم اکڑ کر پتھر کی طرح سخت ہو جاتا تھا۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ یہ کوئی انسان نہیں ہے بلکہ پتھر کا مجسمہ ہے۔
شام کو جب موم خانے کو بند کرنے کا وقت ہوا تو نوکر چاکر موم کے گڈّوں کو پلاسٹک کی چادروں سے ڈھانپنے لگے۔
ایک بے وقوف نوکر نے ڈاکٹر مرنجی کو بھی موم کا گڈّا سمجھا۔ اس نے ڈاکٹر مرنجی پر پلاسٹک کی چادر لپیٹ دی۔ ڈاکٹر مرنجی اپنی سوچ بچار میں گم تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ کیا گزر رہی ہے۔
اُدھر ڈاکٹر کی بیگم ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب بہت دیر ہو گئی اور مرنجی گھر نہیں پہنچا تو انھیں بہت تشویش ہوئی۔ وہ سیدھی کرنل کے گھر پہنچیں، اس سے کہا، "ڈاکٹر صاحب صبح میلا دیکھنے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ وہ ابھی تک گھر واپس نہیں لوٹے۔"
کرنل نے کہا، "وہ صبح میرے ساتھ ہی گئے تھے میں میلے کی سیر کر کے گھر واپس آ گیا اور انھیں اپنے ساتھ لانا بھول گیا۔ ڈاکٹر صاحب میرے انتظار میں کھڑے ہوں گے۔"
پھر کرنل کو اچانک یاد آیا کہ اس وقت موم خانہ بند ہو چکا ہو گا۔
وہ پریشان ہو کر بولا، "اوہ میرے خدا، کہیں اُن لوگوں نے ڈاکٹر مرنجی کو موم خانے میں بند نہ کر دیا ہو۔ ہمیں فوراً وہاں جا کر ڈاکٹر صاحب کو تلاش کرنا چاہیے۔"
وہ دونوں بھاگم بھاگ میلے میں پہنچے۔ موم خانے کا پردہ ایک طرف سے سرکا کر وہ رینگتے ہوئے خیمے میں داخل ہو گئے اور ڈاکٹر مرنجی کو تلاش کرنے لگے۔ ڈاکٹر کی بیگم زور سے بولیں، "وہ رہے، وہاں اس کونے میں۔"

بیگم صاحبہ کی نظر کم زور تھی اور وہاں اندھیرا بھی تھا، اس لیے وہ غلطی سے ڈاکٹر کے گڈّے کو اصلی ڈاکٹر سمجھ بیٹھیں۔

کرنل نے موم کے گڈّے کو ٹٹول کر دیکھا۔ وہ پریشان ہو کر بولا، "ارے انھیں کیا ہوا؟ یہ تو بالکل پتھر کی طرح سخت ہو رہے ہیں!"

بیگم بولیں، "ڈاکٹر صاحب پر اس سے پہلے بھی کئی دفعہ دورہ پڑ چکا ہے۔ جب کبھی یہ سوچ بچار میں گم ہو جاتے ہیں تو وہ پتھر کی طرح سخت اور کسی مجسّمے کی طرح بے جان سے ہو جاتے ہیں!"

کرنل نے پوچھا، "اب کیا کریں؟"

بیگم بولیں، "پہلے انھیں گھر لے چلتے ہیں۔ وہاں ہوش میں لانے کی کوئی ترکیب کریں گے۔"

وہ دونوں گڈّے کو اصلی ڈاکٹر سمجھ کر کھینچ کھانچ کر گھر لے گئے۔

اِدھر یہ دونوں خیمے سے باہر نکلے، اِدھر ڈاکٹر مرچی کا سوچ بچار کا دورہ ختم ہو گیا اور وہ اپنے ہوش و حواس میں آ گیا۔ جب اس نے اپنے آپ کو پلاسٹک کی چادر میں لپٹا ہوا دیکھا تو وہ بہت سٹپٹایا۔ وہ بولا، "ہائیں، یہ میں کہاں ہوں؟ اوہو، اب یاد آ گیا۔ میں موم خانے کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک خیالات میں گم ہو کر رہ گیا اور یہ بے وقوف مجھے بھی موم کا گڈّا سمجھ بیٹھے۔ تچ، تچ۔ اب بھوک بھی بہت زور کی لگ رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے میں نے کئی روز سے کھانا نہیں کھایا ہے!"

ڈاکٹر مرچی نے پلاسٹک کی چادر کو جھٹک کر دور پھینکا۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹول کر دیکھا۔ خوش قسمتی سے چیونگم اور ٹافیاں مل گئیں۔ وہ چیونگم چبانے لگا۔

ایک نوکر کسی کام سے موم خانے گیا۔ وہ ڈاکٹر مرچی کو وہاں چلتا پھرتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بے وقوف ابھی تک یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ موم کا گڈّا ہے۔ اس نے شور مچا دیا، "ارے بچاؤ۔ بچاؤ۔ موم کا گڈّا زندہ ہو گیا ہے!"

منیجر اور دو تین نوکر یہ شور ہنگامہ سُن کر وہاں آ گئے۔ منیجر نے ڈپٹ کر پوچھا، "یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے؟"

نوکر اپنی بدحواسی پر قابو پا کر بولا، "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اس موم کے گڈّے کو پلاسٹک کی چادر میں لپیٹ کر اُس کونے میں کھڑا کیا تھا۔ اب یہ خوب مزے سے اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا ہے۔"

ایک اور بدھو قسم کے نوکر نے کہا، "موم کا گڈّا زندہ ہو گیا ہے!"

منیجر نے کہا، "ارے تو بے وقوفوں کی طرح کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جلدی سے اُسے پکڑ کر لاؤ!"

سب نوکر ڈاکٹر مرچی کے پیچھے بھاگے۔ بے چارے ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیوں یہ لوگ میری جان کے دشمن ہوتے ہیں؟ شاید میں نے غلطی سے کوئی چیز اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی ہے۔

آخر ان لوگوں نے ڈاکٹر کو پکڑ لیا۔ ڈاکٹر نے بہت ہاتھ پاؤں چلائے، لیکن اس کی کچھ نہ چل سکی۔

...نے چلّا چلّا کر کہنا چاہا کہ" بے وقوفو! یہ میں ہوں ...ے۔ ڈی۔ مرنجی۔"

لیکن وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکے، کیوں کہ چیونگم ...ے ان کے دانت چپک کر رہ گئے تھے۔ نوکرانے

...پہنچتے ہونے لے گئے اور اسے ایک پنجرے میں ...بند کرکے تالا لگا دیا۔ ڈاکٹر پنجرے کی جالیوں سے ...زور آزمائی کرتے رہے۔ پھر انھوں نے تالا توڑنے ...کی بہت دیر تک کوشش کی، لیکن انھیں کامیابی ...نہ ہو سکی۔ آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

اُدھر ڈاکٹر کے گھر میں اس کی بیگم اور کرنل ...موم کے گڈّے کو ہوش میں لانے کی کوشش میں ...مصروف تھے۔ بیگم نے کمرے میں انگیٹھیاں جلادیں۔ ...گرم پانی کی بوتلیں ڈاکٹر کے سینے پر رکھیں۔ آخر گرمی ...کے اثر سے موم پہلے تو نرم ہوا، پھر ٹپک ٹپک ...کر گرنے لگا۔

کرنل نے گڈّے کو ہاتھ لگا کر دیکھا اور بولا، ..."اب تو یہ پہلے کی طرح سخت نہیں رہا۔ اس کا مطلب ...یہ ہے کہ اب ڈاکٹر کا حال پہلے سے بہتر ہے۔"

ڈاکٹر کی بیگم کے ہاتھ پر موم کے قطرے گرے ...تو ان کے منہ سے زور کی چیخ نکل گئی۔ کرنل نے ...گھبرا کر پوچھا،" کیا ہوا بھابی، خیر تو ہے؟"

بیگم نے کہا،" اِدھر دیکھیے کرنل،" ڈاکٹر کا ہاتھ پگھل پگھل کر گر رہا ہے۔"

کرنل کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ وہ سر پر ہاتھ مار کر بولا،" اوہ، ہم سے کتنی بڑی بھول ہوگئی ہے۔ ہم جسے ڈاکٹر سمجھے ہیں وہ اصل میں موم کا گڈّا ہے۔ بھابی، جلدی کرو۔ اس سے پہلے کہ کسی کو اس کی گم شدگی کا پتا چلے، ہم اسے اس کی جگہ پر واپس رکھ آتے ہیں۔"

وہ ڈاکٹر کا مومی گڈّا اٹھا کر موم خانے میں لے گئے۔

اُدھر ڈاکٹر کا حال بہت خراب تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔

پھر اچانک کوئی چیز رینگتی ہوئی خیمے کے اندر داخل ہوئی۔ ڈاکٹر نے عینک درست کی اور غور سے دیکھا۔ وہ حیران ہو کر بولا،" یہ تو ڈاکٹر مرنجی کا سلیپر دکھائی دیتا ہے۔ اگر یہ ڈاکٹر مرنجی ہے تو پھر میں کون ہوں؟ کیا میں موم کا گڈّا ہوں۔ اوہ میرے خدا، یہ کیا چکّر ہے؟"

پھر خیمے کے اندر بیگم اور کرنل داخل ہوئے۔ انھوں نے موم کا گڈّا ایک کونے میں کھڑا کر دیا۔

ڈاکٹر نے زور سے کہا،" ہیلو!"

کرنل نے ڈاکٹر کو دیکھا اور بولا،" بندۂ خدا، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ڈاکٹر جواب دینے کے بجائے اچھلنے کودنے لگا۔ کرنل فکر مند ہو کر بولا:

"شاید تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ زیادہ نہ سوچا کرو۔"

ڈاکٹر مرنجی خوشی سے اچھلتے ہوئے بولا:

" آہا ہا ہا۔ یہ الجھن بھی حل ہو گئی۔ میں، میں ہوں یعنی ڈاکٹر مرنجی اور وہ، وہ ہے یعنی موم کا گڈّا۔"

کرنل نے دو کیلوں کی مدد سے تالا کھولا اور ڈاکٹر کو پنجرے سے باہر نکالا۔ پھر انھوں نے موم کے گڈّے کو پنجرے میں بند کرکے تالا لگا دیا۔

کرنل بولا: "اب جلدی سے بھاگ چلو۔ ورنہ وہ تمھارے ساتھ ہمیں بھی پنجرے میں بند کردیں گے۔"
وہ اسی راستے سے رینگ کر خیمے سے باہر نکلے۔

جب وہ گھر پہنچے تو رات کا دھندلکا چھٹ چکا تھا۔ ڈاکٹر کی بیگم نے جلدی جلدی میز پر ناشتہ لگایا۔ ڈاکٹر مریکی بار بار کہتا، "خدایا، تیرا شکر ہے کہ میں موم کا گڈا نہیں ہوں۔"

کرنل نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا، "اگر سب لوگ تمھاری طرح رات کا کھانا ناشتے کے وقت کھایا کریں تو کافی بچت ہو سکتی ہے۔"

پھر اس نے ڈاکٹر مریکی کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا، "تم پھر کسی سوچ میں گم ہو گئے ہو؟"

ڈاکٹر مریکی چونک کر بولا، "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کل جب ان لوگوں کو معلوم ہوگا کہ چلتا پھرتا گڈا پھر بے جان ہوگیا ہے تو ان پر کیا گزرے گی؟"

سال نو

نثار چنگیزی

سال نو پر پھر مرا بچّو یہی پیغام ہے
سال نو کیا ہے؟ سمجھنا! یہ ہمارا کام ہے

سال نو ہم کو عطا کرتا ہے عزم معتبر
سال نو پھر دے رہا ہے راحتِ قلب و جگر

سال نو دیتا ہے ہم کو دعوتِ فکر و عمل
سال نو کہتا ہے ہم سے خوابِ غفلت سے نکل

کل نیا سال آئے تو ہم کو نہ ہو شرمندگی
آج وہ کرلیں ملے جس سے بہار زندگی

زندہ دل قوموں کو صدیوں یاد کرتا ہے جہاں
اور اس پر رشک کرتا ہے ستاروں کا جہاں

آج کی جتنی خوشی ہے سب ہمارے نام ہے
ہر بشر کے ہاتھ میں گویا خوشی کا جام ہے

عہد کرلیں پھر خوشی میں سال نو کی ایک بار
خود بڑھیں گے دیس کو آگے بڑھائیں گے نثار

بیرواچندپور، کھوریا بازار، ضلع گورکھپور، پن ۲۷۳۱۶۴

سلطانہ آصف فیضی

مصریوں کی شادی

جناب آصف علی اصغر فیضی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک مصر میں ہندستان کے سفیر کی حیثیت سے رہے۔ اس درمیان میں ان کی بیگم صاحبہ محترمہ سلطانہ آصف فیضی نے مصریوں کے رہن سہن، ان کی سماجی زندگی اور عادت و خصائل کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ اس مضمون میں آپ نے مصر کی ایک شادی کا حال لکھا ہے جسے پڑھ کر آپ یہ محسوس کریں گے کہ گویا آپ خود یہ شادی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

(ادارہ)

اپنی مصروفیت کے باوجود مجھے ایک مصری لڑکی کی شادی میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ یہ ایک معزز عہدے دار کی لڑکی کی رخصتی کی تقریب تھی۔ اس دعوت کے لیے ہمیں اہرام والی سڑک پر جانا تھا۔ قاہرہ کے گنجان بازاروں، عالی شان عمارتوں اور دل کش باغوں سے مصر کے شہرۂ آفاق اور پُرشکوہ اہرام ۱۲ میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اس عجیب و غریب شاہی قبر کی زیارت کے لیے دنیا کے ہر کونے سے سیاح یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس سڑک پر جو شہر سے اہرام تک جاتی ہے، گرمیوں میں بے شمار قہوہ خانے کھل جاتے ہیں۔

جب ہم سفارت خانے سے چلے تو رات کے نو بجے تھے۔ ہماری مصری رہبر رشاد اپنے جوشیلے انداز میں دولھا دلھن اور اس کے خاندان کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتا رہی تھیں۔ دلھن بہت خوب صورت ہے اور دولھا کا باپ بہت دولت مند ہے۔ ان کا نکاح تین مہینے پہلے ہو چکا ہے آج تو صرف رخصتی کی رسم ہے۔ ابھی تحفہ نہیں دینا چاہیے ــ" مصریوں میں تحفہ یا تو ایک روز پہلے بھیج دیتے ہیں یا پھر شادی کے بعد دلھن کے گھر دیا جاتا ہے ــ اس کے بعد رشاد نے بڑے آہستہ سے میر

کان میں کہا "لڑکی اس شادی سے خوش نہیں ہے، مگر باپ
کے حکم کے سامنے مجبور ہے۔ لیکن لڑکا اس شادی سے
خوش ہے اور شادی کے بعد تعلیم کی خاطر انگلستان
جانے والا ہے۔"

اس بات چیت میں ہماری گاڑی اس جگہ پہنچ گئی جہاں
ہم مدعو تھے۔ دروازے پر بے شمار ننھے ننھے قمقمے تار سے
بندھے قطار در قطار لٹک رہے تھے۔ یہیں دو نوجوان
مصری خوش شکل سیاہ انگریزی سوٹ اور ترکی ٹوپی پہنے
دروازے پر موجود تھے یہ آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کر
رہے تھے۔ انھوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ یہ دونوں دلھن
کے بھائی تھے یہاں سے ہم باغ میں پہنچے، درختوں کی ڈالیوں
پر پتیوں کی آڑ سے رنگین بلب جھانک رہے تھے۔ قسم قسم کی
رنگ برنگی شراب اور شربت سے مہمانوں کی خاطر کی جا رہی
تھی۔ یکایک سامنے سے ایک موٹے تازے قوی الجثہ مصری آئے
یہ دلھن کے باپ تھے اور رشاد کے بیان کے مطابق اپنی بیٹی کو
دولت کے لالچ میں اس کی مرضی کے خلاف بیاہ رہے تھے۔ مصر
میں عام طور پر شادیاں والدین کی رضامندی ہی سے انجام
پاتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہاں طلاق کا عام رواج ہے۔
لڑکیاں پہلی شادی اپنے والدین کی مرضی پر کر لیتی ہیں اور
دوسری شادی خود کرتی ہیں۔

رشاد نے پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ
سامنے دلھن زرد رنگ کے گون میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ
کھڑی ہے۔" رشاد نے بتایا کہ کھانے کے بعد وہ دلھن کا جوڑا
پہنے گی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا کہ "دولھا کہاں ہے"۔ رشاد نے
اشارے سے بتایا کہ وہ ایک نوجوان ساتھی کے ساتھ درخت
کے سائے میں سگریٹ پی رہا ہے۔ اس کی سج دھج دیکھ کر یہ
گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ اس محفل کا نوشہ ہے۔ ادھر
دلھن بار بار ہر طرف گھوم رہی تھی اس کے بال مصری لڑکیوں
کی وضع کے ترشے ہوئے، گردن اور شانوں پر لوٹ رہے
تھے۔ لیکن اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ذرا
سی دیر میں ایک رقاصہ کا ناچ شروع ہو گیا۔

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ناچنے والی تھک چکی
تھی۔ یکایک سب مہمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ دالان میں گئے
جہاں طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ رشاد نے ایک
صاحب سے جھک کر کہا جس کے بعد وہ میز سے سرک گئے۔
اور میری بھی سموسوں تک رسائی ہو گئی۔ یہ ورقی سموسہ
میدے کا تھا جس میں پنیر بھرا ہوا تھا۔ جس کو تلنے کے بجائے
دم دے کے پکایا جاتا ہے۔ پلاؤ میں چلغوزے، کشمش، بادام
اخروٹ اور مختلف سوکھے میووں کو بھی ملا دیا تھا اس قسم
کے پلاؤ کو "چہ کسا" کہتے ہیں۔ چاولوں میں ذرا سی مٹھاس
آجاتی ہے مگر کسی قسم کا مصالحہ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے مزا
نہ آیا۔ البتہ پلاؤ کی قابوں میں مرغ کے پارچے جمائے تھے
یہ ٹکڑے اچھے پکے تھے۔ کئی قسم کے میٹھے رکھے ہوئے تھے
سوئیوں کا حلوہ بالائی پڑا ہوا، میدے کی لوزیں دودھ
اور شکر میں پکی ہوئی چاندی کے ورق لگا کر رکھی گئی تھیں۔
کھوئے کی مٹھاس، برفی کے ٹکڑے وغیرہ بھی بنے۔

کھانے کے بعد دلھن نیا جوڑا زیب تن کرنے گئی۔ اب
حاضرین بڑی بے چینی سے "زفاف" کی رسم کا انتظار کر رہے
تھے اس میں باقاعدہ عزیزوں، دوستوں اور حاضرین کے
سامنے دلھن دولھا کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ اس پر نکاح
سے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔

اچانک ہر طرف سے کیلی کی آواز بلند ہوئی اور تالیاں
بجنے لگیں۔ زینے پر دلھن نمودار ہوئی معلوم ہوتا تھا کہ کہیں
سے پری آ کر کھڑی ہو گئی ہے، اس کا سر سے پاؤں تک
یورپی لباس تھا۔ ناچنے والیوں کی گانے کی آوازیں سنائی
دینے لگیں۔ اس جلوس کو ہر شخص ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا
آٹھ نوجوان کنواری لڑکیاں روشن موم بتیاں تھامے نظر
جھکائے دلھن کو اپنے ساتھ لیے اتر رہی تھیں موم بتی پر سفید
پنی جھلک رہی تھی دلھن کے سر پر سفید باریک کپڑا پڑا ہوا
تھا۔ جس پر نازک نازک سفید پھولوں کا تاج رکھا ہوا تھا
دلھن کا ہاتھ دولھا کے ہاتھ میں تھا اور دونوں بہت سہج
سہج نیچے اتر رہے تھے۔

جب برات چلتی ہوئی آئی تو دلہا دلھن کے سروں پر سے سونے چاندی کے پھول نچھاور کیے گئے۔ بہت سی بوڑھی عورتوں اور کنواری لڑکیوں نے ان پھولوں کو بڑھ کر اٹھالیا۔ جب برات نیچے اتری تو ایک پھولوں کے سجے ہوئے منڈپ میں ایک بجے سجائے صوفے پر دولہا اور دلھن کو بٹھادیا گیا۔ اب چار رقاصاؤں نے دولہا اور دلھن کے سامنے رقص کرنا شروع کردیا۔ ان کے گانے میں دلھن کی خوب صورتی کا ذکر تھا اور آیندہ زندگی کے لیے دعائیں تھیں۔ دلھن ہاتھ پہ ہاتھ رکھے شرمیلی نظریں نیچی کیے فرش پر بکھرے ہوئے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ عموماً ایسے موقع پر دستور ہے کہ دولہا، دلھن کو کوئی قیمتی زیور منہ دکھائی کے طور پر دیتا ہے مگر اس شور ہنگامے اور مجمع کی وجہ سے ہمیں کچھ دکھائی نہ دیا صرف دروازے پر ایک عالی شان سجی سجائی موٹر پھولوں کی چادر اوڑھے دلھن کے انتظار میں کھڑی نظر آئی۔

مضامین صاف خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھیے اور اپنا پورا پتا بھی۔

سپاہی راجا

ڈاکٹر شمشاد ادیب سہارنپوری

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گانو میں ایک سپاہی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ رہتا تھا ایک بار وہ جنگ پر گیا اور وہیں لڑتا ہوا مارا گیا۔ سپاہی کے مرنے کے بعد ماں بیٹا دونوں بے سہارا ہو گئے بے چارے بہت غریب تھے اسی لیے کچھ دنوں کے بعد فاقو پر فاقوں کی نوبت آگئی۔ ایک دن سپاہی کے بیٹے نے اپنی ماں سے کہا۔ ماں مجھے دو روپے دو، میں شہر جا کر ڈھیر ساری دولت کما کر لاؤں گا۔ ماں نے کہا کیا کہتے ہو بیٹا "میرے پاس تو ایک پائی بھی نہیں ہے دو روپے میں کہاں سے لاؤں۔"

بیٹے نے کہا ابا جان کا پرانا فوجی کوٹ جو ہے اُسے بیچنے سے ضرور کچھ نہ کچھ مل جائے گا پھر انھوں نے پرانے کوٹ کو تین روپے میں فروخت کر دیا۔ بیٹے نے ماں سے کہا۔ ماں یہ لو ایک روپیا دو روپے میں لے کر جا رہا ہوں جب تک نوکری نہیں ملتی انھیں دو روپیوں سے گزارہ کروں گا یہ کہہ کر سپاہی کا بیٹا گھر سے چل دیا۔
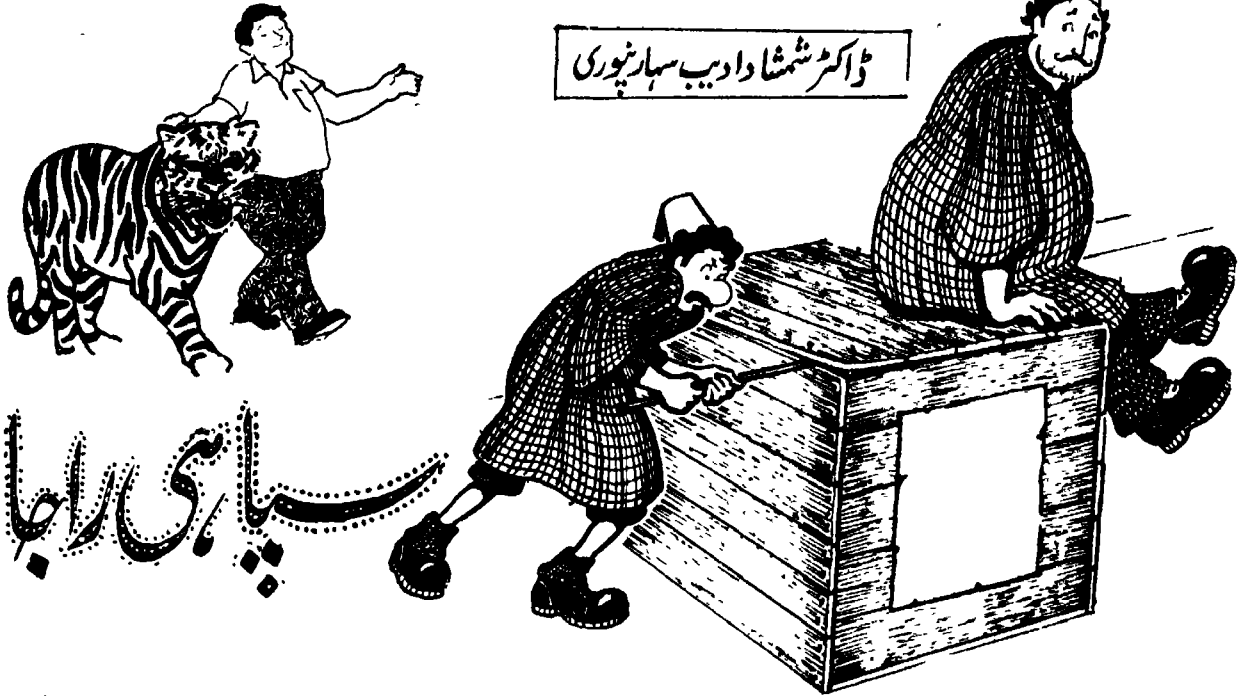
راستے میں ایک بڑا گھنا جنگل پڑتا تھا جنگل کے بیچ میں اسے ایک شیرنی بیٹھی ہوئی نظر آئی جو اپنے پنجے کو چاٹ چاٹ کر بڑی دردناک آواز میں چلا رہی تھی سپاہی کا لڑکا سر پر پانو رکھ کر بھاگنے کو ہی تھا کہ شیرنی نے اسے پکار کر کہا اے اچھے اور نیک لڑکے میرے پنجے میں ایک کانٹا چبھ گیا ہے اسے ذرا نکال دے میں زندگی بھر تیرا احسان نہیں بھولوں گی۔

سپاہی کے لڑکے نے جواب دیا خالہ بی مجھے کانٹا نکالنے میں تو کوئی عذر نہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ کانٹا نکالتے وقت درد سے بے چین ہو کر تم کہیں مجھے مار نہ ڈالو شیرنی نے کہا نہیں بیٹا ایسا نہیں ہوگا لو میں اس درخت کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتی ہوں کانٹا نکلتے وقت جب میرے زیادہ درد ہوگا تو میں اس درخت کو کاٹ لوں گی سپاہی کا لڑکا شیرنی کی یہ بات سن کر کانٹا نکالنے کے لیے راضی ہو گیا جب اس نے شیرنی کے پنجے سے کانٹا نکالا تو وہ درد سے بلبلا اٹھی غصے میں شیرنی نے اپنے سامنے والے درخت کو جھنجھوڑ ڈالا اور اتنے زور سے درخت پر حملہ کیا کہ وہ لوٹ کر زمین پر آ رہا درخت کی جڑ میں سے ایک صندوق نکلا شیرنی نے صندوق سپاہی کے لڑکے کو دیتے ہوئے کہا۔ لو بیٹا یہ صندوق میں تمھیں انعام میں دیتی ہوں لیکن

ہنیا بالنس - سہارنپور

دیکھو اسے گھر لے جاکر ہی کھولنا راستے میں اگر کھولا تو نقصان اٹھاؤ گے۔

سپاہی کا لڑکا صندوق سر پر رکھ کر خوشی خوشی گھر کی طرف روانہ ہوا ابھی وہ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے صندوق پہلے سے کچھ بھاری ہو گیا ہو اور ہر قدم کے ساتھ بھاری ہوتا جا رہا ہے وہ ہمت کرکے برابر چلتا گیا لیکن آدھے راستے پر پہنچ کر اسے خیال آیا کہ کہیں اس شیرنی نے مجھے دھوکا تو نہیں دیا ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی جادوگرنی ہو اور اس صندوق کے ذریعے مجھ پر جادو کرنا چاہتی ہو یہ خیال آتے ہی اس نے وہ صندوق وہیں زمین پر پٹخ دیا اور اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔ لیکن یہ کیا صندوق میں سے ایک بڑا عجیب آدمی نکل آیا اس کا قد ایک بالشت تھا۔ اور داڑھی سوا بالشت تھی۔ صندوق میں سے نکلتے ہی ایک بالشت کے بوڑھے نے لڑکے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا لڑکے نے حیران ہو کر کہا۔ بابا تم ہو تو بالشت بھر کے لیکن وزن تمھارا کئی من ہے۔ کیا نام ہے تمھارا ؟" بالشتیہ"۔ بالشت بھر کے بوڑھے نے جواب دیا۔ لڑکا بولا اچھا ہوا کہ مجھے جلدی پتا چل گیا کہ اس صندوق میں تم چھپے بیٹھے ہو تمھارا بوجھ اٹھانے سے تو جان بچی ۔" ایسا نہ کہو" بونے نے کہا اگر تم اس صندوق کو اسی طرح بند گھر تک لے جاتے تو تم اسے ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا پاتے خیر فکر نہ کرو میں اب بھی تمھاری خدمت کروں گا۔ میری مالکن یعنی جنگل کی رانی شیرنی کا حکم ہے کہ میں تمھاری ہر خواہش اچھی طرح پوری کروں۔" اچھا یہ بات ہے تو پھر جلدی سے میرے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ بھوک کے مارے میری تو جان نکلی جا رہی ہے لو یہ دو روپے جلدی سے جاکر بازار سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آؤ۔ سپاہی کے لڑکے کی یہ بات سنتے ہی بونا غائب ہو گیا اور سیدھا حلوائی کی دکان پر پہنچا ایک بڑے کنستر کے پیچھے کھڑا ہو کر بولا اے میاں حلوائی دینا مجھے مٹھائی۔

حلوائی نے ادھر اُدھر دیکھا لیکن اسے کوئی آدمی دکان پر کھڑا نظر نہ آیا بونا ایک بالشت کا تو تھا ہی کنستر کے پیچھے کھڑا کس طرح دکھائی دیتا اس لیے ایک بار پھر چلاّ کر بولا۔" اے میاں حلوائی دینا مجھے مٹھائی"

لیکن حلوائی کو اس بار بھی بونا دکھائی نہ دیا۔ اس پر بونا غصے میں لال پیلا ہو کر حلوائی کے قریب پہنچا اور اس کے پاؤں میں چٹکی بھری اور بولا کیا تمھیں دکھائی نہیں دیتا میں کنستر کے پاس کھڑا کب سے چلاّ رہا ہوں۔ وہ حلوائی چونک پڑا بونے سے معافی مانگ کر بولا۔ اب کہو میاں بونے تمھیں کتنی مٹھائی چاہیے۔ باتیں نہ بناؤ جلدی سے ایک من مٹھائی۔ لیکن تم اٹھا کس طرح سکو گے ؟ تمھیں اس سے کیا تمھیں جو کہا ہے وہ کرو اور ہاں دیکھو یہ رہے تمھاری مٹھائی کے روپے" اتنا کہہ کر اس نے جیب میں پڑے ہوئے چاندی کے روپے کھنکھنائے۔ حلوائی نے جلدی سے مٹھائی باندھی اور ٹوکری بونے کے سر پر رکھ دی بونا منہ چڑاتا ہوا بغیر پیسے دیے وہاں سے چل دیا بے چارہ حلوائی دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔"

حلوائی کی دکان پر سے بونا سیدھا نان بائی کی دکان پر پہنچا اور اس سے تنور روٹیاں لینے کے بعد انگوٹھا دکھا کر بھاگ آیا بے چارہ نان بائی بھی ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اُدھر سپاہی کا لڑکا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ نہ جانے بونا کہاں غائب ہو گیا تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اچانک مٹھائی کی ٹوکری اور روٹیاں لے کر وہاں پہنچ گیا۔ ماتھے پر سے پسینا پونچھنے کے بعد ہانپتے ہوئے بولا۔ صرف ایک تنور روٹیاں اور ایک من مٹھائی ہی مل سکی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کے لیے کافی رہے گی۔ سپاہی کا لڑکا کھانے کا اتنا سامان دیکھ کر حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ ایک بالشت کا تو یہ آدمی اور اتنا سامان اٹھا کر کیسے لے آیا ؟ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا اس نے جلدی جلدی مٹھائی کھائی اور پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا باقی ساری مٹھائی اور روٹیاں بونا دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر گیا۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں ایک ساتھ سفر پر روانہ ہوئے، چلتے چلتے وہ ایک راجا کے محل کے پاس پہنچے راجا کی ایک بیٹی تھی نام تو کچھ اور تھا لیکن سب اسے پھول شہزادی

کہتے تھے بات یہ تھی کہ شہزادی بہت ہی نازک اور پھولوں کی طرح کومل تھی اس کا وزن صرف گلاب کے پانچ پھولوں کے برابر تھا۔ شاہی رسم و رواج کے مطابق ہر روز اسے سونے کے ترازو میں تولا جاتا تھا۔ اور حیرت کی بات تھی کہ روزانہ اس کا وزن ایک سا رہتا نہ رتی کم نہ ایک رتی زیادہ اتفاق کی بات جب سپاہی کا لڑکا بونے کے ساتھ محل کے پاس سے گزرا تو پھول شہزادی اپنے محل کی کھڑکی میں کھڑی بازار کی سیر کر رہی تھی۔ جیسے ہی لڑکے کی نظر پھول شہزادی پر پڑی تو وہ اپنے دوست بونے سے بولا۔

"دوست کیا تم مجھے اس محل کے اندر نہیں پہنچا سکتے میں شہزادی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پہلے تو بونا اس کام کے لیے راضی نہ ہوا لیکن جب لڑکے نے اصرار کیا تو وہ مان گیا اور اپنی ہتھیلی پر بٹھا کر پھُر سے اڑ کر محل کے اندر جا پہنچا آہٹ پاکر شہزادی نے چونک کر دیکھا۔ اپنے کمرے میں اجنبی لڑکے اور بالشت بھر کے آدمی کو دیکھ کر پھول شہزادی ڈر گئی پہرے داروں کو بلانے کے لیے اس نے تالی بجائی لیکن کمرے میں پہرے داروں کے پہنچنے سے پہلے ہی بونا ایک ہاتھ میں شہزادی اور دوسرے ہاتھ میں سپاہی کے لڑکے کو اٹھا کر باغیچے میں چلا آیا دونوں کو باغ میں ایک جگہ بٹھا کر اس نے ایک بہت بڑے درخت کو اکھاڑا اور باغ کے بڑے دروازے پر کھڑے ہو کر پہرا دینے لگا شہزادی کو محل میں نہ پاکر ہر جگہ اس کی تلاش ہونے لگی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک کانا کوتوال گھوڑے کو سرپٹ دوڑائے باغیچے کی طرف آنکلا بونے میاں نے درخت کے تنے سے کانے کوتوال اور اس گھوڑے کی اتنی پٹائی کی کہ گھوڑا دولتی جھاڑتا ہوا اس جگہ سے فوراً بھاگ نکلا۔ کانا کوتوال دوڑا ہوا راجا کے پاس آیا اور بولا — بچائیے مہاراج میں مرا پھول شہزادی باغ شیریں میں ہے لیکن وہاں ایک نہایت خوفناک بونا پہرا دے رہا ہے قریب جانے پر وہ درخت اکھاڑ کر اس سے حملہ کرتا ہے۔ کوتوال کی زبانی یہ واقعہ سن کر راجا غصے سے آگ بگولا ہو گیا اسی وقت اس نے اپنی بھاری فوج کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ فوج جب باغ کے قریب پہنچی تو بونے نے پہلے کی طرح ایک ہاتھ پر شہزادی کو اور دوسرے پر سپاہی کے لڑکے کو بٹھایا اور ہوا میں اڑ گیا راجا اور راجا کی فوج دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

گھر پہنچ کر سپاہی کے لڑکے نے شہزادی کے ساتھ شادی کر لی اور دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ شادی کی تقریب سے فارغ ہو کر سپاہی کے لڑکے نے خوش ہو کر بونے کو آزاد کرتے ہوئے کہا میاں بونے اب مجھے تمھاری ضرورت نہیں رہی اب تم اپنی مالکن کے پاس جا سکتے ہو۔ بونے نے کہا بہت اچھا میرے آقا لیکن ایک بات بتائے دیتا ہوں کہ ابھی آپ کو کئی ایک مصیبتوں کا سامنا کرنا ہے۔ میری داڑھی کا یہ ایک بال رکھ لیجیے اگر آپ کو میری مدد کی ضرورت پیش آئے تو اسے آگ میں جلا دینا میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر بالشت بھر کا وہ آدمی پھُر سے اڑ گیا دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک روز سپاہی کا لڑکا اپنی بیوی شہزادی پھول کے ساتھ سیر کرنے کے لیے نکلا مگر واپسی کے وقت وہ گھر کا راستہ بھول گیا راستے کی تلاش میں دونوں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے کہ انھیں سامنے سے ایک سادھو آتا ہوا نظر آیا قریب پہنچ کر لڑکے نے سادھو کو اپنی رام کہانی سنائی، دونوں کی دکھ بھری کہانی سن کر سادھو بولا بچو گھبراؤ نہیں اب تو رات ہو گئی ہے تم میرے ساتھ میری کٹیا پر چلو اور کھانا کھاؤ کل میں تمھیں گھر چھوڑ آؤں گا۔" پھول شہزادی اور سپاہی کا لڑکا دونوں سادھو کی باتوں میں آ گئے اور اس کے ساتھ اس کی کٹیا پر پہنچ گئے اور سادھو نے شہزادی کو اپنی کٹیا کی چابیوں کا گچھا دیتے ہوئے کہا "لو بیٹیا تم سامنے والا کمرہ کھول کر اس میں سے کھانے پینے کی چیزیں نکال کر خوب کھاؤ پیو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں" اتنا کہہ کر سادھو وہاں سے چلا گیا۔ شہزادی نے سادھو کے کہنے کے مطابق کمرہ کھولا اور اس میں سے اچھے اچھے پھل اور مزے دار کھانے نکال کر کھانا شروع کیا ابھی دونوں نے کھانا شروع

ہی گیا تھا کہ قریب کے کمرے سے کسی کے رونے اور سسکنے
کی آواز آئی سپاہی کے لڑکے نے جلدی سے اٹھ کر کمرہ کھولا
تو وہ یہ نظارہ دیکھ کر کانپ گیا کمرے کے اندر بہت سی انسانی
کھوپڑیاں پڑی تھیں ایک طرف ایک لڑکی زنجیر میں جکڑی ہوئی
تھی سپاہی کے لڑکے کے دریافت کرنے پر اس لڑکی نے
بتایا کہ یہ سادھو انسانی بھیس میں ایک خونخوار جادوگر ہے۔
ایک دن میں جنگل میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ پانی بھرنے آئی
تھی تو یہ بہلا پھسلا کر ہمیں یہاں لے آیا اور قید کر لیا میری
ساری سہیلیوں کو تو یہ ایک ایک کرکے مار کر کھا چکا ہے۔ آج
میری باری ہے وہ شاید آگ جلانے کے لیے لکڑیاں لینے
گیا ہے اگر ہوسکے تم یہاں سے جلدی سے بھاگ جاؤ یہ سن کر
سپاہی کے لڑکے کے ہوش اڑ گئے اس نے جلدی سے قیدی
لڑکی کو آزاد کیا اور شہزادی کو ساتھ لے کر وہاں سے
بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا ابھی انھوں نے گھر سے قدم باہر رکھا
ہی تھا کہ سامنے سے وہی سادھو آتا ہوا دکھائی دیا سپاہی
کے لڑکے نے جلدی سے بونے کی داڑھی کا بال نکال کر آگ
میں ڈال دیا دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں زور زور کی سرسر
کی آواز سنائی دینے لگی جو آہستہ آہستہ قریب آرہی تھی۔
سادھو بھی بونے کی طاقت سے واقف تھا اس لیے وہ بھی
جلدی سے بارش بن کر مصنوعی بارش برسانے لگا ادھر بونے
نے جب دیکھا کہ سادھو بارش بن گیا ہے تو اس نے خود کو
آندھی میں تبدیل کرکے بارش کو روکنے کی کوشش کی اس پر
سادھو نے کبوتر کا روپ دھار کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں
اپنی خیریت سمجھی بونے نے اسی وقت عقاب بن کر اس کا پیچھا
کیا کبوتر اپنی پوری طاقت سے اڑتا ہوا آسمان پر راجا اندر
کے دربار میں پہنچا اور ایک گلاب کا پھول بن کر اس کی گود
میں جا گرا راجا اندر اس وقت اپنے دربار میں بیٹھے گانا
سن رہے تھے بونے نے بھی وہاں پہنچ کر گانا شروع
کر دیا اور اتنی میٹھی آواز میں گایا کہ راجا نے خوش ہو کر
کہا بھئی واہ کمال کر دیا بولو تم کیا چاہتے ہو جو مانگو گے سو پاؤ
گے بونے نے کہا مہاراج مجھے صرف وہ پھول چاہیے جو
آپ کی گود میں ہے راجا نے جیسے ہی پھول اٹھانے کی
کوشش کی پھول چوہا بن کر بھاگ نکلا لیکن بونے نے جلدی
سے بلی بن کر چوہے کو دبوچ لیا ادھر پھول شہزادی اور اس کا
شوہر اور قیدی لڑکی تینوں سادھو کے مکان میں کھڑے
ہونے کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے کہ یکایک سائیں سائیں
کی آواز پیدا ہوئی اور بونے صاحب آگئے بولے میں
اس کمبخت کا خاتمہ کرکے آیا ہوں۔ چلیے اب میں آپ
لوگوں کو اپنے اپنے گھر پہ چھوڑ آؤں اتنا کہہ کر ایک ہاتھ
میں پھول شہزادی اور سپاہی کے بیٹے کو اٹھایا اور دوسرے
پر قیدی لڑکی کو بٹھایا اور ہوا میں اڑ چلا پہلے قیدی لڑکی
کو اس کے ماں باپ کے پاس پہنچایا پھر سپاہی کے لڑکے اور
پھول شہزادی کو لے کر شاہی محل پہنچا پھول شہزادی کا
باپ اپنی بیٹی کے غم میں مر چکا تھا۔ پھول شہزادی کے کہنے
پر لوگوں نے سپاہی کے لڑکے کو راجا کی گدی پر بٹھا دیا
اب تو سپاہی کا لڑکا راجا بن کر عدل و انصاف کے ساتھ
حکومت کرنے لگا اور اپنی پیاری ماں اور ملکہ
شہزادی پھول کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا۔ دیکھا آپ
نے کیسی مزے دار ہے یہ کہانی۔

(پنجاب کی ایک عوامی کہانی)

بقیہ ص ۱۸

میں —— لیکن حیوانات تو دکھائی دیتے ہیں؟
انٹارکٹکا —— ہاں بحری حیوانات کی شکل
میں سیل اور وہیل مچھلی کی قسم یہاں ملتی ہے۔ بحری
اور بری حصوں پر کافی چڑیاں ملتی ہیں۔ ان میں اسکوا گل
اسنو پیٹرل اور کئی قسم کی پینگوئن چڑیاں پائی جاتی ہیں۔
جو ہمارے ساحل کی طرف آنے والے ہر انسان کا گویا
انتظار کرتی رہتی ہیں۔

دو شکاری (قسط ۱۴)

امۃ الرحمٰن محسنی

دو منٹ بعد ہم اپنا سامان ٹیکسی میں رکھ کر اور خود بھی بیٹھ کر آہستہ آہستہ ناہموار کچی سڑک طے کر کے بڑے راستے پر جا رہے تھے۔

ابّو خوشی اور فخر سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ "بشیر! دیکھا تم نے کیا مال بٹور کر لایا ہوں۔ یہ کیسا جناتی کام ہوا ہے"! اور بشیر بھیا کی نظریں ان پھولے ہوئے تھیلوں پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ وہ حیرت زدہ ہو کر کہہ رہے تھے۔

"ارے لنگڑے آدمی! تم نے یہ سب کیسے کر ڈالا؟"

"تمھیں معلوم ہے یہ سب دالی نے کیا ہے"۔ وہ بڑی شان سے "میرا بیٹا "چیمپین آف دہ ورلڈ" ہے نا"!

بشیر بولے "اور واحد ذرا تصور تو کرو کل شہباز خاں کی شکار پارٹی ہے۔ تم نے وہاں شکار کے لیے ایک بھی تیتر نہیں چھوڑا ہنکاروں کو کیسی مشکلوں کا سامنا ہوگا۔ شکاریوں کا مارے غصے کے کیا حال ہوگا"؟

"ہاں بھیا یہ سب باتیں تصور کر رہا ہوں۔ بڑا ہلہ گلہ مچے گا۔ شہباز خاں صاحب کا دھواں دھواں چہرہ بھی میری نظروں میں گھوم رہا ہے۔"

"ذرا سوچو تو"! بشیر بھیا مزہ لیتے ہوئے بولے۔ "بڑے بڑے لوگ اپنی بڑی بڑی چمکدار کاروں میں میلوں سے چل کر آئیں گے۔ اور جب جنگل میں شکار کے لیے جائیں گے۔ تو انھیں وہاں شکار کے لیے ایک چڑیا کا بچہ بھی مارنے کے لیے نہیں ملے گا۔" اور یہ کہہ کر بشیر بھیا اتنے ہنسے کہ ٹیکسی اور راستے کی طرف سے ان کا دھیان ہی ہٹ گیا تھا۔ گاڑی جب راستے سے اتری تب انھیں پتا چلا۔

"ابو! آپ اتنے بہت سے تیتروں کو کیا کریں گے"۔ میں نے پوچھا۔

"کیا کریں گے؟ اپنے دوستوں میں تقسیم کریں گے"۔ ابو نے جواب دیا۔ "پہل تو بشیر سے ہوگی۔ کیوں بشیر بھیا ایک درجن کافی رہیں گے؟" "ارے بہت"! بشیر بھیا خوش ہو کر بولے۔

"اور ایک درجن ڈاکٹر حسین کو بھیجیں گے۔ اور ایک درجن مہتاب علی کو"۔

"مہتاب علی"! میں نے حیرت سے پوچھا۔ "ابو کیا آپ سرجنٹ مہتاب علی کی بات کر رہے ہیں"؟

"ہاں ہاں سرجنٹ مہتاب علی! وہ اپنا پرانا دوست ہے۔"

"مہتاب علی بہت ہی پیارا آدمی ہے۔ بہت عزت اور محبت سے ملتا ہے"۔ بشیر بھیا نے کہا۔

میں سرجنٹ مہتاب علی کو قصبے کے پولس مین کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ وہ لمبے قد، موٹے جسم، کالی کھڑی مونچھوں والا آدمی ہے بڑی گلیوں، سڑکوں پر بڑی شان سے نپے تلے اور جمے ہوئے قدم رکھتا ہوا اس احساس کے ساتھ چلتا ہے کہ اس وقت وہ بڑی اہم شخصیت ہے۔ اس کو صرف دیکھ لینے ہی سے میرا دم خشک ہو جاتا تھا۔ اس کی یونیفارم میں پیتل کے سنہرے بٹن ہیروں کی طرح چمکتے ہوتے ہیں۔ اگر سڑک پار کرتے میں وہ مجھے نظر آجاتا تھا۔ تو میں وہاں سے دور جا کر سڑک پار کرتا تھا۔

ابو نے کہا۔ "مہتاب کو تیتر کا روسٹ بہت ہی پسند ہے۔"

"اس کو تیتر پکڑنے کی بھی کئی ترکیبیں آتی ہیں"۔ بشیر بھیا نے بتایا۔

مسکن دودھ پور علی گڑھ

یہ باتیں دونوں میں ہو رہی تھیں اور میں حیرت کے ساتھ سن رہا تھا۔ اور ساتھ ہی مجھے یہ بھی دریافت ہوا کہ سرجنٹ بہتا کسی اور طرح کی مخلوق نہیں ہے۔ بلکہ ہم ہی جیسے عام انسان ہیں۔ اور یہ باتیں سننے کے بعد مجھے آیندہ ان سے زیادہ ڈر بھی نہیں لگے گا۔

"ابو! کیا آپ جاتے ہی ان تیتروں کو تقسیم کر دیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں دانی آج رات نہیں تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پوچنگ کے بعد اپنے گھر ہمیشہ خالی ہاتھ جایا کرتے ہیں۔ کیوں کہ کیا پتا شیر خاں یا اس کا کوئی ساتھی گھر کے دروازہ پر کھڑا کوئی چیز لاتے دیکھنے کا انتظار کر رہا ہو۔"

"شیر خاں بڑا چالاک اور مکار ہے" لشبیر بھیا نے کہا۔ "وہ شہباز صاحب کی کار میں ہی آئے گا۔ اس لیے جس کار میں وہ آتا جاتا ہے اس کے ٹینک میں تم کو آدھا کلو چینی ڈال دینی چاہیے تھی۔ بس اس کی نظر بچا کر ڈال دیتے۔ ہم تو پوچنگ کرنے سے پہلے چوکیداروں کی چوکسی پہلے ہی کر لیتے ہیں تاکہ وہ ہم کو پکڑنے اور دیکھ بھال کرنے نہ آسکیں۔ واجد مجھے بڑی حیرت ہے۔ تم اتنے بڑے پیمانے پر یہ کام کرنے نکلے تھے۔ اور چوکیداروں کا کوئی انتظام نہیں کیا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ شکر سے ہوتا کیا ہے؟"

"ارے! شکر اس منحوس گاڑی کو پورے طور پر جام کر دیتی ہے۔" لشبیر بھیا نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ "جب تک انجن کا ایک ایک پرزہ کھول کر صاف نہ کیا جائے۔ گاڑی ایک انچ نہیں سرک سکتی۔ کیوں واجد! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"بالکل ٹھیک" ابو نے کہا۔

اب ہم ناہموار راستے سے نکل کر سڑک پر آچکے تھے۔ لشبیر بھیا نے ٹیکسی قصبے کی طرف موڑ لی تھی۔ اور ابو سے پوچھ رہے تھے۔ "یہ سامان تم کو فاروق صاحب ہی کے یہاں رکھنا ہے؟"

"ہاں" ابو نے جواب دیا۔ "بس سیدھے فاروق صاحب کے یہاں چلے چلو۔ فاروق صاحب کی بیگم ہی سب کے حصے بھجوائیں گی۔"

"اور دانی! کیا یہ بات میں نے تم کو نہیں بتلائی تھی۔"

"نہیں ابو آپ نے مجھے نہیں بتلائی تھی۔" میں نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ میں اس وقت بے حد حیران تھا۔ بیگم زبیدہ، فاروق انجنیر کی بیوی تھیں۔ ان کو میں نے دیکھا تھا۔ اور میں ان کو جانتا تھا۔

قاعدہ یہ ہے کہ حصہ تقسیم کرنے کے لیے کسی معزز خاتون کو چنا جاتا ہے۔ "کیوں لشبیر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" ابو نے سوال کیا۔ "اس کام کے لیے تم نے بیگم زبیدہ کا انتخاب بہت مناسب کیا ہے"۔ لشبیر بھیا نے کہا۔

ابو اور لشبیر بھیا جو باتیں کر رہے تھے۔ میں کھلے منہ گول آنکھوں سے سن اور ان کو دیکھ رہا تھا۔ اور یقین نہیں آرہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پورے ضلع کے لوگ پوچنگ کے مسخرے پن میں لگے پڑے ہیں۔ "فاروق صاحب کو تیتروں کا قورمہ بہت مرغوب ہے۔" ابو کہہ رہے تھے۔ لشبیر بھیا کہہ رہے تھے۔ اور ہنس رہے تھے۔ "واجد یہ بتاؤ پسند کسے نہیں ہے۔"

جب ہم قصبے کی سڑکوں پر چل رہے تھے تو روشنیاں جل چکی تھیں۔ بسیں آجا رہی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔

ابو بولے۔ "دانی! ان چڑیوں کو اتنے آرام سے سلا کر ہم نے ان پر بڑا احسان کیا ہے۔ کل کو ان پر بہت برا وقت آنے والا تھا۔ اچھا ہوا کہ ہم نے ان کو پکڑ لیا ہے۔"

لشبیر بھیا بولے یہ تو شکار ہونے سے پہلے ہی آدھ مری ہو جاتیں۔ ہنکانے ہی میں ان کے پُرنچ جاتے اور بہت سی تو زخمی ہو جاتیں۔

ٹیکسی ایک کم آبادی والی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ تھوڑی دور چل کر فاروق صاحب کے گیٹ کے سامنے جا کر رک گئی۔ اتفاق سے ابھی ان کے گھر روشنی نہیں ہوئی تھی۔ نہ آس پاس کوئی آدمی ہی ہم کو ملا۔ میں اور ابو گاڑی سے اتر آئے اور تیتروں کے تھیلوں کو گاڑی میں سے اتار کر ایک کوٹھلوں کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ اور باہر آکر لشبیر بھیا کو ہم نے خدا حافظ کہا، شکریہ ادا کیا اور دونوں اپنے گھر کی طرف چل دیے۔

(باقی آیندہ)

سفید ریگستان

ڈاکٹر قنبر رضوی

سلسلے کے لیے دیکھیے شمارہ ۱۵ جنوری ۱۹۸۲ء

دوسرے دن میری ملاقات اینٹارکٹکا سے قطب جنوبی پر واقع تین ہزار میٹر بلند پٹھار پر ہوئی۔ اس کے جسم پر ہر طرف برف کے کپڑے تھے اور بہت کم حصہ کھلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ چاروں طرف برف کے دریا ایک دوسرے سے ملحق، سیکڑوں کی تعداد میں بہتے ہوئے اینٹارکٹکا کے دامن کو چھو رہے تھے۔ یہ برف کے دریا گلیشیر کہلاتے ہیں۔ ان پر برف کی موٹائی کہیں تین سو میٹر تھی تو کہیں دو ہزار میٹر۔ ایک اور عجیب بات جو اینٹارکٹکا کے ساحلی دامن میں دکھائی دی تھی جو کسی اور براعظم کے ساحل پر نہیں ملتی، وہ تھی برف کے تودوں کی ایک قطار۔ مغرب میں بحرِ روس کے ساحل سے چپکا ہوا اُتھلے سمندر میں تیرتے ہوئے برف کا سلسلہ اتنا طویل تھا جتنا یورپ کے ملک فرانس کا رقبہ۔

میں نے بڑھ کر اینٹارکٹکا سے پوچھا۔ "اے برفیلے براعظم! آپ کا یہ برفانی لباس پھیلتے پھیلتے کہاں تک پہنچ گیا ہے۔"

اینٹارکٹکا ـــــ آیئے ذرا بلندی سے دیکھیے۔ یہ برفانی سلسلہ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر شمالی سمندروں کی سطح کی طرف کھسک گیا ہے۔ بعد میں گھل کر یہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

میں ـــــ آپ کے لیے یہ برف کی چادر تیار کیسے ہوتی ہے؟

اینٹارکٹکا ـــــ دراصل جنوری کے آخر سے ہی کسی خلیج یا کھاڑی کے اس حصے میں جو ہوا کی آڑ میں ہوتا ہے، برف کی تہ پر تہ جمنی شروع ہو جاتی ہے مارچ تک یہ پھیل جاتی ہے اور بندرگاہوں پر کھڑے ہوئے جہاز بھی اگر ہوا کے رخ پر نہیں ہیں تو وہ بھی زد میں آجاتے ہیں۔ بس تیز ہوائیں جو اکثر قطب سے ساحل کی طرف چلا کرتی ہیں۔ برف کے چادر بننے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ جہاں جہاں آڑ ہوتی ہے برف کی موٹی چادر اکتوبر نومبر تک بڑھتی ہی رہتی ہے۔

میں ـــــ معاف کیجیے گا۔ اس برف کے لبادے کے نیچے مجھے دو اینٹارکٹکا دکھائی دیتے ہیں۔ مغرب میں ایک چھوٹا اینٹارکٹکا اور مشرق میں ایک بڑا۔"

اینٹارکٹکا ـــــ جی نہیں۔ اگر خط گرینوچ (Greenwich) یعنی صفر درجہ طول البلد اور ۱۸۰ درجہ طول البلد کو خط تقسیم مان لیں تو میرے جسم کے چار حصے ہیں۔ اینڈرلی۔ وکٹوریہ۔ اُوس اور ویڈل ـــــ ان میں پہلے دو حصے برّی اور دوسرے دو حصے بحری ہیں ـــــ بحرِ اُوس اور بحرِ ویڈل کے درمیان ایک نشیبی میدان ہے جس سے مغرب میں ہمارا ایک تہائی حصّہ ہے جو مغربی اینٹارکٹکا کہلاتا ہے۔ اس میں جزیرہ نما، ایڈورڈ ہفتم

اے کے ڈگری کالج شکوہ آباد

میری بائرڈ لینڈ، ایلزورکا پٹھار۔ جزیرہ نما پامر یا گراہم لینڈ شامل ہیں۔ باقی دو تہائی حصہ مشرقی اینٹارکٹکا کہلاتا ہے۔ جس میں کوٹس لینڈ، کوین ماڈ لینڈ، اینڈرلی لینڈ، کیمپ ساحل، میک رابرٹس ساحل، پرنسس الیز بتھ لینڈ، ولہم دوئم ساحل، کوئنس میری ساحل، ایڈلی ساحل، جارج پنجم ساحل، ولکیز لینڈ، اوٹس لینڈ اور وکٹوریہ لینڈ کے علاقے ہیں۔ اسی حصے میں ولہم دوئم ساحل پر ایک بلند مخروطی آتش فشاں پہاڑ بھی واقع ہے جس کو کوہ گوس کہتے ہیں۔

میں ــــ سب سے اونچا پہاڑ کون سا ہے؟

اینٹارکٹکا ــــ راس شمالی سب سے بلند کوہستانی سلسلہ ہے۔ ۸۰° جنوبی سے ۸۵° جنوبی تک جنوبی مشرق سمت میں پھیلے ہوئے اس سلسلے پر ہماری سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ مارکھم ہے جو ۱۵۱۰۰ فیٹ یا تقریباً پانچ ہزار میٹر اونچی ہے اسی طرح ۸۰° جنوبی کے قریب مجموعہ الجزائر میں اوس جزیرہ پر واقع کوہ ایریبس ۱۳۲۰۲ فیٹ یا سوا چار ہزار میٹر اونچا ہے۔

میں ــــ کیا جغرافیہ داں اور سائنس داں حضرات ان سب پہاڑوں کا مطالعہ کرچکے ہیں؟

اینٹارکٹکا ــــ جی نہیں!! ابھی تک جغرافیائی مطالعہ صرف ساحلی خطے تک محدود ہے کیوں کہ اندرونی حصہ تو برف کی کئی ہزار فیٹ موٹی تہ سے ڈھکا ہوا رہتا ہے۔ مغربی اینٹارکٹکا میں برف کی موٹائی کم رہنے سے مطالعہ ہو رہا ہے۔ سب سے خاص بات اس حصے کی یہ ہے کہ یہاں موڑ دار کوہستانی سلسلہ ہے اور جنوبی امریکہ سے قریب ہونے کی بنا پر کوہ اینڈیز کے کوہستانی سلسلے کے آتش فشانی مادے سے بنی ہوئی چٹانیں بھی یہاں دکھائی دیتی ہیں۔ علم الارض کے نقطۂ نظر سے یہ حصہ اہم سمجھا جاتا ہے۔

میں ــــ کیا علم الارض کے ماہرین نے معدنیات کا بھی پتا لگایا ہے؟

اینٹارکٹکا ــــ جی ہاں۔ مشرقی اینٹارکٹکا میں کچھ خاص معدنیات کا پتا لگایا گیا ہے۔ وکٹوریہ لینڈ میں کوئلہ کئی سو مربع کلومیٹر جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ اندازہ ہے کہ یہاں کی قدیم گرینائٹ اور نیس چٹانوں میں یورینیم سونا، مینگنیز اور دوسری اہم معدنیات بھی پائی جاتی ہیں۔ مغربی اینٹارکٹکا میں جنوبی شیٹلینڈ جزیروں پر تانبہ سیسہ اور لوہا پایا گیا ہے۔ مغربی حصے میں پٹرولیم کے ملنے کے بھی امکانات ہیں۔

میں ــــ اتنے قیمتی معدنیات کی موجودگی اور امکانات کے باوجود یہاں انسان دور دور نہیں دکھائی دیتا۔

اینٹارکٹکا ــــ جناب اس برف کے ریگستان میں انسان کے لیے کوئی دلکشی نہیں ہے۔ انسان بھلا ان تیز ہواؤں اور برفباری کا کیسے مقابلہ کرے۔ اس براعظم پر پانی تو برستا نہیں۔ درجۂ حرارت کا اوسط ۵° فارن ہائٹ یا سینٹی گریڈ کے نقطۂ انجماد سے ۱۵° نیچے رہتا ہے، جو شمال کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں یہاں ۹۱° سینٹی گریڈ درجۂ حرارت ریکارڈ کیا گیا جو بہت ہی کم ہے۔ جنوبی قطب پر ہوا کا دباؤ بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور ہوائیں بھی بہت تیز اور سرد ہو جاتی ہے جس سے سردی اور برفباری دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ساحلی علاقوں کی طرف ہوا اور تیزی سے چلنے لگتی ہے۔ جارج پنجم اور اڈیلی ساحلی علاقوں میں تو یہ رفتار بڑھ کر ۸۰ کلومیٹر فی گھنٹہ ہو جاتی ہے۔

میں ــــ مجھے تو نباتات بھی یہاں نہیں دکھائی دیتے۔

اینٹارکٹکا ــــ جی ہاں چونکہ گرمیوں میں بھی درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر نہیں ہوتا۔ اس لیے یہاں نباتات دکھائی نہیں دیتے۔ کہیں کہیں جہاں برف کے درمیان چٹانیں دکھائی دینے لگتی ہیں وہاں نباتات دکھائی دینے لگتی ہیں۔

باقی صفحہ ۱۴۷ پر

تاریخ کی روشنی میں

دشمن کا علاج

جس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان فلسطین میں جنگ ہو رہی تھی اور یورپ کے بہت سے بادشاہ اپنی اپنی فوجیں لے کر مسلمانوں کے مقابلے میں آ پہنچے تھے، اُنھی دوران انگلستان کا بادشاہ رچرڈ بیمار ہو گیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے ایک طبیب کو تمام ضروری دوائیں دے کر رچرڈ کا علاج کرنے کے لیے روانہ کیا۔

جب طبیب رچرڈ کے خیمے پر پہنچا تو رچرڈ کے دربان نے اُسے روک دیا اور بولا: "بادشاہ سلامت اس وقت آرام کر رہے ہیں۔ میں انھیں جگا نہیں سکتا۔ تم کس کام سے آئے ہو؟"

طبیب نے کہا: "مجھے سلطان صلاح الدین نے تمھارے بادشاہ کے علاج کے لیے بھیجا ہے۔"

یہ سن کر دربان حیران رہ گیا۔ وہ بولا: "کیا تم ہمارے بادشاہ کو اچھا کر سکتے ہو، تم تو ہمارے دشمن ہو۔ اے طبیب! تو واپس چلا جا، سلامتی اسی میں ہے۔ تیرا سلطان بھی اگر آ جائے تب بھی میں اپنے بادشاہ کے آرام میں خلل نہ ڈالنے دوں گا۔"

اس پر طبیب بولا: "اے دربان! یاد رکھ ہماری قوم ڈٹ کر تجھ سے مقابلہ کر رہی ہے اور کرتی رہے گی مگر مسلمان ہمدرد اور بڑے دل والے ہوتے ہیں، نفع پہنچانا چاہتے ہیں۔ تیرے بادشاہ کی صحت اور شفا کے خواہش مند ہیں۔ جا اپنے آقا کے پاس اور اس سے میرے لیے اجازت طلب کر۔ ممکن ہے اس کی شفا میرے ہی ہاتھوں پر لکھی ہو۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ہم تمھارے بادشاہ کی شفا چاہتے ہیں، لیکن تم نہیں چاہتے۔ کتنے شرم کی بات ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ تم ڈرتے ہو، لہٰذا کسی نعمت کے مستحق نہیں ہو۔ میرے آقا سلطان صلاح الدین نے شاید غلطی کی جو مجھے یہاں بھیجا۔"

یہ سن کر دربان نے کہا: "ہم اپنی جان کے لیے نہیں ڈرتے مگر اپنے بادشاہ کے لیے بے شک ڈرتے ہیں۔"

اتنے میں بادشاہ رچرڈ جاگ گیا اور اس نے خیمے کے اندر سے آواز دی۔

"یہ کیا شور ہو رہا ہے۔ اے دربان! تو میرے آرام ...

ایک پیسے کا کرشمہ

معین الدین
قصبہ۔ گڑھی عبداللہ خاں

بہت پرانی بات ہے۔ شہر بغداد میں دو دوست رہتے تھے سعد و سعدی۔ سعد و سعدی میں دوستی کا رشتہ بچپن سے قائم تھا۔ ایک روز دونوں میں بحث شروع ہوئی کہ انسان کی زندگی میں رنج و راحت، افلاس و ریاست، تکلیف و صحت، اس کی اپنی جدو جہد اور رکھ رکھاؤ سے پیش آتے ہیں یا پھر تقدیری امور ہیں اور بغیر انسانی خواہش کے خود بخود پیش آتے رہتے ہیں؟ دونوں میں اسی طرح کی بحث ہوتی رہی، جب یہ بحث طویل ہو گئی تو انھوں نے امتحان لینے کا فیصلہ کیا کہ کسی نہایت غریب آدمی کو منتخب کر کے اس کی امداد کرنی چاہیے۔ طے ہوا کہ اسے ہر قسم کی سہولت فراہم کی جائے کہ وہ اپنی کوشش اور ہمارے روپے سے اپنی حالت سنوارے۔ اس کے بعد انجام دیکھ کر اس مسئلے پر آخری رائے قائم کی جائے گی۔ دونوں دوست ایسے آدمی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کئی روز تک ان کی تلاش جاری رہی۔

شہر بغداد میں ہی ایک شخص حسن خیال نامی رہا کرتا تھا۔ جو بہت غریب ہونے کے باوجود ایمان داری اور دیانت داری سے رسی بٹ کر اپنے بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ جھوٹ بولنا اس کے لیے بہت بڑا جرم تھا۔ اس نے شہر میں ہی ایک دکان رسیاں بیچنے کے لیے کر رکھی تھی۔

سعد و سعدی کو جب کوئی موزوں آدمی نہ ملا تو سعدی نے حسن خیال کے بارے میں رائے دی تو سعد نے اطمینان کرنے کے لیے دیگر اشخاص سے حسن خیال کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو ہر شخص نے حسن خیال کو ایمان دار آدمی بتایا۔ جب سعد و سعدی کو پورا یقین ہو گیا کہ یہ شخص غریب لیکن دیانت دار آدمی ہے تو دونوں اس کی دکان کی طرف بڑھے۔ سلام دعا کے بعد دونوں دوستوں نے رائے ظاہر کی کہ ہم نے یہ طے کیا ہے کہ تمھاری امداد کریں۔ یہ کہہ کر سعدی نے دو سو اشرفیاں غریب کو دے کر کہا یہ رقم ہم تمھیں خدا کے نام پر دیتے ہیں تاکہ تم اپنا کاروبار صحیح طریقے پر چلا سکو۔

حسن خیال نے اشرفیوں کی تھیلی لے لی اور ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور جب وہ دونوں دوست چلے گئے تو حسن خیال نے بیوی کے مشورے سے دس اشرفیاں سن خریدنے کے لیے الگ جیب میں رکھ لیں باقی ایک سو نوے اشرفیاں حسن نے اپنی پگڑی میں باندھ لیں اور سن خریدنے کے لیے بازار کا رخ کیا۔ چلتے وقت بیوی نے یہ بھی کہا تھا کہ قصاب کی دکان سے گوشت لیتے آنا۔ حسن خیال سن اور گوشت خرید کر گھر لوٹ رہا تھا۔ راستے میں ایک چیل نے گوشت کو دیکھ کر جھپٹا مارا اور حسن کی پگڑی، جس میں گوشت اور ایک سو نوے اشرفیاں بندھی ہوئی تھیں، پنجوں میں پھنسا کر لے اڑی۔ غریب حسن خیال دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا کیونکہ چیل نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

حسن کو اتنی بڑی چیز کے چلے جانے کا بہت رنج تھا کیوں کہ سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ اگر سعدی نے آکر دریافت

کیا کہ کھا کام شروع کیا ہے تو کیا جواب دوں گا۔

یہی سوچتا ہوا حسن گھر پہنچا تو بیوی نے کہا چہرے پر اداسی چھائی ہوئی ہے کیا وجہ ہے....؟ حسن نے سب حال بتایا تو بیوی کو بھی بہت رنج ہوا۔ حسن نے بیوی کو سمجھایا کہ یہ سب تقدیر کی باتیں ہیں صبر کرو اگر ہماری قسمت میں غریبی ہی لکھی ہے تو ہزار سعدی بھی مل کر ہمیں امیر نہیں بنا سکتے.....“

اور پھر حسن خیال صبر کر کے بدستور اپنے کام پر لگ گیا۔

ایک مدت کے بعد وہی دونوں دوست سعد و سعدی حسن خیال کے پاس آئے اور کاروبار کے بارے میں معلوم کیا تو حسن نے بڑی شرمندگی کے ساتھ سارا واقعہ بیان کر دیا۔

سعد نے اس کو بناوٹ پر محمول کیا اور کہنے لگا کہ آج تک کسی نے سنا ہے کہ چیل اشرفیوں سمیت پگڑی لے کر اڑ جائے...؟ لیکن سعدی نے کہا دوست قسمت اسی کا نام ہے۔ حسن خیال ایسا آدمی نہیں معلوم ہوتا کہ جھوٹ بولے۔ اسی طرح کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ چلتے وقت سعدی نے حسن کو پھر دو سو اشرفیاں دیں اور کہا کہ ان کو دیکھ بھال کر رکھنا...؟ اور اگر تم نے محنت سے کام کیا تو مجھے امید ہے کہ تم ضرور آسودہ حال ہو جاؤ گے۔ اور پھر وہ دونوں دوست چلے گئے۔ حسن خیال کچھ دیر دکان پر بیٹھا رہا پھر اشرفیاں لے کر گھر آیا تو معلوم ہوا کہ بیوی کسی عزیز کے یہاں گئی ہوئی ہے۔

حسن نے ایک سو نوے اشرفیاں ایک بھوسی کے گھڑے میں رکھ دیں اور اوپر سے گھڑے کا منھ بند کر دیا اور دس اشرفیاں سن خریدنے کے لیے جیب میں رکھیں اور اپنی دکان پر جا کر کام کرنے لگا اور بیوی سے بتانا بھول گیا کہ فلاں گھڑے میں اشرفیاں رکھی ہیں۔

اگلے روز حسن خیال دکان پر تھا کہ اتفاقاً ایک مٹی فروخت کرنے والا مٹی بیچتا پھر رہا تھا اور حسن کی بیوی کو مٹی کی ضرورت تھی اس نے وہی بھوسے کا گھڑا دے کر مٹی خرید لی۔ شام کو حسن خیال گھر آیا تو بیوی سے کہا کہ سعد و سعدی آئے تھے اور دو سو اشرفیاں دے کر گئے ہیں جو فلاں گھڑے میں رکھی ہیں۔ یہ سن کر بیوی نے سر پیٹ لیا کہ تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔؟ میں نے وہ گھڑا مع بھوسی کے دے کر مٹی خرید لی تھی۔

حسن خیال کی اس وقت ایسی حالت تھی کہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ اس کے دل میں خیال آرہے تھے کہ سعدی مجھے جھوٹا، بد معاش، آوارہ اور نہ جانے کیا سمجھے گا۔ میں اس کو کس طرح منھ دکھاؤں گا۔ اس فکر میں حسن کی حالت بیمار نہ ہوتے ہوئے بھی بیماروں جیسی ہو گئی تھی کچھ دن کے بعد جب اس کا غم ہلکا ہو گیا تو پھر دکان پر جانے لگا۔ دن گزرتے رہے۔

کچھ عرصے کے بعد حسن کو سعد و سعدی آتے دکھائی دیے۔ دکان پر آکر دونوں نے سلام کیا اور حسن خیال کی حالت دریافت کی۔ شدت رنج و شرم سے حسن کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ انھیں کوئی جواب نہ دے سکا۔ بڑی مشکل سے حسن نے انھیں کل واقعہ روتے روتے سنایا۔ سعدی گو مایوس تھا لیکن اس نے حسن کو تشفی دی کہ تم اس قدر کیوں پریشان ہوتے ہو۔ بہرحال وہ روپیا قرض نہیں تھا۔ میں نے خدا کے نام پر دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے تمھاری کم عقلی پر افسوس ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں رخصت ہونے لگے تو سعد نے جیب سے ایک پیسا نکال کر حسن کو دیا کہ اس کو اپنے پاس رکھو اگر تمھاری تقدیر میں اچھے دن دیکھنے لکھے ہیں تو کیا عجب ہے، اسی پیسے سے حالت بدلنی شروع ہو جائے۔ سعدی یہ سن کر ہنس پڑا کہ جس کو چار سو اشرفیاں امیر نہ بنا سکیں تو اس ایک پیسے کا کیا بھروسا! سعد نے کہا میں یہ نہیں کہتا کہ اگر اس نے تدبیر سے کام لیا تو یہ پیسا اس کو امیر بنا سکتا ہے، میرا مقصد یہ ہے کہ اگر اس کی قسمت میں ریاست ہے تو ممکن ہے یہ پیسا ہی اس کے ظہور کا سبب بن جائے۔ یہ کہہ کر دونوں دوست چلے گئے حسن نے وہ پیسا اٹھا کر طاق میں رکھ دیا! اور خود گھر کے کام میں مصروف ہو گیا۔ زندگی کے کچھ دن اور اسی طرح گزر گئے۔ ایک روز حسن جب گھر ہی پر تھا کہ محلے کی ماہی گیر کی بیوی آئی اور بولی کہ مجھے ایک پیسے کی سخت ضرورت ہے۔ میرا شوہر سوت لا کر جال کی مرمت کرنا چاہتا ہے۔ اگر جال درست نہ ہوا تو کل ہمیں کھانے کو ٹکڑا میسر نہیں ہوگا۔ حسن نے وہی پیسا اٹھا کر اسے دے دیا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ اگلے روز وہی عورت ایک مچھلی لے کر آئی اور کہنے لگی کہ میرے شوہر نے عہد کیا تھا کہ پہلے جال میں جو بھی آئے گا وہ تمھیں

لاکر دیں گے۔ اس لیے یہ مچھلی آئی ہے قبول فرمائیں۔ حسن نے وہ مچھلی لے کر بیوی کو دے دی۔ جب حسن کی بیوی نے مچھلی صاف کی تو اس کے پیٹ سے ایک کافی بڑا شیشے جیسا ٹکڑا نکلا جو اس نے بچوں کو دے دیا۔ بچے دن بھر اس سے کھیلتے رہے۔ اگلے روز حسن حسب معمول دکان پر چلا گیا۔ دوپہر کو پڑوسی یہودی جوہری کی بیوی حسن کے گھر لسی لینے آئی تو اس نے بچوں کے ہاتھ میں وہ شیشے کا ٹکڑا دیکھا اور حیران ہو کر پوچھا کہ یہ شیشہ کہاں سے لائے ہو۔ حسن کی بیوی نے کہا کہ مچھلی کے پیٹ سے نکلا ہے۔ یہودن نے اپنے گھر جاکر شوہر سے اس کا ذکر کیا کہ حسن خیال کے یہاں مچھلی کے پیٹ سے ایسا نادر و نایاب ہیرا نکلا ہے جس کی قیمت سے وہ واقف نہیں ہیں۔

اگلے روز یہودن اپنے شوہر کے ساتھ حسن کے گھر گئی۔ اور کہنے لگی۔ یہ شیشہ تمھارے لیے بیکار ہے ہمیں دے دو بولو کیا لوگے اس کا؟ اس وقت کسی کام سے گھر آگیا تو یہودن نے کہا کہ اگر بیس اشرفی میں یہ شیشے کا ٹکڑا دینا چاہو تو ہمیں دے دو۔ بیس اشرفیوں کا ذکر سن کر حسن کو خیال آیا کہ ذرا سے ٹکڑے کی اتنی بڑی قیمت دیتی ہے۔ ضرور اس میں کوئی راز ہے۔ تبھی حسن کو سعد کے الفاظ یاد آگئے کہ اگر تقدیر میں ہوا تو اسی پیسے سے امیر بن سکتے ہو۔ حسن یہی سوچتا رہا۔ لیکن یہودن سمجھی کہ قیمت کم لگائی ہے شاید۔ کہنے لگی اچھا پچاس اشرفی لے لو۔ اب حسن کو یقین ہو گیا کہ یہ قیمتی چیز ہے۔ یہودن قیمت بڑھاتی بڑھاتی ایک لاکھ اشرفی تک پہنچ گئی۔ آخر کار سوا لاکھ میں سودا ہو گیا اور یہودن نے گھر سے قیمت لاکر دے دی اور ہیرا لے کر چلی گئی اب حسن خیال بہت خوش تھا جو کچھ سعد نے کہا تھا وہ پورا ہو گیا تھا حسن خیال نے جبھی ایک محل تعمیر کرایا اور بڑے بڑے کارخانے کھول دیے۔ اب حسن خیال خواجہ حسن خیال کے نام سے پکارا جانے لگا۔

(الف لیلیٰ کی کہانی کا انگریزی سے ترجمہ)

بقیہ صفحہ ۱۹

میں کیوں خلل ڈال رہا ہے؟

دربان بولا: "میرے آقا! ایک طبیب آیا ہے جسے سلطان صلاح الدین نے بھیجا ہے۔ بڑی دیر سے یہ جھگڑا کر رہا ہے اور آپ کے پاس آنا چاہتا ہے۔ میں اُس کو منع کر رہا ہوں۔"

یہ سُن کر رچرڈ نے کہا: "جس شخص کو سلطان صلاح الدین نے بھیجا ہے تو اُسے روک رہا ہے؟ اے طبیب تو میرے پاس چلا آ۔ میں تیرے سلطان کا مزاج جانتا ہوں۔ وہ ہر عزت اور احترام کا مستحق ہے، لہٰذا اُس کا بھیجا ہوا آدمی بھی ہر عزت کے لائق ہے۔ حالانکہ تو میرے بدترین دشمن کا بھیجا ہوا طبیب ہے، مگر تو یقیناً میرا مرض دور کر دے گا۔ کیا واقعی تجھے سلطان نے بھیجا ہے؟ کیا واقعی وہ اتنا اچھا آدمی ہے؟ لیکن اس کی ضمانت کون دے گا کہ تو اپنے دعوے میں سچا ہے؟"

طبیب نے کہا: میرا تیرے پاس آنا ہی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اے بادشاہ! میں تیرا دشمن ہوں، تو مجھ سے ڈرتا ہے، مگر میں تجھ سے نہیں ڈرتا۔ میرا آقا سلطان صلاح الدین سچا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ تیرے خیال سے نہیں ڈرتا۔ وہ اس کا محتاج نہیں کہ وہ تجھے زہر دے کر مار دے۔ وہ چاہتا ہے کہ تو اچھا ہو جائے وہ نہیں چاہتا کہ تو بستر پر مرے۔ وہ چاہتا ہے کہ تو میدانِ جنگ میں لڑتا ہوا مرے جو بہادروں کے مرنے کی بہترین جگہ ہے۔"

رچرڈ نے کہا: "اے طبیب! تو نے بالکل سچ کہا۔ اندر آجا اور تیرا جو جی چاہے کر۔"

پھر جب طبیب خیمے کے اندر چلا گیا تو رچرڈ نے دربان سے کہا: "اگر میں اچھا ہو جاؤں تو اس طبیب کو پورا پورا انعام ملے اور اگر مر جاؤں تو میرے خون کا اس سے کوئی بدلہ نہ لے۔"

طبیب نے دوا پلائی اور رچرڈ اچھا ہو گیا۔

سچّی خوشی

محمد عرفان نجف علیمی

شمیم کے گھر میں قدم رکھتے ہی ماں نے بتایا ــــ "بیٹا! تمھاری کہانی جو ایک سرکاری پرچے میں چھپی تھی، اس کا آج معاوضہ آیا ہے۔" "کیا سچ مچ میری کہانی کا معاوضہ آیا ہے؟" شمیم خوش ہوتا ہوا بولا۔ "ہاں میرے لال! ابھی پوسٹ مین ۳۰ روپے کا منی آرڈر دے گیا ہے۔ دیکھو ابھی ویسے ہی رکھا ہے۔" ماں نے روپے شمیم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! کھانا کھالو بھوک لگی ہوگی۔ کھانا کھاکر شہر چلے جاؤ اور وہاں سے ان پیسوں کے اپنے لیے کپڑے خرید لاؤ۔ عید کے چار دن ابھی باقی ہیں۔ کہیں نہ کہیں کپڑا سِل ہی جائے گا۔ دیکھو! اللہ پاک کتنا مہربان ہے! اس نے کس طرح انتظام کر دیا ہے۔ کل تک میں اسی فکر میں پریشان تھی کہ کس طرح تمھارے کپڑے کا بندوبست ہوگا؟ اگر عید کے دن بھی نئے کپڑے نہ ہوں گے، تو لوگ ہماری غریبی کا مذاق اڑائیں گے۔"

شمیم جلدی جلدی کھانا کھاکر شہر کو چل پڑا۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انٹر میں پڑھتا تھا۔ بچپن ہی میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسے بچّوں کے رسائل میں کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ جب وہ بچّوں کا کوئی رسالہ دیکھتا اور اس میں چھپی کہانیاں پڑھتا تو اسے بڑا مزہ آتا اور وہ سوچنے لگتا کیا میں کبھی اسی طرح اتنی اچھی کہانیاں لکھ سکوں گا؟ وہ خوب محنت سے کہانیاں لکھتا اور چھپنے کے لیے رسالوں میں بھیجتا تو شروع شروع میں اس کی زیادہ تر کہانیاں واپس لوٹ آتیں اور وہ وقتی طور پر اداس ہو جاتا مگر وہ محنتی اور باہمّت تھا اس نے ہمت نہ ہاری۔ برابر کوشش کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی محنت اور لگن سے اچھی اچھی کہانیاں لکھنے لگا۔ اس نے ایک کہانی سرکاری پرچے کے لیے بھیجی تھی۔ اسی کا آج معاوضہ آیا تھا۔ آج وہ دل ہی دل میں بڑا خوش تھا کہ اب کیا ہے؟ اب تو مزہ ہی مزہ ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہے؟ اب تو ہر ماہ کہانی چھپے گی اور ہر ماہ معاوضہ ملے گا۔ اسکول میں بھی ساتھیوں پر میری دھاک جم جائے گی۔ سب میری عزّت کریں گے اور اس طرح ایک دن میں بھی ایک بہت بڑا کہانی کار بن جاؤں گا۔

شمیم تصوّرات کی دنیا میں گھوڑے دوڑاتا ہوا اسٹیشن کے قریب پہنچ گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک پُل تھا جسے پار کرکے ہی چوک کے لوگ سول لائنس آتے جاتے تھے۔ اکثر پُل کے پاس کچھ غریب بچّے اور جوان کھڑے رہتے جو راہ گیروں کا سامان اور سائیکل وغیرہ کو اس پار سے اُس پار لے جانے کا کام کرتے رہتے انھیں فی چکّر ۱۰ پیسے مزدوری ملتی تھی۔ شمیم جیسے ہی پُل کے قریب پہنچا ایک چھوٹا لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بولا ــ "سائیکل پار کرنا ہے کیا بابوجی! لائیے میں پار کر دوں۔" یہ سن کر شمیم رک گیا اور کھڑا سوچنے لگا کہ میں اس لڑکے سے بڑا ہوں۔ اگر میں اس لڑکے سے سائیکل پار کراتا ہوں، تو یہ میرے لیے بڑے شرم کی بات ہوگی اور اگر سائیکل پار نہیں کراتا تو اس کے پیسوں کا نقصان ہوگا۔ اور اگر سائیکل پار کرائے بغیر اسے پیسے دے دیتا ہوں تو اس کی عادت

درگاہ اسٹریٹ بیگم سرائے ــ الٰہ آباد ۱۲

خراب ہوگی اور ہو سکتا ہے اس کی یہ عادت کل اسے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر آمادہ کردے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی بیچ وہ لڑکا بول پڑا ـــ "کیا سوچتے ہیں؟ بابوجی! کہیے تو میں سائیکل لے چلوں۔ آج میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے کسی طرح جلدی جلدی پانچ روپے پورے کرنے ہیں" ـــ "ٹھیک ہے لے چلو!" شمیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا ـــ اس لڑکے کی باتیں سن کر شمیم فکرمند ہو گیا۔ جیسے ہی اس لڑکے نے سائیکل سیڑھیوں سے اتار کر رکھی، شمیم نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بڑے ہی پیار سے بولا ـــ "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمھیں دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ اتنی کم عمر میں اتنی محنت کا کام کرتے ہو۔ یہ عمر کی پڑھنے اور کھیلنے کی ہے" "بابوجی! آپ سچ کہتے ہیں لیکن کیا کروں تقدیر کے آگے کس کا بس چلتا ہے؟ میری قسمت میں شاید یہی لکھا تھا" اتنا کہہ کر وہ لڑکا دہرانے "بابوجی! میں بھی آپ ہی کی طرح ایک کالج میں پڑھتا ہوں لیکن میں یتیم ہو چکا ہوں۔ میری بیوہ ماں ہے۔ کسی طرح وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور میرا پیٹ پالتی ہے جو کچھ میں کماتا ہوں، اس سے میری پڑھائی کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ لیکن ماں کے بیمار ہونے کے سبب کچھ دنوں سے کھانے کا سہارا بھی جاتا رہا۔ اب اس سے محنت مزدوری نہیں ہوتی۔ میں شام کو جب اسکول سے آتا ہوں تو یہیں بوجھ ڈھوتا ہوں۔ جو پیسا اس سے ملتا ہے، اس سے کھانا پینا چلتا ہے۔ اور اسی میں سے تھوڑا بہت بچا کر فیس کے لیے بھی رکھتا ہوں۔ لیکن اس مہینے امتحان کی فیس بھی جانی ہے جو ۲۵ روپے ہوگی صرف تین دن باقی ہیں فیس جمع ہونے میں۔ اگر وقت پر فیس جمع نہ ہوئی تو میں امتحان میں شامل نہ ہو سکوں گا!" ـــ لڑکے کی دکھ بھری کہانی سن کر شمیم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کو اپنا وہ زمانہ یاد آنے لگا جب اس کے والد کا انتقال ہوا تھا اور وہ بے سہارا ہو گیا تھا ـــ شمیم کے دل پر اس لڑکے کی باتوں کا گہرا اثر ہوا۔ وہ فوراً لڑکے کو ساتھ لے کر اس کے اسکول گیا۔ اسکول بند ہی ہونے والا تھا شمیم نے اپنے معاوضے کے پیسے سے اس کی فیس چکا دی۔

دھیرے دھیرے سورج ڈوبتا جا رہا تھا وہ سول لائنس سے ہو کر گزر رہا تھا۔ وہاں ہر طرف چہل پہل تھی کپڑے کی دکانیں، ٹوپی، جوتے، موزے کی دکانیں برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھیں۔ دکانوں پر لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ کچھ لوگ اپنے ساتھ اپنے بچوں کو لیے ان کی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے اور بچے اپنی من پسند چیزیں پا کر اتنا خوش تھے جیسے انھیں سارے جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ آج پورا شہر دلھن کی طرح سجا ہوا تھا لیکن شمیم کو شہر کی رنگینیاں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔ شمیم پیسے ختم ہو جانے کی وجہ سے عید کے لیے کچھ بھی نہ خرید سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ بہت ہی خوش تھا۔ کیوں کہ اس نے ایک مجبور اور پریشان حال لڑکے کی مدد کی تھی۔ شمیم نے اس لڑکے کی مدد کر کے اپنا فرض ہی نہیں چکایا تھا بلکہ اس نے سچی خوشی حاصل کر لی تھی وہ خوشی جو اسے بیش قیمت کپڑوں سے نہیں مل سکتی تھی ـــ

گُدگُدیاں

ایک صاحب:۔ (دھوبی سے) تم نے قمیص بھی گم کر دی اور دھلائی کے پیسے بھی مانگ رہے ہو؟

دھوبی:۔ حضور! وہ قمیص دھلائی کے بعد گم ہوئی تھی۔

عادل عثمانی کلٹی

ایک انگریز نے ایک آدمی کو مولی اور ستو کھاتے دیکھا تو اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ کیسا آدمی جو پیلی مٹی کو سفید لکڑی سے اپنے منہ میں ٹھونس رہا ہے۔

تبسّم (خورشید سے) یہ تم روٹی کیوں تول رہے ہو۔؟

خورشید: ڈاکٹر نے مجھے ہلکی غذا کھانے کو کہا ہے۔

دکان مالک: (نوکر سے) کل تم نے جن صاحب سے کہا تھا "جب کچھ نہیں لینا تو جہنم میں جاؤ" وہ صاحب شہر کے جج ہیں اس لیے فوراً فون پر معافی مانگو۔

نوکر: (فون پر) صاحب کل جو میں نے آپ کو جہنم میں جانے کے لیے کہا تھا اب آپ وہاں پر مت جائیے گا۔

ہمارے بزرگ لکھنے والے جب بھی کوئی کہانی لکھتے ہیں تو بس ایک ہی بات ذہن میں رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ کہانی سبق آموز ہو اور پڑھنے والے اس سے زیادہ سے زیادہ سبق لے سکیں لیکن وہ کہانی کی دلچسپی کو قطعی فراموش کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر تقریباً سبھی کہانیوں کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

"ایک غریب لکڑہارا تھا وہ بڑی محنت سے دن بھر جنگل میں لکڑیاں کاٹتا تھا" یا پھر "ایک راجا تھا وہ بہت ہی رحم دل اور انصاف پسند یا ظالم و جابر تھا" وغیرہ وغیرہ۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے جوں ہی کہانی شروع کرتے ہیں، بار بار پڑھے ہوئے گھسے پٹے جملے ان کے استقبال کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور وہ بیزاری سے منہ بنا کر آگے پڑھے بغیر صفحہ الٹ دیتے ہیں۔ اگر کہانی کا آغاز اچھے اچھے دلچسپ جملوں سے کیا جائے تو کوئی بھی پیامی کہانی مکمل پڑھے بغیر نہیں چھوڑے گا اور اس طرح سے پیام تعلیم سے ان کی دلچسپی بھی برقرار رہے گی۔ لیکن ہمارے لکھنے والے پیام تعلیم کا اتنا خیال کہاں کرتے ہیں؟

مجھے یقین ہے کچھ لوگوں کو میری باتیں بری ضرور لگیں گی لیکن میں نے صاف گوئی سے کام لیا ہے اور جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے اسے الفاظ میں بیان کر دیا ہے اگر وہ ٹھنڈے دماغ سے غور فرمائیں گے تو یقیناً خود کو میرے خیال سے متفق پائیں گے۔

جاوید نہال حشمی کانکی نارہ ۲۴ پرگنہ

آج ہی انعامی رقوم موصول ہوئیں۔ بروقت ادائیگی کا بہت بہت شکریہ!! ایک غلطی کے ۳ اور بالکل صحیح کا ایک انعام (تمام رقوم) موصول ہو گئیں۔ انعامی مقابلہ شروع کرنے سے تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے یہ مقابلہ آپ کو بہت پہلے شروع کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال انعامی مقابلہ شروع کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

محمد یوسف ۔ مکتبہ اطفال ۔ مالیگاؤں

ماہ دسمبر ۸۳ کا پیام تعلیم بہت ہی خوب صورت ڈھنگ سے شائع ہوا۔ سرورق کی تصویر بہت ہی لاجواب ہے۔ آدھی ملاقات کا کالم ہمیشہ برقرار رکھیے۔ ڈاکٹر خلیل اللہ خاں کی کہانی سڑکیں بے حد پسند آئی۔ "بچوں کی کوشش" میں کہانیاں اور نظم بہت اچھی لگی۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ کتاب دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے (آمین)

سید افسر حسن
ویسٹ بلاک۔ نیو کریم گنج (گیا)

میں نے پیام تعلیم پڑھا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔
خاص طور پر اس میں دو مضمون اچھے ہیں۔
(۱) ہنر اور سفر۔ جناب مناظر صدیقی صاحب (۲) مونگ پھلی کیلاش ناتھ کول ترجمہ خلیل اللہ خاں صاحب۔ ہنر اور سفر بہت پسند کیا ہمیں امید ہے کہ آپ ہر ماہ ایسی ہی کہانیاں شائع کرتے رہیں گے۔
مونگ پھلی میں ہمیں بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔

حیدر علی
۸۳۱ حویلی اعظم خاں چتلی قبر دہلی ۶

میں آپ کا رسالہ پیام تعلیم تقریباً ایک سال سے پڑھ رہا ہوں آپ کا یہ من پسند رسالہ مجھے بہت پسند ہے یہ رسالہ ہر دن اور دن بہ دن ترقی کرتا جا رہا ہے۔ یہ آپ کا رسالہ سب ہی پڑھنے والوں کو پسند آیا ہے مجھے جنوری کے رسالے میں ندیم انصاری کا آستین کا سانپ بہت پسند آیا ــــ یہ رسالہ دن بہ دن ترقی کرتا جائے گا۔ انشاءاللہ۔

محمد ہارون۔ کرانا شاپ مانا (اکولہ)

نیشنل ہائی اسکول داپولی کی کامیابی

بزم اردو چپلون کی طرف سے شہر چپلون (مہاراشٹر) میں ۷/جنوری ۸۴ کے روز منعقدہ غزل خوانی کے مقابلے میں نیشنل ہائی اسکول داپولی ضلع رتناگیری کی طالبات نے حصّہ لے کر نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس اسکول کی درجہ دہم کی طالبات حریفہ اسماق ملّا اور نجمہ یوسف ملّا نے مذکورہ مقابلے کے گروپ نمبر ۳ (ثانوی گروپ) میں انفرادی طور پر بالترتیب اول اور دوم انعامات حاصل کیے اور اپنی مشترکہ کامیابی سے غزل خوانی کی شیلڈ بھی جیت لی۔ اس کے علاوہ درجہ پنجم کی طالبہ تبسّم قمرالدین رکھانگے نے گروپ نمبر ۲ (ابتدائی گروپ) میں انفرادی طور پر دوسرا انعام حاصل کر کے اپنے اسکول کی اس شاندار کامیابی میں مزید اضافہ کیا۔

انجمن خیرالاسلام کرلا گرلس اسکول کو مبارکباد

ایل وارڈ کرلا کی سائنسی نمائش برائے ۸۴-۱۹۸۳ء میں انجمن خیرالاسلام گرلس اسکول کرلا کی طالبات نے کپڑے کی مل میں کپڑے کو رنگ دینے اور سکھانے کے عمل کی مشین کا ورکنگ ماڈل پیش کیا اور اس کے عمل کے طریقے سے متعارف کرایا۔ ایل وارڈ کمیٹی کی جانب سے اس ٹیم کو سینئر یز کے اول انعام سے نوازا گیا نیز سائنسی مضامین اور کوئیز کے مقابلوں میں بھی انعامات حاصل کیے اسکول کی سائنسی ایسوسی ایشن کی جانب سے اسکول کی طالبات اور معلمات کو مبارکباد پیش کی گئی ہے۔

اینگلو عربک کے طلبہ کو انعامات

نئی دہلی ۱۲ فروری۔ اگلے روز اوبرائے انٹرکانٹی نینٹل میں روٹری کلب دہلی (قطب) کی جانب سے تقسیم انعامات کی ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی جس میں اینگلو عربک سینئر سکنڈری اسکول اجمیری گیٹ کے ان طلباء کو جنھوں نے ۱۹۸۳ء کے منعقدہ سکنڈری اور سینئر سکنڈری امتحانات میں فرسٹ، سکنڈ اور تھرڈ پوزیشن حاصل کی تھی۔ بطور انعام مبلغ تین تین سو روپے دیے گئے

وزیراعظم مسز اندرا گاندھی، اپنی قیام گاہ پر شجاعت کا ۱۹۸۳ء کا ایوارڈ حاصل کرنے والوں کے ساتھ۔

شفیق منزل مدرسہ ثانوی کے تقریری مقابلے میں

اول انعام حاصل کرنے والی تقریر

جناب صدر، اور عزیز ساتھیو!

اس وقت میں آپ لوگوں کے سامنے کچھ لب کشائی کرنے حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے کہ آپ حضرات بغور سماعت فرمائیں گے اور میری غلطیوں کو درگزر فرمائیں گے۔

ایک حدیث ہے کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم اس حدیث میں پیارے رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے ایک اور جگہ آپ نے ارشاد فرمایا اطلبوا العلم ولو کان بالصین علم حاصل کرو چاہے چین میں ہی کیوں نہ ملے۔ چونکہ اس زمانے میں چین عرب سے دوسرے ممالک کے مقابلے میں زیادہ دور سمجھا جاتا تھا اس لیے آپ نے اس کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے لیے ہمیں کتنے ہی دور دراز کا سفر کیوں نہ کرنا پڑے مگر ہم علم حاصل کرکے رہیں۔

میں طالبان علوم کے دلوں میں شوق و دلچسپی، محنت و لگن اور عزم و حوصلہ پیدا کرنے کے لیے عبرت انگیز حیات آفریں باتیں پیش کروں گا کہ ہم اپنے اس دورِ ظلمت کدہ میں علم کی شمع درخشاں بن کر چمکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم نور ہے جس طرح نور ایک محسوس کی جانے والی چیز ہے اس طرح علم بھی اپنے آغاز و شباب میں ہے۔ بنوامیہ اور خلفائے عباسیہ کے مبارک دور بلکہ خود خلفائے راشدہ کے دور میں ہی، سیاسی، تعلیمی و تمدنی ترقی پروان چڑھی۔ مگر جوں جوں علمی طاقت کمزور ہوتی گئی علم اور علماء کی قدر دانی بھی کم ہوتی گئی۔

یہ مختصر تبصرہ میں نے آپ لوگوں کی نذر اس لیے کیا کہ اگلی روایات کے مطابق میں آج کل کے طالب علموں میں علمی زندگی بسر کرنے کی لہر دوڑا سکوں۔ کہ جب وہ علم کی تلاش کریں گے۔ کد و کاوش، محنت و سعی اور اپنے مطلب میں لگ جائیں گے تو وہ بھی پھر درِ یکتا اور صدف کے چمکتے اور جگمگاتے ہوئے اکیلے موتی ہوں گے جس کی چمک اور جگمگاہٹ لوگوں کی نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے اور دنیا جس کی قیمت لگانے سے عاجز ہو جاتی ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ دنیا میں صرف وہی لوگ علوم و فنون میں ترقی کر سکتے ہیں جو صاحب ثروت ہوں یا اونچی ہستی کے لوگ ہوں تو ایسا کہنا ہمارے لیے بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ ہمیں معلوم ہے۔ ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ فقر و فاقہ تنگدستی و غربت کے باوجود علماء نے اپنی اصلی طلب اور جستجو سے دنیا میں علوم و فنون کے ذخائر اور ندیاں بہا دیں۔ آج ہمارے لیے یہ عبرت کا مقام ہے کہ ہم دنیوی خطرات سے الگ ہو کر علمی کاموں میں شغل پیدا کریں ورنہ اگر امرا کی طرح غربا نے بھی علم سے رابطہ نہ رکھا تو پھر علوم و فنون کا کوئی نام لیوا نہ رہے گا۔ حالی کا یہ شعر کہ؛

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا ترقی کی بلندیوں پر پہنچ گئی مگر پھر بھی دنیا میں وہ لوگ بہت کم ہیں جو ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

ساتھ ہی میں آپ لوگوں کو ایک علمی جھلک بھی دکھاتا چلوں۔

ایک عالم تھا مگر وہ بے دین تھا عراق کے بازار میں جاتا اور اسی طرح ڈینگیں مارتا رہتا تھا۔ ایک دن جب وہ بازار میں آیا تو ایک ٹیلے پر کھڑا ہو گیا اور اس نے لوگوں سے تین سوالات کیے۔ ایک دس گیارہ سال کا لڑکا آیا اور اس نے کہا کہ میں تمہارے سوالات کے جوابات دوں گا۔ تو یہ دیکھ کر آس پاس کے لوگ بھی اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اس آدمی نے بچے سے پہلا سوال کیا کہ بتاؤ تمہارا خدا اس وقت کیا کر رہا ہے؟ تو بچے نے کہا جناب آپ عالم ہیں جواب دینے والے کا مرتبہ سوال کرنے والے کے مرتبہ سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے آپ نیچے آئیے اور میں اوپر جاتا ہوں، چنانچہ وہ لڑکا اوپر گیا اور آدمی نیچے آ گیا تب بچے نے جواب دیا کہ میرا خدا اس وقت ایک بے دین کا مرتبہ گھٹا کر ایک بچے کا مرتبہ بڑھا رہا ہے، بچے کے اس جواب سے لوگ حیران ہو گئے ——— دوسرا سوال آدمی نے کیا کہ بتاؤ تمہارے خدا سے پہلے کیا چیز تھی؟ بچے نے آدمی سے کہا آپ پانچ سے الٹی گنتی گنیے۔ آدمی نے گننا شروع کر دیا۔ پانچ، چار، تین، دو، ایک۔ جب وہ ایک پر رک گیا تو لڑکے نے کہا بتاؤ ایک سے پہلے کیا ہے؟ تو آدمی نے کہا کہ ایک سے پہلے کچھ نہیں۔ تب اس بچے نے جواب دیا کہ اسی طرح خدا بھی ایک ہے اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں۔ لڑکے کے اس جواب سے لوگ بہت خوش ہوئے اور متعجب بھی ——— تیسرا سوال آدمی نے پوچھا بتاؤ تمہارے خدا کا رخ کس طرف ہے۔ تب بچے نے ایک موم بتی لی اور اس کو جلا کر آدمی سے پوچھا کہ بتاؤ اس موم بتی کا رخ کس طرف ہے تو آدمی نے کہا کہ اس کا رخ تو چاروں طرف ہے۔ تب بچے نے جواب دیا کہ اسی طرح خدا کا رخ بھی چاروں طرف ہے اور وہ ہر طرف دیکھ رہا ہے۔ بچے کے اس جواب سے بھی لوگ حیران ہو گئے۔ یہ ہے علمی جھلک کہ ایک بچے نے اپنی عقلمندی اور علم کی بنا پر اس آدمی کے سوالات کا کس طرح جواب دے کر لوگوں کو حیران و ششدر کر دیا۔

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو عقلمند ہیں، دانش ور ہیں مگر علم نہ ہونے کی وجہ سے ناقص ہیں۔ مثال کے طور پر ایک صاحب سائیکل پر جا رہے تھے ان کے آگے ان کا بچہ بیٹھا رو رہا تھا۔ ایک راہ گیر نے پوچھا کہ جناب آپ کا یہ بچہ کیوں رو رہا ہے؟ تو سائیکل والے نے جواب دیا کہ رو نہیں رہا بلکہ اس کو رلایا گیا ہے کیوں کہ سائکل میں گھنٹی نہیں ہے تو آپ نے دیکھا کہ دنیا میں اس قسم کے بھی عقلمند لوگ پڑے ہیں مگر علم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی عقل کا صحیح استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔

ہم دنیا میں مختلف چیزوں کا عینی مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ ساری چیزیں محض علوم و فنون کے ذریعے ہی سے عمل میں آئی ہیں اگر کسی شخص نے کسی چیز میں کمال حاصل کیا ہے تو یہ اچھی طرح یاد رہے کہ اس کی تہہ میں صرف اور صرف محنت و مشقت اور علم پوشیدہ ہے اس نے بھی ہماری طرح اپنی ماں کی آغوش میں جنم لیا اور اپنی ماں کا دودھ پی کر پروان چڑھا۔

ساتھیو! وہ فوائد اور معلومات جن کی بنا پر ہم علوم و فنون میں مہارت رکھنے والوں کو بحر العلوم کہتے ہیں۔ مگر کیوں آخر کیونکر؟ جواب آسان ہے محض علم، محنت و مشقت کی بنا پر۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:۔

نیند کہتی ہے بہت جاگ چکا سو بھی جا
کامرانی کا ہے اصرار کہ آرام نہ کر

عزیز ساتھیو! جب تم علم کی راہ میں خاک ہو جاؤ گے تو رنگا رنگ پھول تمہارے وجود میں کھل اٹھیں گے۔

مگر افسوس کہ ہمارے دلوں میں علم کی سچی محبت نہیں۔ ہمارے قلوب علم کی روشنی سے روشناس نہیں۔ ہمارے دلوں میں حاصل کرنے کا جذبہ نہیں۔ مگر ہمیں نہیں معلوم کہ اپنی زندگی کو ترقی کے راستے پر گامزن

کرنے کے لیے علم کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے اگر ہم نے علم حاصل نہ کیا تو سمجھیے کہ ہم نے اس دنیا میں کچھ نہیں پایا کیونکہ علم ایک ایسی دولت ہے جو کبھی چرائی نہیں جاسکتی ہے اور اس کو جتنا خرچ کیا جائے اس میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔

کاش ہمارے دلوں میں علم کی سچی محبت جاگ اٹھے ہمارے قلوب علم کی روشنی سے روشناس ہو جائیں۔ ہمارے دلوں میں علم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے کہ اپنی ہم زندگی کو ترقی کے سانچے میں ڈھال کر ایک ایسی شکل دے سکیں جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے باعث فخر ثابت ہو سکے۔ مگر یہ یاد رہے کہ علم بغیر عمل کے درکار نہیں جس علم پر عمل نہ کیا گیا وہ علم ہمارے لیے بیکار ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس پر علم پر عمل نہ کیا گیا وہی علم وبال جان بن جاتا ہے اسی لیے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

آخر میں خدا سے دعا ہے کہ ہمیں علم کی دولت سے مالا مال کر دے۔ ہمارے دلوں میں علم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر دے تاکہ ہم اس دنیا میں رہ کر اس کے دیے ہوئے احکام و حقوق کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ ورنہ پھر ہم اس کے ہی مستحق ہوں گے کہ!۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

انعام الرحمٰن درجہ دہم (سی)
جامعہ ہائر سکنڈری اسکول

ضمیر کی آواز

احمد اور موہن ایک ہی جماعت کے طالب علم تھے۔ احمد گانو کے جاگیردار کا لڑکا تھا۔ نہایت ملنسار اور بلند اخلاق۔ موہن گانو کے چمار کا لڑکا تھا۔ ان دونوں میں گہری دوستی تھی۔ اکثر موہن کا باپ اسے سمجھاتا۔ "بیٹا ہم غریب لوگ اس لائق نہیں کہ کسی بڑے آدمی سے دوستی کا تصوّر بھی کر سکیں تو، احمد سے ملنا چھوڑ دے بیٹا۔۔۔ ورنہ یہ دوستی ہم پر کسی دن آفت ڈھائے گی۔ تو جاگیردار صاحب کو نہیں جانتا بیٹا۔"

لیکن موہن باز نہ آتا۔ ادھر جاگیردار صاحب اپنے بیٹے سے کہتے "پیر کے جوتے کو ہمیشہ پیر میں ہی پہنا جاتا ہے۔ سر پر ہرگز نہیں رکھا جاتا۔ تم موہن سے ملنا چھوڑ دو یہ نیچ لوگ ہمارے برابر نہیں"۔ "لیکن ابّو وہ میرا اچھا دوست ہے۔ ہم لوگ ایک ہی جماعت میں پڑھتے ہیں۔ وہ ہر سال اوّل آتا ہے وہ مجھ کو بہت کچھ سکھاتا ہے"۔ "احمد تم اس چمار کی اولاد سے پڑھتے ہو تمھارے ماسٹر کیا تمھیں کچھ نہیں سکھلاتے؟" "یہ بات نہیں ابّو۔ وہ بہت نیک ہے۔ میرا عزیز ترین دوست۔۔۔" "احمد کان کھول کر سن لو آئندہ میں تم کو ہرگز اس کے ساتھ نہ دیکھوں ورنہ دونوں کی کھال ادھیڑ دوں گا" لیکن احمد اور موہن دونوں کو اپنے والدین کی بات کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ دونوں ذات پات، امیری غریبی کے جھگڑوں سے دور دوستی اور انسانیت کی راہ پر آگے بڑھتے رہے جب موہن کے گھر کوئی نہ ہوتا تب احمد چپکے سے موہن کے ہاں چلا جاتا۔ دونوں روکھی سوکھی جوار کی روٹی ہری مرچ کی چٹنی سے کھاتے۔ احمد کو خلوص اور بے لوث محبت سے بھرپور اس غذا میں مرغ مسلّم اور بریانی سے بڑھ کر لذت محسوس ہوتی۔ دونوں ایک ساتھ گھومتے باغوں کی سیر کرتے۔ اور دل لگا کر پڑھتے۔

جب احمد اور موہن نے آٹھویں جماعت پاس کی تو احمد کے ابّو نے اسے سایکل لا کر دی۔ احمد اسکول جاتے وقت سایکل پر موہن کو بھی ساتھ لے لیتا۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا ایک دن احمد موہن کے گھر آیا۔ چلو موہن گھومنے چلیں۔ دیکھو میں سائیکل لایا ہوں۔ دونوں نکل پڑے۔ احمد سائیکل چلا رہا تھا۔ موہن پیچھے بیٹھا تھا۔ دونوں سڑک پر نکل آئے۔ ابھی کچھ دور ہی گئے تھے کہ سامنے سے ٹرک آتا ہوا دکھائی دیا احمد سے سائیکل بہک گئی اور تیز رفتار ٹرک دونوں کو روندتا ہوا نکل گیا۔

احمد اور موہن ایک ہی وارڈ میں پڑے تھے۔ احمد بُری طرح زخمی تھا جب کہ موہن کو معمولی چوٹ لگی لیکن وہ بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ احمد کے بچنے کی امید نہ تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں بے کار ہو چکی تھیں۔ اور اس کو خون کی ضرورت تھی۔ لیکن کسی کا خون اس کے خون سے نہیں مل پا رہا تھا۔ جب موہن کو ہوش آیا تو اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "احمد کیسا ہے ڈاکٹر صاحب؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں" ڈاکٹر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔" ڈاکٹر صاحب آپ... آپ بولتے کیوں نہیں۔ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔" موہن نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔" احمد کی دونوں آنکھیں بے کار ہو گئی ہیں۔ اور اسے خون کی فوری ضرورت ہے۔ مگر افسوس کسی کا خون اس کے خون سے نہیں مل رہا ہے۔" "نہیں ڈاکٹر صاحب" موہن نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے میرے تو معمولی چوٹ ہے۔ میرا خون اسے دے دیجیے بھگوان کے لیے ڈاکٹر صاحب دیر مت کیجیے میرا خون احمد کو دے دیجیے۔ ورنہ اگر احمد کو کچھ ہو گیا تو میں زندگی بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ اسے بچا لیجیے ڈاکٹر۔" موہن نے ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ لیے۔ اور پھر موہن کا خون ٹیسٹ ہوا اس کا خون احمد کے گروپ کا تھا۔

چنانچہ موہن کا خون احمد کے جسم میں داخل ہونے لگا احمد کی حالت سنبھلنے لگی مگر موہن احمد سے دور ہوتا گیا جب موہن پر غشی طاری ہونے لگی تب اس نے ڈاکٹر سے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔" اب احمد کیسا ہے؟" "ٹھیک ہے موہن۔ اب وہ خطرے سے باہر ہے۔" "ڈاکٹر میری ایک التجا اور سن لیجیے۔ اگر میں مر جاؤں تو میری دونوں آنکھیں احمد کو دے دی جائیں اور یہ بات اسے ہرگز نہ بتائی جائے۔ وہ پریشان ہوگا۔ یہ تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر وعدہ کر دو۔ ڈاکٹر نے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن موہن کا ہاتھ اونچا ہو کر نیچے گر گیا۔

جاگیر دار صاحب کبھی موہن کے مردہ جسم کو دیکھتے اور کبھی اس نلکی کو جس سے احمد کے رگوں میں خون جا رہا تھا۔ اور اب احمد کے آنکھوں کے حلقے میں موہن کی آنکھیں تھیں۔ جب احمد اپنے گھر آیا تو اسے دیکھ کر جاگیر دار صاحب گلے لگانے آگے بڑھے مگر احمد سے جب آنکھیں چار ہوئی تو جاگیر دار صاحب لرز گئے جیسے احمد کی آنکھیں بول رہی ہوں موہن کی صورت میں جاگیر دار صاحب یہ ذات اور دھرم کے فرق سے کچھ نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا رشتہ دوستی کا ہے انسانیت کا ہے۔ آیئے ایک بار صرف ایک بار مجھے گلے سے لگا لیجیے۔

سید شمس العارفین رضوی
(ہسپورہ اورنگ آباد بہار)

ترانۂ انساں

علم کی داستاں اب سنائیں گے ہم
امن کے گیت اب گنگنائیں گے ہم
رات کا اب اندھیرا بڑھا اس قدر
ہر طرف نفرتوں کی بنی ہے ڈگر
پیار کا ایک دیپک جلائیں گے ہم
امن کے گیت اب گنگنائیں گے ہم

ہر طرف ہے غریبی کا ڈیرا یہاں
بھوک اور مفلسی کا سویرا یہاں
درد و غم کو جہاں سے مٹائیں گے ہم
امن کے گیت اب گنگنائیں گے ہم
ہم کو آزاد گاندھی سے رہبر ملے
جن کی کوشش سے راہوں میں گلشن کھلے
آج سے ان کے سپنے سجائیں گے ہم
امن کے گیت اب گنگنائیں گے ہم
اب نہ ہوگا کدورت کا طوفاں رواں
ہم بنائیں گے انسانیت کا جہاں
نام انساں کا روشن کرائیں گے ہم
امن کے گیت اب گنگنائیں گے ہم

جاوید اختر روشن عمر ۱۶ سال
انساں اسکول کشنگنج (بہار)

گیارہ چیزیں

یاد رکھیے

سب سے تیز ترین تلوار	غصہ میں ہوئے الفاظ
سب سے بڑا بہادر	بدلہ نہ لینے والا
سب سے قیمتی خزانہ	نیک خیالات
سب سے میٹھا راگ	سچ بولنا
سب سے اعلا شغل	مطالعہ
سب سے اچھا نشہ	خدمتِ خلق
سب سے خوشنما پھول	خوش مزاجی
سب سے قیمتی موتی	میٹھے الفاظ
سب سے اچھا ہتھیار	عقلِ سلیم
سب سے اچھی خیرات	معاف کر دینا
سب سے مضبوط ڈھال	قوتِ برداشت

زکریا احمد (نانڈیڑ)

مدد

ایک آدمی بہت غریب تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ کہ وہ ہمیشہ کسی کی بھی مدد کرتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ وہ راستے میں گزر رہا تھا ایک ندی کے کنارے اسے ایک مچھلی تڑپتی ہوئی دکھائی دی اس نے فوراً مچھلی کو اٹھایا اور ندی میں پھینک دیا اور پھر راستے پر چلنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک پہلوان قسم کا آدمی سائکل لے کر گزر رہا تھا کہ ایک عورت سامنے آگئی ۔ سائیکل والے نے اسے یکا یک زور دار لات ماری وہ عورت برداشت نہ کر سکی اور سڑک پر گر گئی اسی وقت وہی غریب آدمی جلدی سے سائیکل والے کے پیچھے دوڑا اور اس نے جب دیکھا کہ وہ میرے پیچھے آ رہا ہے تو سائکل کی رفتار تیز کی اور پھر دوبارہ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اسی وقت اس کی سائیکل ایک کار سے ٹکرا گئی۔ اور وہ پہلوان آدمی وہیں مر گیا۔ اسی وقت پہلوان) کے ساتھیوں نے مدد کرنے والے شخص کو پکڑ لیا اور مشورہ کیا کہ اس کو ندی میں پھینکنے کے لیے چلو اور سب نے اس بچارے کو ندی میں پھینک دیا جیسے ہی وہ ندی میں گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی مچھلی اس کے قریب آتے دکھائی دی تو وہ شخص ڈرنے لگا لیکن مچھلی قریب آئی اور اس کو اتنی زور سے اچھالا کہ وہ شخص سطح پر آگیا اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی بھاری چیز لٹک رہی تھی اسے حیرت ہوئی اور اس نے دیکھا ایک تھیلی لٹک رہی تھی جو کہ بہت وزنی ہے اس نے جلدی سے کھول کر دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس تھیلی میں ہیرے اور جواہرات بھرے تھے اب وہ بہت امیر ہو گیا تھا لیکن پھر بھی دوسروں کی مدد کیا کرتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ وہی بہت سارے آدمی جنھوں نے غریب آدمی کو پھینکا تھا اس کے گھر میں چوری کرنے آتے اور ان میں سے ایک نے کہا کہ تم کو یہ سب کہاں سے ملا اس نے ساری داستان سنائی تو سب کے سب دریا پر گئے ان میں سے تین آدمیوں نے ندی میں چھلانگ لگائی ان کو بھی وہی مچھلی دکھائی دی پھر مچھلی نے اسی طرح ان آدمیوں کو سمندر کی سطح پر پھینکا۔ پھر ان کے ہاتھوں میں بھی تھیلیاں لے گئی وہ بہت خوش ہوتے اور انھوں نے خوشی خوشی وہ تھیلی جیسے ہی کھولی تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کیونکہ اس تھیلی میں صرف سانپ ہی سانپ بھرے پڑے تھے اس وقت سانپوں نے ان سب کو کاٹ لیا اور وہ وہی تڑپ کر مر گئے تو میرے دوستو ہمیں اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں ہر ایک کی مدد کرنا چاہیے وہ دوست ہو یا دشمن۔

الیس۔ ڈی ہاشمی

فرمان پورہ اچل پور ایم۔ الیس

عقلمند بچہ

کسی زمانے کی بات ہے کہ ایک بادشاہ کسی ملک

پر حکومت کر رہا تھا اس نے ایک دن اپنے ایک وزیر سے کہا "کہ میں ایک ایسی کہانی سننا چاہتا ہوں جو کبھی ختم نہ ہو وزیر نے اس بات کا پورے ملک میں اعلان کر دیا کہ بادشاہ ایک ایسی کہانی سننا چاہتا ہے جو کبھی نہ ختم ہی نہ ہوا ور یہ بھی اعلان کر دیا کہ جو ایسی کہانی سنائے گا بادشاہ اسے انعام واکرام سے نوازے گا لیکن جس کی کہانی ختم ہو گئی تو اسے قید کر لیا جائے گا کئی لوگ بادشاہ کے دربار میں آئے اور کہانی ختم ہونے پر قید کر دیے گئے کوئی اب کہانی سنانے کے لیے آتا ہی نہیں تھا۔

ایک دن ایک بچہ بادشاہ کے دربار میں آیا جو بہت عقلمند تھا بادشاہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگا اور بولا "بیٹا چپکے سے گھر چلا جا ورنہ تجھے بھی قید کر دیا جائے گا"۔ بچہ بولا۔ آپ میری فکر نہ کریں اور میری کہانی سنیں" بادشاہ نے کہا" اچھا سناؤ" بچہ نے کہانی کہنا شروع کی "ایک تھا بادشاہ اس کے نجومی نے اس سے کہا کہ اگلے سال قحط پڑنے والا ہے بادشاہ نے کافی لمبا اور کافی چوڑا ایک کمرہ بنوایا۔ اور اسے گیہوں سے بھر دیا تا کہ اگلے سال قحط کے موقع پر کام آئے۔ بادشاہ نے اس کمرے کے تمام دروازے بند کر دیے اس کمرے کی کوئی کھڑکی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی روشن دان تھا۔ ایک دن ایک کبوتر نے دیکھا کہ اس کمرے کی چھت کے قریب ایک چھوٹا سا سوراخ ہے کبوتر سوراخ میں سے اندر چلا گیا اور ایک دانہ لے کر باہر اڑ گیا پھر ایک اور کبوتر آیا اور گیہوں کا ایک دانہ لے کر اڑ گیا پھر ایک اور کبوتر آیا اور گیہوں کا ایک دانہ لے کر اڑ گیا پھر ایک اور کبوتر آیا اور گیہوں کا دانہ لے کر اڑ گیا

بادشاہ غصے سے بولا" پھر کیا ہوا؟"

بچہ بولا ایک پھر کبوتر آیا اور گیہوں کا دانہ لے کر اڑ گیا۔ کافی دیر تک وہ اسی بات کو دہراتا رہا۔

بادشاہ تنگ آ کر کہا "پھر کیا ہوا؟"

بچہ بولا" ہونا کیا تھا ایک اور کبوتر آیا اور گیہوں کا دانہ لے کر اڑ گیا۔

بادشاہ چڑ گیا اور کہنے لگا" آخر پھر کیا ہوا؟" اس کے بعد کی بھی کوئی بات بتاؤ۔"

بچہ جھٹ بولا" بادشاہ! جب کبوتر اپنا کام ختم کرے گا تو کہانی بھی آگے بڑھے گی۔

بادشاہ مسکرا کر کہنے لگا" بس کرو میرے بیٹے۔ تمھاری کہانی ختم ہو ہی نہیں سکتی ہے، بادشاہ بہت خوش ہوا اور بچے کے والد کو اپنے دربار میں بلایا اور انھیں انعام دے کر واپس کیا۔

محمد انور عادل عثمانی: عمر ۱۴ سال
محلہ پتیانہ۔ پوسٹ کلٹی (بردوان)

علم کیا ہے؟

(۱) ایک دولت ہے۔
(۲) ایک چراغ ہے جو دل کو روشن کرتا ہے۔
(۳) ایک روحانی غذا ہے۔
(۴) وہ دولت ہے جس کو کوئی چرا نہیں سکتا۔
(۵) ایک ایسا پھول ہے جو فرسودہ ہو کر خوش بو دیتا ہے۔
(۶) ایک ایسی دولت ہے جس کے نہ ہونے پر انسان مفلس کہلاتا ہے۔
(۷) جوانوں کے واسطے زینت اور بوڑھوں کے واسطے عصا (لاٹھی) ہے۔
(۸) وہ غذا ہے جس سے انسان کو کبھی سیر نہ ہونا چاہیے۔
(۹) کی قدر و قیمت سیم و زر سے کہیں زیادہ ہے۔
(۱۰) کی ابتدا 'زہر' اور انجام 'آب حیات' ہے۔
(۱۱) ایک مشعل ہے جو جہالت کی تاریکی کو دور کرتی ہے۔
(۱۲) ایک ایسا خزانہ ہے جو خرچ کرنے سے بڑھتا ہے اور بچانے سے گھٹتا ہے۔
(۱۳) وہ بخار ہے جو کسی پر چڑھتا تو چڑھتا ہی جاتا ہے پھر نہیں اترتا۔
(۱۴) ایک ایسا دیا ہے جو زمانے کو راستہ دکھاتا ہے اور اسے ٹھوکر لگنے سے بچاتا ہے۔

محمد فردوس اطہر۔ محمد علی روڈ ڈالی گنج بردوان
(دیسٹ بنگال)

چنو اور منو
کہانی اور تصاویر: جاوید نہال حشمی
اسکول کی چھٹی ہوتے ہی چنو، منو کے گھر چل دیا۔
لیکن دروازے میں قدم رکھتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ منو سر پر ٹوپی رکھے بغیر نماز پڑھ رہا تھا۔
چنو نے پیام تعلیم سنبھالی اور صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔
PEYAM TALIM DELHI
کیوں بھئی! سر پر ٹوپی رکھے بغیر ہی کیوں نماز پڑھ رہے تھے؟
میں جانتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔
کیا یہ وِگ ٹوپی کا کام نہیں کر سکتی؟
ایں......؟؟؟

پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 6

دفتر پیام تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ

15 مئی ۱۹۸۴ء

فیس داخلہ کچھ نہیں۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

ایک سَو روپے کے نقد انعامات

پہلا انعام : بالکل صحیح حل پر مبلغ ساٹھ روپے۔ دوسرا انعام : ایک غلطی والے حل پر مبلغ چالیس روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبروار لکھیے

1 - یہ فرمان ـــــ کی طرف سے آیا ہے (اللہ / خدا)
2 - ـــــ کرنے والوں میں سے ایک بوڑھا بولا (لڑائی / مشورہ / باتیں)
3 - معلوم ہوا کہ ایک ـــــ بچے سے ملاقات ہوگئی (معصوم / چھوٹے / معمّہ)
4 - لیکن ـــــ کے ذریعے سمندر کون پار کر سکتا ہے (ناؤ / گھوڑے)
5 - میرے ـــــ نے ایک بڑی دوکان بھی کر لی ہے (شوہر / بھائی)
6 - وہ اناج کی ـــــ پر محصول مانگتے ہیں (گاڑیوں / بوریوں)
7 - یقیناً یہ کوئی عجیب و غریب ـــــ ہے (جانور / کیڑا)
8 - پھر بطخ کے ـــــ کے لیے پانی تیار کرتی ہے (نہانے / تیرنے)

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ صحیح جواب صفحہ 35 کی کتابوں میں ہی ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا : (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصّہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمّے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

ٹوکن پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 6

میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام ....

پتہ ....

(اپنے حل اِس پتے پر بھیجیے)

پیامی ادبی معمّا نمبر 6 ماہنامہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پیامی ادبی معمہ ۴ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل: (۱) دور بہار کی تلاش صفحہ ۴۱ (۲) پرندہ تابیل خاں صفحہ ۵ (۳) ہمدرد جوہر قابل صفحہ ۱۷ (۴) وصیت ۔ خرگوش کا سپنا صفحہ ۳۹ (۵) شیر خرگوش کی چال صفحہ ۱۵ ۔
(۶) پیارہ دم کٹا سانپ صفحہ ۳۱ (۷) بڑبڑاتی ۔ اس نے کیا کر نہ جانا صفحہ ۴ ۱۔
(۸) جوستے ۔ تین اناڑی صفحہ ۵۲

بالکل صحیح حل پر پہلا انعام حاصل کرنے والے ۱۶ خوش نصیب فی کس چار روپے تقسیم کیئے گئے

(۱) صابر میاں R/W ۲۹۱HE ۔ گراونڈ فلور ۔ بھرم نگر روڈ باندرہ بمبئی ۵۱
(۲) بجبیں قدر (۳) صابرہ شیخ (۴) ببلی گڈی (۵) غزالہ (۶) جبیں احسن
(۷) آئی ایس شیخ (مندرجہ بالا پیابیوں کا پتہ وہی ہے جو صابر میاں کا ہے)
(۸) ارشاد علی خاں ۔ معرفت اعجاز علی ارشد ۔ باغ پالٹو ۔ پٹنہ ۸
(۹) عاصمہ خاتون مکان نمبر ۱۳۵۰ پہاڑی املی مٹیا محل ۔ دہلی ۶
(۱۰) خلیق احمد کمرہ نمبر ۴۳۹ اے ڈگ منسٹری آف لا ۔ شاستری بھون نئی دہلی ۱
(۱۱) ہماخانم محمد یوسف ۔ میونسپل اردو گرلس اسکول ۳۹ اقبال روڈ مالیگاؤں (ناسک)
(۱۲) شائستہ خلیل ۱۳۵ پہاڑی املی مٹیا محل ۔ دہلی ۶
(۱۳) ظہیر ہمدانی ۔ ڈائمنڈ باغ ۔ سمیکر مالیگاؤں (ناسک)
(۱۴) سید عشرت فاطمہ ۱۳۵۰ پہاڑی املی ۔ مٹیا محل ۔ دہلی ۶
(۱۵) نزہت قاضی رفیع الدین ۔ گھولی محلہ ۔ شری وردھن ۔ رائے گڑھ
(۱۶) نورافشاں محمد یونس ۔ میونسپل گرلس اسکول ۳۹ اقبال روڈ مالیگاؤں (ناسک)

ایک غلطی پر دوسرا انعام حاصل کرنے والے ۱۰ خوش نصیب فی کس چار روپے تقسیم کیے گئے

(۱) آفتاب احمد شیخ دبیر پورہ حیدر آباد (۲) ملک عنبر ظہیر ہمدانی مالیگاؤں (۳) ابرار علی باغ پالٹو پٹنہ (۴) جی ایس انصاری علی روڈ مالیگاؤں (۵) محمد ریحان ۔ مولانا آزاد روڈ ۔ بمبئی ۸ (۶) این ایس انصاری علی روڈ ۔ مالیگاؤں (۷) آر ایس انصاری علی روڈ مالیگاؤں ۔ (۸) احمد پرویز چنگیزی چندن پور ۔ گورکھپور (۹) یسین جلال ۔ کلیان بمبئی (۱۰) عبدالعزیز دین احمد انصاری مدنپورہ بمبئی ۸

بیس نکات کی
یہ کہانی
گاؤں گاؤں
میں بجلی پانی
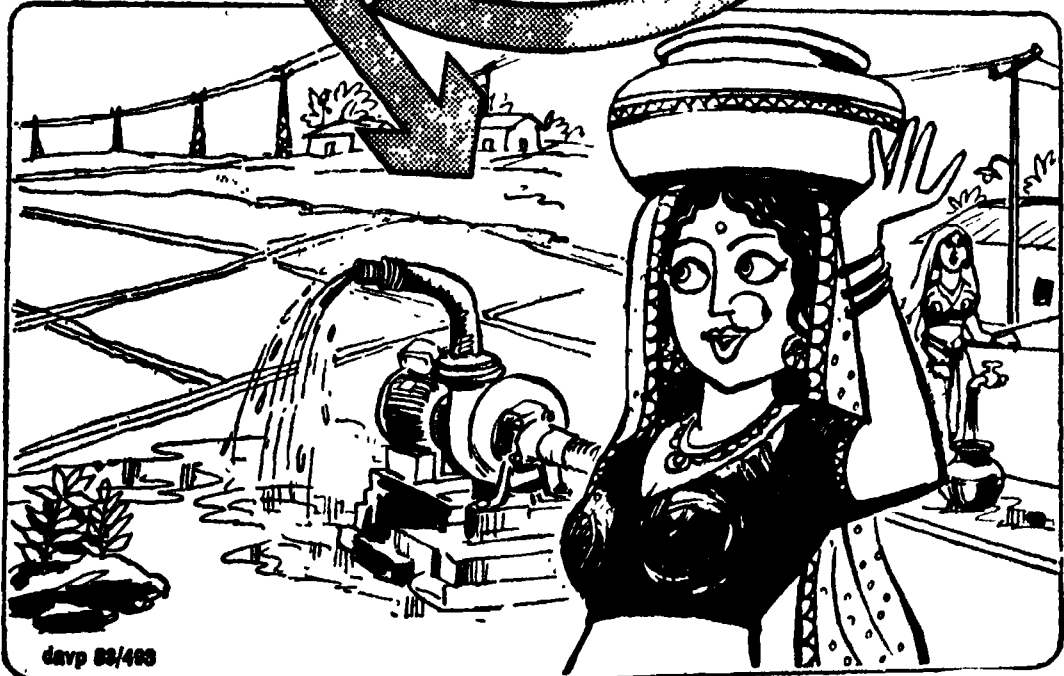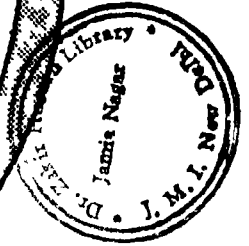
یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔
قیمت: ۲/۲۵
اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
گاندھی باباکی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت: ۳/۰۰
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت: ۲/۰۰
جب اور اب
(آصف مجیب)
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال کی باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔
تین اناڑی
عصمت چغتائی
گگو، بلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔
قیمت ۳/۔
ترجمہ:
قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمٰن
الہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی، لیکن اب تو اُس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(سیفی پریمی)
کہاوت اور کہانی
روزمرّہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت: ۲/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰
دہلی
بمبئی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd. No. D(SE)-043 April, 1984

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی ۲۵
چھوٹی جان کی طرف سے
منی کیلئے

پھر میں چگوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت: ۱/۵۰
پان کھا کر، طبلہ بجا کر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت: ۱/۵۰
ڈنا دن تا کے سے
چھوٹے بچوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت: ۱/۵۰
پکڑ ڈرم کے ٹکو
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰
پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰
ہپو جپو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے۔ انھیں
کی زبان میں۔ قیمت: ۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچوں کے لیے انھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت: ۲/۵۰
بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
بی بنڈکی اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰
جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
کہانیاں سبھی سب
کی سب مزے دار
قیمت: ۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا؟ یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت: ۱/۵۰
لومڑی کا گھر
یہ کتاب بھی چھوٹے بچوں کے لیے
لکھی گئی ہے۔ بڑی ہی مزے دار
کہانی ہے۔
قیمت: ۱/۵۰
دہلی
بمبئی
علی گڑھ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مئی ۱۹۸۴ء جلد: ۲۱ شمارہ ۵

ایڈیٹر — ولی شاہجہانپوری

قیمت: ۲/۵۰ روپے سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

اپریل کا شمارہ آپ کو وقت پر مل گیا ہوگا اس کے متعلق ہمارے پاس خطوط بہت کم آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ لوگ امتحانات کی تیاری میں مصروف ہوں، اب تو امتحانات سے فارغ ہو گئے ہوں گے اور نتائج کا بے چینی سے انتظار ہو رہا ہوگا ہماری بھی دعا ہے کہ آپ کی محنتیں رائیگاں نہ جائیں اور آپ سب کو محنت کا پھل ملے۔

زیر نظر شمارہ حاضر ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کے متعلق اپنی رائے اور مشورہ ضرور دیں اس سے ہمیں بھی فائدہ ہوتا ہے اور لکھنے والوں کی بھی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

اس شمارے میں شہاب الدین انصاری صاحب کا بہت معلوماتی مضمون "طبی جادوگر" آپ کو ضرور پسند آئے گا اور ہمیں امید ہے کہ انصاری صاحب اسی طرح آپ کی معلومات میں اضافہ کرتے رہیں گے

سری نواس لاہوتی صاحب اس محفل میں پہلی بار شرکت کر رہے ہیں ان کا شمار حیدرآباد کے اردو نوازوں میں ہوتا ہے "عقل اور بھینس" میں کون بڑا ہے اور کیوں؟ معلوم کیجیے۔

شوکت پردیسی اور نوگل بھارتی صاحبان ہمارے پرانے رفیقوں میں ہیں ہماری تساہلی کی بدولت دونوں حضرات عرصے کے بعد پھر شریکِ محفل ہوئے ہیں۔

چھٹیوں کی وجہ سے پیامی ادبی معمہ نمبر ۷ کے انعام میں اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ آپ زیادہ دلچسپی اور سکون کے ساتھ حل تلاش کریں۔

پیام تعلیم کے اطہر پرویز نمبر کی تیاریاں ہو رہی ہیں اگلے ماہ تاریخ کا اعلان کیا جائے گا۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

بچوں کے تایا جان

یوسف ناظم

عشرت رحمانی

ایک تھا توتا

پرانے زمانے کا ذکر ہے، کسی گانوٗ میں ایک کسان
ے اپنے گھر میں ایک توتا پالا ہوا تھا۔ یہ توتا ملک آسٹریلیا
ے جنگل کا تھا۔ اس توتے کی قسم کو وہاں کی زبان
ں "لوری کیٹ" کہتے تھے۔ اس قسم کا توتا بہت
ہ دار مانا جاتا تھا اور وہ انسانوں میں رہ کر انسانوں کی بول چال
ب سمجھنے اور بولنے لگتا تھا اور انسانوں کی حرکتیں دیکھ کر ان کی خوب نقلیں بنانے لگتا۔

ایک دن کیا ہوا کہ اس کسان نے دھان کے
یت میں ایک بھینس کو چرتے دیکھا۔ یہ بھینس
ں کے پڑوسی کی تھی۔ کسان اس بھینس کو پکڑ کر
پنے گھر لے آیا اور چپکے سے اسے ذبح کر ڈالا۔
ر اس کے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے
ارے گھر نے خوب مزے سے کھایا۔ جو گوشت
ی گیا تھا وہ ایک ٹین کے صندوق میں بند کر کے
ھ دیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ اب روزانہ اس میں سے
ھوڑا تھوڑا گوشت نکال کر پکایا کریں گے۔ یہ صندوق
ں نے ایک کوٹھری میں چھت پر چھپا کر رکھ دیا۔

لوری کیٹ توتا کسان کی یہ ساری حرکتیں
یکھ رہا تھا اور سب باتیں سُن رہا تھا۔

دوسرے دن کسان کا وہ پڑوسی جو بھینس کا
الک تھا کسان کے گھر آیا اور اس نے اس سے
چھا کہ بھائی، کل سے میری بھینس کہیں کھو گئی ہے
ں نے ہر جگہ ڈھونڈی، مگر کہیں نہیں ملی۔ میں
بہت پریشان ہوں۔ تم نے تو میری بھینس نہیں دیکھی۔
کسان نے اس کو صاف جواب دے دیا کہ نہیں
بھائی، میں نے تو تمھاری بھینس نہیں دیکھی۔

کسان کا توتا لوری کیٹ اپنے پنجرے میں بیٹھا
ان دونوں کی یہ باتیں سُن رہا تھا۔ جب کسان کا
پڑوسی واپس جانے لگا تو اس نے جلدی سے کہا،
"میرے مالک نے تمھاری بھینس کے ٹکڑے کر کے
اس کا کچھ گوشت کھایا بھی ہے اور کچھ ایک ٹین کے
صندوق میں بند کر کے کوٹھری کی چھت پر رکھ دیا ہے۔"

کسان توتے کی یہ بات سن کر بہت گھبرایا۔ پڑوسی
نے کسان کے گھر کی تلاشی لی اور اس کو صندوق میں

چھپایا ہوا گوشت مل گیا۔ کسان نے اپنی بات بنانے

اور اُسے ٹالنے کے لیے جھوٹ بولا کہ یہ گوشت تمہاری بھینس کا نہیں ہے دوسری بھینس کا گوشت ہے جو میں کل بازار سے خرید کر لایا تھا۔ میں اکٹھا گوشت خرید لاتا ہوں اور اسی طرح صندوق میں بند کر کے رکھ دیتا ہوں۔ جو گھر کے کھانے پکانے کے کام آتا ہے۔

توتے نے جلدی سے پھر کہا، "نہیں، نہیں میاں یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ تمہاری ہی بھینس کا گوشت ہے۔ میرے مالک نے باہر سے بھینس لا کر میرے سامنے اس کو گھر میں کاٹا تھا اور اس کے گوشت کے ٹکڑے کیے تھے۔"

پڑوسی حیران تھا کہ وہ کسان کی بات کو سچ مانے یا توتے کو سچا سمجھے۔ آخر وہ حاکم کے پاس گیا اور اس کو سارا حال بتا کر کسان پر اپنی بھینس کی چوری کا مقدمہ کر دیا۔ حاکم نے کسان کو حکم بھیجا کہ کل عدالت میں حاضر ہو کر پڑوسی کی شکایت کا جواب دے۔ کسان کو توتے پر بڑا غصہ آیا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ آخر اس نے سوچ بچار کے بعد توتے کو پنجرے سے نکالا اور پیتل کے ایک بڑے سے برتن میں بند کر دیا، پھر اس برتن کے منہ کے اوپر کپڑا لپیٹ دیا۔ موسم بڑا خوش گوار اور سہانا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ لوری کیٹ توتا بے چارا کپڑے لپٹے ہوئے برتن میں بند پھڑک رہا تھا۔ کسان بہت چالاک تھا اس نے برتن پر خوب پانی چھڑکا اور اس کو زمین پر زور زور سے پٹکتا رہا۔

جب صبح ہوئی تو کسان نے لوری کیٹ کو برتن سے نکال کر پھر اس کے پنجرے میں بند کر دیا اور اس کے پنجرے کو لے کر عدالت جا پہنچا۔ مقدمہ شروع ہونے پر حاکم نے کسان کے پڑوسی سے کہا کہ اب اپنی شکایت بیان کرو۔ اس نے حاکم سے کہا کہ کسان کے توتے نے مجھے بتایا کہ میری بھینس کو کسان پکڑ کر اپنے گھر میں لایا تھا اور اس نے اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھایا بھی اور باقی گوشت ایک صندوق میں بند کر کے کوٹھری میں چھپا دیا۔ میں نے تلاشی لی تو واقعی صندوق میں گوشت کے ٹکڑے مجھے ملے۔

حاکم نے توتے سے پوچھا، تو اس نے کسان کے پڑوسی کی ساری باتوں کو دہرا کر حاکم کو بتایا کہ میرے مالک نے وہ بھینس پکڑ کر اپنے گھر میں کاٹی تھی اور یہ جھوٹ بولا تھا کہ وہ گوشت پڑوسی کی بھینس کا نہیں ہے، مگر میرے مالک نے پڑوسی سے غلط کہا تھا۔

کسان سے حاکم نے دوبارہ پوچھا کہ توتا جو کچھ کہتا ہے کیا یہ سچ ہے؟ کسان نے جواب دیا کہ حضور، توتا بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ میرا پڑوسی اور حضور ایک پرندے کی بات کو تو سچ مانتے ہیں، لیکن میرے بیان پر کسی کو یقین نہیں آتا۔ یہ سراسر ظلم اور زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ حاکم نے کہا: "مگر لوری کیٹ قسم کے توتے بہت سمجھ دار ہوتے ہیں اور تمہارے توتے کو تمہارے خلاف جھوٹی بات کہنے کی کیا ضرورت ہے اس لیے ہمیں اس کی بات پر یقین آتا ہے۔"

کسان بولا: "حضور، اصل میں میرے توتے کی عادت ہے کہ وہ بہت سی باتیں غلط کہتا ہے۔"

حاکم نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو تم اس کی کسی بات کی مثال پیش کر کے اپنے بیان کا ثبوت دو۔"

اس پر کسان نے کہا: "مثلاً آپ ابھی اس سے پوچھیے کہ پچھلی رات کیسا موسم تھا اور دیکھیے کہ یہ کیا جواب دیتا ہے؟"

حاکم نے توتے سے سوال کیا کہ بتاؤ پچھلی رات کیسا موسم تھا؟ لوری کیٹ بے چارے پر اپنے مالک کی چالاکی سے جو کچھ بیتی تھی اس کو وہی معلوم تھا اس لیے اس نے جواب دیا:

"رات بہت اندھیری تھی۔ بادل گرج رہے تھے اور زور کی بارش ہو رہی تھی"۔ کسان نے حاکم سے کہا:

"حضور نے سُن لیا۔ یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔ حالانکہ پچھلی رات چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ موسم کتنا سہانا تھا اور آسمان پر بادلوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ اب بھلا آپ اس جھوٹے پرندے کی بات کا یقین کریں گے"۔

اس پر حاکم کو یقین ہو گیا کہ لوری کیٹ کو جھوٹ بولنے اور باتیں بنانے کی عادت ہے۔ کسان واقعی بے گناہ ہے اور اس نے اسی وقت کسان کو چھوڑ دیا۔ پڑوسی بے چارہ شرمندہ ہو کر اپنے گھر واپس آ گیا۔

اس کے بعد گھر واپس آتے ہی کسان نے مارے غصّے کے لوری کیٹ کو پنجرے سے نکالا اور اُڑا دیا۔ اِس کم بخت نے تو اپنی باتوں سے مجھے پھنسوا دیا تھا۔ اگر میں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے کر اس کو جھوٹا ثابت نہ کرتا تو مجھے قید خانے میں بند ہونا پڑتا۔ لوری کیٹ خوشی خوشی اُڑتا ہوا جنگل میں جا پہنچا اور دوسرے توتوں کے ساتھ، ہنسی خوشی رہنے لگا۔

ایک دن لوری کیٹ نے جنگل میں ایک نیا پرندہ دیکھا، جس کے پر سبز اور سرخ رنگ کے تھے۔ اس نے نئے پرندے سے پوچھا: "بھائی، تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" نئے پرندے نے جواب دیا: "مجھے لوٹیاں توتا کہتے ہیں۔ میں جنوب کے پہاڑی علاقے سے آیا ہوں اور اب اس جنگل میں رہنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے یہاں رہنے کی اجازت دو تو میں تمھارے ساتھ مل کر خوشی خوشی رہوں"۔ لوری کیٹ نے اس سے پوچھا: "کیا تم انسانوں کی بولی بھی بول سکتے ہو؟" اس نے کہا: "ہاں" میں اچھی طرح انسانوں کی بولی بولنا جانتا ہوں"۔

لوری کیٹ نے توتے سے کہا: "اس جنگل میں تم بڑی خوشی سے رہو، مگر تم اجنبی ہو۔ اس لیے میری ایک نصیحت یاد رکھو اور اسے گرہ میں باندھ لو۔ میں بھی انسانوں کی بولی جانتا ہوں۔ گانوؤں میں اور شہروں میں انسانوں کے گھروں میں رہتا رہا۔ میں ان کی سُنی سنائی باتیں بھی دُہراتا تھا اور خود بھی ان کی زبان میں باتیں کرتا تھا، لیکن انسان کو یہ بُرا لگا کہ میں

سچ بولتا ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ جو مجھے وہ بولنا سکھائیں وہی بولوں اور ان کی طرح جھوٹی سچی باتیں کیا کروں۔ ایک دفعہ سچ بولنے پر مجھے ایک کسان کے گھر سے نکلنا پڑا۔ میں نے اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کیا کہ سچ بولنے سے مجھے یہ تو فایدہ ہوا کہ قید سے چھٹکارا ملا اور یہ بھی کہ میں انسانوں کی طرح دھوکا، فریب اور جھوٹ نہیں بولتا۔ ہم حیوان انسانوں

ے اچھے ہیں کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ دھوکے
زی نہیں کرتے نہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس لیے
میں انسانوں کے ساتھ رہو تو صرف وہی بولنا جو
ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہنا نہیں تو
نہیں ہوگی۔ مجھے تو میرے پیدا کرنے والے
نے بچالیا۔ انسان میرے سچ بولنے کے قصور میں مجھے
رجان سے مار ڈالتا تو میں اس کا کیا کر سکتا تھا۔ وہ
تو غصے میں اپنے انسان بھائیوں کو مار ڈالتے ہیں۔
ب اور تم ان کے نزدیک کیا چیز ہیں"۔
توتیاں توتے نے نوری کیٹ کا شکریہ ادا کیا اور
سی وقت سے اس کی بات مان لی۔ یہی وجہ ہے کہ
ریاں توتا اس دن سے جب کسی انسان کے پاس
برے میں رہتا ہے تو صرف وہی باتیں دہراتا ہے
و اس کے مالک اس کو سکھاتے ہیں۔

(بشکریہ نونہال)

مرغی

والی محمد فضل اللہ رومی

کٹ کٹ کرتی آئی مرغی!
چونچ میں دانہ لائی مرغی!
چوزے دوڑے دوڑے آئے
ماں کے منہ میں دانے پائے
ہو گئے خوش وہ دانہ پاکر
ماں سے بولے پھر وہ جاکر
کیوں آئی ہو دیر سے گھر میں
چوٹ لگی ہے کیسے سر میں
ماں نے کہا کہ بندر آئے
گھر میں گئی تو اندر آئے
ڈر کر میں جب دوڑتی آئی
اک پتھر سے ٹھوکر کھائی
چوٹ پہ میری دل نہ کڑھاؤ
جاکر بچو کھانا کھاؤ
بچوں نے جاکر کھانا کھایا
رومی گھر کو واپس آیا

مدرس مدرسہ دینیات آمبور۔ تامل ناڈو

شہاب الدین انصاری

طبّی جادوگر : الیگزنڈر فلمنگ

پنسلین کی دریافت نے زہریلے جراثیم کے ذریعے پھیلنے والی بیماریوں کے علاج میں جو حیرت انگیز سہولت پیدا کردی ہے، اس سے آج پوری دنیا واقف ہے۔ سائنس کی ترقی کے سفر میں اس دریافت کو محض ایک اتفاقی چھلانگ کا نام دیا گیا ہے۔ اب اسے اتفاقی نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ پنسلین جو ایک جاندار یعنی زہریلے جراثیم کے لیے سم قاتل ہے، دوسرے جاندار یعنی انسان کے لیے آبِ حیات بن جاتی ہے۔ البتہ الیگزنڈر فلمنگ کے لیے اس کی دریافت محض ایک اتفاقی حادثہ نہ تھی۔ وہ تو ایک ایسے عنصر کی تلاش میں عرصۂ دراز سے کوشاں تھے۔ فلمنگ کی زخم کے زہریلے پن کو پھیلنے سے روکنے کے مسائل سے دلچسپی پہلی جنگ عظیم کے دوران شروع ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو جنگ میں زخمی ہوجانے کے بعد زخم کے زہر کے جسم میں پھیل جانے کے باعث مرجاتے تھے چنانچہ اس جنگ میں ستر لاکھ فوجی موت کا شکار بن گئے۔

جہاں تک زخم کے زہر کے پھیلنے کا سوال تھا دنیا اس مہلک مرض سے ایک عرصہ سے واقف تھی اور اس کے تدارک کی سعی میں برابر مصروف تھی۔ چنانچہ جوزف لسٹر نامی ایک برطانوی سائنسداں نے زخموں کو صاف کرنے کے لیے کاربولک ایسڈ اور آیوڈین کا استعمال شروع کیا۔ لیکن فلمنگ اور ان کے استاد جوزف رائٹ اس طریقہ کے بنیادی نظریہ کو غلط بتاتے تھے۔ انھیں دنوں لوئی پاسچر کے ایک شاگرد میچنی خوف نے اپنے تجربات سے یہ ثابت کیا کہ کاربولک ایسڈ وغیرہ خون کے سفید ذرّات کو کمزور کر دیتے ہیں۔ انسانی خون کے اندر موجود یہ سفید ذرات جسم میں جراثیم سے مدافعت کی قوت فراہم کرتے ہیں۔ جوزف رائٹ اور فلمنگ کا خیال تھا کہ جراثیم کو ہلاک کرنے کا طریقہ ایسا ہونا چاہیے جو خون کے سفید ذرات کو تقویت دے کر جسم کے اندر مدافعت کی قوت کو مزید تقویت دے۔

طبی دنیا نے فلمنگ اور ان کے استاد کے ان خیالات کو نہ صرف توجہ کے لائق نہیں سمجھا بلکہ اس پر سخت نکتہ چینی کی۔ لیکن فلمنگ اپنے فیصلے پر جمے رہے اور جنگ کے بعد جب وہ اپنی تجربہ گاہ میں واپس آئے تو اپنی تحقیق کے کام کو زیادہ سرگرمی سے شروع کردیا یہاں تک کہ ۱۹۲۱ء میں وہ ایک ایسے جراثیم کش مادہ کی دریافت میں کامیاب ہوگئے جو خون میں موجود سفید ذرات کو کمزور کردینے کے بجائے جراثیم سے مدافعت کرنے میں اس کو سہارا دیتا تھا۔ یہ مادّہ خود انسانی جسم کی پیداوار تھا۔ فلمنگ نے اس مادّہ کو لائسوزائم کا نام دیا۔

لائسوزائم کی دریافت بھی ایک لطیفہ سے کم نہیں۔ ہوا یوں کہ جن دنوں وہ اپنی تجربہ گاہ میں کام کررہے تھے سخت نزلہ کا شکار ہوئے ان کی ناک سے پانی بہنے لگا ایک دن انھوں نے اپنی ناک سے نکلے اس رقیق مادّہ کو

تجرباتی پٹی پر لیسدار تجرباتی مادّہ لگاکر اس کی جانچ کی۔ اس جانچ کے نتیجے میں انھیں معلوم ہوا کہ اس رقیق شئے میں موجود عنصر جراثیم کو فنا کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ عنصر انسان کے آنسوؤں میں بڑی مقدار میں موجود ہے اور نہ صرف آنسوؤں میں بلکہ انسانی پٹھوں میں موجود رقیق مادے میں بھی ہے۔ یہ لائسوزائم ہی ہے جس کی موجودگی کی بدولت انڈے جراثیم کے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا لیکن لائسوزائم کا طبّی استعمال بہت کم تھا۔ ہاں اس دریافت نے فلمنگ کے بنیادی خیال کو تقویت ضرور دی اور ان کے حوصلوں کو بلند کیا۔ اب وہ اور زور وشور سے اپنے تجربے میں مصروف ہوگئے۔ یہاں یہ بات بتانی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ لائسوزائم کوئی دوا نہ تھی بلکہ انسانی جسم میں موجود ایک عنصر تھا۔

۱۹۲۸ء کے موسم خزاں میں جبکہ وہ عام نوعیت کے جراثیم اسٹیفی لوکوکس پر تجربہ کررہے تھے۔ انھوں نے اتفاقیہ طور پر دیکھا کہ جن پلیٹوں پر تجرباتی مادہ پھیلاکر وہ تجربہ کررہے تھے ان میں سے ایک تجربہ گاہ کی کھلی فضا میں چند دنوں کے واسطے پڑی رہ گئی تھی۔ اور کھڑکی میں سے اڑکر آیا ہوا کائی کا کوئی بیج اس پر چپک گیا، نتیجہ میں اس پر کائی کی ایک تہہ چڑھ گئی۔ اور اس مقام سے تمام جراثیم غائب ہوگئے۔ یہ اتفاقی حادثہ ایک بڑی دریافت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کائی سے مقطر مادّہ کو ہی پنسلین کہتے ہیں کیونکہ پنسلین، پنسلیم نامی نباتاتی پودوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے یعنی برش جیسی شکل کے پودے اور اس لیے اس جراثیم کش مادّے کا نام پنسلین رکھا۔ اسی سال فلمنگ لندن یونیورسٹی کے اسکول برائے مطالعہ جراثیم میں پروفیسر ہوئے تھے۔

ڈاکٹر فلمنگ نے دیکھا کہ پنسلین زہریلے پن سے بھی عاری ہے اور یہ بہت سے مضرت رساں جراثیم کو پنپنے سے روکتی ہے۔ اپنے تجربہ کے نتائج انھوں نے ایک طبّی رسالہ میں ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔ اب فلمنگ نے کائی کے کیمیاوی اجزاء پر تجربہ کرنا شروع کیا۔ اس کام کے لیے انھوں نے گوشت کے باریک ٹکڑوں کا محلول تیار کیا اور اس پر کائی اگائی۔ اس محلول کی رنگت زرد ہوگئی۔ ہفتہ بھر بعد اس رقیق کو ایک چھلنی میں چھان کر حاصل شدہ مادّہ کے جراثیم کو ختم کرنے کے اثرات کا تجربہ کیا گیا۔ نتائج اب بھی اطمینان بخش تھے۔ یہ مادّہ جراثیم مارنے میں کاربولک ایسڈ سے تین گنا زیادہ مؤثر تھا۔ لیکن ان کی اس دریافت سے آیندہ بارہ برس تک کوئی کام نہیں لیا گیا۔ اپنی ابتدائی حالت میں پنسلین کے اثرات جلد زائل ہوجاتے تھے۔ بطور دوا استعمال میں لانے کے لیے ضرورت تھی کہ کوئی دواسازی کا ماہر اس میں ٹھہراؤ پیدا کرے۔ آخر آکسفورڈ کے دواسازی کے ماہرین ہورڈ فلورے اور آرنسٹ بورس چین نے کافی مقدار میں پنسلین جمع کرکے اس پر معالجاتی تجربہ گاہ میں تجربہ کیا۔ ان لوگوں نے فلمنگ کا مضمون پڑھا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران آکسفورڈ کی ایک ٹیم امریکہ گئی جہاں پنسلین کو دوا کی شکل دی گئی۔ تیار دوا سب سے پہلے معرکے جنگی محاذ پر بھیجی گئی اس محاذ کے جنرل مشہور فوجی منٹگمری تھے، انھوں نے پیغام بھیجا کہ علاج میں اس دوا نے انقلاب برپا کردیا۔ ۱۹۴۵ء میں فلمنگ، فلورے اور چین کو طب کا نوبل انعام ملا۔ آؤ اب اس نوبل انعام یافتہ سائنسداں کی زندگی کے ابتدائی حالات دیکھیں۔ فلمنگ ۶/ اگست ۱۸۸۱ء کو ڈارویل کے قریب لاخ فیلڈ کے مقام پر اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد پہاڑی علاقے کے کاشتکار تھے۔ ان کے آٹھ بچے تھے ۶ سال کی عمر میں فلمنگ نے اسکول جانا شروع کیا، اس اسکول میں صرف ۱۲ بچے تھے۔ ۱۲ سال کی عمر میں وہ ڈارویل کے اسکول میں داخل ہوئے۔ دو سال بعد وہ کلمورناک

کی اکیڈمی میں داخل ہوئے ۔ اسی عرصے میں ان
کے والد کا انتقال ہوگیا ۔ اب ان کے خاندان
والوں کے سامنے یہ سوال تھا کہ الیگزنڈر کو کھیت
پر بھیجا جائے یا ان کی تعلیم جاری رکھی جائے خوش قسمتی
سے ان کی بڑی بہن نے انھیں مزید تعلیم کے واسطے
ایک چار سالہ تجارتی کورس میں داخلہ دلایا ۔ جسے
دو سال ہی میں انھوں نے مکمل کرلیا ۔ کورس کی تکمیل
پر انھوں نے ایک جہازراں کمپنی میں کلرک کی ملازمت
کرلی اور چار سال تک ملازم رہے ۔ ۱۹۰۱ء میں
ان کے چچا کے انتقال پر انھیں ورثہ میں کچھ رقم ہاتھ آئی
اس رقم سے انھوں نے طب کی تعلیم کے لیے لندن کے
سینٹ میری کالج میں داخلہ لیا ان کے بڑے بھائی اور
بہن پہلے سے طب کے پیشے میں آچکے تھے ۔ فلمنگ اپنی
کلاس کے ذہین طالب علم تھے ۔ ۱۹۰۶ء میں یونیورسٹی
کے آخری امتحان میں انھوں نے پانچ مضامین میں
امتیازی نمبر حاصل کیے ۔ یونیورسٹی کا گولڈ میڈل ان
کے حصے میں آیا ۔ اور وہ رائل کالج آف سرجن کے
فیلو مقرر ہوئے ۔ اپنی اعلا تعلیمی کامیابی کی بدولت
ان کے سامنے ملازمت کے وسیع امکانات تھے ۔ لیکن
طب کی خوش قسمتی سے انھوں نے سینٹ میری اسپتال
میں سر آمروتھ رائٹ کی تجربہ گاہ میں ان کے معاون
کی حیثیت سے کام کرنا پسند کیا ۔ سر آمروتھ اسپتال
کے ٹیکے کے محکمہ کے سربراہ تھے ۔ وہ ٹیکے کے ذریعہ
علاج کے فن میں ایک پیش رو کی حیثیت رکھتے تھے ۔
اور ٹائی فائیڈ جیسے موذی مرض کا ٹیکہ ایجاد کرنے
کی وجہ سے سائنسی دنیا کی ایک معروف شخصیت بن چکے
تھے سینٹ میری ہی کی تجربہ گاہ میں آخر فلمنگ کو پنسلین
کی دریافت میں کامیابی ہوئی تھی

جو بات ان کی تجربہ گاہ میں کھلی رہ جانے والی پلیٹ پر اتفاقیہ
ہوئی تھی اور جس نے پنسلین تک راہ دکھائی تھی وہ دوبارہ نہ ہوسکی ۔ اپنی تعلیم

و تدریس کے دوران مظاہرہ کے واسطے انھوں
نے دوسرا ہی ڈھنگ اپنایا ۔ اکثر وہ کائی کو پہلے
اگا لیتے اس کے بعد اس پلیٹ پر اسٹیفلی لوکوکا جما دیتے
اور اسے ۲۴ گھنٹے پنپنے دیتے ۔ ان کی وہ پلیٹ
جس پر پہلا تجربہ ہوا تھا اب بھی محفوظ ہے لیکن
اب وہ سوکھ کر اکڑ گئی ہے اور ایسی پلاسٹک کا
پرانا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے جس کا سورج میں کھلے
رہ جانے سے رنگ بگڑ گیا ہو ۔

پہلی جنگ عظیم میں خدمت کے دوران ان کی
ملاقات ایک آئرستانی نرس سے ہوئی اور انھوں
نے اس سے شادی رچالی ۱۹۲۴ء میں ان کے یہاں
ایک لڑکا چارلس نامی پیدا ہوا جس کی ناک اپنے باپ
کی طرح بیچ میں سے بیٹھی ہوئی تھی ۔ پنسلین کی
کامیابی کے بعد دنیا بھر کے ملکوں نے انھیں عزت
بخشی ۔ اپنے نوبل لیکچر میں انھوں نے کہا: میرے
لیے یہ بات خصوصیت کے ساتھ باعث دلچسپی تھی کہ
کس طرح لندن کے اسپتال کی حشراتی تجربہ گاہ
میں ایک سادہ تجربہ سے وہ شئے جسے ہر شخص
کھلونوں کی ایک قسم سمجھتا تھا، مفطر ہونے کے بعد
بہت سے عام جراثیمی زہر کے امراض کے علاج
کے لیے قابل استعمال بنی اور کس طرح پھر یہ
ایک بڑی صنعت میں تبدیل ہوگئی ۔ فلمنگ نے صرف
پنسلین ہی نہیں دریافت کی بلکہ طبی تحقیق کو ایک
نئی سمت دکھائی اب لوگ قدرت کے خزانے میں
سے مدافعتی دوائیں تلاش کرنے میں گرمجوشی سے
لگ گئے ۔ نتیجہ میں کئی دوائیں وجود میں آئیں ۔
ان میں اسٹرپٹو مائی سین خصوصیت سے قابل ذکر
ہے ۔ فلمنگ کو دنیا کے بہت سے ملکوں سے دعوت
ملی ۔ وہ ہندستان بھی آئے ۔ اگرچہ تحقیق کے
کام میں ان کی صلاحیت بے مثال تھی لیکن انھیں
جلسوں میں تقریر کا فن نہیں آتا تھا ۔ ایک بار جب

وہ اٹلی میں ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے تو ایک شخص بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے آیا اس کے ساتھ اس کے تین بچے بھی تھے وہ بولا کہ جناب یہ بچے اگر آج زندہ ہیں تو محض آپ کی بدولت۔ اس وقت فلمنگ نہایت سادگی سے بولے "قدرت اس دوا کو ہزاروں سال سے بنا رہی ہے میں نے تو صرف دریافت کی ہے"۔ ۱۹۴۶ء سے ایک یونانی لڑکی ان کے تجربہ گاہ میں کام کرتی تھی وہ بلا کی ذہین تھی اور برطانیہ ایک وظیفہ کے تحت آئی تھی۔ اپنی پہلی بیوی کے انتقال پر ۱۹۵۰ء میں انھوں نے اپنے تجربہ گاہ کی اس رفیق سے شادی کرلی۔ ۷۴ سال کی عمر میں ۱۱ر مارچ ۱۹۵۵ء کو ان کا انتقال دماغ کی رگ پھٹ جانے سے ہوا۔

شوکت پردیسی

بدھو بھائی

دھواں جو انجن نے پھینکا
بھیڑ میں کھا کھا کر دھکّا
بدّھو نے بھی ٹکٹ لیا
مل گئی جب ان کو گاڑی
ہنس دیے بدّھو کھی کھی

خیر سے بدّھو گھر کو آئے
اپنے ساتھ کھلونے لائے
ہاتھی، گھوڑا، اونٹ اور گائے
موٹر، یکّہ، اور بگھی
ہنس دیے بدّھو کھی کھی

میں نے کہا کہ بدّھو بھائی!
اچھی نہیں ہے روز پٹائی
کھیل کو چھوڑو، کرو پڑھائی
کھاؤ دودھ شکر اور گھی
ہنس دیے بدّھو کھی کھی

علم ہے اللہ کی رحمت
جس نے بھی پائی یہ دولت
سب میں ہے اس کی عزّت
روشن ہے منزل اس کی
ہنس دیے بدّھو کھی کھی

جمدہاں ضلع جون پور

سری نیواس لاہوٹی

عقل بڑی کہ بھینس

بچو! اکثر آپ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں کہ "عقل بڑی کہ بھینس"!! اس کہاوت کا پس منظر کیا ہے آج ہم اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بہت پرانی بات ہے کہ ایک بار ایک بادشاہ جنگل میں شکار کھیلنے گیا اور راستہ بھٹک کر بھوکا پیاسا ایک کنویں کے پاس پہنچا۔ اس کنویں کے پاس دو بچے کھیل رہے تھے۔ اجنبی کو دیکھ کر وہ اس کے پاس آئے۔

بادشاہ نے ان سے کہا: "بچو! میں بہت تھک گیا ہوں کہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ بھوک اور پیاس کے مارے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ کیا تم لوگ میری کچھ مدد کر سکتے ہو"

بچوں نے اجنبی کو آسرا دیا اور دوڑ کر گھر سے کھانا پانی لے آئے۔ بادشاہ نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد بچوں سے پوچھا کہ "تمہاری کیا خواہش ہے۔ میں اسے پورا کروں گا"۔

ایک لڑکے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا کہ "مجھے ایک بھینس چاہیے"۔

دوسرا لڑکا بھی تھوڑی دیر سوچتا رہا اور پھر کہا کہ "مجھے عقل چاہیے"۔

بادشاہ نے دونوں کی باتیں سنیں اور شہر کا راستہ دریافت کر کے چلا گیا۔ دوسرے دن جس لڑکے نے بھینس مانگی تھی اس کے پاس بھینس بھجوا دی گئی اور دوسرے لڑکے کو علم کے حصول کے لیے شہر بلا لیا گیا۔ یہ لڑکا دل لگا کر پڑھنے لگا اور چند ہی دنوں میں اپنی ذہانت سے سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔

رفتہ رفتہ زمانہ گزرتا گیا اور وہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر سلطنت کا وزیر اعظم بن گیا۔ ایک بار وہ دورے پر اپنے گاؤں گیا تو اسے اپنا وہی پرانا دوست ملا۔ اس کی بھینس کبھی کی مر چکی تھی اور وہ مصیبت کے دن کاٹ رہا تھا۔ وزیر اعظم نے اس کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا کہ "کیوں بھائی! اب بتلاؤ کہ "عقل بڑی کہ بھینس!" بس! اس کے بعد سے یہ کہاوت چل پڑی!!

ٹیڑھی کھیر!!

بچو! کسی بھی مشکل کام کو دیکھ کر آپ کی زبان سے یہ کہاوت نکل پڑتی ہے کہ "ارے! یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے"۔ اس کہاوت کا مطلب ہے کہ معاملہ بڑا مشکل ہے اور جو کام سامنے ہے وہ بڑا کٹھن ہے۔ اس کہاوت کی حقیقت کیا ہے وہ آپ کو سمجھاتے ہیں۔

اردو ہال حمایت نگر۔ حیدرآباد

ایک دفعہ ایک اندھے کو کسی آدمی نے کھیر کھانے کی دعوت دی۔ اندھا بڑا شکی تھا اس لیے کھیر کی بات سنتے ہی کہنے لگا: "ذرا مجھے سمجھاؤ کہ یہ کھیر ہوتی کیسی ہے" ؟

"بابا۔ کھیر سفید ہوتی ہے" دعوت دینے والے نے کہا۔

بابا تھوڑی دیر تک سوچتے رہے اور دریافت کیا کہ "اچھا یہ بتاؤ کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے" ؟۔

دعوت دینے والے نے جواب دیا کہ "جو رنگ بگلے کا ہوتا ہے بس وہی کھیر کا رنگ ہوتا ہے"۔

بابا کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہنے لگے کہ "یہ بگلا کیسا ہوتا ہے" ؟

اس بار کھیر کھلانے والے نے بابا کو سمجھانے کے لیے ایک نئی ترکیب نکالی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کی مدد سے بگلے کی سی شکل بنائی اور بولا: "بابا میرا ہاتھ ٹٹول کر دیکھو بگلا کچھ ایسا ہی ہوتا ہے"۔

ہاتھ ٹٹولنے کے بعد بابا گھبرائے اور بولے "ارے باپ رے! بگلا ایسا ہوتا ہے۔ آپ مجھے معاف کریں میں ایسی ٹیڑھی کھیر نہیں کھاؤں گا۔ یہ تو میرے حلق میں پھنس جائے گی"۔

اس کے بعد اس آدمی نے بابا کو لاکھ سمجھایا لیکن وہ کھیر کھانے پر آمادہ نہیں ہوئے بس یہی اس کہاوت کا پس منظر ہے۔

(ہندی سے ترجمہ)

امۃ الرحمٰن محسنی

دو شکاری

(قسط ۱۵)

جلدی ہی ہم قصبے سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے تھے۔ آس پاس ہم دو کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چاند کی روشنی خوب پھیلی ہوئی تھی۔ اونچے نیچے ٹیلے پھلانگتے ہوئے موڑ مڑتے ہوئے اگرچہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ مگر بہت مطمئن اور مسرور اپنے گھر کی طرف جارہے تھے۔

میں نے کہا: "ابو میرا دل اب تک دھڑک رہا ہے۔"

"ایسے ہی میرا بھی تو" ابو بولے۔ لیکن انھوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "دانی! اوہ! کیا شاندار وقت گزرا ہے۔ کیسی تفریح رہی ہے۔"

ہم میدانوں، پگڈنڈیوں سے گزر کر اب سڑک پر آگئے تھے۔ اور وہاں بھی میں اور ابو ایسے چل رہے تھے جیسے کہ سارا گرد و پیش ہماری ریاست ہے اور ہم اس کا معائنہ کرتے اور دیکھتے پھر رہے ہیں۔

"دانی!" ابو نے بات شروع کی "تمھیں اندازہ ہے کہ آج رات یعنی ۳۰ ستمبر جمعہ کو تم نے اور میں نے مل کر شہباز خان کے جنگل کے اعلا درجے کے ایک سو بیس تیتر تھیلوں میں بھرے ہیں۔" میں نے ابو کی طرف دیکھا ان کا چہرہ بھرپور مسرت سے چمک رہا تھا۔ بازو چلنے میں معمول سے زیادہ ہل رہے تھے۔ جوتے کی عجیب سی نعل کھٹ کھٹ بج رہی تھی۔ اور وہ مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ "بھنے ہوئے تیتر کیا لذیذ جنتی کھانا ہے دانی مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ تم نے کبھی بھنا ہوا تیتر کھایا ہے؟"
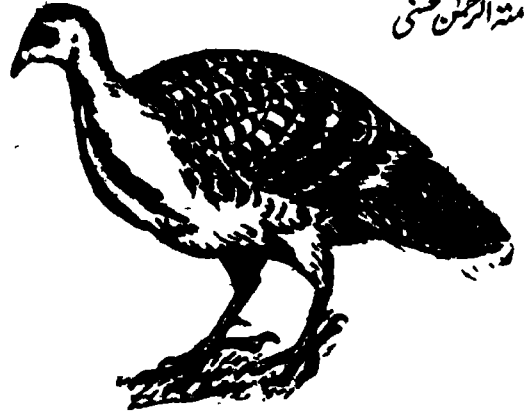
"نہیں میں نے کبھی نہیں کھایا۔"

"اب کھانا۔ تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ جب تم کھاؤ گے تب پتا چلے گا کہ اس کا کیا ذائقہ ہوتا ہے! اور کیا سوندھی خوشبو ہوتی ہے۔ اس کی خوش بو میں ایک جادو ہوتا ہے۔"

"ابو کیا اسے صرف بھونا ہی جاتا ہے؟"

"ہاں کم عمر کے چوزے تلے بھی جاتے ہیں۔ اور اس طرح کی چڑیاں روسٹ ہی میں ذائقہ دیتی ہیں۔ قورمہ ان کا اتنا زیادہ مزیدار نہیں ہوتا۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہم ان کو کیسے بھونیں گے ہمارے پاس تنور قسم کی کوئی چیز تو ہے نہیں۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمارے پاس تنور نہیں ہے۔" ابو نے کہا۔ "اس کے لیے میں نے سوچا ہے کہ کل کو شہر جاکر بجلی کا ایک اُوَن خرید لیں گے۔" بجلی کا اُوَن! میں نے ان کو حیرت سے دیکھا۔

"ہاں ہاں! جب ہمارے پاس اتنا بڑا اور شاندار تیتروں کا ذخیرہ ہے تو اس کو ٹھیک سے پکانے کا بھی انتظام ضروری ہے۔ اُوَن ہم اپنی ورک شاپ میں رکھیں گے۔ وہاں بجلی کے پلگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"ابو وہ تو بہت قیمتی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں اگر تیتر بھوننے کے لیے زیادہ پیسے خرچ ہو بھی جائیں تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔" کچھ دیر خاموشی رہی ہم اُوَن

مسکن۔ دودھپور۔ علی گڑھ

میں بھُنے ہوئے حسین اور لذیذ تیتروں کے خواب دیکھتے رہے۔
پھر اّبو بولے "دادی میں سوچ رہا ہوں کہ سب دوستوں کو تقسیم کرکے بھی ہمارے پاس پچاس چڑیاں بچ رہیں گی۔ اگر ان کو قاعدے سے رکھا جائے تو ان کو ہم مہینوں کھا سکتے ہیں۔ تو پھر ہم کو اس کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔ کیوں نہ ہم ایک چھوٹا سا ڈیپ فریزر بھی خرید لیں؟"
"نہیں ابو! اس میں بہت پیسے خرچ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔
"تو کیا ہوا۔ تیتروں کے بہانے ہمارے پاس ہمیشہ کے لیے ایک بہت کام کی چیز ہو جائے گی۔"
"ابو کیا آپ کی اماں کے پاس بھی تنور ہوگا؟"
"ہاں تھا! اور وہ بہت عمدہ تھا۔ اسے کوئلوں سے جلایا جاتا تھا۔ سردیوں میں تو وہ دن رات جلا کرتا تھا۔ اگر کوئلے نہیں ہوتے تھے تو لکڑی کے ٹکڑے کرکے اس میں ڈالتے تھے۔"
"کیا اس میں پرندے بھی بھن سکتے ہیں؟"
"پرندے کیا اس میں بکرا بھی بھن سکتا تھا۔ اور کمرہ بھی سردی کے موسم میں گرم رہتا تھا۔"
ہم راستے بھر باتیں کرتے ہوئے۔ آخر پیٹرول پمپ پر پہنچ گئے۔ میں نے کہا: "اگر یہاں شیر خاں آجائے تو کیا ہوگا۔"
"اگر ابھی آجائے تو ہم اسے نظر نہیں آسکتے۔ یہ لوگ ہمیشہ کسی جھاڑی کے پیچھے یا درخت کی آڑ میں چھپ کر نگرانی کیا کرتے ہیں۔ اگر ہمارے کندھے پر کوئی تھیلا لٹکا ہوا دیکھیں یا ہماری جیبیں غیر معمولی طور پر ابھری ہوں گی۔ تب وہ شبہ کرکے سامنے آتے ہیں۔ ہم تو کوئی بھی چیز لیے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر وہ ہوں گے بھی تو سامنے نہیں آئیں گے۔ تم بے فکر رہو۔" میں نے شبہ کی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر شیر خاں وغیرہ کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ ہم اطمینان سے اپنے گھر میں آگئے۔ ابو نے لیمپ جلایا اور پھر چولھا جلا کر کیتلی میں پانی کے پانی ابلنے کو رکھ دیا۔ چند منٹ کے بعد ہم بڑے سکون سے بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ اور باتیں کر رہے تھے۔ ابو نے کہا۔ "میری زندگی میں ایسا ہنگامہ خیز وقت پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ کیسی ہما ہمی ہم دونوں پر سوار تھی۔ مگر کام بہت ہی عمدگی سے انجام پایا ہے۔ اس کی مجھے بڑی خوشی ہے۔"

دوسرے دن صبح کو ساڑھے سات بجے ابو ورک شاپ میں گئے اور ڈاکٹر حسین کے نمبر ڈائل کرکے ان سے باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے کہا:
"سنو ڈاکٹر! آپ اگر آدھ گھنٹے میں یہاں آجائیں تو میں ایک بہت عجیب اور حیرت انگیز تحفہ آپ کو پیش کروں گا۔ اور تماشا بھی دکھاؤں گا۔ ڈاکٹر نے جواب میں کچھ کہا۔ اور ابو نے ریسیور جگہ پر رکھ دیا۔

ٹھیک نو بجے ڈاکٹر حسین اپنی کار میں آگئے۔ ابو ان کو لینے کے لیے آگے بڑھے۔ وہ گاڑی میں سے اتر کر پمپ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ دونوں میں سرگوشیوں میں باتیں ہونے لگیں پھر ایکدم چھوٹے سے بڑے میاں اچھلنے لگے تالیاں اور سیٹیاں بجاتے تھے اور ہنستے تھے اور کہتے جا رہے تھے۔ تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔ یہ کیسے ہوگیا۔ اور پھر میری طرف جھپٹے۔ میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا "پیارے بچے میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں"۔ اور خوشی کے جوش میں زور زور سے میرے ہاتھ دبانے لگے۔ اتنے زور سے کہ دُکھنے لگے۔ "تم نے تو ایک معجزہ دکھا ڈالا۔ ایک قلعہ فتح کرلیا۔ کیا بات تمھارے ذہن میں آئی ہے۔ میری اتنی عمر ترکیبیں ڈھونڈنے میں گزری مگر یہ بات سوچ ہی نہ سکا۔ ماشاء اللہ تم میں ایجاد کی صلاحیت ہے۔ دادی عزیز بیٹے میں تمھاری ذہانت کو سلام کرتا ہوں۔ تم واقعی "چیمپئن آف دہ ورلڈ" ہو۔
دیکھیے ڈاکٹر! وہ آرہی ہیں۔ ابو نے سڑک کی طرف اشارہ کرکے کہا۔
"کون آرہی ہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔
"فاروق انجینئر کی بیوی!" وہ بڑے فخر سے ان کا نام لے رہے تھے۔ جیسے کہ وہ ایک کمانڈر ہوں اور اپنے کسی منتخب بہادر آفیسر کی بات کر رہے ہوں۔

ہم تینوں پمپ کے پاس کھڑے ہوئے سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابّو نے پھر ڈاکٹر سے پوچھا "کیوں کیا وہ آپ کو نظر نہیں آئیں"؟ میں نے دیکھا کہ بہت دور سے ایک دھندلا سا خاکہ ہماری طرف بڑھا آرہا ہے۔ میں نے پوچھا "مگر وہ کیا دھکیل رہی ہیں"؟

ابو نے مجھے بامعنی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تیتروں کو یہاں پہنچانے کا ایک ہی محفوظ طریقہ تھا وہ یہ کہ بچے کے نیچے چھپا کر لایا جائے۔ "کیوں ڈاکٹر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"بچے کے نیچے چھپا کر"؟ ڈاکٹر حسین نے تعجب سے پوچھا:

"ہاں ہاں! ایک بچہ گاڑی میں اور بچہ کو اس پر بٹھا کر!"

"بڑی عجیب و غریب ترکیب ہے۔" ڈاکٹر نے حیرت کے لہجہ میں کہا۔ "ایک ذہین آدمی ہی یہ ترکیب سوچ سکتا ہے۔ اب تو وہ نظر آسکتے ہیں"۔ ابو نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ انھوں نے اپنے ہی بچے نصرت فاروق کو گاڑی پر بٹھا رکھا ہے۔ چھوٹا سا ہی ہے کوئی ڈیڑھ سال کا ہوگا۔ بہت ہی پیارا بچہ ہے۔"

ہاں! ڈاکٹر نے تائید کی۔ "میرے ہی ہاسپٹل میں پیدا ہوا تھا۔ بہت تندرست بچہ ہے۔ پیدائش پر بھی اس کا وزن ساڑھے آٹھ پونڈ تھا۔ اب تو مجھے بھی نظر آرہا ہے۔ وہ رہا۔"

اور مجھے بھی نظر آرہا ہے۔ میں نے کہا۔ بس ایک نکتہ سا گاڑی کے اوپر ابھرا ہوا ہے۔ اور گاڑی کا ہُڈ گرا ہوا ہے،

ابّو نے خوش ہو کر کہا۔ ذرا تصوّر تو کیجیے اس ایک ننّھی سی چیز کے نیچے ایک سو سے زیادہ تیتر ہیں۔

ڈاکٹر نے یقین نہ کرتے ہوئے کہا: "ایک بچہ گاڑی میں ایک سو کیسے آجائیں گے۔ مہمل بات ہے۔"

"اگر اس میں کچھ تبدیلیاں کر دی جائیں۔ تب آسکتے ہیں۔ ابو نے کہا۔ اس پریم کو ایک سو تیتروں اور بچے کے لیے خاص طور سے گہرا کیا گیا ہے۔ عام سائز سے لمبا اور چوڑا تو یہ پہلے ہی سے تھا۔"

"ابّو! اسے گہرا کیا خود آپ نے کیا ہے"؟ میں نے پوچھا۔

"ہاں دانی! کچھ تھوڑی تبدیلیاں میں نے کی ہے"۔ ابو نے کہا۔ "تمھیں یاد ہے۔ جب میں تمھیں اسکول چھوڑ کر کشمش لینے گیا تھا؟"

"جی ہاں۔ پرسوں ہی تو! میں نے کہا۔" "تو کشمش لے کر میں سیدھا فاروق صاحب کے یہاں گیا تھا۔ تب ہی میں نے اس گاڑی کو شکار کا سامان رکھنے کے قابل بنانے کے لیے تبدیلیاں کی تھیں۔ اب یہ دیکھنے میں پہلے سے بہتر لگتی ہے۔ اسے پاس آنے دو تب دیکھنا۔ زبیدہ بیگم کہتی ہیں کہ یہ پہلے سے زیادہ ہلکی چلتی ہے۔ جب میں اسے بنا چکا تھا تب انھوں نے اسے بہت دور تک چلا کر دیکھا تھا۔"

"اور بچہ کو بیٹھانے کی جگہ کہاں بنائی ہے"۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "تیتروں کے اوپر بس ایک چادر ڈال کر بچہ کو بٹھانے کی جگہ ہے۔ وہ تیتروں کے ملائم پروں کے گدّے پر بیٹھا رہے گا۔" "اوہ بہت عمدہ"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"آج ننھے نصرت کو بہت آرام دہ گدگدی سواری ملی ہوگی۔" ابو نے کہا۔

ہم سب پمپ کے پاس کھڑے زبیدہ بیگم کو آتے دیکھ رہے تھے۔ آج اکتوبر کی پہلی تاریخ تھی۔ کالے بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ تھوڑی گرج بھی تھی۔ ہر لمحہ بارش آنے کی توقع کی جارہی تھی۔

ابو میں ایک خاص بات تھی۔ میں نے اکثر غور کیا ہے کہ وہ بعض موقعوں پر کوئی نہ کوئی اچنبھے میں ڈالنے والی بات کر جاتے تھے۔ اگر کوئی لمبے عرصے تک ان کے ساتھ رہے تو ان کی باتوں پر حیرت کیے بنا نہ رہ سکے۔ وہ کسی مداری کی طرح اپنے جادو کے تھیلے میں سے کوئی حیرت انگیز چیز ایک دم نکال لایا کرتے ہیں۔ ایسے ہی اس وقت پریم اور بچہ کی بات تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ چند منٹوں میں اور بھی کوئی انوکھا تماشا ہم دیکھنے والے ہیں۔

ابو نے کہا۔ قصبے کے بیچ میں سے وہ کیسے ہمت اور دلیری کے ساتھ نکل کر آئی ہیں!

لگ رہا ہے کہ وہ بہت ہی جلدی میں ہیں ۔ میں نے کہا ۔ ان کے چلنے کا انداز بالکل بھاگنے جیسا ہے ۔ شاید وہ سامان کو جلد سے جلد پہنچانے کی جلدی میں ہیں۔ ڈاکٹر نے رائے ظاہر کی ۔

ابو نزدیک آتے ہوئے ہیوے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے ۔ کہنے لگے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش کی آمد کی وجہ سے جلدی میں ہیں ۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ یہ ہی وجہ ہے ۔ وہ بچے کے بھیگنے کے ڈر سے جلدی کر رہی ہیں ۔ اگر بارش آجائے گی تو وہ ہڈ بھی تو چڑھا سکتی ہیں ۔ میں نے کہا ۔ انھوں نے اسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ ڈاکٹر جن کی نگاہیں بھی اسی طرف لگی ہوئی تھیں ۔ چلا کر بولے ۔ دیکھو تو وہ بھاگ رہی ہیں ۔

ابو فکر مند ہو کر ان کو آتے ہوئے تک رہے تھے اور بالکل خاموش تھے ۔ اسی وقت مجھے ایسا لگا کہ بچے کے رونے کی آواز میں نے سنی ہے ۔ ابو یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟ میں نے گھبرا کر پوچھا ۔ مگر انھوں نے جواب نہیں دیا ۔

ڈاکٹر نے کہا ۔ "سنو تو سہی لگتا ہے بچہ کسی پریشانی میں ہے ۔"

اس وقت بیگم صاحبہ ہم سے دو سو گز کے فاصلہ پر ہوں گی ۔ اور ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ بدحواسی کے عالم میں بھاگتی ہوئی آرہی تھیں ۔ ابو آپ نے کچھ سنا ؟ میں نے ابو سے کہا ۔ ہاں میرے کان میں بھی آوازیں آرہی ہیں ۔ وہ چیخ اور رو رہا ہے ۔ ڈاکٹر نے کہا ۔ چھوٹی سی باریک چلاتی ہوئی آواز ہر لمحہ قریب آرہی تھی ۔ بلا ایک لمحہ رکے ۔ ابو نے کہا ۔ شاید بچہ کو کسی طرح کا دورہ پڑا ہے ۔ شکر ہے اس وقت یہاں ڈاکٹر موجود ہیں ۔ ڈاکٹر غور سے بس دیکھے جا رہے تھے ۔ بولے کچھ نہیں ۔ سنیے یہ آواز کیسی ہے ؟ میں نے گھبرا کر کہا ۔

شرط لگالو یہ بالکل کسی طرح کا دورہ ہے ۔ ابو نے کہا ۔ یا اور اسی طرح کی کوئی بیماری ہے ۔

نہیں ۔ ڈاکٹر نے فکر مند لہجے میں کہا ۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ اسے کسی طرح کا دورہ ہے ۔

ابو بڑی بے چینی سے اپنا پیر رکھ اور اٹھا رہے تھے ۔ اور کہہ رہے تھے ۔ بچوں کو روز کچھ نہ کچھ بیماری ہو ہی جایا کرتی ہے ۔ سوائے ڈاکٹر کے کسی کو اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ کیا بیماری ہے ۔

بے شک ! ڈاکٹر نے کہا ۔ بچوں کو روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے ۔

بہر حال جو کچھ بھی ہے دل چاہتا ہے کہ وہ اس بری طرح بھاگنا بند کر دیں ۔ ابو نے پریشان ہو کر کہا ۔ مجھے ڈر ہے کہ اس بھاگم بھاگ میں کہیں سارا کھیل ہی چوپٹ نہ ہو جائے ۔

اچانک پریم میں سے ایک موٹا سا تیتر نکلا اور اڑنے لگا ۔ ایک اینٹوں کا ٹرک بھی پیچھے سے آرہا تھا ۔ اس کے ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا ۔ اور سیٹی بجانے لگا ۔ ابو نے گھبراہٹ کا نعرہ بلند کیا ۔ ٹرک ڈرائیور نے جو دیکھ رہا تھا ۔ اور آگے سرکیا اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا ۔ پریم سے نکلا ہوا تیتر تھوڑی دیر تک نشہ کی سی حالت میں اڑنے کے لیے پر پھڑپھڑاتا رہا اور پھر سڑک کے کنارے گھاس پر گر پڑا ۔ اوہ خدائے برتر ڈاکٹر نے نعرہ لگایا ۔ ادھر دیکھو !

سڑک کے پیچھے ہی ایک سبزیوں سے لدا ہوا ٹھیلہ آیا اور بھاگتی ہوئی بیگم زبیدہ کو کچھ کہہ کر آگے نکل گیا ۔

غضب ہو گیا ۔ ڈاکٹر چلائے ۔ ایک تیتر پریم سے اور نکلا ۔ ایک اور ۔ ایک اور بھی ۔ کوئی تعجب نہیں! اب مجھے سب معلوم ہو گیا ہے کہ کیا ہوا ہے ۔ سونے کی دوا کا اثر ختم ہو گیا ہے ۔ ابو کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا ۔

بیگم زبیدہ نے آخری پچاس گز بھاگم بھاگ بدحواسی اور ہنگامہ سے گزر کر طے کر لیے تھے ۔ روتے چلاتے

بچے اور چاروں طرف اڑتے ہوئے تیتروں کے ساتھ گاڑی پیٹرول پمپ کے سامنے لاکر انھوں نے کھڑی کر دی تھی۔ اور سخت بوکھلاہٹ میں چلا کر کہتے ہوئے کہ دیکھیے یہ کیا غضب ہوگیا۔ بے تابی سے لپک کر بچے کو اٹھالیا۔ اور پیار کرنے لگیں۔

جیسے ہی بچے کا وزن اٹھا۔ تیتروں کا ایک عظیم الشان بادل پریم ہیں سے اٹھا اور ہمارے سروں پر کا پورا آسمان بڑے بڑے بھورے بازو پھڑ پھڑاتے پرندوں سے بھر گیا۔

سونے کی گولیاں کا اثر ختم ہونا ہی تھا۔ ڈاکٹر حسین نے اداسی سے سر ہلا کر کہا۔ صبح کو ہمیشہ سونے کی پلز کا اثر ختم ہو ہی جایا کرتا ہے۔

تیتروں پر ابھی نشہ کافی تھا۔ چند سیکنڈ اڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور پھر نیچے آجاتے تھے۔ اور پھر جمع ہو کر زمین سے اڑے اور پٹرول پمپ پر بیٹھ گئے۔ کچھ ورک شاپ کی چھت پر اور آفس کی دہلیز پر بیٹھ گئے۔ جن سے اڑا نہیں جا رہا تھا۔ وہ چل کر اندر میز اور الماریوں میں گھس گئے۔ اور زیادہ نشے والے ہمارے سامنے روش پر ہی بیٹھ گئے۔ ابو بہت ہی خاموشی اور حیرت انگیز طور پر نہایت سکون سے کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ مگر بیگم زبیدہ اپنے بچہ کو لپٹائے اسے چھپا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور خود رو رہی تھیں۔ اور کہہ رہی تھیں کیسی اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں۔

بیگم صاحبہ! آپ بچہ کو لے کر گھر کے اندر چلی جائیے۔ ابو نے کہا۔ اتنی بہت سی چڑیاں دیکھ کر یہ اور بھی ڈر اور گھبرا رہا ہے۔ اور دائی اس پریم کو ورک شاپ میں لے جائے۔

سڑک پر لڑکوں اور ٹھیلوں کے علاوہ طرح طرح کی کاریں بھی آ آ کر جمع ہو رہی تھیں۔ لوگ ان میں سے اتر کر تیتروں کے اس عظیم الشان جھنڈ کو دیکھنے کے لیے اس طرف آ رہے تھے۔

ابو! ادھر دیکھیے: میں نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ وہ دیکھیے کون آ رہا ہے۔ (باقی آئندہ)

محبوب راہی

نیک ارادے

سچائی سے پیار کروں گا
اجلا کاروبار کروں گا

بن کر میں پتوار جہاں میں
سب کی نیّا پار کروں گا

رنج مٹا کے اس دنیا کے
خوشیوں کی بھرمار کروں گا

نفرت کے شعلوں پر پیہم!
چاہت کی بوچھار کروں گا!

ظالم سے ہر لمحہ نفرت
مظلوموں سے پیار کروں گا

خود غرضوں میں رہ کر راہی
میں ہر دم ایثار کروں گا

گلزاری مسجد بارسی تاکلی۔ آکولہ

آفتاب عالم

مرد کی بات

بچو اتر پردیش جسے عرف عام میں یوپی کہتے ہیں اس کے اُتر میں ایک ضلع ہے جسے گڑھوال کہتے ہیں. گڑھوال ایک طرف جہاں اپنی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی پہاڑیوں، لہلہاتے باغوں اور سیب کے پیڑوں کے لیے مشہور ہے، وہیں دوسری طرف اس علاقے نے ہمیشہ بہادروں کو جنم دیا ہے کسی زمانے میں گڑھوال میں راجا اجے پال راج کرتا تھا۔ وہ حد درجہ بہادر اور ہمتی تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے راج کے چاروں طرف کے علاقوں کو فتح کرلیا۔ کچھ گڑھوال کے راجا تو مارے ڈر کے خود اجے پال کے دربار میں آنے لگے اور بنا لڑے بھڑے اپنا راج اس کے سپرد کرنے لگے۔ جو بھی اس کی مخالفت کرتا وہ منہ کی کھاتا۔

مگر ایک شخص جو راجا اجے پال کی شہرت سے نہ تو ڈرا اور نہ اس نے اپنا علاقہ اس کے حوالے کیا۔ یہ تھا کفو چوہان اور اس کا گڑھ تھا اُپوکوٹ۔ گڑھ ٹوٹے سردار ہارے مگر نہیں ڈرا تو کفو چوہان اور نہیں لٹا تو اُپوکوٹ کا گڑھ۔

راجا اجے پال کی طاقت اور سلطنت دونوں دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ بچو، بزرگوں نے کہا ہے کہ سلطنت اور طاقت گھمنڈ و غرور پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے راجا اجے پال بھی طاقت اور سلطنت پا کر حد درجہ گھمنڈی ہوگیا۔ اس نے اپنے وزیروں کو بلا کر کہا: "کون ہے کفو چوہان اور کیسا ہے اس کا گڑھ۔ اسے دربار میں حاضر کیا جائے۔" راجا کا غرّانا تھا کہ کچھ سپاہی کفو چوہان کے یہاں بھیجے گئے انھوں نے اپوکوٹ پہنچ کر راجا سے کہا: "حضور اگر آپ اپنے جان کی حفاظت چاہتے ہیں تو مہا راجا کے دربار میں چلیے، ان کے سامنے اپنا سر جھکایئے معافی مانگیے اور اپنا راج مہا راجا کے حوالے کر دیجیے۔" ان باتوں کو سن کر کفو چوہان مسکرایا اور سپاہیوں سے کہا: "جاؤ اپنے مہاراجا سے کہہ دینا کہ کفو چوہان جانوروں میں شیر، چڑیوں میں شاہین اور انسانوں میں حد درجہ بہادر ہے وہ تم کو کچھ نہیں سمجھتا جو کرنا ہو کرلینا۔"

کفو کا جواب سن کر راجا غصے سے پاگل ہوگیا اس کا خون کھول اٹھا اس نے گرج کر کہا: "ایک چھوٹے سے سردار کی یہ ہمت، وہ مجھے للکار رہا ہے فوراً فوج تیار کرو اور اُپوکوٹ کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔" وزیروں نے سمجھایا کہ حضور تھوڑا صبر کریں ایک بار اور سفیروں کو بھیجیں ہو سکتا ہے اب اسے آپ کی طاقت کا اندازہ ہوگیا ہو اور وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔

دوبارہ سپاہی اپوکوٹ بھیجے گئے انھوں نے پھر عرض کی کہ "حضور ضد مت کیجیے، اکڑے مت رہیے، آپ جیسے بہت سے سرداروں نے مہاراجا کے سامنے اپنا سر جھکا دیا ہے آپ کی بھی خیریت اسی

شیلاز ہند اردو لائبریری جون پور۔ یوپی

میں ہے کہ مہاراجا کی اطاعت قبول کر لیجیے اور اپنا گڑھ مہاراجا کو سونپ دیجیے۔"

کفو ایک بار پھر مسکرایا اور بولا: "اپنے مہاراجا سے کہہ دینا کہ کفو مٹی کا نہیں بنا ہے اُس کی رگوں میں بہادر ماں باپ کا خون ہے اگر مہاراجا نے میرے علاقے پر غلط نگاہ ڈالی تو اُس کی راجدھانی شری نگر کو تباہ کر دیا جائے گا۔"

اب کیا تھا اجے پال نے اُپُو کوٹ پر چڑھائی کر دی کفو کی ماں نے جب قلعہ کے جھروکے سے ایک بھاری فوج کو آتے ہوئے دیکھی تو کفو سے پوچھا: "بیٹا کفو یہ کیا ہے۔" کفو تو جانتا ہی تھا بولا: "ماں یہ راجا اجے پال کی فوج ہے وہ ہمارے گڑھ پر حملہ کرنے آ رہا ہے۔" ماں تو ایک عورت تھی ڈر گئی، گھبرا کر کہنے لگی: "بیٹا تم نے بہت برا کیا راجا اجے پال سے کیوں لڑائی مول لی، معافی مانگ لیتے۔" کفو شیر کی طرح گرجا: "میں کیوں معافی مانگ لوں، میں بھی چھتری ہوں، میں اپنی شان اور بات کے لیے آخری دم تک لڑوں گا۔" اُس کی بانہیں پھڑکنے لگیں، آنکھوں میں خون اُتر آیا وہ اپنی چھوٹی سی فوج لے کر اجے پال سے ٹکر لینے کے لیے میدان میں اُتر آیا۔ خوفناک لڑائی شروع ہو گئی۔ سر اور دھڑ کٹ کٹ کر گرنے لگے، خون کا بازار گرم ہو گیا۔ کفو کی چھوٹی سی فوج نے اجے پال کی ٹڈی دل فوج پر قہر ڈھا دیا مگر ایک عظیم فوج کے سامنے مٹھی بھر نوجوان کب تک ٹکتے۔ کفو اکیلے لڑتا رہا آخر کار تھک کر اور لہولہان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ راجا اجے پال جو گھوڑے پر سوار تھا فخر سے سینہ تانے کفو کے پاس پہنچا اور نفرت و حقارت سے اس کی طرف دیکھا کفو کو اتنے میں ہوش آ گیا۔ اجے پال نے مسکراتے ہوئے کفو سے کہا: "اب بھی اگر جان کی خیر چاہتا ہے تو سر کو جھکا۔" اس حالت میں بھی کفو مسکرایا اور تن کر اجے پال کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اجے پال نے اپنے سپاہیوں کو للکارا۔ "اس بدمعاش کا سر دھڑ سے اس طرح جدا کرو کہ وہ میرے پیروں پر گر پڑے۔" سپاہیوں نے تلوار چلائی کفو کا سر دھڑ سے الگ ہو گیا مگر بچو تمھیں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ وہ سر اجے پال کے پیروں پر گرنے کے بجائے اس کے سر کی طرف اچھل گیا۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ آدمی مر تو جاتا ہے مگر اس کی بات رہ جاتی ہے۔

بچوں کے لیے نئی اور دلچسپ کتابیں

کہانیاں، معلوماتی، سوانح

کتاب	قیمت
چیپاوت کا آدم خور شیر	۱/۵۰
چھوٹا لڑکا	۱/۵۰
نیلا ہیرا	۴/۵۰
چیونٹی رانی	۱/۵۰
پھر میں چگوں کیا خاک	۱/۵۰
بی مینڈکی اور توتا	۱/۵۰
مچھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
لومڑی کا گھر	۱/۵۰
بندر اور نائی	۲/۵۰
جادو کا گھر	۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
ہتو جیتو	۱/۵۰
پانچ بونے	۱/۵۰
تاک دِنا دِن تاکے سے	۱/۵۰
مدورا نا پردیس چلے	۱/۵۰
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	۱/۵۰
پکڑو دم کٹے کو	۱/۵۰
لال مرغی	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
جن حسن عبد الرحمٰن (اول)	۲/۵۰
جن حسن عبد الرحمٰن (دوم)	۲/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (اول)	-/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (دوم)	-/۵۰
گلد بوجو ہیا اور غبارے	۱/۵۰
ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰
آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰

کتاب	قیمت
محمد شفیع الدین نیر	۷/۵۰
ہار کی تلاش	۶/۰۰
موم کا محل	۴/۰۰
اس نے کیا کرنا جانا	۱/۲۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	۱/۵۰
ایک کچوری تیل میں	۱/۵۰
چوری کی عادت	۲/۰۰
دادا نہرو	۵/۰۰
بچوں کے اقبال	۴/۵۰
دم کٹا سانپ	۱/۰۰
پہیلیاں	-/۸۰
تین اناڑی	۳/۰۰
میگھ نگر کا راجا	۱/۲۵
سندر چنار	-/۷۵
کھیل سنسار	۴/۵۰
جوہر قابل	۳/۰۰
میر انیس	۲/۰۰
چنبیلی	۱/۲۰
شہزادہ اور ٹھگ	۲/۰۰
خرگوش کی چال	۲/۵۰
چٹانوں کی کہانی	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰
خرگوش کا سپنا	۵/۰۰
شیر خاں	۱/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
بہادر	۲/۵۰

کتاب	قیمت
میاں دھینچوں کے بچے	۱/۵۰
لومڑی کے بچے	۱/۵۰
تامیل خاں	۱/۵۰
صحت کی الف بے	۳/۰۰
دھنک	۳/۰۰
گلا بوجو ہیا اور پری زاد	۲/۰۰
جلوہ غالب	۳/۰۰
وطن کے جاں نثار	۳/۰۰
سرکس	۱/۵۰

مذہبی کتابیں

کتاب	قیمت
ہمارا دین (اول)	۶/۰۰
ہمارا دین (دوم، سوم) فی حصہ	۶/۰۰
یسرنا القرآن	۲/۲۵
اسلام کیسے شروع ہوا	۴/۵۰
ہمارے رسول	۳/۰۰
ہمارے نبی	۱/۵۰
اسلامی عقائد و مسائل مذہب	۶/۰۰
قرآن پاک کیا ہے	۳/۰۰
اللہ کا گھر	۳/۰۰
عقائد اسلام	۱/۵۰
حضرت نظام الدین	۲/۰۰
چار یار	۴/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰۰
سرکار دو عالم	۳/۰۰
اسلام کیسے پھیلا (حصہ اول)	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا (حصہ دوم)	۴/۵۰
خلفاء اربعہ	۳/۷۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
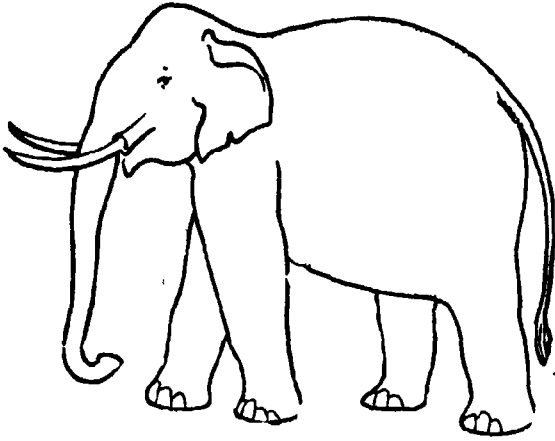
عبدالوحید منطق

حقارت کی شرمندگی

کسی گھنے جنگل میں ایک ہاتھی اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ہاتھی کو اپنے بچے سے بے انتہا پیار تھا۔ ذرا بھی اس کی نظر سے غائب ہونے پر تلاش کرلیتا تھا۔ ہاں اولاد کا پیار انسان کو ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کو بھی ہوتا ہے۔

اتفاق سے ایک روز ہاتھی اپنی غذا کی تلاش میں دور نکل گیا اور اس بچے کو کوئی اٹھالے گیا۔ کچھ دیر بعد ہاتھی آیا بچے کو نہ پاکر پریشان ہوا سارے جنگل میں پاگل کی طرح ڈھونڈتا پھرتا رہا۔ اس کے فراق میں کھانا پینا چھوڑدیا۔ اس کے دماغ پر ایسا صدمہ پڑا کہ وہ پاگل ہوگیا۔ پاگل پن سے سارے جنگل میں ایک ہلچل مچادی۔ جو بھی چیز اس کے سامنے آتی اس کو اکھاڑ پھینکتا۔ جانور ملتے انھیں پھاڑ ڈالتا تھا۔ اس طرح جنگل میں خوف وہراس کی لہریں دوڑنے لگیں۔ ہر جانور پریشان ہوگیا۔ حتیٰ کہ شیر بھی کچھ دنوں کے بعد اس ہاتھی کو ہر روز اس کی خوراک پوری کرنے کی غرض سے ایک جانور نذر کرنا ضروری ہوگیا۔ اب تو ہر ایک اپنی جان کی پناہ مانگنے لگا۔ اس ہاتھی کو ختم کرنے کی غرض سے تمام جانوروں نے شیر کی صدارت میں ایک میٹنگ کی جس میں گینڈا، بھیڑیا، چیتا، لومڑی اور دیگر بہت سارے درندے جمع ہوئے گینڈا جو کہ طاقت کا دھنی ہے کہنے لگا" اس ہاتھی کا خاتمہ کرنا اپنے بس کی بات نہیں۔ چیتا جو کہ اپنی بہادری وخوں ریزی پر ناز کرتا تھا آج بلی کی طرح سہما ہوا ہے بھیڑیا جو اپنی ظالمانہ مکاری کا اعلان کیا کرتا تھا اس ہاتھی کا خاتمہ کرنے پر تیار نہیں ہے۔ لومڑی اپنی مکاری کے لیے مشہور تھی لیکن وہ بھی بے بس تھی۔ آخر شیر جو جنگل کا بادشاہ تھا وہ بھی اپنی خونخوری نضول سمجھنے لگا۔ یہاں تک کہ جنگل کے کسی بھی جانور کی یہ ہمت نہ ہوتی کہ اس کا مقابلہ کرکے اس کا خاتمہ کیا جائے۔ ہر کوئی اس کے جبر و تشدد سے کانپنے لگا۔ اور بغیر فیصلے کے میٹنگ برخاست ہونے ہی والی تھی کہ ایک پیڑ سے ننھی سی چیونٹی نکلی کہنے لگی —

ہیچ ہے —! تمھاری زندگی —! اتنے بڑے بڑے سورما جمع ہوتے اور اس ہاتھی کا خاتمہ نہیں کرسکتے! تعجب اور افسوس صد افسوس!!"

آؤ میں اس کا خاتمہ کرسکتی ہوں سب قہقہے لگاکر ہنسنے لگے اور کہا "بی چیونٹی اپنی اوقات کیوں بھولتی ہو؟ تم اس قدر حقیر اور اس کا خاتمہ! جاؤ اپنا کام کرو تم تو اس کے ایک پھونک میں آسمان کی سیر کروگی۔ تم کہاں اور وہ کہاں —؟"

چیونٹی نے کہا تم میری باتوں کو مذاق مت سمجھو دنیا کا ہر کام طاقت سے نہیں بلکہ حکمت سے بھی ہوا کرتا ہے۔" اگر تم دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی ہار قبول کرو" سب نے مل کر کہا" اگر تم نے اس ہاتھی کا خاتمہ کردیا تو ہم ہارے تم جیتیں۔"

چیونٹی دھیرے دھیرے کھسکتے کھسکتے ہاتھی کے

(بقیہ صہ ۲۴ پر)

نیر پرسو بنت (کھڑکی پورہ) ضلع ایوت محل

نوگل بھارتی

عربستان میں محمد طاہر نام کا ایک بادشاہ بادشاہت کرتا تھا. بادشاہ بڑا ہی رنگین مزاج تھا. پھر بھی وہ مذہب پرست تھا۔

قریب کے دیہات میں فرید احمد نام کا ایک عطر فروش رہتا تھا. انواع واقسام کے خوشبودار پھولوں سے عطر تیار کرتا تھا اور وہ فروخت کر کے اپنا گھر چلاتا تھا. فرید احمد پہلے ہی سے خدا کے وجود کا منکر تھا. خدا پر اس کو بھروسا نہیں تھا. دین و دنیا سے کوئی سروکار نہیں تھا صرف آپ بھلا اپنا کام بھلا۔ یہی اس کی روزمرّہ کی زندگی تھی۔

حسب معمول وہ ایک دن عطر تیار کر رہا تھا کہ ایک بزرگ فقیر اس کے پاس آیا. فرید احمد نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی. مگر فقیر اس کی طرف ایک ٹک دیکھتا ہی رہ گیا اور اس نے دھیمی آواز میں کہا بیٹا! تیری تقدیر بہت ہی خراب دکھائی دے رہی ہے. تیرے خاطر ایک معصوم شخص کو پھانسی کے تختے پر لٹکنا پڑے گا. خدا سے دعا مانگ تیرا بھلا ہو جائے گا. خدا حافظ۔

عطر فروش نے اس کی طرف حیرت سے دیکھنے سے پہلے ہی وہ فقیر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا. اسے بڑی حیرت ہوئی. ایک دن وہ یونہی بیٹھا تھا. بادشاہ کا قاصد اس کے پاس آکر کہنے لگا. حضور نے اسی وقت دربار میں بلایا ہے. فرید احمد ڈر گیا. پھر بھی ہمّت سے کام لے کر وہ قاصد کے ساتھ چل پڑا۔

دربار میں پہنچ کر اس نے آداب بجالایا. بادشاہ نے حکم دیا: "دیکھو! ہمارے دربار میں پڑوسی بادشاہ آنے والے ہیں. ان کے خاطر خاص شاہی اجلاس ہونے والا ہے۔ اس لیے اعلا درجے عطر کی دس بوتلیں تیار کر کے لاؤ. ایک ہفتہ کی مہلت دی جا رہی ہے، ہاں عطر نہایت ہی اعلا قسم کا ہونا چاہیے. طبیعت خوش ہونی چاہیے سب کی!

یہ حکم سن کر عطر فروش خود کو خوش نصیب سمجھنے لگا۔ بادشاہ کی دی ہوئی پیشگی رقم لے کر وہ گھر پہنچا. شاہی دربار میرے عطر کی خوشبو سے مہک اٹھے گا. اس خیال سے وہ جھوم اٹھا. اس نے جوہی، موگرا چنبیلی، گلاب وغیرہ خوشبودار پھولوں کا ڈھیر لا کر عطر کی تیاری میں جٹ گیا۔

تین چار دنوں کے بعد خسر کے انتقال کی خبر اس کے کانوں تک پہنچی. اس نے بیوی سے کہا. بیوی نے رونا دھونا شروع کیا. وہ میکے میں جانے کے لیے بے قرار ہو گئی. اس کا میکہ تیس چالیس میل کے فاصلے پر تھا. سفر طویل ہونے کی بدولت بیوی کو اکیلے بھیجنے سے مجبور تھا. اس نے خود ہی بیوی کو میکے میں پہنچا کر آنا مناسب سمجھا. شاہی دربار میں عطر پہنچانے کا بھی اہتمام کرنا چاہتا تھا. لیکن ابھی چار پانچ دنوں کی مدّت ہے تب تک میں واپس آ ہی جاؤں گا۔ یہ سوچ کر بیوی کو لے کر وہ اونٹ پر منزل بہ منزل سفر طے کرنے نکلا. سارا ریگستانی ملک اور پھر کڑی دھوپ! آخر کار وہ دوسرے دن سسرال پہنچا اس کے خسر کی تجہیز وتکفین بھی ہو گئی تھی. اس رات اس نے وہاں قیام کیا۔ اور دوسرے دن سب کو صبر کی ہدایت کر کے وہ اکیلا ہی واپس لوٹنے کے لیے نکلا۔

پندرہ بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اونٹ بیٹھ گیا. طوفان کے آثار نظر آنے لگے. دیکھتے ہی دیکھتے طوفان شروع ہوا. اب تو فرید احمد گھبرایا. اس نے اونٹ کی آڑ میں خود کو چھپا لیا. چار پانچ گھنٹوں کے بعد بھی طوفان رکا نہیں. اس نے ایک چوتھائی روٹی کھائی تھوڑا سا پانی پیا اور پھر پہلے ہی کی طرح

اونٹ کی آڑ میں پڑا رہا۔ ہوتے ہوتے رات ہوئی پھر بھی طوفان رکنے کے آثار نظر نہیں آئے۔ طوفان بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اسے امید تھی کہ صبح تک طوفان رک جائے گا۔ لیکن صبح بھی طوفان اسی حالت میں رہا۔

آگے کی راہ چلنا اس کے لیے دشوار تھا۔ طوفان مسلسل چار روز تک رہا۔ غذا بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ بادشاہ کو عطر دینے کا یہ آخری دن ہونے کی وجہ سے وہ غم سے نڈھال ہوگیا۔

پانچویں دن سورج کی پہلی کرن کے ساتھ وہ بیدار ہوا۔ جسم میں جان تو نہیں تھی۔ پھر بھی اسے ایک بات کی بہت ہی خوشی ہوئی۔ کیونکہ اب طوفان ختم ہوگیا تھا اور ہر طرف اطمینان دکھائی دے رہا تھا۔

شاہی دربار میں عطر پہنچانے کا دن گزر گیا تھا۔ اب اپنی جان بچنے والی نہیں۔ اس کا اسے یقین ہوگیا۔ اس نے واپس سسرال جاکر چھپ کر رہنے ہی میں خیر سمجھی۔

ادھر شاہی دربار میں اجلاس کے وقت عطر کی زبردست کمی محسوس کی گئی۔ بادشاہ سخت ناراض ہوا ڈیڑھ دمڑی کے عطر فروش کی یہ مجال! اس نے حکم دیا کل کے کل اسے دربار میں حاضر کیا جائے؟ چاروں طرف سپاہی دوڑ پڑے۔

سپاہیوں نے فوراً اس کا پتا لگایا اور اسے گرفتار کیا۔ اس کی بیوی نے سپاہیوں کے پانوٴ پر سر رکھا۔ پھر بھی عطر فروش کو دربار میں حاضر کیا گیا۔ عطر فروش کو دیکھ کر بادشاہ بھڑک اٹھا۔ تو غدار ہے۔ اس نمک حرام کو پھانسی دی جائے۔

سزا کا نام سنتے ہی عطر فروش تھر تھر کانپ نے لگا۔ اس نے ساری حقیقت بادشاہ کو سنائی۔ وہ رو رو کر کہنے لگا۔ حضور معاف کیجیے حضور۔ ۔ ۔ ۔ بہت بڑی غلطی ہوئی۔ کچھ بھی کیجیے مگر مجھے پھانسی نہ دیجیے۔ میری بیوی بچے بھوکے مریں گے۔

عطر فروش کی حقیقت سن کر خدا پرست بادشاہ کا دل پسیجا۔ بادشاہ نے پھانسی کی سزا مسترد کر کے اسے غلام کی حیثیت سے رہنے کے لیے کہا۔ اور اس کے بیوی بچوں کے لیے وظیفہ مقرر کیا۔

عطر فروش اب شاہی دربار میں دیگر غلاموں کی طرح غلام کی حیثیت سے رہنے لگا۔ ہر کوئی کام کرنے کا مسلسل کرتے رہنے کا۔ آرام نہیں کسی طرح کی سہولت نہیں۔

شاہی محل کے ہی قریب ایک چھوٹے سے محل کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ وہاں عطر فروش کو پتھر ڈھونے کے کام پر لگا یا گیا۔ عطر فروش اس قسم کے سخت کام کا عادی نہیں تھا۔ اس وجہ سے ایک دن وہ بے ہوش ہوگیا دوسرے غلام اسے ہوش میں لے آئے۔ لیکن ہوش میں آتے ہی وہ پاگل پن کا ڈھونگ رچا کر بادشاہ کو برا بھلا کہہ کر غصّے کا اظہار کرنے لگا۔

بادشاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچتے ہی اس نے عطر فروش کو دربار میں بلایا اور اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ عطر فروش نے بڑی عاجزی کی۔ معافی مانگی لیکن بادشاہ نے غلاموں کے سردار کو حکم دیا کہ اس نمک حرام کو غلاموں کے بازار میں جاکر فروخت کر دو ایسے کمینہ آدمی کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔

بادشاہ کے حکم کے مطابق عطر فروش کو غلاموں کے بازار میں فروخت کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اتفاق سے اس دن بازار میں ایک جگہ بہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہوا۔ اور اس جگہ لوگ جمع ہونے لگے۔ دیکھتے دیکھتے بھیڑ بڑھنے لگی۔ سردار کے پوچھنے پر پتا چلا کہ ایک غلام نے یہاں کے غلاموں کے سردار کا خون کیا ہے۔ خون ہونے کی اطلاع ملتے ہی عطر فروش کے غلاموں کا سردار بھی ادھر دوڑ پڑا۔ جائے حادثہ عطر فروش سے سو اقدام کے فاصلہ پر تھا اور ٹھیک اس نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا۔ ہاتھ پانوٴ میں بیڑیاں تو نہیں تھیں۔ اعطر فروش بازار سے دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ادھر خونی غلام کو گرفتاری عمل میں آتے ہی آہستہ آہستہ سارا ماحول سرد ہوگیا۔ غلاموں کا سردار جب واپس آیا عطر فروش کو وہاں نہ دیکھ کر

وہ سہم گیا۔ اس نے ہر سو تلاش کیا۔ لیکن اتنی دیر میں عطر فروش کئی میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔
پنے ہاتھ سے ایک غلام بھاگ گیا۔ اب میری خیر نہیں یہ غلاموں کے سردار نے جان لیا۔ وہ سر جھکائے دربار میں حاضر ہوا۔ غلاموں کے سردار نے ڈرتے ڈرتے ساری حقیقت بیان کی۔ بادشاہ بھڑک اٹھا۔ اس نے فوراً پھانسی دینے کا حکم دیا۔ غلاموں کے سردار نے بہت منت سماجت کی۔ لیکن بادشاہ نے حکم واپس نہیں لیا۔ عطر فروش کی شرارت سے بادشاہ پہلے ہی سے خفا تھا۔ غلاموں کے سردار کو آخر پھانسی دی گئی۔

دن پر دن گزر گئے۔ ادھر عطر فروش سسرال سے اپنی بیوی بچوں کو لے کر دوسری جگہ رہنے لگا تھا۔ کئی دنوں کے بعد اسے پتا چلا کہ غلاموں کے سردار کو بادشاہ محمد طاہر نے کس طرح پھانسی دی۔ یہ خبر سنتے ہی فرید احمد کی آنکھوں میں آنسوں آئے۔ اسے اپنے بارے میں کی ہوئی فقیر کی پیش گوئی یاد آئی۔ وہ بے اختیار رونے لگا اور کہنے لگا میرے خاطر ایک بے گناہ شخص کو پھانسی دی گئی میرے مولا مجھے معاف کر۔ وہ آخر خدا کی ہستی کا قائل ہو ہی گیا۔ اس نے گناہوں سے توبہ کی۔ غریبوں کی مدد کرنے لگا اور یاد الٰہی میں مشغول رہنے لگا۔

بقیہ صفحہ ۲۱

قریب جاتی ہے۔ اور یہ تمام دیکھتے رہتے ہیں۔ ہاتھی کے قریب جاکر اس کی سونڈ میں گھس جاتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں اتنا بڑا ہاتھی تڑپ کر گر جاتا ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے مرجاتا ہے۔ سارے جانور خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ لیکن دل ہی دل میں بے حد شرمندہ ہوتے ہیں کیوں کہ اس قدر حقیر جانور اتنے بڑے ہاتھی کو ختم کر دیتا ہے

دیکھا بچو! اتنے بڑے جانور کو ایک معمولی چیونٹی جس میں کچھ بھی طاقت نہ ہو اس کو ختم کر سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں بھی اپنے سے کسی کو حقیر یا کمتر نہیں سمجھنا چاہیے تاکہ حقارت کی شرمندگی نصیب نہ بن جائے۔

ملازم: "کیا حکم ہے جناب؟"
ملاقاتی: تمھارے صاحب گھر ہیں۔ میں نے ایک بل . . . ."
ملازم: صاحب کل شام شہر سے باہر گئے تھے۔
ملاقاتی: مجھے بل کی ادائیگی کرنی تھی۔
ملازم: (جلدی سے) اور آج صبح واپس آ گئے ہیں میں ابھی اطلاع کرتا ہوں تشریف رکھیے۔

جدید آرٹ کی نمائش تھی ایک شخص دیر سے ایک تصویر کے سامنے کھڑا تھا آرٹسٹ کو دیکھ کر تحسین بھرے لہجے میں بولا

میرے منہ میں تو یہ تصویر دیکھ کر پانی بھر آیا ہے۔"
آرٹسٹ! "جی یہ غروب آفتاب کا منظر دیکھ کر آپ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیوں؟"
وہی شخص: خدا کی پناہ! غروب آفتاب کا منظر؟ میں تو اُسے اُبلا ہوا انڈا سمجھ رہا تھا۔

ایک چھوٹا سا بچہ چونی لے کر کھیلنے نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چونی کھو کر روتا ہوا واپس آگیا۔ اس کے ابا نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
" مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تم چونی کھو دو گے۔"
لڑکا سسکیاں لیتا ہوا بولا۔
مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ یہی کہیں گے۔"

نام:- سلیم احمد خان عمر ۱۲ سال
مشغلہ:- کرکٹ کھیلنا۔ پیامِ تعلیم ہر ماہ پڑھنا۔ دیگر معلوماتی رسالے پڑھنا۔ بہن نہ ہونے کی وجہ سے امّی کا ہاتھ بٹانا۔
پتا:- کلگاؤں تعلقہ ڈگرس ضلع ایوت محل (مہاراشٹر)

نام:- جتون عمر ۱۲ سال
مشغلہ:- پیامِ تعلیم پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا۔ ورزش کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔
پتا:- سلیکٹ فیکٹری کے سامنے۔ نیو کریم گنج (گیا)

نام:- طاہرہ یوسف عمر ۱۳ سال
مشغلہ:- دینی کتب کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ مدرسے جانا۔
پتا:- ٹھسکل تکیہ محلہ، رٹر بڑی گارڈن۔

نام:- محمد رسول شیخ عمر ۱۸ سال
مشغلہ و شوق:- اخبارات کا مطالعہ کرنا، دوستوں سے ملاقات کرنا، کالج پابندی سے جانا۔
پتا:- ابن عبدالمنان۔ گلزار پورہ مقام پوسٹ پیپل گاؤں راجہ گھام گاؤں ضلع بلڈانہ۔

نام:- ریحانہ پروین بنت محمد رفیق عمر:- ۱۱ سال
مشغلہ و شوق:- اسکول جانا۔ بڑوں کی عزت کرنا، نیک کام کرنا لطیفے سننا، نماز پڑھنا۔
مکمل پتا:- محمد رفیق قریشی شوکت علی چوک آکوٹ ضلع اکولہ ۴۴۴۱۰۱

مضامین صاف خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھیے اور اپنا پورا پتا بھی۔

اردو کا ننھا منا مقرر

بھیونڈی میں رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیر کالج کے زیر اہتمام آل مہاراشٹر سیکنڈری اسکول تقریری مقابلے میں یعقوب بیگ ہائی اسکول (پنویل) کے طالب علم زاہد عبدالوہاب ڈولارے نے دوسرا انعام حاصل کیا اور نواں انعام عمر فقیر محمد کچھی مذکورہ اسکول کے طالب علم نے حاصل کیا۔

زاہد عبدالوہاب ڈولارے

سیرت پر انگریزی مقرر

پونا کے عبدالواحد مولدینہ اردو مدارس کے سیرت النبیؐ تقریری مقابلوں کا جشن سیمیں حال ہی میں منایا گیا۔ اس جشن میں پہلی بار یہ دیکھا کہ اردو تقریری مقابلوں کے ساتھ اس سال بچوں کے درمیان سیرت پر انگریزی تقریروں کا بھی مقابلہ کرایا گیا۔ یہ ایک

محمد شاہد پیر بھائی

خوش گوار تبدیلی ہے جسے سب نے پسند کیا۔ اس موقع پر جناب اصغر پیر بھائی کے فرزند محمد شاہد پیر بھائی سینٹر اسٹریٹ (پونہ) نے جو سینٹ ونسنٹ ہائی اسکول کے تیسری جماعت کا طالب علم ہیں، نے بڑے موثر انداز میں اعتماد کے ساتھ سیرت پر انگریزی میں کامیاب تقریر کی۔ اور انعام حاصل کیا۔

نیشنل ہائی اسکول داپولی میں سائنس اور آرٹ نمائش

نیشنل ہائی اسکول داپولی ضلع رتناگیری میں اتوار مورخہ ۱۱ر مارچ ۸۴ کے روز سائنس اور آرٹ کی ایک شاندار نمائش منعقد کی گئی تھی جسے ایک ہزار سے زائد علم دوست افراد نے دیکھا اور پسند کیا۔ منڈن گڑھ (مہاراشٹر) کے تحصیلدار جناب قمرالدین کمال قاضی نے اس نمائش کا افتتاح کیا اور سراج الاسلام جونیئر کالج فروس (کھیڈ) کے پرنسپل جناب محمد عبدالغفور پرکار نے اس موقع پر منعقدہ جلسے کی صدارت فرمائی۔ جلسے میں صدر کے ہاتھوں اسکول کے مختلف بچوں کو انعامات اور توصیفی اسناد دیے گئے اور درجہ دہم کے ریحانہ عباس مجوانے کو ۸۴ - ۱۹۸۳ کی بہترین طالبہ کے اعزاز سے نوازا گیا۔

دنیا کا سب سے بڑا بلب

جاپان کی ایک فرم نے ۵۰ کلوواٹ کی طاقت کا ایک بلب تیار کیا ہے جس کی روشنی اتنی زیادہ ہے کہ چھے سو گز دور بیٹھ کر بھی اخبار پڑھا جاسکتا ہے۔ بلب بنانے والی کمپنی کا دعوا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا بلب ہے۔ اس کا محیط ۱۲ر انچ اور لمبائی ۲۶ر انچ ہے۔ اس کی طاقت عام بلبوں سے ۲۰،۷ گنی زیادہ ہے۔

مارچ ۸۴ء کا پیام تعلیم موصول ہوا۔ آپ علیل ہیں یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ہم آپ کی صحت کے لیے خدا سے دست بدعا ہیں۔ اس شمارے کے لیے اس سے زیادہ اور کیا کہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی علالت کے باوجود وقت سے نکلا۔ البتہ رحیمو چاچا (تصویری کہانی) بہت پسند آئی۔ تعویذ اچھی نظم ہے، مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ یہ نظم دوبارہ شائع ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے عملہ کے لوگوں کو از حد پسند آئی ہو۔ بہرحال ہمیں دوبارہ محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ اس کے لیے ہم مشکور ہیں۔

نثار چنگیزی
بیروا چندن پو۔ کھوریا بازار۔ ضلع گورکھپور

مارچ کے پیام تعلیم میں اپنی ترجمہ کی ہوئی کہانی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس ماہ کے پیام تعلیم کا سرورق بہت خوب صورت لگا۔ امید ہے آئندہ بھی ایسے ہی خوب صورت سرورق نکلا کریں گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ جو تصاویر سرورق پر چھپنے کے لیے جاتی تھیں انھیں اندر کے کسی صفحہ پر "بانیوں کی پھلواری" کے نام سے دیں۔ فروری کے پیام تعلیم میں مضمون "مونگ پھلی" بہت معلوماتی لگا۔ پیام تعلیم میں ادبی معما کی ترقی پر بہت زیادہ خوشی ہے۔ ایسا ہی کوئی اور جیسے رنگ بھریے یا تصویر دیکھ کر کہانی لکھیے یا کسی اچھی سی تصویر پر ایک دو لائن کی نظم لکھ کر بھیجئے (لڑکیں ساتھ میں رہے) شروع کر دیے تو انشاء اللہ پیام تعلیم کی ترقی میں اُٹھ چاند ضرور لگیں گے۔ بچوں کے ادب کی تصویر کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ قابل تعریف ہے اسے برقرار رکھیں پیام تعلیم کی ترقی کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

شگوفتہ مہر
۳۸۵ شاہ گنج الٰہ آباد۔

میں آپ کا رسالہ "پیام تعلیم"، تقریباً چھ ماہ سے پڑھ رہا ہوں مجھے یہ رسالہ بے حد پسند ہے اس رسالے میں پہلے سے کہیں اچھے مواد ہوتے ہیں۔ مجھے خاص طور سے یہ کہنا ہے کہ آپ اس میں کارٹونی کہانیوں سے شمارے کا صفحہ ضائع نہ کریں لہٰذا ہمیں آپ سے درخواست ہے کہ آپ شمارہ میں سائنسی، سماجی مضامین لکھا کریں جن سے معلومات میں اضافہ ہو۔

محمد انور
گورنمنٹ بوائز مڈل اسکول مٹیا محل دہلی ۶

نیا شمارہ "پیام تعلیم" کا بہت پسند آیا۔ اس کا ٹائیٹل ہی اتنا خوبصورت تھا کہ پورا پڑھنے کے بعد بھی دل چاہتا ہے اسے کھول کر دیکھتا رہوں کہ اس میں کیا کیا ہے۔
دو شکاری کی قسطیں اب کافی مزیدار ہوتی جا رہی ہے۔ اور بھی سبھی کہانی لائق پسند رہیں۔ نظمیں بھی کافی اچھی تھیں۔

ریحان احمد
درگا پور کٹیہار۔

مجھے آپ کا رسالہ "پیام تعلیم" بہت پسند آیا۔ خاص طور سے مجھے یہ کہانیاں بہت پسند آئیں۔ "ایک پیسے کا کرشمہ" جناب معین الدین صاحب "سچی خوشی" جناب محمد عرفان نجیف علمی صاحب "سپاہی راجا"، جناب ڈاکٹر شمشاد ادیب سہارنپوری صاحب "ایک پیسے کا کرشمہ" بہت پسند آیا ہے۔
ہمیں امید ہے کہ آپ ہر ماہ ایسی ہی کہانیاں شائع کرتے رہیں گے۔

نواب الدین
مکان ۹۸۷ گلی مدرسے والی مٹیا محل دہلی ۶

بچوں کی کوششیں

ماں کا رتبہ

پیارے بچو! آپ جانتے ہوں گے کہ ماں کا کیا رُتبہ ہوتا ہے! اگر ہم اپنی ماں کی عزّت اور خدمت کریں گے تو خدا تعالیٰ ہم کو اس کے بدلے میں اجر دے گا۔ لیکن ہمارے بہت سارے دوست ایسے ہیں کہ وہ اپنی ماں کی عزّت نہیں کرتے، جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ سچ پوچھیے تو ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ اور جنت میں ہمارا دوست وہی ہوگا جو اپنی ماں کی خدمت اور عزّت کرے گا جس کا ایک قصہ مشہور ہے۔

ایک مرتبہ کوئی شخص آنحضور صلعم کی خدمت میں پہنچا اور عرض کرنے لگا۔ "اے اللہ کے رسول کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ جنت میں میرا دوست کون ہوگا؟" آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا "یہاں سے کچھ دور کا فاصلہ طے کرو، راستے میں ایک قصائی گوشت کا ملتا نظر آئے گا جنت میں وہی شخص تمھارا دوست ہوگا۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص اس جگہ پر پہنچ گیا۔ اور سلام کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ سارا گوشت فروخت کرنے کے بعد کچھ گوشت اپنے دوست کے ساتھ لے کر گھر چلا آیا۔ اس گوشت کو پکانے کے بعد اوپر سے ایک ٹوکری اتاری، جس میں ایک ضعیف اور سفید بالوں والی بڑھیا سو رہی تھی۔ اس نے ماں کو کھلانے کے لیے اس کو اس جگہ پر لٹکا دیا پھر اپنے دوست کی خاطر تواضع کی۔ دوست نے اس سے پوچھا کہ یہ بڑھیا کون ہے؟ تو اس نے کہا یہ میری ماں ہے۔ زیادہ کمزور ہوگئی ہے جس کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ دوست نے پھر پوچھا کہ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ تو اس نے کہا کہ یہ اللہ سے دعا مانگ رہی تھی کہ میرے بیٹے کو جنت فردوس میں جگہ عطا فرما۔ آخر اس دوست کا انتقال ہوگیا۔ اس کی ماں کی دعا کامیاب ہوگئی۔

میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے عزیز طالب علم اور پیارے بچے اس پر ضرور عمل کریں گے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہم تمام کو ماں کی عزّت اور مدد کرنے کی توفیق عطا فرمائے!

ایم امتیاز شبنم
۱۰۰۳، نیو اسٹریٹ وانمباڑی

زمین کی عمر کیا ہے؟

یہ ایسا سوال ہے جس کا صحیح جواب ہم کبھی بھی نہیں دے سکتے۔ انسان نے زمین کی عمر کا پتا لگانے کے لیے برسوں صحرا نوردی کی ہے۔ اور اس کے جواب میں اس کو مختلف قسم کی داستانیں اور قصّے بھی ملے ہیں۔ اب سے چار سو سال قبل انسان اس قابل ہوا کہ اس

سوال پر سائنسی نقطۂ نظر سے غور کر سکے۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ زمین سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے۔ تب سائنس والوں نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس نے یہ کام کب سے شروع کیا۔ زمین کی عمر کا پتا لگانے کے لیے یہ کام بھی ضروری تھا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ نظام شمسی کی پیدائش کس طرح ہوئی۔ سورج اور تمام دیگر سیارے کب وجود میں آئے۔

اس سلسلے میں مختلف نظریات وجود میں آتے۔ ایک نظریہ یہ تھا کہ خلا میں سفید اور گرم گیس کا بہت بڑا ڈھیر ہے جو مستقل چھوٹے سے چھوٹا اور گرم سے گرم ہو رہا ہے جب یہ گیس کا بادل چھوٹا ہو گیا۔ تو اس نے گیس کا دائرہ بنا کر چھوڑنا شروع کیے۔ ہر ایک دائرہ گاڑھا ہو کر ایک سیارہ بن گیا۔ اور باقی تمام گیس کا ڈھیر سکڑ کر ایک مرکز پر اکٹھا ہو کر سورج بن گیا۔

ایک دوسرا نظریہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ کروڑوں سال قبل ایک بڑا ڈھیر تھا جو چھوٹے مگر ٹھوس سیاروں پر مبنی تھا اور سورج اس کے مرکز میں تھا۔ ایک بڑا ستارہ سورج کے قریب آیا اور اس کو اس نے کھینچا جس کی وجہ سے اس کا حصہ بکھر گیا۔ ان بکھرے ہوئے حصوں نے ان چھوٹے ستاروں کو اس طرح اٹھا لیا۔ جس طرح لڑھکتی ہوئی برف گرتی ہوئی برف کو اٹھا لیتی ہے اور وہ سیارے بن گئے۔

شکیل احمد
اے۔ ایم یو سٹی ہائی اسکول علی گڑھ

خدا کے بندے

ایک بھکاری جو نہ جانے کب سے بھوکا تھا؟۔ لڑکھڑاتا ہوا ہاتھ پسارے سڑک پر چل رہا تھا۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ مگر وہ مسلسل چل رہا تھا دیکھنے سے لگتا تھا کہ بس وہ چند قدم اور چل سکے گا اور پھر گر پڑے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ دیر کے لیے گرے اور کچھ لوگ اسے پھر اٹھا کر کھڑا کر دیں۔ چلنے کے لیے لڑکھڑاتے رہنے کے لیے، زندگی کا بوجھ اٹھانے کے لیے اس میں شاید اب برائے نام ہی سکت باقی رہ گئی تھی۔ مگر وہ برابر چل رہا تھا۔ زبان بھی چل رہا تھا مگر رفتار میں فرق تھا۔ وہ بھکاری ڈگمگاتا ہوا چل رہا تھا اور کسی کسی راہ گیر کو روک کر ہاتھ پھیلاتے ہوئے۔ "خدا کے نام پر" مگر ہر راہ گیر لگتا تھا کہ خدا اور بھگوان سے منکر ہے کیونکہ خدا اور بھگوان کا اتنا واسطہ دینے کے باوجود اس کی ہتھیلی خالی تھی وہ لڑکھڑاتا ہوا سڑک کو روندتا ہوا چلا جا رہا تھا ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی بھوک کا، اپنے افلاس کا اور نہ جانے کس کس چیز کا بدلہ سڑک سے لے رہا ہو۔

وہ بھکاری لڑکھڑاتے قدموں سے ایک شراب خانے کے آگے سے گزرا۔ اندر سے ایک شرابی نکل رہا تھا جو اسی کی طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ قدم بہک رہے تھے۔ دو ڈگمگاتے قدم آمنے سامنے ہوئے مگر دونوں میں کتنا بڑا فرق تھا۔ ایک بھوک سے لڑکھڑا رہا تھا۔ زندگی کے بھاری بوجھ سے لڑکھڑا رہا تھا اور دوسرا؟ ــــ وہ بھی لڑکھڑا رہا تھا شراب کے نشے سے، زندگی کے نشے سے مگر ڈگمگا رہا تھا وہ بھی، بھکاری نے شاید اس ڈگمگاتے شخص کو دیکھ کر ایک منٹ کے لیے کچھ سوچا تھا۔ اور پھر ایک ڈگمگاتے شخص نے دوسرے لڑکھڑاتے شخص کے آگے حسب عادت ہاتھ پھیلا دیا اور اپنا رٹا ہوا جملہ دہرایا "خدا کے نام پر"۔ "بھگوان کے نام پر"۔ شرابی نے ایک لمحہ کو مدہوش آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر کچھ رکھ دیا شاید بھکاری کا مطلب حل ہو گیا۔ اور بھکاری ایک ایسے شخص سے جو خدا اور بھگوان سے منحرف لگتا تھا۔ پیسا لے کر آگے چلا۔ مگر شاید یہ سکہ جو اسے شرابی نے دیا تھا اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ اس لیے وہ پھر ان ہی قدموں سے آگے

چلا۔ اب وہ انھیں قدموں سے چلتا ہوا ایک مسجد کے آگے سے گزرا۔ شاید نماز ختم ہوئی تھی۔ لوگ خدا کی خوشنودی حاصل کرکے نکل رہے تھے۔ اب وہ مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور خدا کے ماننے والوں کے سامنے خدا کے نام پر ہاتھ پھیلا دیا۔ اور۔ خدا کے ماننے والوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں نکلا جو خدا کے نام پر اسے کچھ دے جاتا۔ جب کہ وہ اسی کے نام پر مانگ رہا تھا جس کی وہ لوگ عبادت کرکے آ رہے تھے۔ وہاں سے ناامید ہوکر وہ پھر چلا کسی انجانی منزل کی طرف —— اب اس کے قدم ایک مندر کی طرف اٹھ رہے تھے اس کے کانوں میں ناقوس کی آواز آ رہی تھی۔ شاید اس نے سوچا کہ خدا اور بھگوان الگ الگ دو طاقتیں ہوں اس لیے اگر خدا کے گھر کے دروازے سے کچھ نہیں ملا تو ممکن ہے کہ بھگوان کے گھر سے کچھ مل جائے وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے مندر کی طرف چلا۔ اور آہستہ آہستہ مندر کی طرف گیا۔ مندر میں لوگ مصروف تھے۔ اس نے دیکھا کہ پتھر سے تراشے ہوئے بھگوان کے قدموں میں سونے اور چاندی کے چمکتے ہوئے سکے نچھاور ہوتے پڑے ہیں۔ ان سکوں کو دیکھ کر شاید اس نے بغاوت کی ٹھان لی تھی کیونکہ —— اس نے سوچا کہ بھگوان میں اتنی شکتی ہے کہ وہ اپنے بندے کو کچھ دلا سکے اس لیے اس نے آنکھ بچا کر بھگوان کے قدموں میں سے چند سکے اٹھا لیے اور دوسرے ہی لمحہ —— ایک شور بپا ہوا چور —— چور —— اور لوگ ایک ایسے باغی کو جس نے بھگوان سے بغاوت کر دی تھی۔ چور سمجھ کر مارنے لگے چند خدا پرستوں نے اسے پیسا دینے سے انکار کر دیا۔ اس سے معافی مانگ لی اور چند بھگوان کے ماننے والوں نے اسے چور کہہ کر ہمیشہ کے لیے بھگوان کے پاس پہنچا دیا۔ کیونکہ اس نے ان کے بھگوان کے قدموں میں سر رگڑنے کی بجائے بھگوان کے قدموں میں پڑی ہوئی دولت اپنی جھولی میں بھرنی چاہی تھی اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اسے بھگوان کے نام پر کوئی کچھ نہیں دے گا۔

بھکاری کی لاش مندر کی سیڑھیوں پر پڑی تھی، پولیس واردات کی تفتیش کر رہی تھی۔ بھکاری کے خالی پیٹ میں خدا ترس قسم کے لوگوں کی دی ہوئی بھوک ابھی تک موجود تھی۔ بھگوان کے پجاریوں کی دی ہوئی ان چوٹوں کے زخموں سے اب تک خون رس رہا تھا جنھوں نے اسے بالآخر موت کی نیند سلا دیا تھا اور اس کی مٹھی میں ایک بے دین شرابی کی دی ہوئی چونی صبح کے سورج کی پہلی کرن کی طرح چمک رہی تھی۔

حیدر علی
مکان نمبر ۱۳۸۳ حویلی اعظم خاں چتلی قبر دہلی ۶

پانی کی گواہی

ایک شخص حلوائی کی دکان پر گیا اور اپنی جیب سے ایک روپیا نکال کر حلوائی کو دیا اور بولا۔

"اے حلوائی اس ایک روپے کی تازہ اور عمدہ مٹھائی اندر سے لاکر دے! مگر یاد رکھ اگر مٹھائی اچھی نہ ہوگی تو مارے تھپڑوں کے تیرا منہ لال کر دوں گا اور اتنی جوتیاں ماروں گا کہ تیری عقل مربو ڑھی کے پھر میں آ جائے گی اور جو مٹھائی پوری نہ دے گا تو مار مار کر تیرا حلوہ نکال دوں گا۔

حلوائی نے جو اس بے لگام کا یہ کلام سنا تو بے چارے کی سٹی گم ہو گئی اور ایسا چپ ہوا کہ جیسے کوئی ٹپ چپ کی مٹھائی کھاتا ہے کچھ دیر بعد حلوائی نے جواب دیا اے بھائی تجھ کو اس آب و تاب کی مٹھائی دوں گا کہ ویسی مٹھائی چاند سورج میں بھی نہ ہوگی۔ میری بات پر ہرگز شک نہ کرنا میں نقد نہیں

ہوں جو میری بات جھوٹ ہو اور اگر تجھ کو یقین نہیں ہے تو لے یہ ایک لڈو کھا دیکھ پھر کیسا جنت کا دروازہ کھلتا ہے"۔

غرض یہ کہ حلوائی نے اس کے ہاتھ سے روپیا لے کر اپنے گلے میں رکھ لیا اور اٹھ کر کوٹھری کے اندر گیا۔ موقع غنیمت جان کر خریدار نے حلوائی کے گلے کے سارے پیسے اٹھا کر اپنے رومال میں باندھ لیے حلوائی مٹھائی لے کر باہر آیا اور اس آدمی کے حوالے کر دی۔ وہ مٹھائی لے کر فوراً وہاں سے فرار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد حلوائی کو پیسوں کی ضرورت پیش آئی اس نے گلے میں ہاتھ ڈالا تو پورے پیسے غائب تھے وہ حلوائی بے حال ہو کر کہنے لگا۔

کوئی مجھ پہ کیا غضب کر گیا
کہ جس سے میں جیتے جی مر گیا

پھر یکایک اسے خیال آیا کہ ہو نہ ہو جو شخص ابھی مٹھائی لینے آیا تھا یہ اسی کی حرکت ہے حلوائی اس کے پیچھے گیا اور اسے ایک گلی سے پکڑ کر اپنی دکان پر لے آیا اور اس سے اپنا روپیا طلب کیا خریدار نے صاف انکار کیا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ اکبر بادشاہ کے محل میں دونوں جا پہنچے۔ دونوں نے اپنی اپنی صفائی پیش کی۔

اکبر بادشاہ نے رومال خریدار سے لے کر توشک خانے میں رکھ دیا اور دونوں کو صبح سویرے (کل) حاضر ہونے کے لیے کہا۔ غرض یہ کہ اکبر بادشاہ نے ساری رات یہ گتھی سلجھانے کی کوشش کی اور پھر صبح سویرے حلوائی اور خریدار حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے نوکر کو حکم دیا کہ جلد سے جلد گرم پانی کا طشت حاضر کرو۔

اکبر بادشاہ نے پیسوں کا رومال طشت کے پانی میں ڈبو دیا تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ نے دیکھا کہ اس طشت کے پانی میں چکناہٹ تیر رہی ہے۔ اس طرح سچ اور جھوٹ کا پتا لگ گیا۔ پھر حلوائی کو اپنے پیسے مل گئے اور خریدار کو جیل میں رکھا گیا۔

محمد سلیم عبدالرحمٰن
لکشمی بائی تاوڑی چال نیو میل روڈ۔ کرلا

گیت

ہمت کے گیت سناتا چل
منزل آسان بناتا چل
جو آگ جلا دے دنیا کو
تو ایسی آگ بجھاتا چل
جس باغ میں سبزہ مرجھاتے
اس باغ میں پھول کھلاتا چل
خطروں سے بھرا ہے یہ جیون
تو امن کے نغمے گاتا چل
بے نام سہی خالد لیکن
محفل میں رنگ جماتا چل

خالد حسین
معرفت حسین برادرس نسور ۵۶۰۰۰۷

اچھے بچے

یہ چھوٹے چھوٹے بچے
یہ پیارے پیارے بچے
لگتے ہیں کتنے اچھے
اسکول جاتے بچے
محنت ہے کام ان کا
ہمت ہے نام ان کا
خوف خدا ہے ان میں
پاس وفا ہے ان میں
ہیں سب کو اچھے لگتے
یہ پیارے پیارے بچے
یہ چھوٹے چھوٹے بچے

واصف علی (درجہ نہم)
دلاور پور مونگیر

اولاد

آنٹی کی شادی کو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ قدرت نے ابھی تک ان کی گود سونی رکھی تھی۔ دوسروں کے بچوں کو دیکھ کر ان کا دل رو پڑتا تھا۔ مزاروں پہ جانا۔۔۔۔ چادر چڑھانا۔۔۔۔ منت ماننا۔۔۔ اور دعائیں مانگنا ان کا روزانہ کا معمول بن گیا تھا مگر مقدر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔

ایک دن انکل کو پتا چلا کہ شہر میں کوئی بابا آئے ہوئے ہیں۔ اور ان گنت لوگوں کو ان کے تعویذ سے فائدہ ہوا ہے۔ دوسرے روز وہ آنٹی کو لے کر بابا کے پاس گئے۔ بابا نے ان کو ایک تعویذ دیا۔ آنٹی نے کچھ روپے نکال کر بابا کو دیئے اور تعویذ لے کر گھر آ گئے۔

اس تعویذ کا اثر یا اللہ کی قدرت کہ ویران گلشن میں ایک گل کھلا۔ آنٹی اور انکل تو پھولے نہ سماتے تھے۔ آنٹی نے لڑکے کا نام آفتاب رکھا تاکہ ان کے بعد ان کا آفتاب اس زمین پر آفتاب بن کر چمکے۔ لیکن قدرت پھر قدرت ہے۔

آفتاب جب ایک سال کا ہو چکا تھا۔ تو اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انکل نے یکے بعد دیگرے کئی ڈاکٹر بدل ڈالے۔ پیسا پانی کی طرح بہا دیا۔ آنٹی آفتاب کو اپنے سینے سے لگائے خدا سے صحت کی اس کی دعا مانگ رہی تھیں لیکن آفتاب کی حالت دن بہ دن بگڑتی چلی گئی۔

انکل پھر اس بابا کے پاس گئے اور ایک تعویذ پھر لائے اور آفتاب کے بازو پر باندھ دیا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تعویذ کے باندھتے ہی آفتاب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ آنٹی آفتاب کے مردہ جسم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ریحان احمد درگاپور کٹیہار (بہار)

کہانی: ارشد جمال حشمی
تصاویر: جاوید نہال حشمی

ارے او چھوٹے میاں! کہاں جا رہے ہو بھئی؟ یہ تو بڑے اچھے موقع پر ملاقات ہوگئی — ذرا سننا تو؟

میں اسٹیشن جا رہا تھا کہ راستے میں بارش شروع ہو گئی اور میں پھنس گیا۔ بہت دیر سے حیران و پریشان کھڑا ہوں۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔ ذرا مہربانی کرکے اپنی چھتری میں مجھے اسٹیشن پہونچا دو۔
کیوں نہیں، کیوں نہیں! ضرور چلئے، آیئے میرے ساتھ۔

ارے او جناب، او بھائی، او صاحب ذرا مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیجئے۔ اس کمبخت بارش نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔
جی ہاں، ضرور، ضرور آپ بھی آ جایئے

اور چھوٹے میاں نے اخلاقاً بہت سے لوگوں کو ساتھ لے لیا۔

اور پھر ...... !!!

دفتر پیام تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 جون ۱۹۸۴ء	# پیامی ادبی معمّا نمبر 7 150 روپے کے نقد انعامات	فیس داخلہ کچھ نہیں۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

پہلا انعام : بالکل صحیح حل پر مبلغ 100 روپے۔ دوسرا انعام : ایک غلطی والے حل پر مبلغ 50 روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبروار لکھیے

1 - نوکرانیوں نے جی کھول کر سلامہ کی ـــ کی (خدمت / مرمت)
2 - جس نے ہم کو اتنی ـــ سے بچایا۔ (مصیبتوں / آفتوں)
3 - مگر خدا کی ـــ سے ناامید نہیں۔ (نعمت / رحمت)
4 - ـــ برابر بھی اس کی مرضی کے خلاف نہیں چلتے (ذرہ / بال)
5 - سب ـــ کی مخلوق ہیں (خدا / اللہ)
6 - بابا ناصح کی ملاقات زیادہ ـــ تھی یا دولت سے بھرا ہوا یہ تھیلا (روزی / قیمتی)
7 - اپنے میاں کے ساتھ ـــ کر آئیں (دوڑ / بھاگ)
8 - وہی تم کو اس ـــ میں لایا ہے (دنیا / جہان)

ادھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں صحیح جواب صفحہ 35 کی کتابوں میں ہی ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا : (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

(اپنے حل اِس پتے پر بھیجیے)

پیامی ادبی معمّا نمبر 7 ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹوکن پیامی ادبی معمّا نمبر 7

میں اڈیٹر پیام تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام ....

پتا ....

پیامی ادبی معمہ ۵ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل (۱) راستے۔ اسلام کیسے پھیلا (دوم) ص۱۴۴ سطر ۱۵ (۲) زبان ہمارے محاورے ص۶۶ سطر ۱ (۳) جا۔ سرکار کا دربار ص۳۴ سطر ۵ (۴) پھوٹ پھوٹ۔ حضرت نظام الدین اولیاء ص۲۸ سطر ۸ (۵) قطب شمالی۔ جن حسن عبدالرحمٰن (دوم) ص۱۲ سطر ۹ (۶) چند۔ اللہ کے صفی ص۵ سطر ۱ (۷) کھسیانی۔ آؤ ڈراما کریں ص۴ سطر ۱۲ (۸) تکلیف۔ تین اناڑی ص۲ سطر ۹

بالکل صحیح حل پر پہلا انعام حاصل کرنے والے ۱۲ خوش نصیب فی کس ۵ روپے تقسیم کیے گئے

(۱)۔ غزالہ۔ ۲۹۱۔ بہرام نگر۔ باندرہ ایسٹ۔ بمبئی ۵۱
(۲) برجیس قدر (۳) صابرہ شیخ (پتا وہی ہے جو غزالہ صاحبہ کا ہے)
(۴) رضیہ سلطانہ معرفت اطفال بک ڈپو ۱۴۴۔ محمد علی روڈ۔ مالیگاؤں۔
(۵) ایم ایس انصاری (۶) جی ایس انصاری (پتا وہی ہے جو رضیہ سلطانہ صاحبہ کا ہے)
(۷) زیدا احمد زبیر احمد شیخ ۱۵۷ (اے) فینٹ والا بلڈنگ۔ پاپٹ روڈ کرلا بمبئی ۷۰۔
(۸) پرویز اختر کیراف نثار چنگیزی۔ بیریا چندن پور۔ کھوریا بازار۔ گورکھپور۔
(۹) شائستہ خلیل ۱۳۵۰ پہاڑی املی۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶
(۱۰) عاصمہ خاتون (۱۱) سید عشرت فاطمہ (پتا وہی ہے جو شائستہ خلیل کا ہے)
(۱۲) خلیق احمد کمرہ ۴۳۹ اے ونگ منسٹری آف لا شاستری بھون نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ایک غلطی پر دوسرا انعام حاصل کرنے والے ۱۰ خوش نصیب فی کس چار روپے تقسیم کیے گئے

(۱) محمد انور۔ دلی ۹۴ (۲) رعنا خلیل پہاڑی املی دہلی ۶۔ (۳) م۔ ش انصاری مالیگاؤں (۴) ملک عنبر مالیگاؤں (۵) ایچ کے انصاری مالیگاؤں (۶) جلیس احسن بمبئی ۵۱ (۷) بے بی گڈی بمبئی ۵۱ (۸) عبداللہ شریف میل وشارم (۹) محمد سلیم اللہ شریف حیدرآباد (۱۰) رضیہ شبنم نالندہ بہار۔

کھیتی کو زمین
رہنے کو مکان
بیس نکات کی
یہ ہے شان
davp 83/495

کتابیں
بچوں کی دل چسپی کے دو مزیدار ڈرامے۔ یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔
قیمت: ۲/۲۵
گاندھی بابا کی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت: ۲/۰۰
اردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
قیمت
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت: ۲/۰۰
جب اور اب (آصف مجیب)
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال
باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔ قیمت
تین اناڑی عصمت چغتائی
گگو، ببلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔ قیمت ۳/=
ترجمہ: قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمٰن
الہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی لیکن اب تو اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(سیفی پریمی)
کہاوت اور کہانی
روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت: ۲/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ہیں جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰
بمبئی
مکتبہ جامعہ
جامعہ نگر۔ نئی

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd. No. D(SE)-043 May, 1984

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

بچوں کی مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
ہمارا دین (اول، دوم، سوم)	سید شہاب الدین دسنوی (فی حصہ)	۶/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول، دوم)	عبدالواحد سندھی (فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امیر البحر	〃 〃	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اول، دوم)	〃 〃 (فی حصہ)	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	〃 〃	۳/۰۰
اسلام کیسے شروع ہوا؟	〃 〃	۴/۵۰
رسولؐ پاک	〃 〃	۳/۵۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۲/۰۰
رسولؐ پاک کے اخلاق	〃 〃	۳/
اللہ کے خلیل	〃 〃	۲/۵۰
تحسین القرآن	تالیف: خدیجہ سیدہ طاہر سیف الدین	۴/۵۰
منہاج القرآن	〃 〃	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
عقائد اسلام	〃 〃	۱/۵۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
آں حضرت	〃 〃	۱/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحی فاروقی	۲/۷۵
نبیوں کے قصے	〃 〃	۲/۲۵
ہمارے رسولؐ	〃 〃	۳/۰۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۳/۰۰
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی	۱/۵۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان	۳/۰۰

ترقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

پیام تعلیم

بچوں کی دل چسپی کے دو مزیدار ڈرامے۔
یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔
قیمت: ۲/۲۵
گاندھی باباکی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت: ۴/۰۰
اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
قیمت: ۷/۵۰
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت: ۲/۰۰
جب اور اب (آصف مجیب)
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال پہلے کی ایسی باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔ قیمت: ۱/۷۵
عصمت چغتائی
بلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی
پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان
لکھا گیا ہے۔ قیمت ۳/=
ترجمہ: قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمٰن
الٰہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی، لیکن اب تو اُس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(سیفی پریمی)
کہاوت اور کہانی
روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت: ۲/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین گیسبر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰
دہلی ۶
بمبئی ۳
علی گڑھ ۱
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی ۲۵

جون ۸۴ ۱۹ء	جلد: ۲۱	شمارہ ۶

ایڈیٹر — ولی شاہجہانپوری

قیمت: ۲/۵۰ روپے سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

اپریل کے مہینے میں ڈاکٹر اطہر پرویز کے انتقال پر ماتم کناں ہوئے۔ ابھی یہ زخم ہرا ہی تھا کہ ۲۶ اپریل کو ایک اور معروف مزاحیہ ادیب خواجہ عبدالغفور صاحب کے اچانک انتقال کی خبر نے ایک اور صدمہ پہنچایا۔ خواجہ صاحب مرحوم کو پیام تعلیم سے بھی دلچسپی تھی اور آپ نے پیام تعلیم کو اپنے دلچسپ مضامین سے نوازا بھی ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم کی رحلت سے اردو ادب ایک اچھے مزاحیہ ادیب سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

جون کا شمارہ حاضر ہے اس شمارے میں بہت دنوں کے بعد احمد جمال پاشا صاحب نے ایک کہانی بھیجی ہے' امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔ سیّد محمود نقوی صاحب کئی ماہ کے بعد ایک انگریزی کہانی کا دلچسپ ترجمہ لائے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ چیزیں آپ کو پسند آئیں گی۔ نظموں میں ناوک حمزہ پوری' حافظ باتوی اور مومن خاں شوق کی نظمیں آپ کو یقیناً پسند آئیں گی۔

جاوید نہال حشمی بڑی پابندی سے کارٹونی کہانیوں کے ذریعے آپ کی دل چسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ہم آپ کی اور اپنی طرف سے حشمی صاحب کے شکرگزار ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ حشمی صاحب اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

مصوّر
شکیل اعجاز۔ مومن پورہ، اکولہ۔

پرانے زمانے میں کسی شہر میں ایک شیخ جی رہتے تھے۔ لوگ انھیں شیخو میاں کہہ کر پکارتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گرمی کا موسم تھا اور یہ کمرے کے اندر پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے کہ مکھیوں نے انھیں ستانا شروع کر دیا۔ شیخ جی غصّے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور پنکھے سے سب مکھیوں کو مار کر باہر نکال دیا۔ پھر آکر اطمینان سے لیٹ گئے۔ اتفاق سے ایک مکھی کمرے ہی میں رہ گئی تھی۔ وہ اڑ کر آئی اور ان کے گال پر بے تکلف بیٹھ گئی۔ انھوں نے اس کو اڑا دیا، لیکن پھر وہ دوسرے گال پر بیٹھ گئی۔ اب حالت یہ تھی کہ یہ ایک گال سے اڑاتے تو وہ دوسرے گال پر بیٹھ جاتی۔ شیخو میاں حیران پریشان تھے کہ اس مکھی کم بخت سے کس طرح نجات حاصل کریں۔

گالوں پر تھپڑ مارتے مارتے سارا منھ لال ہو گیا۔ بلکہ لہولہان نظر آنے لگا، مگر ذرا سا کیڑا کسی طرح قابو میں نہیں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے مکھی کو بھی ان سے ضد ہو گئی ہے۔ اور وہ بڑے ڈھیٹ پن سے انھیں ستانے میں لگی ہوئی ہے۔

شیخو میاں نے کئی بار مکھی کو پکڑنے کے لیے دونوں ہاتھ چلائے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ ان کی مٹھی میں آ پھنسی، پھر تو شیخو میاں نے اسے ایسا بند کیا کہ مکھی کسی طرح باہر نکل ہی نہیں سکتی تھی۔

شیخو میاں یوں کہنے کو تو صحت مند جوان تھے، مگر تھے بہت سیدھے سادے۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر چلچلاتی دھوپ میں سیدھے تھانے پہنچے، رپٹ لکھوائی اور تھانے دار کے سامنے پیش ہوئے، تو کہنے لگے "جناب والا! ایک فوجداری کا مقدمہ ہے۔ اس بد ذات نے میرا سارا منہ لہولہان کر دیا ہے، میں جناب سے انصاف چاہتا ہوں۔"

تھانے دار نے یہ دیکھ کر کہ واقعی گال لال ہیں اور کچھ کچھ لہو کے نشان بھی ہیں، دریافت کیا، "تمھیں کس نے مارا ہے؟ اس کا نام اور پتا بتاؤ ہم ابھی

سپاہیوں کو بھیج کر اسے پکڑواتے ہیں۔"

اس پر شیخو میاں نے اپنی مٹھی جھٹ کھول دی۔ مٹھی
کا کھلنا تھا کہ تتلی آن کی آن میں اڑ کر یہ جا وہ جا
شیخو میاں منھ دیکھتے رہ گئے۔ تھانے دار کو بہت غصہ
آیا۔ اس نے خیال کیا کہ کوئی دیوانہ ہے یا صرف شرارت
سے ہمیں تنگ کرنے کو فضول باتیں کر رہا ہے۔ اس لیے
تھانیدار نے اس زمانے کے دستور کے مطابق
انھیں شہر سے نکال دینے کا حکم دیا۔ شیخو میاں یہ سن
کر رونے پیٹنے لگے۔ آخر انھوں نے بڑی خوشامد سے
ایک بار ماں سے مل لینے کی اجازت چاہی۔ تھانیدار
نے ان کے ساتھ دو سپاہی کر دیے اور یہ ان
کے ساتھ اپنی ماں کے پاس پہنچے۔

اس وقت رات ہو چکی تھی۔ انھوں نے دیکھا
کہ ماں دروازے پر کھڑی ان کا راستہ دیکھ رہی
ہے۔ شیخو میاں نے ماں کو اپنا سارا حال سنایا
اور بولے "اماں، ذرا جلدی سے میرے لیے تھوڑے سے
تل کے لڈو بنا دو۔ راستے میں مجھے بھوک لگے گی تو
کھا لوں گا۔"

ماں بے چاری یہ سن کر بہت روئی پیٹی اور
بیٹے کی بے وقوفی پر انھیں بھی بہت کچھ برا بھلا کہا۔
پھر اٹھی اور کوٹھری میں جا کر تل اور گڑ
نکال کر لائی۔ جلدی جلدی انھیں اوکھلی میں ڈال کر
کوٹنے پیسنے لگی۔ اتفاق سے وہاں اوکھلی میں پہلے ہی
سے ایک زہریلا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا، وہ
بھی گڑ اور تلوں کے ساتھ پس گیا۔ اس نے سب
مسالے کے بیس لڈو بنائے اور ایک کپڑے میں باندھ
کر بیٹے کو دے دیے۔

صبح ہوتے ہی شیخو میاں جانے کو تیار ہو گئے
لڈوؤں کی پوٹلی بغل میں دبا کر ساتھ لی اور باہر جا کر
سپاہیوں کے ساتھ چل دیے۔ سپاہیوں نے انھیں
تھوڑی دور جا کر شہر کے دروازے کے باہر نکالا اور
خود وہ دونوں تھانے واپس چلے گئے۔

بے چارے شیخو میاں دن بھر ادھر ادھر مارے مارے
پھرتے رہے۔ رات کو ایک سرائے میں جا کر پڑ رہے
تھکے ماندے تو تھے ہی لیٹتے ہی سو گئے۔ لڈو کھانے
کا بھی دھیان نہ رہا۔

سرائے میں ان کی کوٹھری کے قریب ہی بیس ڈاکو
بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان ڈاکوؤں نے جو شیخو میاں
کی پوٹلی کو دیکھا تو رال ٹپک پڑی۔ سمجھے کوئی قیمتی چیز
سونا چاندی یا نقدی کی قسم کی ہوگی۔ ان میں سے کئی
ڈاکو چپکے سے آئے اور پوٹلی اٹھا کر لے گئے۔ پھر انھوں
نے اپنی کوٹھری میں جا کر جو وہ پوٹلی کھولی تو اس میں
لڈو دیکھے۔ بہت ہی جھنجھلائے۔ لیکن کیا کرتے! آخر
انھوں نے آپس میں کہا کہ خیر چلو جو کچھ ہے ناشتہ ہی
سہی اور سب نے ایک ایک لڈو جلدی جلدی اٹھا کر

کھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد زہر نے اپنا اثر دکھایا اور
ایک ایک کر کے سب بے ہوش ہو گئے۔ صبح کو جو
شیخو میاں سو کر اٹھے تو پوٹلی غائب تھی۔ ادھر ادھر دیکھا
آخر سامنے کوٹھری میں پڑا تو دکھائی دیا، مگر لڈو ندارد۔
قریب پہنچ کر کوٹھری کے اندر پہنچے تو وہاں اکٹھے
بیس چور بے سدھ پڑے تھے آؤ دیکھا نہ تاؤ،
جھٹ رسی لے کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

اصل میں یہ بیس ڈاکو بڑے مشہور اور خطرناک تھے. شہر کے سب افسر اور پولیس کے آدمی ان کی تلاش میں تھے. حاکم شہر کی طرف سے ڈاکوؤں کو پکڑوانے یا ان کا پتا بتانے پر بھاری انعام مقرر تھا.
شیخو میاں کو اس کی کچھ خبر نہ تھی وہ چلے جا رہے تھے کہ سڑک پر سامنے دیواروں پر اشتہار دیکھے. ان کو پڑھا کہ جو کوئی ان مشہور اور بدنام ڈاکوؤں کو پکڑلے یا پکڑوائے یا ان کا پتا بتائے گا، اس کو بڑا عہدہ اور بھاری انعام دیا جائے گا. مارے خوشی کے شیخو میاں اچھل پڑے اور سیدھے تھانے پہنچے. وہاں جا کر تھانیدار سے کہا کہ ہم نے ان اشتہاری مجرموں کو پکڑ کے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے ہیں ہمیں ابھی حاکم شہر کے پاس لے چلیے جو ہم ان کو یہ خبر سنائیں اور اپنا انعام پائیں.
تھانیدار ان کو لے کر اسی وقت حاکم شہر کے پاس گیا اور سارا حال کہہ سنایا حاکم بہت حیران ہوا اور پوچھا کہ وہ سب ڈاکو کہاں ہیں؟ شیخو میاں نے بتایا کہ فلاں جگہ سرائے میں سب بندھے پڑے ہیں.
حاکم نے تھانیدار اور کئی سپاہی شیخو میاں کے ساتھ اس سرائے کو بھیجے کہ جا کر سب ڈاکوؤں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دو. شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ اب رعایا آرام چین سے رہے ایک بہادر آدمی نے ان سب ڈاکوؤں کو پکڑ لیا ہے.
اس کے بعد شیخو میاں کو ایک بڑا عہدہ دار بنا دیا اور ان کے رہنے کے لیے ایک بڑا مکان اور بھاری انعام دیا. اب شیخو میاں کو اپنی ماں یاد آئیں اور حاکم سے کہا. حاکم نے ایک سوار بھیج کر ان کی ماں کو بلا لیا.
آخر شیخو میاں اپنی ماں کے ساتھ ایک مکھی کے طفیل بڑے آرام چین اور شان و شوکت سے رہنے لگے.

(بہ شکریہ۔ نونہال۔ کراچی)

ناوک حمزہ پوری

سپنا سچ ہوگا

سچ ہونے والا ہے سپنا
خلد نشاں ہوگا دیش اپنا
چین کا نغمہ گھر گھر ہوگا
امن کا چرچا گھر گھر ہوگا
لوگ فرشتہ خصلت ہوں گے
نیک چلن خوش سیرت ہوں گے
رہیں گے مل جل کر سب باہم
فرقہ بندی چھوڑیں گے ہم
امن و اماں سے لوگ رہیں گے
چین سے جاگیں گے سوئیں گے
رنگ و نسل کا فرق مٹے گا
ذات و اصل کا فرق مٹے گا
گھر گھر دودھ کے مٹکے ہوں گے
شہد کے چھتے لٹکے ہوں گے
کھانے کی کچھ کمی نہ ہوگی
جنتا کپڑوں کی بھی نہ ہوگی
رہنے سہنے کو گھر ہوں گے
مکاں سبھی کے سندر ہوں گے
کہو کبھی ایسا بھی ہوگا؟
یہ سپنا پورا بھی ہوگا؟

نوس اردو لائبریری حمزہ پور۔ شیر گھاٹی۔ گیا (بہار)

لالچی بوڑھا

احمد جمال پاشا

کسی زمانے میں کسی جھونپڑی میں رہنے والے دو غریب آدمی روزی کی تلاش میں ایک قصبے میں پہنچے جہاں انھوں نے محنت مزدوری کرکے تین سو روپے پس انداز کر لیے۔

انھوں نے سوچا کہ اگر وہ اتنی بڑی رقم کے ساتھ پردیس گئے تو ضرور لٹ جائیں گے۔ اس لیے کسی ایمان دار آدمی کے پاس ہمیں یہ رقم امانت کے طور پر جمع کروا دینا چاہیے۔

وہ کئی دن تک سوچتے رہے کہ کس کے پاس امانت رکھوائیں۔ آخر انھیں قصبے کے اُن بڑے میاں کا خیال آیا جن کی انگوٹھیوں میں گھنگرو بجتے تھے۔ وہ بڑے میاں کے پاس گئے اور پوچھا۔

"آپ نے اپنی انگلیوں میں اتنے گھنگرو کیوں باندھ رکھے ہیں۔؟"

بڑے میاں بولے:

"میاں! بات یہ ہے کہ ہر طرف بہت سے مچھر اور تتلیاں اُڑتی رہتی ہیں۔ میرے ہاتھ سے ان کو نقصان نہ پہنچ جائے، گھنگرو کی آواز سے وہ ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ اور میرے ہاتھ سے بچ جاتے ہیں۔"

دونوں غریب آدمیوں نے سوچا کہ بڑے میاں سے بڑھ کر کون امین ہو سکتا ہے جو اتنا خدا ترس ہے وہ ایمان دار بھی ضرور ہوگا۔ انھوں نے اپنی رقم گھنگرو والے بڑے میاں کے پاس امانتاً رکھوا دی۔

کچھ زمانے بعد جب دونوں نے پردیس سے کافی رقم کما لی اور گاؤں واپس جاکر یہودی سے کھیت چھڑا کر کھیتی باڑی کرنے اور وطن میں رہنے کا ارادہ کیا تو بڑے میاں سے اپنی رقم واپس لینے گئے۔

بڑے میاں دونوں کو دیکھ کر بہت بگڑے اور غصّہ میں گرج کر بولے:

"بے ایمانو! تم دونوں جیسے بھٹیروں کے پاس تین سو روپے کہاں سے آسکتے ہیں؟ اپنے ہوش میں ہو؟ میں نے تو اس سے پہلے کبھی تم دونوں کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔"

بڑے میاں بہت چیخے چلائے اور دھکّے دے کر دونوں غریبوں کو گھر سے نکال دیا۔ غصّہ ہوتے اور نکالتے میں ان کے دونوں ہاتھ ان کی زبان سے بھی زیادہ تیز چل رہے تھے۔ ان کی انگلیوں کے گھنگرو جھن! جھن جھن! بج رہے تھے۔

دونوں غریب آدمی جاکر سڑک کے کنارے زمین پر بیٹھ کر اپنی بے بسی پر رونے لگے۔ ادھر سے ایک چالاک مگر رحم دل عورت گزری اس نے رونے کی وجہ پوچھی۔ دونوں نے رو رو کر بڑے میاں کی بے ایمانی کا قصّہ بتایا۔ چالاک عورت نے بہت غور سے دونوں کی باتیں سُنیں۔ کچھ دیر سوچتی رہی اس کے بعد بولی۔

"تم دونوں کل بڑے میاں کے پاس صبح چھ بجے

نشاط افزا۔ سیوان

جاتا وہ تمھاری امانت واپس کر دے گا۔ لیکن آیندہ بڑے میاں کی میٹھی باتوں اور گھنگروؤں کے جال میں نہ پھنسنا۔"

دوسرے دن صبح ۱/۲ ۵ بجے چالاک عورت بڑے میاں کے پاس گئی اور بولی۔

"میرا شوہر کاروباری آدمی ہے۔ ہزاروں روپے میرے پاس چھوڑ کر کاروبار کے سلسلے میں پردیس چلا گیا ہے۔ گھر میں اکیلی ہوں۔ چور ڈاکوؤں کا بہت خطرہ ہے اس لیے براے مہربانی یہ روپیا آپ میرے شوہر کے آنے تک اپنے پاس امانتاً رکھ لیں۔"

بڑے میاں خوش ہو کر بولے۔

"بیٹیا! تم بالکل صحیح جگہ آئی ہو۔ مجھ سے بہتر اور محفوظ جگہ تمھیں کہاں ملتی۔ میرے پاس سب ہی امانت رکھوانے ہیں۔"

ابھی دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ دونوں غریب آدمی آکر اپنی رقم مانگنے لگے۔ بڑے میاں نے سوچا اگر اس آدمی کے روپے دے دوں تب بھی اس عورت کے روپے ان سے بہت زیادہ ہوں گے ورنہ وہ بھی ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس نے فوراً دونوں غریب آدمیوں کے روپے واپس کر دیے۔ دونوں خوشی خوشی چلے گئے۔ اتنے میں ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بولا۔

"ابا پردیس سے واپس آگئے۔"

یہ سن کر چالاک عورت لڑکے کے ساتھ گھر چل دی اور لالچی بوڑھا کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

حافظ باقوی

بتاؤ یہ کون ہے؟

"کرکر کرکر کٹ" کرتے ہیں شب بھر
دعوا ہے بے حد شیریں زباں ہیں
کہتے ہیں "سوئیں بے فکر بچے
ہم سنتری ہیں ہم پاسباں ہیں"
سنتے ہیں ان کی آواز بچے
پر بے خبر یہ کیا ہیں کہاں ہیں
مونچھیں ہیں لمبی ٹانگیں ہیں ٹیڑھی
اچھلے ابھی تھے جانے کہاں ہیں؟
آواز ان کی جھنکار سی ہے
چھوٹے سے کیڑے ننھی سی جاں ہیں
بچو، عزیزو! بوجھو تو جانیں
وہ کون ہیں جو یوں گلفشاں ہیں
جھٹ بولے حافظ "آہا! بتاؤں؟
جھینگر میاں ہیں جھینگر میاں ہیں"

۱۴/۵ جمیل آباد دیل دشارم - ۶۳۲۵۰۹

وہ کون تھا؟

سید محمود نقوی

بہت پہلے کی بات ہے، ایک عورت جس کا نام مارگریٹ تھا، تیمارداری اور زچہ بچہ کی دیکھ بھال میں کافی شہرت رکھتی تھی اور یہی اس کا پیشہ بھی تھا۔ دور دور سے لوگ اسے اپنے یہاں بچے کی ولادت کے وقت لے جاتے۔ ایک رات بارہ بجے جب کہ اسے سوئے ہوئے بھی کافی دیر ہوگئی تھی۔ کسی نے زور زور سے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر مسلسل دستک اور آوازوں نے اسے پریشان کر دیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا کون ہے؟

اندھیری رات تھی، بادل بھی چھائے ہوئے تھے، پھر بھی اسے اپنے پھاٹک کے قریب ایک گھوڑا کھڑا نظر آیا اور اپنے دروازے کے پاس ایک آدمی جو چابک سے دروازہ پیٹنے اور "کوئی ہے کھولو" کی آوازیں لگانے میں مصروف تھا۔

کون ہے؟ عورت کے دوبارہ زور سے پوچھنے پر وہ شخص متوجہ ہوا۔ "میری بیوی کو ابھی فوراً آپ کی مدد کی ضرورت ہے، اگر آپ جلدی سے تیار ہوجائیں تو آپ کو اچھا معاوضہ دیا جائے گا۔"

مارگریٹ نے شمع روشن کی، جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اور لالٹین لیے ہوئے نیچے اتر آئی۔ دروازہ کھول کر اس نے پہلی بار آنے والے شخص کو دیکھا تو وہ کچھ اچھا نہیں لگا، درمیانہ قد، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، کچھ عجیب بدہیئت سا۔ اس کا جی چاہا منع کر دے اس وقت اتنی رات کو وہ نہیں جاسکتی لیکن جیسے آنے والے شخص کو اس کے خیالات کا اندازہ ہوگیا۔ اس نے ایک اشرفی عورت کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "یہ پیشگی لیجیے اور گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں خود آپ کو حفاظت کے ساتھ واپس پہنچادوں گا اور کام کے لیے اچھا معاوضہ بھی مل جائے گا۔" وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے کو رضامند ہوگئی۔ اپنا دروازہ مقفل کیا اور اس شخص کے پیچھے پیچھے چل دی۔ باہر سڑک پر ایک بڑا سا مشکی گھوڑا کھڑا تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ عورت نے اس پر بیٹھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ اجنبی مرد نے اصرار کیا "میری بیوی کو آپ کی فوری مدد کی ضرورت ہے۔"

مارگریٹ نے سوچا، اگر اس کی بیوی بھی اسی کی طرح بدشکل ہوئی تو بچہ کتنا بھیانک ہوگا۔ اس تصور ہی سے اسے ایک کراہیت محسوس ہوئی لیکن کچھ کہے بغیر وہ گھوڑے کی طرف بڑھی اور مرد نے سہارا دے کر اسے سوار کرادیا اور خود اس کے آگے بیٹھتے ہوئے گھوڑے کو مہمیز کر دیا۔ گھوڑا جلد ہی ہوا سے باتیں کرنے لگا، مارگریٹ

ا۔ ے ۔ مینو برج پوری ۔ نئی دہلی۔

نے خوف زدہ ہوکر آنکھیں بند کرلیں اور اجنبی مرد
جو چمڑے کی پیٹی پہنے ہوئے تھا، اسے مضبوطی سے
پکڑ لیا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں
وہ سیاہ گھوڑا نہ جانے کتنی دیر تک دوڑنے کے
بعد آخر ایک جگہ رکا تو مارگریٹ نے اطمینان کا سانس
لیتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان
ہوا کہ وہ ایک اچھے سے مکان کے سامنے تھی اور
دو صاف ستھرے بچے وہاں کھیل رہے تھے۔ وہ
اندر داخل ہوئی تو اس نے ایک خوبصورت عورت
کو اپنا منتظر پایا۔ آتش دان پر کیتلی میں پانی ابل رہا
تھا اور بچے کے کپڑے، جھولا اور ضرورت کی ساری
دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔

کچھ وقفے کے بعد ایک بچے کی ولادت ہوئی
اور سب کچھ معمول کے مطابق رہا۔ ہاں مارگریٹ کو
نومولود بچہ کچھ زیادہ تندرست ضرور محسوس ہوا
کیونکہ جب وہ اسے نہلا دھلا رہی تھی اور ساتھ
ہی اپنی عادت کے مطابق بچے سے باتیں بھی کیے
جا رہی تھی، کتنا پیارا بچہ ہے اپنے پاپا کی طرح، تو
اسے محسوس ہوا جیسے بچے نے اسے گھورا ہو اور
اس کے چہرے پر تمانچا لگانے کی کوشش کی ہو بچے
کی ماں نے ان باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی
اس لیے مارگریٹ نے بھی نظر انداز کر دیا۔

اسی دوران جب مارگریٹ آتش دان کے
سامنے بچے کو اپنے گھٹنوں پر لٹائے ہوئے مالش
کر رہی تھی تو بچے کی ماں نے اپنے پلنگ کے نیچے
سے اٹھا کر ایک شیشی دیتے ہوئے کہا "یہ تیل بچے
کی آنکھوں پر لگا دیجیے"۔ مارگریٹ نے تعجب سے بچے
کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے شیشی لے لی جیسے وہ
کہنا چاہ رہی ہو کہ اس کی کیا ضرورت ہے آنکھوں
پر تو کسی تیل کی مالش نہیں کی جاتی۔ لیکن اس نے
یہ سوچتے ہوئے کہ ہو سکتا ہے ان کے یہاں کا دستور ہو
اور آنکھوں کے لیے یہ کوئی مفید چیز ہو، بچے کی آنکھوں
پر تیل کی مالش کر دی اور اس نئی چیز کو سمجھنے کے لیے
اس نے بچے کی ماں کی نظریں بچاتے ہوئے اپنی
ایک آنکھ پر بھی وہ تیل لگا لیا۔ لیکن تیل کے لگاتے
ہی اسے سکتہ سا ہو گیا۔ ہر چیز بدل گئی تھی، کچھ زیادہ
خوب صورت ہو گئی تھیں اور کچھ بھدی۔ صاف ستھرا
مکان، بستر پر لیٹی ہوئی عورت، ہنستے ہوئے بچے
اب کچھ بھی تو ویسا نہیں تھا۔ وہاں مکان کا وجود ہی
نہیں تھا، برگد کے درخت کی پھیلی ہوئی شاخیں اور
جڑیں تھیں۔ جنھیں اب تک وہ چارپائی، میز اور
آتش دان وغیرہ سمجھ رہی تھی۔ آگ اور شمعیں درحقیقت
کچھ چمکتے ہوئے جگنو تھے۔ "ہاں عورت اور اس کا نوزائیدہ
بچہ اب کچھ اور خوب صورت لگ رہے تھے" اور
پہلے جو دو قاعدے کے بچے کھیلنے میں معروف نظر
آ رہے تھے اب ایسا لگ رہا تھا جیسے دو انتہائی
گندے بچے ہوں اور بار بار اپنا جسم کھجا رہے ہوں"۔

مارگریٹ نے بڑی مشکل سے اپنے ہوش و حواس
برقرار رکھتے ہوئے جلدی جلدی بچے کے کام نپٹائے
اور بچے کو ماں کے برابر لٹاتے ہوئے واپسی کے
لیے تیار تھی۔ اسی طرح اس نے مارگریٹ کو اپنے
پیچھے گھوڑے پر بٹھایا اور تیز رفتاری کے ساتھ اسے
گھر واپس پہنچا دیا۔

بے چاری مارگریٹ نے گھر کے دروازے پر
پہنچ کر ٹھنڈی سانس لی اور بخیریت واپس پہنچ جانے
پر خدا کا شکر ادا کیا۔ صبح ہونے والی تھی وہ یہ سوچ کر
اپنے کاموں میں مشغول ہو گئی کہ وہ لوگ جو بھی ہوں اب
اس الجھن میں پڑنے سے کیا فائدہ، وہ ٹھیک ٹھاک
اپنے گھر واپس پہنچ گئی تھی اور اسے معاوضہ بھی امید
سے زیادہ ہی مل گیا تھا۔

معاوضے کی اس رقم سے اس نے آیندہ بازار کے
دن اپنی ضرورت کی ساری چیزیں خریدنے کا پروگرام

جب وہ ابھی بازار میں پہنچی ہی تھی کہ اسے وہی بدہیئت شخص دکھائی دیا جو اسے آدھی رات کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا وہ ایک دکان سے دوسری دکان پر پہنچتا اور تھوڑا سا مکھن یا پنیر اٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈال لیتا اور جب مکھن پنیر کافی مقدار میں اس نے جمع کر لیا تو دوسری کھانے کی چیزوں کی دکانوں پر پہنچا۔ سبزیاں، پھل آٹا گوشت وغیرہ سبھی کچھ تو اس نے اپنے جھولے میں بھر لیا۔ مارگریٹ اسے بار بار دیکھتی، کوئی تو اسے منع کرے، بغیر پوچھے ہر دکان سے اپنی مرضی کے مطابق چیزیں اٹھا لیتا ہے نہ اسے کوئی ٹوکتا ہے نہ ہاتھ پکڑتا ہے۔ اس کی نظریں بے اختیار اٹھ جاتیں۔ جی میں آتا پوچھے وہ کر کیا رہا ہے لیکن پھر نظر انداز کر دیتی۔ اسی دوران ایک دکان پر وہ بالکل اس کے قریب آگیا۔ اب بات نہ کرنا بھی بداخلاقی تھی جب کہ ابھی چند ہی دن پہلے وہ بڑی اچھی رقم اسے بطور معاوضہ دے چکا تھا۔ قریب پہنچنے پر مارگریٹ نے اسے سلام کیا اور خیریت دریافت کی آپ کی بیگم اور چھوٹا بچہ کیسے ہیں؟

"کیا؟" اس نے پلٹتے ہوئے تعجب سے سوال کیا۔ "تم مجھے آج دیکھ رہی ہو؟"

"کیوں نہیں، میں تو کافی دیر سے آپ کو دکانوں پر آتے جاتے دیکھ رہی ہوں" "اچھا ذرا یہ بتاؤ دونوں آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہو یا کسی ایک آنکھ سے؟"

مارگریٹ نے کچھ توقف سے اپنی آنکھوں کو باری باری بند کر کے دیکھتے ہوئے کہا "داہنی آنکھ سے جناب۔"

"اوہ! یقیناً وہ تیل تم نے اپنی داہنی آنکھ میں لگا لیا ہوگا۔ وہ تمہارے لیے نہیں تھا" یہ کہتے ہوتے اس نے ایک زوردار گھونسا مارگریٹ کی داہنی آنکھ پر مارا اور غائب ہوگیا۔ وہ روتے چیخنے لگی۔ لوگوں کی بھیڑ اس کے چاروں طرف جمع ہوگئی۔ لوگ حیرت زدہ تھے کیونکہ کسی نے بھی کسی شخص کو مارگریٹ کی آنکھ پر گھونسہ مارتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ درد سے بے چین ضرور تھی۔ کہتے ہیں اس دن سے اپنے آخری وقت تک مارگریٹ اپنی داہنی آنکھ سے کچھ بھی نہ دیکھ پائی۔ گھونسا مارنے والا شاید پری زاد تھا۔

دو شکاری (قسط نمبر ۱۶)

امتہ الرحمٰن محسنی

بڑی والی سفید چمک دار کار نمودار ہوئی اور پٹرول پمپ کے سامنے آکر رک گئی ۔ اسٹیرنگ وھیل کے پیچھے سے شہباز خان کا گول پھولا ہوا چہرہ تیتروں کو تک رہا تھا ۔ منہ لٹکا اور کھلا ہوا تھا ۔ مینڈکوں کی طرح آنکھیں حلقوں میں ابلی ہوئی ۔ چہرہ گلابی سے بدل کر اُودا ہو رہا تھا ۔ کشمشی رنگ کی برجیس اور نئے چمکتے ہوئے پالش شدہ بوٹ پہنے ہوئے تھے ۔ پیلا لال بُندکیوں والا ریشمی اسکارف گلے میں بندھا ہوا سر پر دھوپ ہیٹ جمی ہوئی ۔ وہ اپنے معزز عظیم شکاری مہمانوں کے استقبال کے لیے تیار ہو کر نکلے تھے. اپنی گاڑی کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر ہماری طرف اس طرح آئے جیسے کوئی بجار حملہ کرنے کے لیے دوڑتا ہے. ابّو ، ڈاکٹر حسین اور میں ایک جگہ جمے ہوئے کھڑے ان کی حرکات دیکھ رہے تھے ۔ انھوں نے گاڑی سے اترتے ہی ہم پر گرجنا برسنا شروع کر دیا تھا ۔ کافی دیر تک چیختے چلاتے رہے ۔ میرا خیال ہے کہ آپ لوگ بھی سننا چاہیں گے کہ انھوں نے کیا کہا تھا ۔ لیکن ان کا کہا دوہرانا میرے لیے قطعی ناممکن ہے ۔ جو زبان وہ استعمال کر رہے تھے وہ اس قدر نفرت انگیز اور گندی تھی کہ اس کی گرمی میرے کانوں کے سوراخوں کو جلائے ڈال رہی تھی ان کی زبان سے جو الفاظ نکل رہے تھے ۔ نہ میں نے اس سے پہلے سنے تھے اور امید کرتا ہوں کہ آیندہ بھی کبھی سننے کا اتفاق نہ ہوگا ۔

جھاگ کی پھوار ان کے منہ سے نکل کر ان کے ہونٹوں کے گرد جمع ہو رہی تھی اور ٹھوڑی پر سے گزر کر ان کے ریشمی اسکارف پر گر رہی تھی ۔ میں نے ابو کی طرف دیکھا وہ جمے ہوئے نہایت پرسکون انداز میں کھڑے ان کی چیخم دھاڑ کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے ۔ ان کے چہرے کا رنگ واپس آگیا تھا ۔ آنکھوں کے گرد ہلکی سی مسکراہٹ کی جُھرّیاں بھی ظاہر ہو رہی تھیں ۔ ان کے برابر ڈاکٹر حسین بھی بڑے اطمینان سے کھڑے تھے ۔ اور شہباز صاحب کو اس انداز سے دیکھ رہے تھے ۔ جیسے سلاد کے پتے پر کوئی کیڑا ان کو نظر آگیا ہو ۔

وہاں صرف میں تھا جو اپنے اندر سکون قطعی محسوس نہیں کر رہا تھا ۔ آخر کار ابو نے بولنے میں پہل کی کہا : یہ تیتر میرے ہیں ۔ آپ کے نہیں ہیں "۔

" اُو ! بیہودہ آدمی ! میرے منہ پر جھوٹ بکتا ہے" شہباز صاحب دہاڑے "یہاں دور دور بھی میرے سوا کسی کے یہاں تیتر نہیں ہیں ۔"

ابو نے کہا : "یہ میری زمین پر ہیں اور اڑ کر آتے ہیں ۔ جب تک یہ میری زمین پر ہیں یہ میری ملکیت ہیں" وہ نہایت سکون و اطمینان سے کہہ رہے تھے "کیوں ! نیلے چہرے والے بن مانس کیا آپ کو معلوم نہیں ۔ یہ قانون تو سب ہی جانتے ہیں۔"

مسکن ، دودھ پور ۔ علی گڑھ

ڈاکٹر حسین نے منہ ہی منہ میں کھلکھلانا شروع کر دیا۔
ادھر شہباز خاں صاحب کا چہرہ اُودے سے بدل کر سرمئی ہو گیا۔ ان کی آنکھیں اور چہرہ مارے غصے کے پھول رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پھونک مارنے کے لیے منہ میں ہوا بھرے ہوئے ہوں۔ اپنی غضب ناک نگاہیں کبھی ابو پر ڈال رہے تھے کبھی تیتروں پر جو نشے میں غنائے ہوئے پیٹرول پمپ پر جھنڈ کے جھنڈ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ "ارے ان کو ہوا کیا ہے۔ کینے تم نے کیا کر ڈالا ان کو؟" شہباز صاحب بے قابو ہو کر دہاڑے۔

اسی لمحہ قانون کا ہاتھ بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ کالی سائیکل پر سوار بڑے اطمینان سے پیڈل مارتا پیتل کے چمک دار بٹنوں سے آراستہ وردی میں ملبوس مہتاب علی کی صورت میں ہماری طرف آرہا تھا۔

یہ بات میرے لیے ہمیشہ راز ہی رہی کہ سرجنٹ مہتاب علی کسی گڑبڑ یا بے چینی کے ماحول کو کیسے سونگھ لیتے تھے۔ کسی فٹ پاتھ پر لڑکے گالم گلوج کر رہے ہوں۔ یا دو موٹریں ایک دوسرے میں جڑی کھڑی ہوں اور ان کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ آپس میں بحث کر رہے ہوں کہ یہ آپ کی لاپرواہی سے ہوا ہے۔ نہیں آپ کی ـــــ! میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ دو منٹ کے اندر وہاں قصبے کا پولس مین موجود ہوگا۔ ہم نے سرجنٹ کو آتے دیکھا۔ سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ میں تصور کرتا ہوں کہ جب کسی بھرے باتیں کرتے مجمع میں کوئی بادشاہ یا پریزیڈنٹ آتا ہوگا تو وہاں بھی ایسی ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہوگی۔ اور وہ سب خاموش ہو کر تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہوں گے۔

سرجنٹ مہتاب علی اپنی سائیکل سے اتر کر بہت وقار اور شان کے ساتھ چلتے ہوئے آس پاس بیٹھے تیتروں کے جھنڈوں پر نگاہیں ڈالتے گزر رہے تھے۔ بڑی کالی مونچھوں کے پیچھے چہرے پر نہ کوئی حیرت تھی نہ ناراضگی نہ اور کسی طرح کا جذبہ صرف وہ سکون اور بے تعلقی اس چہرے پر دیکھی جا سکتی تھی جو قانون کے چہرہ پر ہمیشہ چھائی رہتی ہے۔

پورے آدھے منٹ تک وہ اپنی آنکھیں پورے فلنگ اسٹیشن پر آہستہ آہستہ گھماتے رہے اور پھر تیتروں کی بھیڑ پر نظریں جما دیں جو ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ شہباز سمیت ہم سب بڑے سکون سے ان کے فیصلے کے اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔

"ہاں تو!" سرجنٹ مہتاب علی نے اپنا سینہ آگے کو نکال اور پھلا کر بظاہر کسی خاص آدمی سے خطاب نہ کرتے ہوئے کہا "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب طرف میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

فوراً شہباز صاحب دہاڑے "میں تم کو بتا دوں گا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ یہ سب میرے تیتر ہیں"۔ ابو کی طرف اشارہ کر کے "اس دغاباز نے ان سب کو میرے جنگل سے پھسلا کر اپنے اس غلیظ فلنگ اسٹیشن پر ہنکا لیا ہے"

"پھسلا کر لایا ہے"، سرجنٹ مہتاب نے پہلے شہباز کی طرف دیکھا اور پھر ہم سب کی طرف دیکھ کر کہا "اس شخص نے پھسلا لیا ہے۔ کیا یہ ہی بات آپ نے کہی تھی؟"

"ہاں ہاں بالکل! یہ ہی ان کو پھسلا کر ہنکا کر لایا ہے!"

"اوہ اچھا!" سرجنٹ نے اپنی سائیکل سنبھال کر ہمارے پیٹرول پمپ سے ٹکا کر کہا "یہ الزام بہت ہی دلچسپ ہے بے شک بہت دلچسپ کیونکہ ایسی بات میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی کہ کوئی چھ میل دور سے تیتروں کو میدان پار کرا کے پھسلاتا ہنکاتا ہوا لے آیا ہو۔ شہباز صاحب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے خیال میں یہ کیسے ہنکائی گئی ہیں؟"

"مجھ سے مت پوچھو!" شہباز صاحب دہاڑے "کہ اس نے یہ سب کیسے کیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ ہاں یہ سب کیا ہوا اسی کا ہے۔ اور ثبوت یہ چاروں طرف موجود ہے۔ یہ سب میری اعلا درجہ کی چڑیاں ہیں جو اس وقت اس گندے فلنگ اسٹیشن پر بیٹھی ہیں۔ جب کہ ان کو شکار کے لیے تیار میرے جنگل میں ہونا چاہیے تھا"۔ یہ الفاظ شہباز صاحب کے منہ سے ایک کھولتے لاوے کی طرح نکل رہے

تھے۔ سرجنٹ نے رک رک کر کہا: "مجھے یاد پڑتا ہے۔ شاید ٹھیک ہی یاد ہو کہ آج آپ کے یہاں بڑی شکار پارٹی کی تقریب منائی جانے والی ہے۔ کیوں شہباز صاحب کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"ارے یہ ہی تو ساری مصیبت ہے"۔ شہباز صاحب سرجنٹ کے سینے پر اپنی انگلی گھسا کر گرجے "اگر ان پرندوں کو میں جلد از جلد اور فوراً ہی اپنی زمین پر نہ لے گیا تو آج کچھ بہت ہی اہم اور معزز مہمان بے حد ناراض ہو جائیں گے۔ اور سرجنٹ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان مہمانوں میں میرا ایک مہمان تمھارا اپنا افسر ہے کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس لیے تم کو بہت تیزی سے اس بارے میں کارروائی کرنی چاہیے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی یہ سرجنٹی کی وردی ہی کھو بیٹھو"۔

سرجنٹ مہتاب علی اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ لوگ ان کے سینے میں انگلیاں چبھوئیں اور شہباز خاں کا اس وقت کا یہ انداز تو انھیں سخت ناگوار گزر رہا تھا وہ ضبط سے کام لے رہے تھے اور اپنی اس ناگواری کو ظاہر ہونے سے روکنے کے لیے اپنا اوپر کا ہونٹ انھوں نے اندر کو دبا رکھا تھا۔ ان کی مونچھیں اس دباؤ سے ایسی کھڑی ہو گئی تھیں جیسے سیہی کے کانٹے۔ (باقی آئندہ)

کیا آپ جانتے ہیں؟

کس نے اور کب ایجاد کیا۔

۱	فاؤنٹن پن	واٹرمین	۱۸۸۴ء
۲	گراموفون	برلینر	۱۸۸۷ء
۳	ہیلی کاپٹر	سیکورسکی	۱۹۳۹ء
۴	ہوائی جہاز	ڈبلو۔ لو۔ رائٹر	۱۹۰۳ء
۵	بیلون	مونٹ گولفر برادر	۱۷۸۳ء
۶	بیرومیٹر	ٹوری کیلی	۱۶۴۳ء
۷	الکٹرک لیمپ	اڈیسن	۱۸۷۹ء
۸	ڈائنامیٹ	الفرڈ نوبل	۱۸۶۶ء
۹	پیراشوٹ	ایف بلانکارڈ	۱۷۸۵ء
۱۰	نائیلون	کاروتھرس	۱۹۳۰ء
۱۱	پرنٹنگ پریس	گٹن برگ	۱۴۵۰ء
۱۲	راڈار	ٹیلر اوینگ	۱۹۲۲ء
۱۳	ریڈیو	جی۔ مارکونی	۱۸۹۵ء
۱۴	ٹیلی فون	گراہم بل	۱۸۷۶ء
۱۵	ٹیلی ویژن	جون بیرڈ	۱۹۲۲ء
۱۶	ریلوے لائن۔ ریلوے انجن (۲۹ میل فی گھنٹہ)	جیمس واٹ	۱۸۲۰ء

ریحان احمد
معرفت پروفیسر ایچ رحمان۔ درگا پور۔ کٹیہار۔ بہار

شفیق عابد (زاہدی)

محنت کا پھل

محمود ایک غریب کاشت کار کا لڑکا تھا۔ اس کے باپ حامد کے پاس صرف چند بیگھے زمین تھی۔ پچھلے سال اُن کا واحد بیل بھی مرگیا۔ جو ساجھے میں چلتا تھا۔ وبا ہی ایسی تھی۔ کتنے ہی لوگوں کے جانور مرنے۔ ان کے جانور تو پھر خریدے بھی جا چکے۔ پیسے والوں نے پیسے کے زور پر اور کچھ لوگ جن کو قرض مل سکتا تھا قرض لے کر۔

حامد بے چارے سے کچھ بھی نہ بن پڑا۔ اُن کے گھر میں نہ پیسہ، نہ قرض ملنے کی اُمید۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ بیل کے بعد وہ بھینس بھی مرگئی جس کے دودھ دہی اور گھی سے روزی روٹی چلتی تھی۔ یہ بھاری نقصان تھا جس نے حامد کی کمر ہی توڑ دی۔ کھیت پھر نہ بوئے جا سکے۔ بٹائی سے کتنا غلّہ آتا۔ نقدی آمدنی کا ذریعہ بھینس تھی وہ بھی نہ رہی۔ بیٹوں پر ایک بیٹا محمود تھا۔ وہ تو خیریت کہیے، اس وقت ہاتھ پاؤں چل رہا تھا اس لیے اُنھوں نے چاروں لڑکیوں کو بیاہ دیا تھا۔ لڑکیاں اپنی اپنی سسرال سے آتی جاتی رہتی تھیں۔

حامد اس وقت سخت پریشان تھے۔ ہاتھ خالی۔ کچھ کھیت رہن، کچھ بٹائی پر۔ خرچ اگرچہ بہت کم تھا۔ پھر بھی آدمی کے ساتھ روٹی کپڑے کے علاوہ دوسری ہزاروں ہی ضرورتیں ہوا کرتی ہیں۔

محمود ابھی چودھویں پندرھویں سال میں درجہ آٹھ کا طالب علم تھا۔ اُس کے دو سال غربت کی وجہ سے برباد ہوگئے تھے۔ بیٹھنے کی دبا آئی۔ ماں باپ دونوں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بہنوں نے چاہا کہ بھائی کو سمیٹ لیں۔ لیکن غیرت مند محمود نے انکار کر دیا۔

حامد کے ایک دوست کلیم میاں بڑے نیک پڑوسی تھے۔ محمود نے اپنے سب کھیت اور رہن کے کاغذات ان کے حوالے کر دیے اور اُن سے کچھ اُدھار لے کر قریبی شہر کلکتے چلا گیا۔ کلیم میاں نے روکا بھی اور کہا کہ تم یہیں پڑھو۔ جیسے سب بچے ویسے تم۔ لیکن محمود نے اس بات کو گوارا نہ کیا۔

کلکتے میں اُس کا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ ایک کے سوا۔ جو محمود ہی کے گاؤں کا تھا اور سیالدہ میں ایک ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ آدمی نیک اور خدا ترس تھا۔ محمود کو دیکھ کر خوش ہوا۔ اُس کی بپتا سُن کر اُس کو ترس آگیا۔ اُس نے محمود کو اسی ہوٹل میں نوکر رکھا دیا۔

محمود دن بھر محنت اور ایمان داری سے اپنی ڈیوٹی بجا لاتا اور رات کو بارہ بجے تک پڑھتا لکھتا رہتا۔ کھانے ناشتے کا آرام تھا۔ ہوٹل کے مالک نے لڑکے کو محنتی اور ایمان دار پا کر کپڑے کا بھی انتظام کر دیا اور خود اپنے ساتھ لے جا کر کوچنگ کلاس میں اُس کا نام لکھا کر سفارش کر دی۔ فیس اور کتاب کاپی کے سارے اخراجات اپنے ذمّے لیے اور اُس کی تنخواہ جمع کرتا رہا۔ کچھ پیسے جیب خرچ کے لیے اپنے پاس سے دے دیتا۔

محمود کو پڑھنے لکھنے اور اپنے گھر کی پریشان حالی کا اتنا خیال تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی کے بعد کا زیادہ وقت پڑھنے ہی لکھنے میں صرف کرتا۔ نماز کا بے حد پابند تھا۔ اپنے کام سے اس کو پیار تھا۔ وہ مالک کو خوش رکھنے کے لیے دکھاوے

دفتر روزنامہ انقلاب۔ بمبئی

کا کام نہیں کرتا تھا بلکہ اپنے گھر کا کام سمجھ کر بڑی ایمان داری اور مستعدی سے کیا کرتا تھا۔ بارہ بجے رات تک پڑھتا لکھتا، پھر صبح سویرے اُٹھ کر نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر اپنا کام سنبھال لیتا۔

ہوٹل کے مالک حاجی صاحب غور سے محمود کی کار گزاری اور چال چلن کو دیکھتے رہے۔ اُس کے تعلیمی شوق کو بھی دیکھا۔ اب اُنھوں نے اُسے کاؤنٹر پر بٹھانا شروع کیا۔ دو چار ماہ حساب کتاب کا جائزہ لے کر اُنھوں نے اچھی طرح پرکھ لیا۔ اُن کو بڑی خوشی تھی کہ اُن کو ایک کام کا لڑکا مل گیا۔

البتہ کلیم میاں کبھی کبھار محمود کو دیکھنے آجاتے۔ حاجی صاحب اُن کو کپڑا لتا، سفر خرچ اور گھر یلو مصارف کے لیے روپیے دے دیتے۔

محمود نے اچھے نمبروں سے میٹرک کر لیا تو خود حاجی صاحب نے زور دے کر کالج میں اُس کا نام لکھوا دیا۔

اندھے کو دو آنکھیں ملیں۔ اب محمود ہر کام میں اور بھی چوکس ہو گیا۔ اب وہ ہوٹل کے سارے انتظامات بھی سنبھالنے لگا اور کالج کا ناغہ بھی نہ کرتا۔

اللہ کی رحمت کہ اُس کی نگرانی میں ہوٹل نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی۔ ہر اعتبار سے یہ ہوٹل ایک معیاری ہوٹل بن گیا اور تین چار سال میں اس ہوٹل کی دو اور مزید شاخیں قائم ہو گئیں اور بمبئی کے اے گریڈ ہوٹلوں کی طرح سیالدہ کا ہوٹل نہ صرف ہوٹل رہا بلکہ ایک اچھا اسٹور بن گیا۔ کلکتے میں اس ایجاد کا سہرا محمود کے سر رہا۔ اور یہ بڑا کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔ اُس نے اس ہوٹل میں زنانہ کیبن بھی بنوا دیے۔ اس لیے مہذب لوگوں کی آمد و رفت بڑھی۔ اُسی اعتبار سے لذیذ، معیاری ہر طرح کے کھانوں، چائے، کافی اور ٹھنڈے مشروبات کا شان دار صاف ستھرا انتظام رکھا گیا۔ لہٰذا اس ہوٹل کا نام بکنے لگا۔

اب بے شمار مزدوروں کی دیکھ ریکھ بھی محمود ہی کے سر آئی۔ محمود اپنے گانو کے اُس آدمی کے احسان کو بھولا نہ تھا جس نے رحم کھا کر محمود کو اس ہوٹل میں رکھوایا تھا۔ محمود نے اُس کو سپروائزر کی حیثیت دلوا دی تھی۔ اس لیے وہ بھی حاجی صاحب کا اور محمود کا سچا بہی خواہ تھا۔

محمود نے آہستہ آہستہ ایم۔ اے کر لیا۔ لیکن وہ حاجی جی کا اتنا احسان مند اور شکر گزار تھا کہ اپنے طور پر وہ اپنے مستقبل کے لیے نہ کچھ سوچتا تھا اور نہ کسی لالچ میں پڑ کر کوئی دوسری ملازمت کی تلاش میں تھا۔

یہ کام حاجی صاحب کا دماغ کر رہا تھا۔

ایک روز محمود کو حاجی صاحب نے اپنے گھر پر بُلایا۔ کلیم میاں بھی آئے ہوئے تھے۔

حاجی صاحب نے کہلایا۔

"محمود! کلیم میاں کو لے کر گھر پر آؤ!"

دونوں حاجی صاحب کے فلیٹ پر پہنچے۔

حاجی صاحب نے بڑی عزّت سے محمود اور کلیم میاں کو بٹھایا۔ اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔

عبدالشکور (محمود کے گانو کے آدمی) کو بھی بلوایا۔ اور تب وہ کھلے۔

"بیٹے محمود! اگر کلیم میاں اور شکور میاں کی بھی رائے ہو تو میری ایک تجویز ہے۔ یا اگر تم سمجھو تو کہوں۔"

محمود نے کہا "آپ ... دینے کا حق ہے۔ آپ حکم دیں، میں اُس کی تعمیل سعادت سمجھوں گا۔ آپ نے میری تعلیم و تربیت میں وہ کچھ کیا جو میرے مجبور ماں باپ نہ کر سکتے تھے۔ میرا رواں رواں تا زندگی آپ کا احسان مند اور غلام رہے گا۔"

حاجی صاحب "ایسا نہ کہو۔ یہ سب خدا کی رحمت ہے۔ میں تو میاں عبدالشکور کا احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے تم جیسے نیک، شریف اور خوش اخلاق محنتی لڑکے کو مجھ تک پہنچایا۔

خیر! یہ باتیں تو بعد کو ہوتی رہیں گی۔ اِس وقت مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ تعلیم ایک بڑا جوہر ہے اور تم کو اِن کے

حاصل کرنے کا شوق بھی ہے۔ میری بھی خواہش تھی کہ میرا کوئی لڑکا ہوتا اور میں اُس کو اعلا تعلیم و تربیت دلوا کر اپنے دل کا حوصلہ نکالتا۔ لیکن اللہ کی مرضی۔ ایک ہی لڑکا تھا اور کالج جاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا۔ میں نے صبر کیا اور اپنے رحیم و کریم معبود کا کبھی شکوہ نہ کیا اور یہی کہہ کر اپنے دل کو ڈھارس دی کہ اللہ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

بہ ہر حال چوں کہ تم نے نہایت ایمان داری سے کام کیا اور وہ کر دکھایا جو ایک سعادت مند بیٹا ہی کر سکتا تھا۔ اس لیے تم پر اور وقتاً فوقتاً تمھارے گھر کی امداد پر جو رقم میں نے دی وہ میرا انعام تھا۔ تمھاری تنخواہ پائی پائی بینک میں جمع ہے جو ایک لمبی رقم ہے۔ میرا حوصلہ بھی پورا ہوا اور تمھارا کام بھی بنے۔ میں نے انتظام کر دیا ہے۔ تم کلیم میاں اور عبدالشکور میاں کے ساتھ پندرہ دن کے لیے گھر جاؤ اور سب سے رخصت ہو کر پندرھویں دن چلے آؤ۔ تم کو بغرض تعلیم لندن جانا ہے تین سال کی بات ہے۔ تمھارے آنے تک ہم اور عبدالشکور یہاں کا کام سنبھال لیں گے۔

یاد رکھو! تم کو واپس آکر اور بھی اونچے پیمانے پر تجارت ہی کو سنبھالنا ہے۔ تمھاری تعلیم کی غرض ملازمت نہ ہوگی بلکہ روشن خیالی، تجربہ، بزنس اصول اور حوصلہ مندی ہوگی۔ اور ملک و ملت اور اپنے پیارے دین کی خدمت کے لیے تم کو جو دین اور دین داری سے لگاؤ ہے اس میں اور زیادہ غلبہ ہونا چاہیے۔ اُمید ہے کہ تم اپنے دین اور کردار کی لاج رکھو گے اور تم آؤ گے تو میرے لیے ایک چمک دار ہیرا بن کر آؤ گے۔"

سب گم صم بیٹھے تھے۔ محمود کے خواب و خیال میں بھی لندن کی بات نہ آئی تھی۔ وہ چھچھورا نہ تھا۔ اُس نے اس خوش خبری پر کسی ہلکے پن کا مظاہرہ نہ کیا کہا تو صرف اتنا کہا۔

"میرا مقصود زندگی تو صرف آپ کے حکم کی تعمیل ہے لیکن ایک ہی خیال میرا دامن کھینچتا ہے کہ اس وقت اللہ کے فضل سے کام اتنا کچھ بڑھ چکا ہے کہ اس عمر میں آپ کو آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب کچھ سنبھال لیں گے۔ مگر میں اپنے دل کو کیا کہہ کر سنبھالوں۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ عبدالشکور بھائی ہیں نا" پہلی بار حاجی صاحب نے عبدالشکور کو بھائی کہہ کر اُن کی عزت بڑھا دی۔ عبدالشکور بھائی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے یہ بھی محمود کی ایمان داری اور نیکی کا کرشمہ تھا۔ "ہم اور وہ مل کر ہر طرح تمھاری اسکیم کے مطابق دیکھ ریکھ کر لیں گے۔ تم اللہ کا نام لے کر سب کی دعاؤں کی چھاؤں میں سدھارو۔ گھر جانے کے لیے میں نے تمھارے اور عبدالشکور میاں کے واسطے سب انتظامات کر دیے ہیں۔"

یہ محمود کی نیکی، محنت اور ایمان داری کا صلہ تھا جو اُس کی کم عمری ہی کے زمانے میں مل گیا اور اللہ کے حکم سے محمود کے پڑوسی عبدالشکور میاں نے کلکتے میں اسے بھٹکنے اور بہکنے نہ دیا۔ اور حاجی جی کی خدا ترسی نے اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ورنہ غریب محمود تو خواب میں بھی لندن کو نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ اس ترقی کا خیال ہی اپنے دل و دماغ میں لا سکتا تھا۔

محمود گھر جا کر پندرھویں دن سب سے رخصت ہو کر کلیم اور عبدالشکور میاں کے ساتھ کلکتے واپس آیا اور ہنسی خوشی لندن سدھار گیا۔ اب عبدالشکور میاں کے دن بھی پھر چکے تھے۔

کلیم میاں جب گھر آنے لگے تو حاجی صاحب نے اُن سے کہا۔ "آپ جائیے چند دنوں میں میاں عبدالشکور جائیں گے اپنا اور محمود کا مکان تعمیر کرا دیں گے۔"

یہی ہوا کچھ دنوں میں ان دونوں آدمیوں کا مکان گانو میں سب سے اچھا خصوصاً محمود کا مکان بڑا شان دار تھا۔

دو سال کے بعد ایک بار خود حاجی صاحب محمود کے گھر آئے اور پندرہ بیس بیگھے زمین خرید کر دے گئے

اور پانچ بیگھے شکور میاں کے لیے۔ شکور میاں کو دل سے اعتراف تھا کہ اُن کے دن محمود کی بدولت پھرے۔

محمود اپنی تعلیم مکمل کر کے قانون کی ڈگری لے کر اور تجارت کی اعلا تعلیم حاصل کر کے ہندستان واپس آیا تو حاجی صاحب نے سب کچھ اس کے حوالے کر دیا اور اُس نے تجارت کو نئے اصولوں کے تحت ایک ہی دو سال میں بہت پھیلا دیا۔ اور نہایت بلندی پر پہنچا دیا۔

چوں کہ وہ ایک پڑھا لکھا قانون داں اور تجارتی گُروں سے واقف، ہیلی سٹی اور اشتہار بازی کا ماہر بن کر آیا تھا اس لیے بہت جلد اس نے ترقی کے راستے ڈھونڈ نکالے۔

حاجی صاحب کے پاس روپے کی کمی نہ تھی اور محمود کے پاس دماغ تھا۔ دونوں نے اپنا اپنا اثر دکھایا۔

علم ہر میدان میں اپنا گھوڑا دوڑا دیتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا آدمی جنگل میں بھی منگل منا سکتا ہے۔ پہلے بھی گھر یلو ہُنر تھے۔ دست کاریاں تھیں لیکن وہ گھروں اور خاندان سے آگے نہ بڑھیں اور نہ وہ خوش حالی لا سکیں جو آج صنعت کی بدولت حاصل ہیں۔ یہ علم اور سائنس کی برکت ہے۔

حاجی صاحب کے یہاں ایک لڑکی کے علاوہ اور کوئی اولاد نہ تھی۔ اولادیں تو ہوئیں بہت سی لیکن اس آخری بچی کے سوا اور کوئی زندہ نہ رہی۔ لڑکی نے بھی بی اے کر لیا تھا۔ یہ محمود سے پانچ سات برس چھوٹی تھی۔ شکور میاں کے ذریعے محمود کی بہنوں کے پاس پیغام گیا۔ اس سے بڑی مُراد اور کیا ہو سکتی تھی۔ کلیم میاں آئے۔ حاجی صاحب سے کہا کہ محمود تو آپ ہی کا ہے آپ اپنی سب کچھ ہیں جو بہتر ہو کیجیے۔

حاجی صاحب نے شکریہ ادا کیا اور ایک ساعت سعید میں یہ تقریب سادگی سے انجام پاگئی۔ بغیر نمائش کے دور تعلیمی ادارے، یتیم خانوں اور دوسری رفاہی انجمنوں میں بہت کچھ دیا گیا۔ محمود کی بھی یہی خواہش تھی اور حاجی صاحب بھی یہی چاہتے تھے۔

آج محمود اور حاجی صاحب کا نام سب کی زبانوں پر ہے۔

محنت، ایمان داری اور علم زندہ باد!

ترانہ

مومن خان شوق

نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں
اُجالوں سے نکھری ہوئی محفلیں ہیں
نہ رُکنا، قدم اور آگے بڑھانا
ترقی کی راہوں پہ دیپک جلانا

نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں
اجالوں سے نکھری ہوئی محفلیں ہیں

فلک کے ستارے زمیں پر بچھاؤ
چلو اپنی دھرتی پہ چاندی اگاؤ

نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں
اُجالوں سے نکھری ہوئی محفلیں ہیں

چلو اس طرف کو جدھر روشنی ہے
بہاروں سے مہکی ہوئی زندگی ہے

نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں
اُجالوں سے نکھری ہوئی محفلیں ہیں

مقدّر سویرے سے اپنا سنوارو
کھلا پرچم جشن جمہور بارو

نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں / اجالوں سے نکھری ہوئی محفلیں ہیں

شاداں پرویز

شمسی توانائی

بچو! آپ نے آتشی شیشے کا کھیل تو دیکھا ہی ہوگا۔ ہاں یہ آتشی شیشہ وہی ہوتا ہے جس کو سورج کے سامنے رکھتے ہیں اس میں سے دھوپ گزر کر ایک خاص نقطے پر آ کر اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اگر ہم وہاں کوئی کاغذ رکھ دیں تو وہ کاغذ جل جائے گا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ کاغذ کیوں جلا؟ آتشی شیشے کے سامنے کاغذ کے جلنے کی وجہ یہ ہے کہ شیشے سے سورج کی کرنیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں اور جمع ہونے سے ان میں اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کاغذ کے اس حصے کو جلا دیتی ہیں جس پر وہ پڑتی ہیں۔ اب آپ لوگ بھی آتشی شیشے سے کاغذ کو جلا کر دیکھیے مگر دیکھیے اس بات کا خیال رکھیے کہ کہیں آپ آتشی شیشے کو اپنے بدن کے کسی حصے کے سامنے رکھ کر نہ دیکھیے ورنہ وہ بھی جلنے لگے گا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سورج کی روشنی میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔

ہاں تو اسی طاقت کو ہم استعمال میں لائیں تو اس سے مختلف کام لیے جا سکتے ہیں۔ آج جو بھی کام مٹی کا تیل، پٹرول، کوئلہ، لکڑی اور بجلی سے لیے جاتے ہیں یہ سارے کام سورج کی توانائی سے لیے جا سکتے ہیں اور بچو! آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اب ہماری زمین کے اندر بہت تھوڑا پٹرول، مٹی کا تیل اور کوئلہ رہ گیا ہے اور پٹرول زیادہ سے زیادہ پچیس تیس سال تک ہمارا ساتھ دے سکتا ہے۔ اس وجہ سے اب ہمیں کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جس سے کہ بغیر پٹرول کے ہمارے جہاز اُڑ سکیں راکٹ اُڑ سکیں، بغیر بجلی کے ہمارے گھر میں سارے بلب روشن رہیں۔ گرمیوں کے موسم میں کمروں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کولر چلیں، فرج چلیں، ہمارا تمام کھانا بغیر بجلی یا کوئلے اور لکڑی کے پکے اور بغیر پٹرول یا ڈیزل کے ہماری کاریں چلیں جو نہ دھواں دیں اور نہ آواز، بغیر کسی ایندھن کے ہماری بسیں اور ریل گاڑیاں چلیں۔ ابھی تو یہ باتیں آپ کو بالکل پرستان کی معلوم ہو رہی ہوں گی مگر بہت جلد ہی یہ دن آنے والا ہے۔ کیونکہ آج کل ہمارے سائنس داں اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہم سے پہلے ہماری ضروریات معلوم کر لیتے ہیں۔ اس وجہ سے جو کام بجلی اور پٹرول سے لیے جا رہے ہیں وہ سب سورج کی توانائی سے لیے جائیں گے۔

ویسے یہ بات نہیں ہے کہ ہم سورج کی توانائی سے کوئی کام نہیں لے رہے ہیں۔ سورج کی توانائی کا استعمال تو زمین پر اس دن سے ہو رہا ہے جس دن سے اس پر زندگی شروع ہوئی ہے۔ ہم اپنی بہت سی چیزیں دھوپ میں رکھ کر سکھاتے ہیں۔ ہم لکڑی سکھا کر اُسے جلانے کے قابل بناتے ہیں۔ ہمارے کسان اناج کو دھوپ میں سکھا کر اُسے گوداموں میں رکھتے ہیں۔ ہم ہری مرچوں کو سکھا کر انھیں لال کر لیتے ہیں اور وہ بہت دنوں تک محفوظ رکھی جا سکتی ہیں۔ مگر یہ طریقہ بہت پرانا ہے۔ اب تو سورج کی توانائی سے چلنے والی ایک ایسی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو دو تین دن میں مرچیں سکھاتی ہے۔ زیادہ دن دھوپ میں رکھنے سے بہت سی مرچیں سڑ گل بھی جاتی تھیں اور ان پر گندگی بھی جم جاتی تھی۔ اس مشین

میں نہ کوئلہ خرچ ہوتا ہے اور نہ بجلی بس سورج کی روشنی سے سارا کام ہوتا ہے۔

پہلے جغرافیہ کے استاد پڑھاتے تھے کہ جب بادل پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں تو بارش ہوتی ہے مگر یہ بات بالکل غلط ہے بارش ہونے میں بھی سورج ہماری مدد کرتا ہے۔ سورج کی گرمی سے سمندر کی اوپری سطح کا پانی بھاپ بن کر اُڑتا ہے اور بادلوں کی شکل لے لیتا ہے۔ پھر جب یہ بادل ٹھنڈے ہوتے ہیں تو پانی کی بوندوں میں بدل جاتے ہیں اور بارش ہوتی ہے۔ بارش ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ ہماری کھیتی کو بڑا فائدہ پہنچاتی ہے۔

جرمنی کے ایک سائنس داں نے تو ایک ایسا ریڈیو بھی بنایا تھا جو کہ سورج کی گرمی سے چلتا ہے۔ اس میں بیٹری یا بجلی کا تار لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ یہ بجلی سے کام نہیں کرتا۔ اس کو تو سورج کی دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ریڈیو کو چلانے کے لیے بس ایک کام کرنا پڑتا ہے وہ یہ کہ اس ریڈیو کے پچھلے حصّے کو کھول کر دھوپ میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں ایک ایسی چھوٹی سی مشین لگی ہوتی ہے جو کہ سورج کی گرمی اکٹھا کر کے اپنا کام کرتی ہے۔ یہ مشین بہت چھوٹی ہوتی ہے بالکل سگریٹ کی ڈبیہ کے برابر۔

سورج کی توانائی سے ٹیلی فون بھی لگائے گئے ہیں اور اُس سے ٹیلی وژن بھی چلایا گیا ہے۔ اب دھیرے دھیرے سورج کی توانائی کا استعمال عام ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ایک سائنس داں نے سورج کی توانائی سے چلنے والا ایک انجن ایجاد کیا تھا اور کھیتوں میں پانی دینے کا ایک پمپ بھی ایجاد ہو چکا ہے۔ اس پمپ کی مدد سے پانی زمین کے اندر سے کھینچا جا سکتا تھا۔ مگر اس کا استعمال عام اس وجہ سے نہیں ہوا کیونکہ اس طرح پانی کھینچے جانے پر خرچ بہت آتا تھا۔ ویسے اس سے پہلے ہی یہ پمپ مصر میں ایجاد ہو چکا تھا۔ مصریوں نے اس پمپ کو دریائے نیل کے کنارے لگا رکھا تھا۔ اس سے دریائے نیل کا پانی کھینچ کر دور دور کھیتوں میں بھیجتے تھے۔ اس کے بعد امریکہ نے بھی اس میں دلچسپی لی اور انھوں نے بھی ایک ایسا پمپ اب سے ستّر سال پہلے بنایا۔

سائنس دانوں نے سورج کی توانائی سے چلنے والی کار بھی ایجاد کی ہے۔ یہ کار نہ دُھواں دیتی ہے اور نہ آواز دیتی ہے دُھواں یہ اس وجہ سے نہیں دیتی کیونکہ اس میں نہ پٹرول خرچ ہوتا ہے اور نہ ڈیزل۔ پٹرول سے چلنے والی کاروں سے جو دھواں خارج ہوتا ہے وہ کاربن کہلاتا ہے۔ یہ ہماری فضا کو گندا کرتا اور صحت کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ سورج کی توانائی سے جو کار چلتی ہے اس میں آٹھ بیٹریاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ بیٹریاں کار کی چھت پر لگا دی جاتی ہیں تاکہ سورج کی دھوپ اُن پر سیدھے طور پر پڑے۔ یہ بیٹریاں سورج کی روشنی میں چارج ہوتی رہتی ہیں مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کاریں رات کو نہیں چلتی ہیں۔ یہ بیٹریاں جو اس کار میں لگتی ہیں شمسی بیٹریاں کہلاتی ہیں۔ یہ بیٹریاں سورج کی روشنی سے اتنی طاقت کھینچ لیتی ہیں جس سے وہ کار اُس وقت بھی چلتی ہے جب دھوپ نہیں ہوتی اور ہم رات کو بھی کار چلا سکتے ہیں۔

سورج کی توانائی سے جاڑوں میں گھروں کو گرم کرنے کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔ مگر اس کے لیے خاص طرح کے گھر بنانے چاہئیں۔ یہ گھر پانی کے تالاب میں تیرتے ہیں اور اُن کی چھت پر ایک شیشہ لگا رہتا ہے جو کہ سورج کی طرف رہتا ہے۔ گھر کی چھت اپنے اندر حرارت کو جذب کرتی رہتی ہے اور اس سے گھر گرم رہتا ہے۔ اس میں نہ بجلی خرچ ہوئی اور نہ ایندھن خرچ ہوا۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ سورج کی توانائی بالکل مفت ہی پڑے گی۔ نہیں بچو اس کا حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ جس طرح پٹرول زمین میں ہوتا ہے۔ اُس کے دریا بہتے ہیں لیکن زمین سے اس کو نکالنا آسان نہیں ہے۔ اس پر خرچ بھی بہت آتا ہے۔ مزدور اُسے نکالتے ہیں اور پھر اُسے دور دور پہنچایا جاتا ہے۔ یہی سورج کی توانائی کا بھی معاملہ ہے۔ دیکھنے میں تو مُفت کی لگتی ہے لیکن اسے استعمال کرنے کے لیے جو بھٹیاں بنائی جائیں گی ان پر بڑا خرچ آئے گا۔ ہمارے سائنس دانوں کو یہ بات بہت پہلے سے معلوم تھی کہ سورج کی توانائی سے کتنے کام لیے جا سکتے ہیں

نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ اس وقت دوسرے ایندھن بہت سستے تھے لیکن اب یہ بہت مہنگے ہو گئے ہیں اس وجہ سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر اس پر ایک بار روپیا خرچ کر دیا گیا تو پھر یہ ہمیں بہت سستی پڑے گی۔

اب ہم کو اندازہ ہو رہا ہے کہ سورج کی توانائی کا زمانہ بہت جلد آنے والا ہے اور ہم روز بروز اس کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ روز پتا چلتا ہے کہ سورج کی توانائی سے چلنے والی کوئی اور نئی چیز ایجاد ہو گئی۔ اس سے ٹیلی فون لگائے گئے ہیں، ٹیلی وژن چلائے گئے ہیں، کولر اور ایر کنڈیشنر چلائے گئے ہیں، چولھے اور کاریں بنی ہیں۔ ہوائی جہاز اور راکٹ اڑائے گئے ہیں، ریل گاڑیاں چلائی گئی ہیں۔ مگر ابھی تک یہ چیزیں عام نہیں ہوئی ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بہت جلد ہی سورج کی توانائی عام ہو جائے گی اور دنیا کے بہت سے ملک اس کو استعمال کرنے لگیں گے۔

سورج کی توانائی سے ہمیں بہت سی آسانیاں ہوں گی اور دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ آئیے ہم اور آپ بھی اس دور کے استقبال کی تیاریاں کریں۔

کرنل یوری مالیشف

راکیش شرما

گینادی شریکالوف

عالیہ آصف

کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ شہر کے لحاظ سے آبادی بھی زیادہ ہے، لیکن آبادی کے لحاظ سے بسوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی لیے اگر ایک بس میں چالیس افراد کی گنجائش ہو وہاں ساٹھ ستر افراد بھرے ہوتے ہیں۔

آج بھی جب میں نے نرسری جانے کے لیے بس پکڑی تو بس پوری بھری ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ کھچا کھچ بھری ہوئی بس میں بے حد گرمی تھی۔ جب بس چلی تو ہوا آنی شروع ہوئی اور حالت بہتر ہوتے ہی میں نے مسافروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میرے سامنے والی سیٹ پر چار طالبات کالج کی یونیفارم پہنے، ہاتھ میں کتابیں پکڑے بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ ان کے دائیں طرف دروازے کے بعد والی سیٹ پر ایک برقع پوش خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک خاتون اپنے دو بچوں کے ساتھ تشریف فرما تھیں۔ ان کے ساتھ ایک معصوم بچی جس کی عمر یہی کوئی آٹھ نو سال ہوگی بیٹھی ہوئی تھی۔

اسی اثنا میں بس دوسرے اسٹاپ پر پہنچ کر رک گئی۔ اس اسٹاپ پر چڑھنے والوں میں ایک معمّر اور ضعیف خاتون سوار ہوئیں۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ بس کا ڈنڈا بھی تھام نہیں سکتی تھیں۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ ہو سکتا ہے کوئی با اخلاق شخص ان معمّر خاتون کے لیے اپنی سیٹ چھوڑ دے۔

میں نے ان طالبات کی جانب دیکھا۔ ماشاءاللہ اچھی صحت مند تھیں۔ اگر وہ چاہتیں تو وہ اپنی سیٹ خالی کر کے انھیں دے سکتی تھیں، لیکن انھوں نے معمّر خاتون کو نظر انداز کر دیا بلکہ سیٹ پر اور پھیل کر بیٹھ گئیں کہ مبادا ان خاتون کے بیٹھنے سے اُن کی یونیفارم کی استری نہ خراب ہو جائے۔

بس میں بیٹھی ہوئی تمام خواتین مسافر تن درست و توانا تھیں، مگر ان میں سے کسی کو بھی اتنی زحمت گوارا نہ ہوئی کہ وہ اٹھ کر اپنے اخلاقی فرض کو پورا کریں۔ مجھے دلی رنج ہوا کہ آج ہم لوگ اپنے پیارے رسولؐ کی پاک سیرت کو اور آپؐ کے نقشِ قدم کو صرف پڑھنے کی حد تک جانتے ہیں۔ حضورؐ نے ہمیں جو سبق دیا ہے وہ ہم نے یاد تو کر لیا ہے، لیکن اس پر عمل کرنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔

میں نے ایک خاتون سے کہا کہ وہ تھوڑی سی سمٹ جائیں اور ان کم زور خاتون کو اپنے ساتھ بٹھا لیں، لیکن انھوں نے جگہ کی کمی کا عذر کر کے معذرت کرلی۔ وہ خاتون اپنی ساتھ والی خاتون سے مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ وہ آج کل کی نوجوان نسل اور بچوں کی شکایت کر رہی تھیں۔ ان کے خیال میں آج کل کے بچوں میں

احساسِ ذمّے داری بالکل موجود نہیں ہے۔ ان کی یہ بات سُن کر میں نے دل میں سوچا، کیا یہ ان کی اخلاقی ذمّے داری نہیں ہے کہ وہ مُعمّر خاتون کو بیٹھنے کا موقع دیں۔ کیا یہ ان کی فرض سے کوتاہی نہیں، لیکن انھیں اپنی ذمّے داری کا کوئی احساس نہیں تھا۔ انھوں نے ایک نظر ضعیف خاتون کی طرف دیکھا اور پھر باتوں میں معروف ہو گئیں۔

ان سے مایوس ہو کر میری نظر برقع پوش خاتون کی جانب اُٹھی۔ انھوں نے بھی معمّر خاتون پر صرف ایک نظر ڈالنا کافی خیال کیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔ میں نے اُن خاتون کی طرف دیکھا جو برقع پوش خاتون کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ وہ نگاہیں چُرا کر اپنی بچّی کی فراک ٹھیک کرنے لگیں۔ آخر تھک ہار کر میں نے ایک خاتون سے درخواست کی کہ مہربانی کرکے وہ اپنی سیٹ ان معمّر خاتون کے لیے چھوڑ دیں۔ ان کا ٹکا سا جواب مجھے یوں ملا، "واہ جی! ہم کیوں چھوڑیں اپنی سیٹ؟ ہم نے بھی تو ٹکٹ کے پیسے خرچ کیے ہیں۔" میں نے ناامید ہوکر اپنی کوشش ترک کر دی۔

اتنے میں مجھے ایک معصوم مترنم آواز سنائی دی، "باجی، آپ امّاں جی کو میری سیٹ پر بیٹھا دیں۔" میں نے مُڑ کر دیکھا۔ یہ وہی معصوم بچّی تھی جو عمر میں تو کم تھی، لیکن اخلاق میں سب سے بلند تھی اور بس میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کے مقابلے میں اچھی انسان تھی۔ (بہ شکریہ نونہال کراچی)
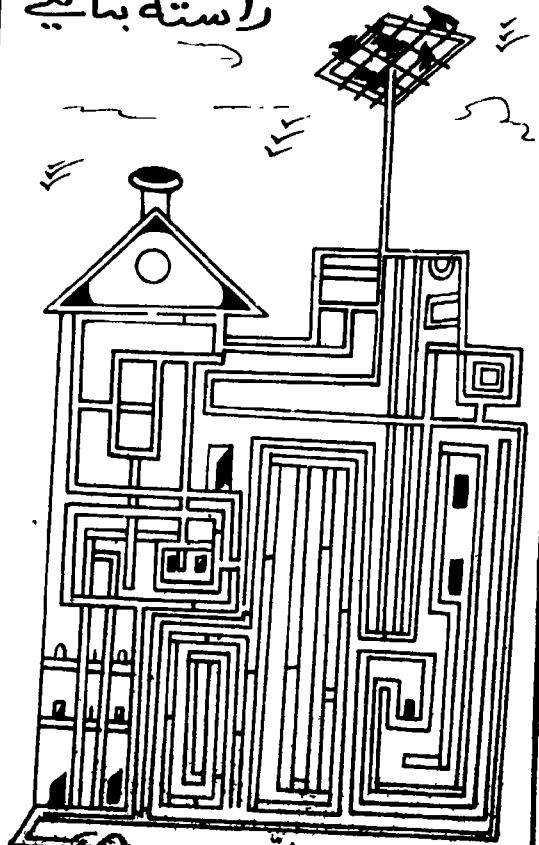
راستہ بتائیے

بچو! یہ پرندہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہے آپ ان کو راستہ بتا کر ان کی مدد کیجیے

رحمان حمیدی

چوری کا انعام

قمرالدین بہت ہی نیک، رحمدل اور عقل مند درزی تھا۔ وہ صبح سے شام تک محنت کرتا اور اپنا اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا۔ آدمی سیدھا سادہ تھا۔ اس لیے اس کی آمدنی بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ بس اتنی آمدنی تھی کہ کسی طرح گزر ہو جاتی تھی۔ اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہ اپنے گاہکوں کا بہت خیال رکھتا تھا کپڑے سی کر وقت پر دے دیتا تھا۔ اس کے سبھی گاہک اس سے بہت خوش تھے۔ وہ بہت رحم دل تھا۔ کبھی کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیتا۔ کبھی کسی غریب کے لیے کپڑے بنوا دیتا۔ کبھی کسی طالب علم کے لیے کتابیں خرید دیتا۔ قمرالدین اس حال میں خوش تھا۔ خدا نے اسے صرف ایک اولاد دی تھی۔ اس کے بیٹے کا نام محمد علی تھا۔ وہ چوتھے کلاس کا طالب علم تھا۔

ایک دن وہ اپنی دکان کھولنے کے لیے آرہا تھا کہ اس کی نگاہ ایک لڑکے پر پڑی۔ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھا رو رہا تھا۔ پوچھ تاچھ پر پتا چلا کہ وہ لاوارث ہے۔ اس کے ماں باپ بھکاری تھے۔ فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ گہری برف باری ہوئی۔ انھیں ٹھنڈ لگ گئی۔ ٹھنڈ کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ قمرالدین نے بچے کو بہت پیار کیا۔ اس کی عمر تقریباً سات آٹھ برس ہو گی۔ وہ بچے کو اپنے ساتھ لے آیا اور دکان پر درزی کا کام سکھلانے لگا۔ قمرالدین نے اس کا نام رستم علی رکھا۔ رستم علی آہستہ آہستہ کاج بٹن کا کام سیکھنے لگا۔ رستم علی اور محمد علی کے درمیان بہت جلد گہری دوستی ہو گئی۔ دونوں ایک ساتھ کھیلتے کودتے اور ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے۔ دونوں صبح سویرے اٹھتے، منہ ہاتھ دھوتے ناشتہ کرتے اور اپنے اپنے کام میں لگ جاتے۔ رستم علی دکان پر آجاتا اور محمد علی اسکول چلا جاتا۔

چند برسوں کے بعد ——!

قمرالدین بیمار پڑ گیا۔ اسے جاڑا اور بخار آگیا۔ قمرالدین کے پاس جو روپے تھے وہ علاج پر خرچ ہو گئے۔ ڈاکٹر نے قمرالدین کو دو ماہ آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے پاس زیادہ رقم نہ تھی اس لیے وہ پریشان پریشان رہنے لگا۔ اسے پریشان دیکھ کر رستم بھی اور محمد علی دونوں پریشان ہو جاتے، دونوں کے چہرے پر اداسی آجاتی دونوں اکثر کھوئے کھوئے رہتے۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ محمد علی کے اسکول میں چوریاں ہونے لگیں۔ ہر روز کلاس سے لڑکوں کی کتابیں چوری ہونے لگیں۔ ماسٹروں نے چور کو پکڑنے کی بہت کوشش کی لیکن چور نہیں پکڑا جا سکا۔ چوری روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی اس لیے ہیڈ ماسٹر نے سبھی لڑکوں کو جمع کر کے اعلان کیا کہ جو طالب علم کتاب، کاپی اور قلم چوری کرنے والے کو پکڑ کر لائے گا اسے سو روپے انعام کے طور پر دیے جائیں گے۔

نہرو میموریل کالج۔ گوموہ (بہار)

یہ بات محمد علی نے رستم علی کو بتائی اور دونوں نے مشورہ کیا کہ ایک چور بن جائے اور دوسرا اسے پکڑ کر ہیڈ ماسٹر کے پاس لے جائے اور انعام حاصل کرے تاکہ قمرالدین کی کچھ خدمت کی جا سکے۔ دونوں نے فیصلہ تو کر لیا لیکن اس بات پر لڑائی ہونے لگی کہ کون چور بنے۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ وہ چور بنے۔ دونوں میں بہت دیر تک بحث ہوئی۔ رستم علی بہت زیادہ اصرار کر رہا تھا۔ اس نے سمجھایا۔

"محمد علی" تم ان کی اولاد ہو، تم اگر چور بنے تو انھیں اور زیادہ تکلیف ہوگی۔ میں ان کا لے پالک ہوں، میرے چور بننے اور جیل جانے کا انھیں غم کم ہوگا۔

محمد علی مجبور ہو گیا۔ وہ رستم کو لے کر ہیڈ ماسٹر کے پاس گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے رستم کو چور سمجھ کر پکڑ لیا۔ سبھی اساتذہ رستم کو نفرت سے دیکھنے لگے۔ ہیڈ ماسٹر نے پولیس کو بلایا اور رستم کو ان کے حوالے کر دیا اور محمد علی کو انعام کی رقم دینے کا حکم دے دیا۔ لیکن ہیڈ ماسٹر نے دیکھا کہ محمد علی خوش ہونے کے بجائے رنجیدہ اور پریشان ہے۔ اس کا چہرہ کمھلایا ہوا ہے۔ ہیڈ ماسٹر کو شک ہو گیا۔ محمد علی دفتر سے انعام کی رقم لے کر چلا تو ہیڈ ماسٹر صاحب بھی پیچھے پیچھے چلے۔ محمد علی نے گھر پہنچ کر اپنے باپ کے ہاتھ میں روپے دیے تو وہ چونک پڑا۔ ابھی وہ پوچھنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ قمرالدین باہر آیا۔ اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو دیکھ کر ادب سے سلام کیا اور بڑے احترام سے بٹھایا۔ محمد علی نے دونوں کے سامنے انعام حاصل کرنے کی ترکیب بتائی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب پوری بات سن کر بہت اداس ہوئے۔ وہ اسی وقت تھانے گئے اور رستم علی کو چھڑا کر لے آئے اور یہ قصّہ دوسرے ٹیچروں کو بھی سنایا۔ سبھی کو رستم علی اور محمد علی کے ساتھ ہمدردی ہو گئی۔ اسکول کے اساتذہ نے چندہ جمع کیا اور قمرالدین کی امداد کی۔ اس امداد سے قمرالدین نے اپنا علاج کرایا اور صحت مند ہو گیا۔

علی نے اپنے دوست ولی کو بتایا "دوست! میں آج کل جو خواب دیکھتا ہوں، وہ سچ ہو جاتا ہے۔"

"اچھا وہ کیسے؟"

"ابھی کل ہی کی بات ہے۔ درجہ میں مجھ کو نیند آ گئی نیند میں، میں نے خواب دیکھا کہ ماسٹر صاحب مجھے مار رہے ہیں ..... اور جب نیند کھلی تو دیکھا ماسٹر صاحب مجھ کو سچ مچ مار رہے تھے۔ •

ایک طیارہ آسمان پر بہت بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا تبھی پائلٹ نے بہت زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ مسافروں نے وجہ دریافت کی تو کہنے لگا، "مجھے اچانک یہ خیال آ گیا کہ جب پاگل خانے کے مالک کو یہ پتا چلے گا کہ میں وہاں سے بھاگ آیا ہوں تو ان کی کیا حالت ہوگی!" •

حامد اپنے چھوٹے بھائی کو گنتی پڑھا رہا تھا جیسے وہ بولتا ویسے ہی بچہ بولنے لگتا۔ تب حامد نے کہا کہ "اچھا اب میں پوچھوں گا تو تم بتانا! نائن ..... یعنی" "نائن کی بیوی!" چھوٹے نے جواب دیا۔ • شگفتہ ہنر

باپ (بیٹے سے) کئی مرتبہ منع کیا ہے کہ کتے کے کان مت کھینچو۔ اب اگر تم نے کتے کے کان کھینچے تو میں تمھارے کان کھینچوں گا۔

بیٹا: (معصومیت سے) ابو اگر میں نے اس کی دم کھینچی تب آپ کیا کریں گے۔ • (شاہد رفیق)

ایک شخص جو اکثر "ت" کو "ٹ" بولتا تھا۔ اس کی اس حرکت کو دیکھ کر اس کی بیوی اس کے گھر آتے ہی رونا شروع کر دیتی۔

ایک دن وہ اپنی بیوی کو ڈاکٹر کے پاس علاج کرانے کی غرض سے لے گیا اور ڈاکٹر سے کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب میں جب گھر آٹا ہوں تو یہ "روٹی" ہے۔ •

نعیم (کریم سے): میرے والد صاحب نے بڑے بڑے امیروں کے گلے کاٹ ڈالے۔ لیکن آج تک پولیس نے ان کو نہیں پکڑا۔

کریم: لیکن تیرے والد ایسا کون سا کام کرتے ہیں کیا وہ جج ہیں۔

نعیم: نہیں، وہ ٹیلر ہیں۔ •

ایک صاحب ہوٹل میں ناشتہ کرنے کے بعد چمچہ دھونے لگتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر بیرہ کہتا ہے۔ "صاحب یہ کام آپ کا نہیں ہے ہمارا ہے۔"

صاحب بولے: "میں اپنی جیب خراب نہیں کرنا چاہتا۔" •

ایک شخص (ہوٹل کے نوکر سے) پانی کا گلاس لاؤ۔

نوکر: پانی کا گلاس نہیں ہے۔ اگر کہو تو کانچ کا گلاس لے کر آتا ہوں۔ • (رحمت اللہ خاں)

استاد (شاگرد سے) تمھارے دیر سے آنے کا کیا سبب ہے۔

شاگرد۔ میں بہت تیزی سے بھاگ کر آ رہا ہوں اس لیے کوئی بہانہ سوچ نہ سکا۔ • (زہرہ شاہد)

مالک (ملازم سے) تمھاری تنخواہ سو روپے ہے اور تم نے ایک سو بیس روپے کے برتن توڑ کر رکھ دیے ہیں۔

ملازم: بہتر ہوگا کہ میری تنخواہ ایک سو پچاس روپے کر دیجیے اس طرح آپ کا نقصان پورا ہو جائے گا۔ اور مجھے کچھ تنخواہ بھی مل جائے گی۔ • (ردمانہ متین)

پیام ملا، پڑھ کر خوشی ہوئی۔ مجھے یہ کہانیاں بہت پسند آئیں
"عقل بڑی کہ بھینس"، "ایک تھا توتا" حقارت کی شرمندگی۔
محمد انور۔ ترکمان گیٹ دہلی ۶

آج جیسے ہی میں نے پیام تعلیم کا نیا رسالہ اپنے ہاتھ
میں لیا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ لیکن جب بچوں
سے باتیں" کا کالم پڑھا تو مجھے دکھ کے علاوہ اور کچھ نہ
مل پایا۔
خدا جناب ڈاکٹر اطہر پرویز مرحوم کو جنت الفردوس
میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین! ثم آمین۔
میں پیام تعلیم، آپ کا رسالہ کافی عرصے سے پڑھ
رہا ہوں۔ ویسے میں کچھ ماہ پہلے تک پیام تعلیم کا خریدار تھا۔
لیکن امتحان سر پر آنے کی وجہ سے مجھے پیام تعلیم کی خریداری
نمبر ختم کروانا پڑا (ختم کر دیا) ویسے میں نے داخلہ اورینٹل
کالج پٹنہ میں لے لیا ہے۔ سبزی باغ پٹنہ سے میں اکثر
ہر ماہ کا پیام تعلیم لے لیا کرتا ہوں۔
لیکن اب میں بہت جلد ہی پیام تعلیم کا خریدار
بننے جا رہا ہوں۔
بچوں کی کوششیں میں ایس ڈی ہاشمی کی کہانی اور
جاوید نہال کی کارٹونی کہانی بے حد پسند آئی۔
جناب محمد عرفان صاحب کی کہانی بھی خوشی بھی بے حد
پسند آئی۔
سید شمس العارفین رضوی

پیام تعلیم دستیاب ہوا۔ خاص طور سے دو مضمون
بہت پسند آئے۔ ایک پیسے کا کرشمہ، سپاہی راجا۔ انشاءاللہ
میں آپ کے دو تین خریدار بنانے کی کوشش کروں گا۔
اعجاز احمد راہی برہانپور

اپریل ۸۴ کا شمارہ باصرہ نواز ہوا ایک ہی نشست میں
پورا پڑھ گیا۔ پرچہ خوب تھا۔ مضامین اچھے تھے مزاج
شاہ کا موم کا گڈا چلنے لگا "معرکے کی چیز ہے"، دشمن کا
علاج نصیحت آمیز چیز ہے "پیسے کا کرشمہ" الف لیلہ سے
ماخوذ ہے پھر بھی یہ کہانی پسند آئی۔ سچی خوشی بہترین
کہانی ہے۔ قابل مبارکباد۔
ظفر احمد خاں
بیرداچندن پورکھوریا بازار ضلع گورکھپور

آپ کا ارسال کیا ہوا پرچہ ملا۔ پڑھ کر بے حد مسرت
ہوئی تمام کہانیاں، نظمیں وغیرہ بہت اچھی ہیں۔ آپ نے
میرا بھیجا ہوا مضمون شائع کیا لیکن ایک غلطی ہے جو نہ جانے
مجھ سے ہوئی یا آپ سے وہ یہ ہے کہ رانی گنج کے بدلے
ڈالی گنج چھپا ہے۔ میں ڈالی گنج میں نہیں بلکہ رانی گنج
میں رہتا ہوں
محمد فردوس اطہر
۱۴ محمد علی روڈ رانی گنج

مئی کا پیام تعلیم وقت پر ملا۔ اس رسالے کو میں اول
تا آخر بغور پڑھتا ہوں۔ یہ رسالہ میری تنہائیوں کا بہترین
ساتھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے دن دونی رات چوگنی ترقی
عطا فرمائے۔ آمین۔
ریحان احمد
درگاپور کٹیہار

بچوں کی کوششیں

آپس میں اتحاد و اتفاق

ایک کسان کے کئی لڑکے تھے جو آپس میں ہمیشہ لڑا کرتے تھے۔ کسان انھیں بہت سمجھاتا مگر وہ نہیں مانتے۔ ایک مرتبہ کسان نے ایک تدبیر سوچی اور ان سب لڑکوں سے لکڑی کا ایک گٹھر لانے کو کہا۔ لڑکے ایک گٹھا لے آئے۔ اس نے ان لڑکوں سے اس گٹھے کی سب لکڑیوں کو ایک ساتھ توڑنے کو کہا۔ سبھوں نے باری باری کوشش کی مگر اس گٹھے کو کوئی نہ توڑ سکا۔ اب کسان نے اس گٹھے کی ایک ایک لکڑی ایک ایک لڑکے کو دے کر اسے توڑنے کا حکم دیا۔ لڑکوں نے فوراً ہی وہ لکڑی توڑ ڈالی۔ کسان نے ان لڑکوں سے پوچھا کہ "تم وہ گٹھا کیوں نہیں توڑ سکے تھے اور یہ لکڑی کیوں توڑ ڈالی"۔ لڑکوں نے جواب دیا کہ "گٹھے میں بہت سی لکڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ اس لیے ہم نہیں توڑ سکے اور لکڑی تو اکیلی تھی۔ اس لیے آسانی سے ٹوٹ گئی"۔ اس پر کسان نے کہا "دیکھو اگر تم لوگ لکڑیوں کی طرح مل جل کر رہو گے تو کوئی بھی تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور اگر الگ الگ رہو گے تو لکڑی کی طرح تمھیں آسانی سے نقصان پہنچایا جا سکے گا"۔ لڑکوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور انھوں نے ایک دوسرے سے لڑنا چھوڑ دیا۔

بلال احمد بن ابوالحسن

میری کتاب

میری اچھی کتاب اور پیاری کتاب
تو مری چاندنی ہے مرا آفتاب

روز پڑھتا ہوں میں دل لگا کر تجھے
اور رکھتا ہوں دل میں چھپا کر تجھے

تو نے علم و ادب کے خزانے دیے
کیسی تحریر کیسے ترانے دیے

عیش کے راستے پر چلاتی ہے تو
خوش نصیبی سے مجھ کو ملاتی ہے تو

مجھ کو منزل ملی تیری تحریر میں
تیرے شعروں کی رنگین تصویر میں

محمد فردوس اطہر
۱۳ محمد علی روڈ رانی گنج۔ بردوان (بنگال)

بھٹکے ہوئے راہی

"میں نہیں چاہتا تھا کہ تمھیں کتے کی موت ماروں انسپکٹر راکیش ـــ!" ڈاکو جوالا سنگھ نے رسیوں سے جکڑے ہوئے انسپکٹر راکیش سے بڑے ہی سفاکانہ لہجے میں کہا۔ "تم سرکاری ٹٹو ہو نا ـــ اس لیے سرکار کے وفادار بھی ہو ـــ لیکن تم یہ بھول گئے تھے کہ جو بھی جوالا سنگھ کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے جوالا سنگھ اس کی زندگی کو دہکتا ہوا جہنم بنا دیتا ہے۔ تم تو اپنی وفاداری نبھا چکے۔ میرے اڈّے تک میرا پیچھا کرنے والے انسان ـــ تجھے تیری موت نے بلایا تھا۔ اب میں اپنا کام پورا کروں گا"۔ اتنا کہتے ہی اس نے اپنا ہنٹر والا ہاتھ بلند کیا "سڑاک" کی آواز کے ساتھ وہ ہنٹر انسپکٹر کی برہنہ چھاتی پر پڑا اور وہاں کی چمڑی اپنے ساتھ کھینچتا چلا آیا۔ انسپکٹر نے ایک کرب ناک چیخ ماری۔

"ہاہا..... ہا..... ہاہا....." جوالا سنگھ انسپکٹر کو تڑپتا دیکھ کر ہنسنے لگا "جب کسی کا گھر جلتا ہے تو مجھے بہت

ہوتی ہے ـــ آج کا دن تیری زندگی کا آخری دن ہے
کل کے سورج کی کرنیں تیری لاش کو دیکھ رہی ہوں گی۔"
"نہیں ـــ نہیں ۔ آہ ۔ میری بیوی اور میرا
رمیش ـــ نہ جانے کن حالات میں ہوں گے انھیں پتا
بھی نہ ہوگا کہ اس وقت میرے اوپر کیا بیت رہی ہے ۔ اُف"
انسپکٹر بڑبڑایا۔
"وہ بھی ـــ چھی ـــ دل چھوٹا نہ کرو پیارے"، جوالا سنگھ
نے زہریلے لہجے میں کہا تمھاری بیوی اور تمھارا وہ چھوکرا
رمیش اس وقت یہیں ہیں ۔ ہی ہی ـــ ہی ـــ
ہے ہے "
"وہ ـــ وہ ـــ دونوں ـ؟" انسپکٹر کے منہ
سے خوف کی وجہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔
"خوب سمجھے ـــ اس وقت میری قید میں ہیں ـ"
ابھی جوالا سنگھ نے جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ ایک عورت
بھاگی ہوئی آئی اور جوالا سنگھ کے پاؤں پر گر گئی یہ کامنی تھی
انسپکٹر کی بیوی ۔!
"انھیں چھوڑ دیجیے ..... چھوڑ دیجیے۔"
"یہ یہاں کیسے پہنچ گئی ؟"
ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور کہا کہ اس نے رام سنگھ
کے ہاتھ پیر کاٹ کھایا ہے اور جو اسے پکڑے ہوئے تھا
اور پھر یہاں آگئی۔
"ٹھیک ہے ـ اس لڑکے کو بھی یہیں لے
آؤ ـ"
کچھ دیر بعد ایک آدمی ایک بارہ تیرہ سال کے
لڑکے کو اپنے ساتھ لایا ۔ وہ لڑکا پتا جی کہہ کر انسپکٹر کی
طرف دوڑا ۔ لیکن جوالا سنگھ نے اسے پکڑ لیا۔
"ہاہاہا ..... ہاہا ..... ہا ..... باپو کے پاس
جانا ہے ۔ ہاہا"، مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو .... لڑکا چلّا
رہا تھا اور اپنے آپ کو اس دیو ہیکل سے چھڑانے کی
ناکام کوشش کر رہا تھا۔
"انھیں میں نے اس لیے قید کیا ہے تاکہ یہ تیرا انجام
اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں ۔ خوب ۔ بہت اچھا خیال ہے ایں ۔
سن کر دل خوش ہوگیا ہوگا"
"ہا .... ہاہا .... ہاہا ...." جوالا سنگھ نے بڑے
گرجدار لہجے میں کہا
"حرامزادے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا ....
نہیں چھوڑوں گا"
"چلاؤ اور چلاؤ" ۔ جوالا سنگھ نے طیش میں کہا "نکال
لو اپنے دل کی بھڑاس"۔
"تم حرام خور .... تجھ جیسا کمینہ شخص میں نے اپنی
زندگی میں نہیں دیکھا"
"دیکھوگے بھی نہیں ـــ کیونکہ زندگی تو اب ختم
ہونے والی ہے ۔ چند منٹوں بعد تمھاری لاش خاک اور خون
میں لوٹتی نظر آئے گی ۔ اور ہاں زیادہ بڑبڑ مت کر ۔ حرامزادے"
جوالا سنگھ نے غصے سے کہا۔
رمیش جو ابھی تک جوالا سنگھ کی مضبوط بانہوں میں
جکڑا ہوا تھا ۔ بولا "تم ... نے میرے پاپا کو کیوں پکڑ رکھا
ہے ـــ؟"
"اسے ـــ ہاہا .... ہا ـــ اسے میں نے نمک حلال
ہونے کے جرم میں پکڑ رکھا ہے ۔
سمجھے ـــ!"
"انھوں نے کیا غلطی کی جس کی سزا تم ہم سب کو دے
رہے ہو ـــ؟"
"ارے اس کی غلطی ـــ اس حرامزادے کی
ایک غلطی ہو تو بتلاؤں ...."
"خبردار ـــ! جو تم نے میرے پاپا کو حرامزادہ کہا
جب کہ کرتوتوں اور شکل سے تم حرامزادے ہو ـــ لوگوں
سے لوٹا ہوا مال حرام کا نہیں تو اور کدھر سے آتا ہے ـ"
"خاموش ـــ!!!" جوالا سنگھ دہاڑا ۔ اس کے
ساتھ ہی ایک زناٹے دار تھپڑ لڑکے کے گال پر پڑا ۔ لڑکا تیورا
کر زمین پر گر پڑا ۔
جوالا سنگھ کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا ۔ اس کی

مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں اور ہونٹ غصّے کے باعث کانپ رہے تھے ۔اس کے چہرے پر کئی رنگ آ اور جا رہے تھے ۔اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا ۔وہ سوچ رہا تھا ٗمیں لوگوں کو حرام زادہ کہنے والا…… کیا ـــ میں نے کبھی اپنے کرتوتوں پر بھی نظر ڈالی ہے ۔ بے قصور لوگوں کو قتل کرنا اور ان کا دیا پیسا چھیننا یہ حرام کا راستہ ہی تو ہے ۔لوگ نہیں ــ میں حرام زادہ ہوں ۔میں نے بہت گھناؤنے جرم کیے ہیں جس کی تلافی مجھ سے نہ ہو سکے گی ۔ٗ آج ایک لڑکے نے اسے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جس سے ایک راستہ تاریکی اور دوسرا اجالے کی طرف جاتا ہے اب تک وہ تاریکی میں بھٹکتا رہا تھا ۔اور کتنے ہی گھر تھے جو اس نے اجاڑے تھے پھول جو ابھی کھلنے بھی نہ پائے تھے جوالا سنگھ نے مسل دیے تھے اچانک وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا ۔

”دوستو! تم نے ہر آڑے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے اب میں اس دھندے کو چھوڑ رہا ہوں کیا کوئی شخص اس کام میں بھی میرا ساتھ دے گا؟“

ایک لمحہ کے لیے اس کے ساتھیوں پر سکوت چھا گیا پر جرنیل سنگھ اس کا جگری دوست تھا ، بڑھا اور کہا ”میں تمہارا ساتھ دوں گا ،، اس کی دیکھا دیکھی سارے ڈاکوؤں نے ہامی بھر لی ۔ کچھ دیر بعد چھوٹا سا قافلہ انسپکٹر راکیش اور اس کی بیوی بچے کے ہمراہ پولیس اسٹیشن کا رخ کر رہا تھا ۔

محمد شکیل راوت

مکان ۳۹۵ محلہ کچا کوٹ مالیر کوٹلہ پنجاب

غرور کا انجام

بہت دنوں کی بات ہے ۔کسی گاؤں میں ایک سنار اور ایک بڑھئی دونوں رہتے تھے ۔سنار بہت غرور والا آدمی تھا ۔وہ بڑھئی سے بہت جلتا تھا ۔ایک دن کی بات ہے کہ بڑھئی اپنا کام کر رہا تھا اچانک سنار وہاں پہنچ گیا پھر کچھ دیر تک کھڑا رہا ۔سنار نے اپنے دل میں سوچا لاؤ بڑھئی سے مقابلہ کیا جائے ۔ بڑھئی تو ہم سے جیت نہیں سکتا ۔اس نے بڑھئی سے کہا تم سے اچھا سامان میں بناتا ہوں اس بات پر بڑھئی نے بھی کہہ دیا تم سے اچھا میں بناتا ہوں اس بات پر دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی ۔بہت دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اچانک وزیر وہاں پہنچ گیا اور وزیر نے ان دونوں سے پوچھا کیا ہوا تو دونوں نے اپنا اپنا واقعہ بتایا ۔وزیر چپ چاپ سنتا رہا ۔وزیر کے سمجھ میں کچھ نہیں آیا ۔وہ سنار اور بڑھئی کو بادشاہ کے یہاں لے آیا اور وزیر نے سارا واقعہ بادشاہ کو سنایا ۔بادشاہ نے کہا ” ہم ایسے فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں جائیے آپ دونوں آدمی ایک ایک چیز بنا کے لائیے جب بنا کے لائیں گے تبھی ہم اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آپ دونوں آدمیوں میں سے کون اچھا سامان بناتا ہے “ بادشاہ کے کہنے پر دونوں واپس گھر گئے ۔سنار نے ایک سونے کی مچھلی بنائی اور بڑھئی نے ایک لکڑی کا گھوڑا بنایا ۔پھر دوسرے دن دونوں اپنی اپنی چیزیں لے کر بادشاہ کے ہاں گئے سب سے پہلے بادشاہ نے سنار کو بلایا اور اس سے کہا تم کیا چیز بنا کر لائے ہو سنار نے کہا ۔سب سے پہلے آپ ایک حوض بنوائیے تب ہم آپ کو اپنی چیز دکھائیں گے ۔ بادشاہ نے سنار کے کہنے پر ایک حوض بنوایا پھر سنار نے اس میں پانی بھر کر مچھلی ڈالی اور مچھلی میں لگا بٹن دبا دیا دبانے کے ساتھ ہی مچھلی پانی میں تیرنے لگی ۔بادشاہ نے کہا ” واقعی تم نے تو بہت اچھی چیز بنائی ہے “ بادشاہ نے اس کو بہت شاباشی دی ۔پھر اس کے بعد بڑھئی کو بلایا کہ تم دکھاؤ ۔تم نے کیا چیز بنائی ہے بڑھئی نے لکڑی کا گھوڑا اس کے سامنے پیش کیا اور گھوڑے میں لگے ہوئے بٹن کی طرف اشارہ کر کے کہا اس کو دبانے سے گھوڑا اڑنے لگتا ہے بادشاہ نے کہا اس پر کون بیٹھ کر دکھائے گا ۔بادشاہ کے صرف ایک لڑکا تھا اور وہیں کھڑا ہو کر پورا ماجرا دیکھ رہا تھا ۔ اس نے کہا ابا جان میں اس گھوڑے پر بیٹھ کر دکھاؤں گا ۔پہلے تو بادشاہ نے اسے بہت منع کیا کہ تم مت بیٹھو لیکن وہ بادشاہ سے ضد کر بیٹھا ۔بیٹھنے کے بعد بٹن دبا دیا

گھوڑا اسے لے کر اڑ گیا سے نیچے آنے کا بٹن معلوم نہ تھا چنانچہ
وہ اڑتا رہا اڑتے اڑتے جب تھک گیا تو نیچے آنے کی ترکیب
سوچنے لگا اچانک اس کا ہاتھ نیچے آنے والے بٹن پر پڑ گیا
اور وہ نیچے اتر آیا وہ گھوڑے کے اوپر جانے اور نیچے
آنے کے بٹن جان گیا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ سنار
کی مچھلی سے یہ زیادہ بہتر ہے۔ جب وہ نیچے اترا تو اسے
معلوم ہوا کہ یہ شہر میرا نہیں بلکہ یہ دوسرا گاؤں ہے اور
شام بھی قریب تھی اس نے یہیں قیام کا ارادہ کر لیا۔ کچھ آگے
بڑھا تو اسے ایک جھونپڑی نظر آئی وہ فوراً اس جھونپڑی
کے پاس گیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر چلّایا اس میں
سے ایک آدمی نکلا پوچھا کیا بات ہے بادشاہ کے لڑکے نے
جواب دیا میں بہت دور کا رہنے والا ہوں اور آج میں
یہیں سونا چاہتا ہوں۔ آدمی نے کہا ٹھیک ہے آئیے اندر
جاکر کھانا کھایا پھر دونوں سونے گئے کچھ دیر کے بعد بہت
تیز روشنی ہوئی۔ اس نے فوراً اس آدمی سے پوچھا یہ کیا
بات ہے کیوں تیز روشنی ہو گئی۔ اس آدمی نے بتایا کہ بادشاہ
کے صرف ایک لڑکی ہے وہ اسے بہت مانتا ہے اس نے اپنی
لڑکی کو ایک انگوٹھی دی ہے وہ انگوٹھی رات میں بہت
چمکتی ہے بادشاہ کی لڑکی جب محل میں سونے جاتی ہے۔ تب
پورے گاؤں میں روشنی ہو جاتی ہے اس نے کہا اچھا یہ
بات ہے بادشاہ کے لڑکے نے سنتے ہی فوراً اپنا گھوڑا
اٹھایا اور بیٹھ کر بٹن دبایا اور شہزادی کے محل میں پہنچ گیا۔
چپکے سے اس نے اس کی انگوٹھی نکال کر اپنے ہاتھ
میں پہن لی اور اپنی والی انگوٹھی اسے پہنا
دی پھر گھوڑے پر بیٹھ کر بٹن دبا دیا اور چلا گیا۔ جب صبح
بادشاہ کو معلوم ہوا کہ شہزادی کی انگوٹھی غائب ہوئی ہے
فوراً اسے دوسری انگوٹھی پہنا دی۔ وزیر سے کہا کہ کوئی
ترکیب کرو اس چور کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ وزیر کچھ دیر
خاموش رہا پھر کہا بادشاہ سلامت ایک ترکیب
سمجھ میں آگئی، بادشاہ نے کہا کون سی ترکیب اس نے
کہا چاروں طرف گڑھا کھدوا کر اس میں گاڑھا رنگ بھروا
دیجیے۔ جو کل آیا تھا اسے یہ معلوم نہ ہوگا کہ یہاں
گڑھا ہے اور وہ اس میں گر جائے گا اور رنگ پھر نکلے
گا نہیں اور چور پکڑ جائے گا۔ بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے
بادشاہ نے گڑھا کھدوا کر اس میں رنگ بھروا دیا۔ دوسرے
دن بادشاہ کا لڑکا پھر انگوٹھی لینے آیا تو اسی رنگ میں
گر پڑا فوراً اٹھ کر بھاگا کچھ دور جانے کے بعد دھوبی ملا
بادشاہ کے لڑکے نے کہا اگر تم یہ میرا داغ صاف کر دو
گے تو میں تمھیں دس اشرفیاں دوں گا۔ دھوبی نے کہا
ٹھیک ہے میں صاف کر دوں گا اور وہ وہاں سے چلا
گیا۔ ادھر بادشاہ اور وزیر دونوں اس کی تلاش میں
نکلے۔ دھوبی نے وہ کپڑے دھو کر اپنے لڑکے کو پہنا دیا
وہ اپنے لڑکے کو لے کر بازار میں جا رہا تھا کہ اچانک
وزیر نے دیکھا۔ وزیر رنگ سے اسے پہچان گیا اور کہا
کہ بادشاہ سلامت یہ چور ہے پکڑا گیا۔ بادشاہ نے کہا
اس کو پکڑو اور اس سے پوچھو کہ یہ رنگ کہاں سے لگا
اس نے جواب دیا بادشاہ سلامت میں دھوبی ہوں۔ اور
یہ کپڑا مجھے ایک لڑکے نے دھونے کو دیا تھا میں چور نہیں
بادشاہ نے کہا اچھا تم چور نہیں ہو تو تم اس لڑکے کو
پکڑ کے لاؤ دھوبی نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ دوسرے دن
لڑکا دھوبی کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ داغ
چھوٹ گیا ہے تو دھوبی نے کہا ہاں چھوٹ گیا ہے چلیے میں
آپ کو آپ کا کپڑا دوں۔ اس بہانے دھوبی لڑکے کو
بادشاہ کے پاس لے گیا اور بتا دیا کہ یہ کپڑا اس لڑکے کا
ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ کپڑا تمھارا ہے اس لڑکے نے
کہا جی۔ بادشاہ نے کہا اس لڑکے کو پھانسی دے دو۔
اور پھانسی لگانے سے پہلے اسے پورے بازار میں گھما
دو اور جو کچھ کہے اور اسے کھلا دو۔ وزیر اور جلاد دونوں
نے اسے ہتھکڑی لگائی اور اسے بازار میں لائے اور پوچھا
آم کھاؤ گے بادشاہ کے لڑکے نے کہا نہیں پھر وزیر
نے کہا مٹھائی کھاؤ گے اس نے جواب دیا نہیں اسی طرح
وزیر نے کئی چیزیں پوچھیں اس نے کوئی چیز کھانے سے

منع کر دیا ... وہ اپنا گھوڑا املی کے پیڑ پر لٹکا کے آیا تھا وزیر نے کہا یہ کیسا بے وقوف لڑکا ہے کچھ نہیں کھاتا۔ جاتے جاتے املی کے پیڑ کے پاس پہنچ گئے وزیر نے کہا املی کھاؤ گے لڑکے نے جواب دیا جی۔ جلاد نے کہا ٹھیک ہم اوپر چڑھ کر گراتے ہیں تم نیچے بیٹھ کر کھاؤ۔ لڑکے نے جواب دیا نہیں میں خود سے توڑ کر کھاؤں گا وزیر جلاد سے اوپر لے کر چڑھ گئے وہ اوپر گیا اور اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر بٹن دبا دیا۔ وہ گھوڑا لے کر اڑنے لگا۔ وزیر اور جلاد رسی پکڑے لٹکے رہ گئے۔ کچھ دیر کے بعد دونوں نے چھوڑ دیا۔ گر پڑے اور گرتے ہی مر گئے۔ بادشاہ کا لڑکا اپنے گھر گیا۔ بادشاہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لڑکے نے جاتے ہی سنار کو بلایا سنار سمجھا کہ شاید مچھلی اور بنوائیں وہ جیسے ہی لڑکے کے پاس گیا اسے اس نے جیل میں بند کر دیا اور بڑھئی کو جیل سے نکال دیا۔ بادشاہ نے پوچھا تو لڑکے نے بتایا اس گھوڑے نے میری جان بچائی ہے یہ کہہ کر پورا واقعہ سنایا اور بڑھئی کو انعام دے کر واپس کر دیا پھر بڑھئی آرام سے رہنے لگا۔

محمد عارف پھولپور

کوئل

کوئل کی آواز نرالی
گھوم گھوم کر ڈالی ڈالی

پھدک پھدک کر یہ متوالی
پیدا کرتی دھنیں نرالی

بچوں کے دل کو بہلاتی
کوکو کی ہے مشق کراتی

اک دم بچے رٹ ہیں لگاتے
کوئل کو اپنے پاس بلاتے

پیار سے بچوں کو سہلاتی
لوگوں کے دل بھی بہلاتی

محمد امتیاز انصاری اوّل
ایسٹ آزاد نگر۔ گوسوں ضلع دھنباد

کام کرو کچھ نام کرو

کام کرو کچھ نام کرو
صبح کرو، یوں شام کرو

میٹھی بولی بول کے بچو
غیروں کو بھی رام کرو

صبح سویرے اٹھ کر بچو
اپنا اپنا کام کرو

محنت سے جیون ہے روشن
اس خوبی کو عام کرو

سورج، چاند یہی کہتے ہیں
کام کرو، آرام کرو

محمد اقبال سندیلوی
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

دوستوں میں ندامت

قاضی، مرزا اور میر جی تینوں میں نہایت دوستی تھی۔ قاضی ہمیشہ دن کے اجالے اور شام گئے مرزا اور میر جی کے گھر جا دھمکتے۔ وہاں سے تینوں سیر و تفریح کے لیے جاتے۔ پروگرام بنتے۔ کھانے کی دعوتیں ہوتیں۔ لیکن قاضی صاحب نے کبھی اپنے گھر ان دوستوں کو نہ بلایا۔ نہ ان دوستوں کو کبھی اپنے گھر آنے کا موقع دیا۔ کیوں کہ یہ ان کے گھر پہلے ہی پہنچ جاتے تھے۔ قاضی صاحب کی دو بیویاں تھیں وہ بڑے رنگین مزاج اور خوش دل آدمی تھے اس لیے آپ نے اور شادی کر ڈالی۔ اب کی مرتبہ جب قاضی صاحب محفل میں بیٹھے تو میر صاحب نے چھیڑ ہی دیا۔ یار آپ تو ہمیں اپنے گھر کبھی نہیں لے گئے۔ اب ہم آپ کے گھر ہی کھانا کھائیں گے۔ وہ بہت ٹال مٹول کرتے رہے۔ زیادہ اصرار پر تیار ہو گئے اور کھانے کی دعوت دے کر گھر چلے آئے۔ اور بیویوں سے کہا آپ اچھا کھانا تیار کریں۔ اور کھانا دیوان خانے میں لگا کر ایک کمرے میں بیٹھ جائیں میرے دوستوں کے واپس لوٹنے تک کوئی بھی بات چیت

نہ کریں، سیر صاحب اور مرزا کھانا کھانے کے لیے آئے ۔
کھانا شروع ہوگیا اتفاق سے کمرہ میں چوہا آیا۔

پہلی بیوی نے کہا!
بادِی بادی کی چُوا چُوا
دوسری کہا!
گیدھر ہے گیدھر ہے
تیسری نے کہا!
وہ گیا وہ گیا

یہ سننا تھا دیوان خانے میں ہنسی کا شور مچ گیا۔ قاضی صاحب شرمندہ ہوئے اور کہا یارو! بھائیو، اس ندامت کے لیے ہی میں آپ کو اپنے گھر نہیں لاتا تھا اور باہر ہی خاطر تواضع کرتا رہا ہوں۔

نظیر احمد خان،
درجہ ششم کلگاؤں ایوت محل

راجا اور قیدی

ایک دن ایک راجا جیل دیکھنے گیا، جیل کے دروازے پر ایسے پانچ قیدی کام کر رہے تھے جن کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ راجا نے ان سے پوچھا تم یہاں کیوں بھیجے گئے۔ تم نے کیا قصور کیا تھا۔ پہلے قیدی نے کہا" مہاراج میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ تھانیدار سے اور مجھ سے دشمنی تھی اس نے میرے اوپر بلا کسی قصور کے مقدمہ چلا دیا اور مجسٹریٹ نے سزا کر دی اس لیے مجھے یہاں آنا پڑا۔"

راجا نے دوسرے قیدی سے پوچھا اور تم کیسے بھیجے گئے؟ دوسرے قیدی نے کہا، حضور میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہمارے گاؤں میں چوری ہوگئی تھی پولیس نے جھوٹ موٹ کو شک کیا اور سزا دلا دی۔"

راجا نے تیسرے قیدی سے پوچھا۔ تمہارا آنا کیسے ہوا؟ اس نے کہا" سرکار میرا کچھ قصور نہیں ہے، میرے خلاف ایک آدمی نے جھوٹی گواہی دی تھی حاکم نے اس آدمی کی بات کا یقین کر لیا اور مجھے قیدخانے بھیج دیا۔"

راجا نے چوتھے قیدی سے پوچھا "اور تم" اس نے کہا" مہاراج! میں کیا کہوں یہ میرے برے دنوں کا قصور ہے، میرا نہیں۔ جج صاحب نے میرے معاملے کو بغیر جانچ کیے ہی مجھے سزا دے دی۔"

چاروں قیدیوں نے اسی طرح کے بہانے کرکے راجا سے چھٹکارے کی منت کی۔ راجا مسکرایا اور پانچویں قیدیوں کی طرف گھوم کر فرمایا: "کیا تم نے بھی کوئی قصور نہیں کیا۔"

پانچویں قیدی نے اپنا سر نیچا کر لیا اور گڑگڑا کر کہا "حضور میں بے قصور نہیں ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کا پھل پا رہا ہوں۔ میں نے اپنے مہاجن کے گھر چوری کی تھی۔ پولیس نے مجھے پکڑ لیا اور حاکم نے سزا کر دی۔ میرا منہ اس لائق نہیں ہے کہ میں آپ سے مہربانی کرنے کو کہوں۔"

راجا نے جیلر کو حکم دیا کہ اس آدمی کی بیڑیاں کھول دو اور اسے چھوڑ دو، اس نے ان چار قیدیوں کی طرح جھوٹ بول کر اپنے قصور کو دونا نہیں کیا۔ یہ سچ بولتا ہے۔" اور راجا نے باقی چار قیدیوں کی سزا اور بڑھا دی۔

محمد فردوس اطہر
معرفت تاج ہومیو سنٹر ۱۴۲ محمد علی روڈ رانی گنج
(بردوان)

موٹو اور چھوٹو
کہانی اور تصاویر : جاوید نہال حشمی

چھوٹو، پچھلے دنوں میں نے کافی ورزش کی تھی تاکہ موٹاپا کم ہو سکے اور وزن بھی کچھ گھٹ جائے — وہ سامنے دیکھو، کیوں نہ ہم دونوں خود کو وہاں وزن کر لیں۔ آخر دیکھوں تو سہی کتنا وزن گھٹ سکا ہے کیا خیال ہے۔
خیال برا نہیں!!

صرف دس پیسے میں، جلدی آؤ موٹو۔
نہیں، پہلے تم —!!

آپ کا وزن تو بہت کم ہے جناب، صرف چوبیس کلوگرام —!
کوئی بات نہیں چلو موٹو، اب تم آؤ
مجھے یقین ہے میرا وزن ضرور گھٹ گیا ہوگا۔

سنئے جناب، اب آپ کو پورے پانچ سو روپے دینے پڑیں گے۔
وہ کیسے —؟؟

مشین کا دام جناب! اشارے کی سوئی اپنی آخری حد کو بھی پار کر چکی ہے اور مشین ٹوٹ کر بالکل ہی بیکار ہو گئی ہے!
کک... کیا؟؟!

پیامی ادبی معمّا نمبر 8

دفتر پیام تعلیم میں
حل وصول ہونے کی
آخری تاریخ
30 ر جولائی ۱۹۸۴ء

150 روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ کچھ نہیں
آپ جتنے حل چاہیں
بھیج سکتے ہیں لیکن ہر
حل کے ساتھ ایک
ٹوکن آنا ضروری ہے۔

پہلا انعام: بالکل صحیح حل پر مبلغ 100 روپے **دوسرا انعام:** ایک غلطی والے حل پر مبلغ 50 روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبر وار لکھیے۔

۱۔ ـــــ کی خرابی تمام جسم کی صحت کو خراب کر دیتی ہے۔ (دانتوں / پیٹ)
۲۔ پھر ـــــ ترقی کرتے کرتے امیرالبحری کے عہدے پر پہنچا۔ (رفتہ رفتہ / آہستہ آہستہ)
۳۔ موتی نے نانی اماں کو سارا ـــــ سنایا۔ (واقعہ / قصّہ)
۴۔ طریقہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی ـــــ کرے۔ (عبادت / اطاعت)
۵۔ لکھنؤ کی شاعری کے خلاف ایک ـــــ تھا۔ (اعلان / جہاد)
۶۔ بہادر وہ جو غصّے کے وقت اپنے آپ کو ـــــ لیتا ہے۔ (سنبھال / روک)
۷۔ میں ـــــ کی بات کر رہا ہوں اور تو زبان چلاتی ہے۔ (قاعدے / ایمان)
۸۔ اور جو مال ـــــ کے مفت ملتا ہے، اُڑا دیتا ہے۔ (بلا مشقت / بلا محنت)

ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں صحیح جواب صفحہ ۳ کی کتابوں میں ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں، البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصّہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمّے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے:
پیامی ادبی معمّا نمبر 8 ماہنامہ پیامِ تعلیم۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹوکن پیامی ادبی معمّا نمبر 8
میں اڈیٹر پیام تعلیم کے فیصلے
سے متفق ہوں۔
نام ....
پتا ....

پیامی ادبی معمّے کا شاندار نتیجہ

صحیح حل (۱) خدا۔ اسلام کیسے شروع ہوا صـ۹۷ (۲) منورہ۔ اسلام کیسے شروع ہوا صـ۱۱۱ (۳) عمر۔ شفیع الدین نیّر صـ۱۲ (۴) گھوڑے۔ اسلام کے مشہور سپہ سالار۔ دوم صـ۴۷ (۵) شوہر۔ خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا صـ۱۷ (۶) بوریوں۔ خرگوش کا سپنا صـ۱۴ (۷) کیڑا۔ چٹانوں کی کہانی صـ۲۲ (۸) نہانے۔ لال مرغی صـ۲۳

صحیح حل پر پہلا انعام حاصل کرنے والے ۶ خوش نصیب

فی کس دس روپے تقسیم کیے گئے

(۱) خلیق احمد۔ روم نمبر ۴۲۹ - A وِنگ منسٹری آف لالیجسلیٹو ڈپارٹمنٹ شاستری بھون۔ نئی دہلی
(۲) محمد ہارون حاجی عبدالرشید۔ مانا تعلقہ مرتضٰی پور۔ ضلع آکولہ
(۳) رعنا خلیل مکان نمبر ۱۳۵۰ پہاڑی املی مٹیا محل۔ دہلی ۶
(۴) سیّدہ عشرت فاطمہ ″ ″ ″
(۵) عاصمہ خاتون ″ ″ ″
(۶) شائستہ خلیل۔ ″ ″ ″

ایک غلطی پر دوسرا انعام حاصل کرنے والے ۸ خوش نصیب

فی کس پانچ روپے تقسیم کیے گئے

(۱) روبینہ عبدالکریم۔ گھانس بازار۔ کلیان (۲) سہیل ارشد نمبر ۱۲ کالونی اندل۔ اندل ضلع بردوان (۳) تابندہ ۴۶۷ گلی گھنٹے والی۔ پہاڑی بھوجلہ۔ دہلی (۴) محمد شفیع انجم ولد عبدالرشید۔ منشی شعبان نگر۔ نمبر ۶ گلی مالیگاؤں (۵) زیڈا احمد شیخ ۱۵۷ (۱۷) پائپ روڈ کرلا۔ بمبئی (۶) عبدالعزیز دین محمد انصاری فیت کی چال۔ عمر رجب روڈ۔ مدنپورہ بمبئی (۷) سعید احمد رضوان گورنمنٹ اردو ہائر پرائمری اسکول آنیکل۔ بنگلور (۸) ابرار علی خاں غلاور کالج۔ باغ بانو۔ پٹنہ۔

ادھر ادھر سے

دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی الازہر

قاہرہ ۲۰ مارچ۔ دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی جامعۃ الازہر کی ایک ہزارویں سالگرہ کی تقریبات یوم الجمعہ کو یہاں اس جگہ شروع ہوئیں جہاں پہلے پہل درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ یہ یونیورسٹی ایک جامع مسجد میں شروع کی گئی تھی اور مصر میں فاطمیوں کا عہد تھا آج اس یونیورسٹی میں دنیا بھر سے تقریباً پانچ ہزار طلبۂ اسلام کے بنیادی ارکان کا علم حاصل کرتے ہیں اور ان طالب علموں میں افریقہ اور ایشیا کے ممالک کے بھی بہت سے طالب علم شامل ہوتے ہیں۔

جامعۃ الازہر کی ایک ہزارویں سالگرہ کی تقریبات میں مصر کے صدر حسنی مبارک نے بھی شرکت کی۔

پانچ ٹانگوں والا
عجیب الخلقت بھکاری

الہ آباد۔ ۲۵ دسمبر۔ یہاں تفضل نامی ایک ایسا بھکاری دیکھا گیا ہے جس کی دو عام ٹانگوں کے علاوہ تین اور چھوٹی ٹانگیں بھی ہیں، جو اس کے پیٹ سے باہر نکلی ہیں۔ ان میں سے ایک ٹانگ کافی بڑی اور موٹی ہے جسے یہ شخص اپنے کندھے پر رکھے ہوئے ہے۔ دوسری بہت وزنی اور گول شکل میں ہے جسے تفضل کو دونوں ہاتھوں سے تھامنا پڑتا ہے تیسری ٹانگ بہت چھوٹی اور پتلی سی ان دونوں کے درمیان سے نکلی ہوئی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ تفضل آسام کا باشندہ ہے جب وہاں حالیہ ہنگامے شروع ہوئے تو وہ آسام سے بھاگ کر الہ آباد آگیا اور یہاں گداگری کا دھندا شروع کر دیا۔

یہ پانچ خوش قسمت بچے ششالینی سکسینہ (۱۳)، رینو (۱۳) سونا اگام شرن پٹیل (۱۲) بیجو پرٹیپارہ (۱۲) اور ایس روی چندر راو (۱۲) ہیں جنھیں پینٹنگ کے مقابلے میں سویت نہرو ایوارڈ ملا ہے۔ یہ بچے ایک مہینے کی سیر کے لیے روس گئے ہیں۔

پان کھاکر طبلہ بجا کر دا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں
لیے لکھی گئی ہے
قیمت : 1/50
پھر میں چکوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت : 1/50
تاک دِنا دن تا کے سے
چھوٹے بچوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت : 1/50
پکڑ دُم کے ڈکر
ایک گدھے نے شیر کو بھگا
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھو
بچوں کے لیے۔ قیمت ۵۰
پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: 1/50
ہیتو جیتو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت: 1/50
روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچوں کے لیے انھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت: 2/50
بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
بی بندری اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: 1/50
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت 1/50
جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت 1/50
بچوں کی کہانیاں
قیمت 1/50
مدورانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت : 1/50
بندر اور نائی
لومڑی کا گھر
1/50
دہلی
بمبئی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage

Regd. No. D(SE)-043 June, 1984

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

ماہنامہ
نئی دہلی ۲۵
پیام تعلیم
عید مبارک

جولائی ۱۹۸۴ء | جلد: ۲۱ | شمارہ ۷

اڈیٹر : ولی شاہجہانپوری

قیمت : ۲/۵۰ روپے / سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں جب پہنچے گا اس وقت آپ سب عید کی خوشیوں کا لطف اٹھا رہے ہوں گے۔ ادارے کی طرف سے ہم تمام پیامیوں کو عید کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مگر دنیا کے رنگ ڈھنگ بھی عجیب ہیں۔ کہیں مسرتوں کے شادیانے، کہیں غموں کے سائے۔ انسانی زندگی غموں اور مسرتوں کے ملاپ کا نام ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

گل اِس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

ابھی یہ شمارہ پریس جانے ہی والا تھا کہ ہم ایک صدمے سے دوچار ہوئے۔ لمبی بیماری کے بعد اچانک پیام تعلیم کے مدیر جناب ولی شاہ جہاں پوری کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ چالیس سالہ رفاقت اس طرح ختم ہوئی۔ ولی صاحب بہت حوصلہ مند، صابر اور راضی برضا رہنے والے انسان ہیں۔ اس صدمے کا بوجھ بھی انھوں نے بڑے وقار کے ساتھ اٹھایا۔ لیکن کوئی بھی غم برداشت کیے جانے سے کم تو نہیں ہوجاتا۔ ہم مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور ولی صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں کے غم میں بھی برابر کے شریک ہیں۔

ادارہ

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

اردو کے مشہور شاعر
ساغر نظامی مرحوم
۱۹۸۴
مصور
شکیل مجاہد آگرہ

سطوت رسول

عید
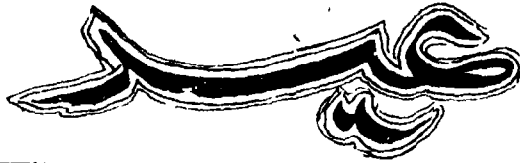
آغازِ سپیدۂ سحر ہے　　پھولوں سے مہکتی رہگذر ہے
ہے موجِ شمیم بھینی بھینی　　چلتی ہے نسیم دھیمی دھیمی
غنچے نہال، باغ گلپوش　　پھرتی ہے صبا چمن میں مدہوش
گاتے ہیں طیور حمدِ باری　　ہر گھر سے نغمہ وکیف جاری
گویا کہ چمن اک پنکھڑی ہے　　اور شاخِ چمن ہری بھری ہے
بادِ سحر ہے عطر آگیں　　پہنے ہوئے ہے لباسِ رنگیں
سبزہ چمن میں ہے جو دھانی　　وہ خندۂ گل، وہ رُت سہانی
ہر شخص ہے مسرتوں سے شاداں　　بچے بھی نہال پا بہ جولاں

اک دوسرے سے مل رہے ہیں
کلیوں کی طرح سے کھل رہے ہیں

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

[illegible] اطہر پرویز (مرحوم)

ننھا میمنا

ایک تھا میمنا۔ ننھا منا سا۔ خوبصورت سا۔ جسے دیکھ کر پیار آتا تھا۔ تھا تو بھیڑ کا بچہ پر حرکتیں کرتا تھا آدمیوں جیسی۔ گھومنے پھرنے کھیلنے کودنے کا بڑا شوقین تھا۔ ایک دن وہ سمندر کے سفر پر نکل پڑا۔ اس نے اپنے لیے ایک چھوٹی سی ناؤ بنائی۔ اس ناؤ میں وہ اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ مگر کچھ دنوں بعد وہ ہر طرف سمندر کا پانی دیکھتے دیکھتے گھبرا گیا۔ وہ دیکھو اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے اور وہ کچھ بول بھی تو رہا ہے۔

میمنا: میں۔ میں۔ ارے میرے خدا یہ پانی کیسا پانی۔ کھارا پانی اور ہر طرف پانی ہی پانی اور پینے کے لائق پھر بھی نہیں اور آس پاس زمین کا نام و نشان نہیں۔ ارے وہ کیا دکھائی دے رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! پیڑ تو نہیں ہے؟ ارے ہاں پیڑ ہی تو ہے۔ ضرور یہاں کوئی جزیرہ ہے۔ ہاں بھائی چھوٹا سا جزیرہ ہے ہر طرف سمندر کے پانی سے گھرا ہوا اور بیچوں بیچ میں زمین۔ پھر تو یہاں کوئی رہتا بھی ہوگا۔ ضرور کوئی رہتا ہوگا۔ لو میری کشتی بھی مڑ گئی ارے یہ تو کوئی شیر ہے۔ ارے باپ رے باپ یہاں سے بھاگنا چاہیے۔ اس کی آواز کتنی بھیانک ہے۔

شیر: ڈرو مت ننھے میمنے! میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں بچوں کو کچھ نہیں کہتا۔ آجاؤ ہمارے جنگل میں۔ یہاں آرام سے رہو۔ کوئی تم سے کچھ نہیں کہے گا۔

میمنا: شیر ماموں! میں آ تو جاؤں، پر یہ تو بتاؤ کہ یہ زمین کس کی ہے۔ مجھے یہاں پر کیا حقوق حاصل ہوں گے۔

شیر: حقوق۔ کیسے حقوق۔ یہ دیکھو۔ میں اس جنگل کا بادشاہ ہوں۔ یہ سارا جنگل میرا ہے۔ یہاں کے پتے بھی ہلنے جلنے کے لیے میرے اشارے کا انتظار کرتے ہیں۔ یہاں کے جانور میری رعایا ہیں۔ ان کی زندگی اور موت میرے حکم پر منحصر ہے تم حقوق کی بات پوچھتے ہو۔ حقوق کیسے حقوق۔ یہ تو صرف مجھے حاصل ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر تم یہاں رہنا چاہو تو تم کو اس وقت تک یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی جب تک کہ اس جنگل میں مجھے

میرا شکار ملتا رہے گا۔ تم کو چرنے کے لیے
گھاس ملے گی۔ میں اپنی رعایا کو گھاس پوس
کی تکلیف نہیں ہونے دیتا اور تم کو چاہیے
بھی کیا؟ پتوار پھینکو اور آجاؤ۔ خدمت کرو
خدمت میں راحت ہے۔

ییمنا: نا بابا نا۔ میں ایسی جگہ نہیں رہنا چاہتا جہاں
مجھے کوئی حق حاصل نہ ہو اور میں دوسرے
کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں۔ لو میں اپنی ناؤ
لے کر کہیں اور چلا جاتا ہوں یہ جگہ مجھ جیسے
آزاد کے لیے نہیں ہے۔ (ناؤ آگے بڑھاتا
ہے۔ شیر غراتا ہے لیکن بے بس ہے اس
لیے کہ وہ پانی میں تو اتر نہیں سکتا اور کشتی
کافی دور ہے)

ییمنا: (ہنستا ہے) اچھا تو یہ جنگل کا بادشاہ ہے۔
بڑا آیا بادشاہ کہیں کا۔ اپنے حقوق کی پوٹلی
باندھے پھرتا ہے۔ یہ حکومت کرنے کے
لائق ہے جسے صرف اپنا خیال ہے۔ صرف
اپنا۔ خود غرض کہیں کا۔ اب میں اور آگے
جاؤں گا اس جزیرے سے بھی آگے۔ ارے
وہ تو کوئی اور جزیرہ ہے اور یہاں تو کوئی چل
پھر رہا ہے۔ ضرور کوئی انسان ہے۔ ہاں بونا
ہے چھوٹے قد کا (پتوار تیز چلاتا ہے۔ اور
تیز چلاتا ہے۔) ارے یہ تو کوئی عورت ہے
ہاں ہاں عورت ہی معلوم ہوتی ہے۔
دیکھو کیسے زرق برق رنگ برنگے کپڑے
پہنے ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ اس کے پیچھے
پیچھے کچھ عورتیں بھی ہیں جو اس کے کپڑے
پیچھے سے اٹھائے ہوئے ہیں۔ واہ بھائی
واہ۔ بڑی شاندار عورت ہے، بڑی رعب دار
(قریب پہنچ کر) بیگم، کیا میں تمہارے یہاں
آجاؤں؟

عورت: گستاخ! ملکہ کہو۔ میں ملکہ ہوں۔ میری زبان
سے نکلا ہوا لفظ یہاں کا قانون بن جاتا ہے
میرے ماتھے کی ایک شکن بڑے بڑے جیالے
سورماؤں کی صفوں کو بکھیر دیتی ہے۔ میری
آنکھوں کا غیض لوگوں کی آنکھوں کا نور چھین
لیتا ہے۔ میں ملکہ ہوں اس نگری کی، مجھے
ملکہ کہہ کر خطاب کرو۔

ییمنا: ملکہ صاحبہ!

ملکہ: ارے یہ بھیڑ کا بچہ کیسا بولتا ہے۔ اور یہ کشتی
بھی تو چلا رہا ہے۔ تمنے یہاں! کیا کہتے ہو۔

ییمنا: کیا میں تمہارے یہاں آجاؤں۔

ملکہ: ضرور آجاؤ۔ شوق سے ییمنے میاں۔

ییمنا: مگر آنے سے پہلے یہ تو بتاؤ۔ مجھے تمہاری نگری
میں کیا کیا حقوق حاصل ہوں گے۔

ملکہ: تمہاری نگری میں۔ بڑے گستاخ ہو تم!
تم کو کسی نے ادب آداب نہیں سکھائے؟
کہو آپ کی نگری میں۔

ییمنا: اچھا۔ آپ کی نگری میں۔

ملکہ: حقوق کیسے حقوق، میں ملکہ ہوں۔ میں تم کو
اپنے خاص محل میں رکھوں گی۔ جہاں تم
میرے پاس ہمیشہ رہنا۔ میں تمہارا خاص
طور پر خیال رکھوں گی۔

ییمنا: ملکہ! میں آپ کی خدمت میں زندگی نہیں
گزار سکتا۔ میں تو کہیں اور جاؤں گا، جہاں
آزادی ہو۔ آزادی! تمہاری بستی تو غلاموں
کی بستی معلوم ہوتی ہے۔

ملکہ: (غصے سے) بے وقوف کہیں کے۔ ہمارے
اوپر راج کرنے آئے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے
جہاں تمہارا جی چاہے۔ مجھے تمہاری ضرورت
نہیں۔ سمندر میں جب طوفان آئے گا تو
اپنے آپ پچھتاؤ گے۔ چھوٹا منہ بڑی بات!

تم باغی بھی معلوم ہوتے ہو۔ لوگوں کو بغاوت
پر آمادہ کرنا چاہتے ہو۔ ہماری نگری میں تمہاری
تمہاری ضرورت نہیں۔ تم جانتے ہو باغیوں
کو ہماری جیلوں میں بلا مقدمہ چلائے بند کردیا
جاتا ہے اگر اس پر نہیں مانتے تو سولی پر
چڑھا دیا جاتا ہے۔

میمنا: آپ بہت ظالم معلوم ہوتی ہیں۔ میں اپنے
آپ جا رہا ہوں۔ تم ملکہ ہوتی تو اپنی نگری میں
مجھے تم سے کیا لینا۔ میں طوفان سے نہیں ڈرتا
تمہاری طرح ڈرپوک نہیں ہوں۔

ملکہ: گستاخ، ذلیل، کمینہ، بدزبان۔ میرے پاس
ایسی کشتی نہیں ورنہ ابھی اس کو دریا سے
نکال کر موت کے گھاٹ اتار دیتی۔ کمبخت،
ذلیل۔

میمنا: (چپو چلاتا جاتا ہے اور بڑ بڑاتا ہے) اب ایسا
بھی کیا۔ میں ملکہ کی خدمت میں رہوں۔ بڑی
آئی مجھے اپنی خدمت میں رکھنے والی۔ میں اور
آگے جاؤں گا۔ شیر اور ملکہ دونوں مجھے دھوکا
دینا چاہتے ہیں۔ خود راجا اور ملکہ ہو کر رہنا
چاہتے ہیں۔ مجھے اپنا نوکر بنا کر رکھنا چاہتے
ہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے یہاں رہنے کی۔ ارے
یہ کون نظر آرہا ہے۔ یہ تو میرے جیسے جانور
ہیں (میں۔ میں۔ میں۔ میمنا مارے خوشی کے
دیر تک بولتا رہتا ہے۔ اس کے جواب میں
بہت سے جانور آوازیں لگاتے رہتے ہیں)
ارے یہ تو خود مجھے بلا رہے ہیں۔ ارے بھائی
مجھ سے کیا کام ہے۔ ذرا جلدی بتاؤ۔

گیدڑ: ہوا۔ ہوا۔ ہوا۔ ہو، ارے میمنا تم یہاں آجاؤ
یہیں رہنے لگو۔

بھیڑ: میرے بچے بھی اسی طرح کے ہیں۔ اچھا ہو جو
یہ یہاں آجائے۔

خرگوش: ارے بھائی میمنے! جلدی آجاؤ۔ اب ہمارا جھگڑا
تم ہی طے کر سکتے ہو۔ قصہ یہ ہے کہ ہمارا راجا
شیر مر گیا ہے۔ وہ بڑا ظالم تھا۔ ہمیں بہت
ستاتا تھا۔ حالانکہ ہم نے ہی اسے چنا تھا۔
اب ہم پھر اپنا نیا راجا چننا چاہتے ہیں۔
اس بار ہم نے سوچا ہے کہ ایسے جانور کو
اپنا راجا بنائیں گے جو گوشت نہ کھاتا ہو اور
آج صبح تم سب سے پہلے نظر آئے۔ اتفاق
سے تم یہاں آگئے اور تم گوشت خور بھی
نہیں ہو۔ اس لیے اب تم ہی ہمارے راجا
بن جاؤ۔

میمنا: ارے میں راجا بن جاؤں! یہ تم کیا کہہ رہے
ہو۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ اے بی لومڑی!
تم کیوں چپ کھڑی ہو۔ تم تو بڑی سمجھدار ہو۔
ذرا تم ہی بتاؤ نا۔

لومڑی: خرگوش ٹھیک کہتا ہے۔ تم ادھر آجاؤ اور
یہاں کے راجا بن جاؤ۔

میمنا: مگر یہاں پر میرے کیا حقوق ہوں گے؟

لومڑی: ارے حقوق۔ یہ سب کچھ تمہارا ہوگا۔ ہم
سب تمہاری رعایا ہوں گے۔ تم کو گھر
بیٹھے سب کچھ ملے گا۔ ہماری زندگی اور موت
تمہارے اشارے پر ہوگی۔ ہمارے اس
دیس میں تمہارا راج ہوگا۔

میمنا: مگر تم مجھے بلا جانے بوجھے اپنا راجا کیوں
بنا رہے ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم سب
بیوقوف ہو۔ اس امید پر کھڑے ہو کہ کوئی
باہر سے آکر تمہارے اوپر حکومت کرے۔
میں محنت سے جی نہیں چراتا اور اتنے
حقوق بھی نہیں مانگتا جتنے تم مجھے دے
رہے ہو۔ میں اپنے راستے پر جاتا ہوں۔
(ناؤ آگے بڑھاتا ہے)

گدھا: بڑا بے وقوف ہے یہ بھیڑ کا بچہ۔ جو راج پاٹ کو ٹھکرا کر جا رہا ہوں مجھے کوئی راجا بنائے تو ابھی ڈھینچو ڈھینچو کرتا ہوا راج سنگھاسن پر بیٹھ جاؤں پر نہ جانے کیوں یہ جانور مجھے اس لائق نہیں سمجھتے۔

میمنا: (اپنے آپ سے) مگر میں جاؤں تو کہاں۔ آخر کب تک اس طرح بھٹکتا رہوں۔ کیا مجھے کوئی کنارہ نہ ملے گا اور میں اسی طرح ٹھوکر کھاتا پھروں (وہ بہت تیزی سے کشتی کھیتا ہوا بہت دور تک چلا جاتا ہے کہ اچانک اسے فاصلے پر بہت سے بچے اور جانور وغیرہ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ میمنے کو دیکھتے ہی ایک بچہ چیختا ہے)

بچہ: ارے میمنے بھیا کیا بات ہے ادھر تو آؤ۔

میمنا: تم کو مجھ سے کیا کہنا ہے۔ میں مسافر ہوں ایک ایسی جگہ کی تلاش میں ہوں۔ جہاں مزے میں رہ سکوں۔

بچہ: تب پھر یہاں کیوں نہیں آجاتے۔

میمنا: آتو جاؤں پر مجھے یہاں کیا حق حاصل ہوگا یہ زمین کس کی ہوگی۔

بچہ: یہ زمین کس کی ہوگی۔ ارے ننھے میمنے تم کو یہ بات کس نے بتائی۔ زمین تو کسی ایک کی نہیں ہوتی۔ وہ تو سب کی ہوتی ہے۔ یہ ہم سب کی ہے اور ہم لوگ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ یہاں کوئی بیکار نہیں ہے، کوئی ننگا بھوکا نہیں ہے۔ کوئی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور ہمارا جزیرہ دور تک پھیلا ہوا ہے اور ہم نے اپنی محنت سے اسے اتنا سندر بنا لیا ہے۔ پہلے تو یہ بالکل اجاڑ تھا۔ دھیرے دھیرے اتنا خوبصورت ہوگیا ہے۔ تم آجاؤ تو اور خوبصورت ہو جائے۔ تم تو بہت ہمت والے معلوم ہوتے ہو۔

میمنا: ہاں یہ جگہ رہنے کی ہے۔ اب میں یہیں رہوں گا (یہ کہہ کر میمنا چپو پھینک دیتا ہے۔ بچے خوشی کے مارے چلانے لگتے ہیں) آؤ۔ آؤ آؤ۔

حافظ باقوی

پیام تعلیم

اب ستاروں کی ضرورت ہے نہ پھولوں کی ندیم
آگیا آگیا دہلی سے "پیامِ تعلیم"

لاؤ پہلے میں اسے دیکھ کے ہولوں سرشار
دید سے آنکھیں منور ہوں، ملے دل کو قرار

پاتے ہیں اس سے ضیا علم کی لڑکے بالے
اس کے الفاظ ہیں مہتاب تو جملے ہالے

اس کی نظموں میں ہے لذت تو مضامین میں مٹھاس
اس کے ہر ایک لطیفے میں گلوں کی بو باس

باغِ ہستی میں مہکتا ہے سدا بن کے شمیم
بچے بچے کی زباں پر ہے "پیام تعلیم"

ہر گھڑی ساغرِ جمشید یہ بن کر چھلکے
علم کے چرخ پہ خورشید یہ بن کر چمکے

جمیل آباد میل وشارم

ثنا اسد

ایک بھوت بھگاؤ ہے

نواب سکندر مرزا کے بزرگ محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ سومناتھ کے مندر پر حملہ آور ہوئے تھے اور وہاں انھیں ایک سونے کا پیالہ بہ طور مالِ غنیمت ملا تھا۔ چنانچہ یہ پیالہ نسل در نسل ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔ اس پیالے کے ساتھ ایک عجیب سی روایت بھی چلی آرہی تھی اور وہ یہ کہ اگر یہ پیالہ اس خاندان سے چلا گیا تو پھر یہ خاندان تباہ و برباد ہو جائے گا۔ نواب سکندر مرزا کا ایک بیٹا تھا صفدر مرزا۔ وہ سیر و سیاحت کے شوق میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب بہ ظاہر تو امیر تھے، مگر اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے روپیا کمانے کی ایک ترکیب سوچی۔ وہ

جانتے تھے کہ امریکا کے لوگ نادر چیزوں کی بہت بڑی قیمت ادا کرتے ہیں۔ اتفاق سے انھوں نے کسی رسالے میں پڑھ لیا کہ امریکہ کا ایک کروڑ پتی نوادر کا انتہائی شیدائی ہے۔ اس کا نام تھا ہنری، لہٰذا نواب صاحب نے اپنے پرانے پیالے کی ایک تصویر، ایک مختصر سے مضمون کے ساتھ اخبار میں شائع کروادی اور اخبار کا تراشا اس کروڑ پتی کو روانہ کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ مسٹر ہنری اس پیالے کی تصویر دیکھ کر اور اس کی تاریخی اہمیت پڑھ کر فوراً اس کی خریداری پر آمادہ ہو جائیں گے اور ہوا بھی بالکل یہی۔ مسٹر ہنری پیالے کی تصویر دیکھ کر فوراً چل پڑے اور نواب صاحب کے پاس آ پہنچے۔

اسی عرصے میں نواب صاحب کا بیٹا صفدر بھی اپنے وطن واپس آگیا اور گھر پہنچنے سے پہلے ہی اسے یہ خبر مل گئی کہ نواب صاحب قدیم خاندانی پیالے کو فروخت کرنے والے ہیں۔ صفدر اس نادر پیالے کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی تھیں، انھیں صحیح سمجھتا تھا، اس نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ اگر اس پیالے کو خاندان کے کسی فرد نے فروخت کر دیا تو خاندان کے آبا و اجداد کی روح بھوت بن کر اس کو پریشان کرے گی۔ چنانچہ صفدر اپنے گھر نہ آیا اور روپوش ہوگیا ادھر مسٹر ہنری اور نواب صاحب میں پیالے کی فروخت کے بارے میں بات چیت شروع ہو گئی۔

نواب صاحب کی حویلی بہت پرانی تھی، اس کا

کچھ حصہ تو جدید طرز کا تھا اور کچھ حصہ انتہائی قدیم طرز کا۔ نواب صاحب اور ان کے گھر والے نئے حصے میں رہتے تھے اور پرانا حصہ کھنڈر بن چکا تھا۔ نواب صاحب نے احتیاطاً اس پیالے کو حویلی کے پرانے حصے میں ایک جگہ چھپا دیا، تاکہ کوئی اسے چرا نہ سکے۔ چوں کہ نواب صاحب اس امریکی سے سودا کرنا چاہتے تھے اور پیالے کی قیمت بہت زیادہ وصول کرنا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے اپنے بھتیجے کو بلوالیا جو ذہین تھا، اس نوجوان کا نام شاہد تھا۔ چنانچہ جب نواب صاحب ہنری اور شاہد تینوں بیٹھ کر ایک دن پیالے کا سودا طے کرنے لگے تو نواب صاحب بولے، دیکھیے ہنری صاحب، یہ میرے بزرگوں کی نشانی ہے، میں اگر اس کو فروخت کردوں تو اندیشہ ہے کہ میرے جدِ اعلا کی روح مجھ کو اور آپ کو بھوت بن کر کہیں چمٹ نہ جائے۔"

در اصل نواب صاحب نے پیالے کی قیمت بڑھانے کے لیے یہ بات کہی تھی، مگر امریکی پر اس کا اثر الٹا ہوا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا اور بولا، "تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر میں یہ پیالہ خریدلوں تو آپ کے جدِ اعلا کا بھوت بھی اس پیالے کے ساتھ ساتھ میرے پاس چلا آئے گا؟ اگر یہ بات ہے تو نہایت ہی اچھا ہے! میں اپنی کیلی فورنیا کی عالی شان کوٹھی میں اس بھوت کو بھی رکھ لوں گا!"

اس کے باوجود نواب صاحب ٹال مٹول کرتے رہے اور سودا طے نہ ہو پایا۔ رات کے وقت جب یہ لوگ کھانا کھا کر بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو نواب صاحب کا پرانا خادم بخشو گھبرایا ہوا آیا اور چلایا، "حضور غضب ہو گیا! بڑے سرکار کی روح پرانی حویلی میں دکھائی دی ہے!" یہ سن کر سب حیران ہو گئے اور پرانی حویلی کی طرف چلے کہ دیکھیں کیا بات ہے، چاندنی میں دور انھوں نے دیکھا کہ حویلی کی ایک فصیل پر ایک شخص کھڑا ہے اور اس کا لباس نہایت پرانے زمانے کا ہے۔ اس کے بال اور داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ نواب صاحب، ہنری اور شاہد آگے بڑھے، مگر ذرا ہی دیر میں وہ آدمی یا بھوت غائب ہو گیا۔ ہنری صاحب کو

اب تو بالکل یقین ہو گیا کہ واقعی اس نادر پیالے کے ساتھ ایک بھوت بھی لگا ہوا ہے۔ اُدھر نواب صاحب اپنی جگہ فکر مند تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ چنانچہ وہ شاہد کو لے کر کتب خانے میں گئے اور مشورہ کرنے لگے۔ دونوں نے طے کیا کہ پیالے کو اس امریکی کے ہاتھ فروخت کردیا جائے مگر قیمت خوب کس کر وصول کی جائے۔

دوسرے دن نواب صاحب پرانی حویلی گئے، تاکہ پیالے کو اس جگہ سے نکال لائیں جہاں اسے چھپا دیا تھا، مگر پیالہ وہاں نہ تھا۔ اب تو نواب صاحب بہت پریشان ہو گئے، فوراً آکر شاہد کو بتایا۔ اس کے بعد رات کو روزانہ وہ بھوت پرانی حویلی کے کسی نہ کسی حصے پر دکھائی دیتا رہا۔ لوگ جب قریب پہنچتے تو وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔

شاہد بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے ایک رات پرانی حویلی کا معائنہ کیا اور اتفاق سے اس کی مڈبھیڑ اس بھوت سے ہو گئی۔ شاہد نے اس بھوت کو پہچان لیا۔ یہ بھوت ووت نہ تھا، بلکہ نواب صاحب کا بیٹا

صفدر تھا، جو بھوت بن کر ڈرا رہا تھا تا کہ نواب صاحب پیالے کو فروخت نہ کریں۔ اس کو واقعی یہ ڈر تھا کہ پیالہ فروخت کر دینے کے بعد خاندان تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اُس نے پیالہ چُرا لیا تھا، کیوں کہ اس نے نواب صاحب کو پیالہ رکھتے دیکھ لیا تھا۔

شاہد نے اس کو سمجھایا کہ یہ اندیشہ فضول ہے۔ پیالہ بیچنے سے اتنی بڑی رقم مل جائے گی کہ نواب صاحب اپنا قرض ادا کر سکیں گے اور بہت سی رقم بچ بھی جائے گی۔ آخر صفدر راضی ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ صفدر اپنی داڑھی اور بال کٹوا کر صبح کو گھر آئے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ گویا ابھی ابھی گھر واپس آیا ہے صفدر نے پیالہ بھی شاہد کے حوالے کر دیا، شاہد نے پیالہ لا کر نواب صاحب کی الماری میں رکھ دیا۔

چنانچہ دوسرے دن صبح کو جب سب لوگ ناشتہ کر رہے تھے صفدر آ گیا۔ گھر والے بڑے خوش ہوئے۔ نواب صاحب نے اسے گلے لگایا۔ ہنری صاحب سے تعارف کروایا۔ پھر پیالے کا سودا طے ہو گیا۔ نواب صاحب کو ایک بہت بڑی رقم مل گئی اور ہنری صاحب پیالہ لے کر امریکہ روانہ ہو گئے۔ ان کو پیالہ حاصل کرنے کی خوشی تو تھی ہی، مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی خوشی تھی کہ پیالے کا بھوت بھی ان کے پاس رہے گا یعنی جہاں پیالہ ہوگا وہیں اس کا بھوت بھی رہے گا۔

چند روز بعد نواب صاحب، شاہد اور صفدر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک تار آ گیا۔ تار بھیجنے والے ہنری صاحب تھے، تار میں لکھا تھا:

"پیالے کا بھوت اس وقت میرے جہاز کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا ہے، میرے لیے یہ بڑی دولت ہے"!

خیال میں بڑی طاقت ہے۔ دراصل ہنری صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ پیالے کے ساتھ بھوت بھی ہے، اس لیے انھوں نے جہاز کے پچھلے حصے پر کسی کالے بھجنگ آدمی کو دیکھا تو ان کا یقین اور پختہ ہو گیا۔ وہ خوش ہوئے۔ پیالہ تو نادر و نایاب ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ بھوت ہونا اور بھی نادر بات ہے۔

* * * * * * * * * * * * * *

محبوب راہی

برسات کا موسم

گھن گھن گرج رہے ہیں بادل	پانی برس رہا ہے چھل چھل
کو کو کوک رہی ہے کوئل	گونج رہا ہے سارا جنگل

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم

دیکھ کے بادل کالے کالے	خوش ہیں کھیتی باڑی والے
جوان بوڑھے لڑکے بالے	خوش ہیں گائیں خوش ہیں گوالے

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم

ہوا کے جو چلتے ہیں جھکڑ	دروازے کرتے ہیں کھڑ کھڑ
بوندیں جو پڑتی ہیں سڑ سڑ	رہے گر گر پڑ پڑ تڑ تڑ

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم

جب سے پروائی چل رہی ہے	خوب طبیعت بہل رہی ہے
دھرتی صورت بدل رہی ہے	مٹی سونا اگل رہی ہے

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم

گلزاری مسجد، بادشاہی تاکی، اکولہ

امۃ الرحمٰن محسنی

دو شکاری

(قسط ۱۷)

"ایک منٹ! صرف ایک منٹ!" سرجنٹ نے کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔ جان گیا ہوں کہ الزام آپ اس شریف آدمی کے سر پر رکھ رہے ہیں نا؟"

"بالکل!" شہباز اپنی پوری آواز سے چلائے۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ اسی کا کیا ہوا ہے۔"

"لیکن یہ تو بتایئے۔" سرجنٹ نے کہا۔ "اس الزام کے ثبوت کے لیے آپ کے پاس کوئی شہادت بھی ہے؟"

"ثبوت! یہ تمہارے چاروں طرف کیا ہے؟ ہر طرف ثبوت ہی ثبوت ہے۔" شہباز صاحب گرجے۔ "کیا تم اندھے ہو۔ تمھیں نظر نہیں آرہا ہے؟" ابو ایک دم قدم آگے بڑھا کر اپنی ستاروں بھری جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ شہباز خاں صاحب کے مقابل جا کر کھڑے ہو گئے اور بہت ہی شیریں آواز میں کہا۔ "یقیناً آپ پوری طرح جانتے ہیں کہ یہ تیتر یہاں کیسے آئے ہیں۔" شہباز صاحب جھلا کر بولے۔ "یقیناً میں نہیں جانتا کہ وہ کیسے یہاں آئے ہیں!"

"تو سنیے میں آپ کو بتلاتا ہوں۔" ابو نے اپنی آواز کی شیرینی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ سمجھنا بہت آسان ہے۔ یہ سب چڑیاں جانتی ہیں کہ اگر آج کے دن وہ آپ کی زمین پر رہیں تو سب شکار کر لی جائیں گی۔ اس لیے شکار کی تقریب ختم ہونے تک وہ وہاں سے اڑ کر یہاں آ گئی ہیں۔" "بکواس! واہیات!" شہباز خاں گرجے۔

"یہ بات بکواس اور واہیات بالکل نہیں ہے۔" ابو نے کہا۔ "چڑیوں میں تیتر انتہائی ذہین ہوتے ہیں۔ کیوں ڈاکٹر صاحب؟"

"بالکل!" ڈاکٹر حسین نے کہا۔ "ان کی دماغی صلاحیتیں دوسرے پرندوں سے زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ جو کچھ ہونے والا ہوتا ہے اس کا انھیں احساس ہو جاتا ہے کوئی شک نہیں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا ان کو شکار کرنا بڑا زبردست اعزاز ہے اس سے بھی زیادہ نواب جہانگیر کا ان کو کھانا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں تیتر اس نکتۂ نظر سے مختلف دیکھتے ہوں گے۔"

"تم دونوں کمینے ہو! بدذات اور لفنگے ہو۔" شہباز خاں انتہائی غضب میں دھاڑے۔ "تم دونوں پاجیوں سے بھی بدتر ہو!"

"تو پھر اب! تو پھر اب!" مہتاب علی جلدی سے بولے۔ "یہ ذلت اور توہین کی باتیں یہاں نہیں چلیں گی۔ اس سے بات بگڑے گی۔ کوئی اچھا کام نہیں ہوگا۔ بہر حال صاحبان! میں ایک تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں اور وہ یہ کہ ہم سب مل کر ان تیتروں کو سڑک پر اڑائیں اور پھر وہاں

مسکن۔ دودھ پور، علی گڑھ

سے شہباز صاحب کی زمین کی طرف اڑانے کی اپنی پوری کوششیں صرف کردیں۔ شہباز صاحب! میری اس تجویز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"تمھاری تجویز معقول اور نہایت مناسب ہے۔ معاملات درست کرنے کی طرف درست قدم ہے" شہباز صاحب نے آواز نیچی کرکے کہا "اور اس پر جلد سے جلد عمل کر دو۔"

پھر سرجنٹ نے مڑکر ابو سے پوچھا "اور واجد! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو۔ کیا تمھیں بھی یہ بات منظور ہے؟"

"مجھے بالکل منظور ہے"۔ ابو نے سرجنٹ کو کچھ عجیب معنی خیز انداز سے دیکھ کر کہا "تمھاری تجویز بہت شاندار ہے۔ تمھاری مدد کرکے مجھے اور دادی کو بڑی خوشی ہوگی۔"

پتا نہیں اس وقت ابو کے دماغ میں کیا تھا۔ کیونکہ جب وہ کسی کو ایسی عجیب نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کوئی بہت ہی مضحکہ خیز بات ہونے والی ہے۔ سرجنٹ مہتاب کی عام طور پر سخت رہنے والی آنکھوں میں بھی اس وقت کچھ جھلملیاں سی مجھے نظر آرہی تھیں۔ "آؤ بیٹے! انھوں نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ ان سست نامعقول چڑیوں کو سڑک پر کھسکا دیں اس کے بعد وہ سارے فلنگ اسٹیشن پر اچھلتے۔ کودتے۔ بازوؤں کو ہلا ہلا کر۔ چلا۔ چلا کر ہنس ہنس کر تیتروں کو سڑک کی طرف دھکیل دینے کی کوشش کرنے لگے میں اور ابو بھی ان کی ساتھ اس احمقانہ کارروائی میں شریک تھے۔ اور آج دوسری دفعہ تیتروں کے بادل آسمان کی طرف پھڑ پھڑاتے ہوئے اٹھتے دکھائی دیئے تب مجھے اندازہ ہوا کہ جب ان پرندوں کو سڑک کی طرف اڑایا جائے گا تو سب سے پہلے بڑی چمکیلی سفید کار پر سے جو کہ شہباز صاحب کی تھی گزریں گے جو بیچ میں ان کے راستے میں کھڑی تھی۔ جس کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ جن چڑیوں پر نشہ گہرا تھا وہ ابھی اڑ نہیں سکتی تھیں۔ وہ ایک جھنڈ میں اڑنے کی کوشش کرتی تھیں اور نشہ کی غناہٹ میں زیادہ دور نہیں جاتی تھیں کہ پٹ سے اس شاندار گاڑی کی چھت اور بونیٹ کی چکنی بے داغ سطح پر گر جاتی تھیں اور وہاں پیر جمانے کی کوشش میں اپنے پنجوں سے اس کی پالش کو کھرچ اور رگڑ رہی تھیں اور آخر پھسل پھسل کر گر گر کر کسی نہ کسی طرح انھوں نے ساری چھت پر قبضہ کرلیا۔

"اوہ! ارے انھیں یہاں سے بھگاؤ!" شہباز صاحب چلا چلا کر کہہ رہے تھے "جلدی کرو! انھیں گاڑی پر سے بھگاؤ!"

گھبرایئے نہیں جناب! سرجنٹ نے باآواز بلند کہا "ہم ان کو بھگانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں آؤ بیٹے! کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کرنا ہی کیا ہے۔ انھیں سڑک پر ہی تو دھکیلنا ہے۔"

احمقو! پہلے انھیں میری گاڑی پر سے تو ہٹاؤ۔ شہباز صاحب غصے کے جوش میں اچھل اچھل کر پھنکار رہے تھے۔ کہہ رہے تھے انھیں دوسرے راستے سے بھیجو! جناب ہم ایسا ہی کریں گے۔ سرجنٹ نے جواب دیا۔

ادھر منٹ بھر میں۔ تیتروں کی لڑیوں اور ہاروں سے گاڑی سج چکی تھی۔ وہ اندر باہر اپنے پنجوں سے گاڑی کو کھرچتے، رگڑتے، پھدکتے، بھاگتے پھر رہے تھے اور گندے پنجوں کے نشانات چھوڑ رہے تھے۔ اور اس پر مزید یہ کہ اندر وہ اسٹیرنگ وھیل اور ڈرائیونگ سیٹ تک پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ سرجنٹ نے چالاکی سے ان کو اندر گھسایا تھا یا وہ خود ہی گھس گئی تھیں۔ لیکن یہ تماشا ہوا ایسی پھرتی اور ہوشیاری سے تھا کہ شہباز صاحب کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوسکی۔

او پاگل آدمی! شہباز صاحب پھنکارے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ ان کو میری گاڑی سے ہٹاؤ! دیکھ نہیں رہے کہ

انھوں نے میری گاڑی کی پالش کا ستیاناس کر ڈالا ہے۔
پالش! سرجنٹ نے تیتروں کا پیچھا روک کر کھڑے ہوتے ہوتے شہباز صاحب کی طرف دیکھا اور پوچھا کیسی پالش؟ بڑا افسوس ہے جناب! ہم نے ان چڑیوں کا رخ سڑک کی طرف کرنے کی پوری کوشش کر لی ہے۔ مگر یہ اس قدر گنوار ہیں کہ بات ہی نہیں سمجھتیں۔ ارے او عقل کے چوپٹ! میری کار! شہباز صاحب بڑبڑا کر دہاڑے، انھیں میری کار سے ہٹاؤ۔

اوہ اچھا! سرجنٹ نے زور سے سر ہلا کر کہا۔ آپ کی کار۔ جناب اب میں آپ کا مطلب سمجھا ہوں۔ یہ بہت ہی غلیظ اور قابل نفرت چڑیاں ہیں۔ لیکن آپ خود اندر جا کر گاڑی اسٹارٹ کیوں نہیں کر دیتے۔ وہ سب خود ہی اڑ جائیں گے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ جناب شہباز صاحب کو اس پاگل خانہ سے بھاگ نکلنے کا یہ بہانہ پسند آیا تھا۔ وہ فوراً ہی اس پر عمل کرنے کے لیے دروازہ میں سے اندر جا کر ڈرائیور سیٹ پر جا بیٹھے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے سرجنٹ نے کار کا دروازہ کھٹ سے بند کر دیا اور اچانک پھر کار کے اندر عجیب ہل چل، ہاہا، ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایک درجن سے بھی زیادہ تیتروں کے چڑ چڑ کرتے، پر پھڑ پھڑاتے کھرچتے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شہباز صاحب کی سیٹ کے چاروں طرف باہر نکلنے کے لیے بے تاب گھبرائی ہوئی چڑیاں اڑ اور پھر رہی تھیں۔ ادھر سرجنٹ مہتاب علی نے یہ تماشا دیکھ کر کھڑکی میں سے اپنے پولس مین والے لہجہ میں کہا۔ پروا نہ کیجیے جناب گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیجیے!

شہباز صاحب کے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ فوراً گاڑی اسٹارٹ کر دیں۔ گاڑی کو حرکت ہوتے ہی اس پر سے تیتروں کا عظیم الشان بادل اٹھا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ اور پھر ہم سب بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ جو تیتر کار پر سے اڑ رہے تھے وہ خلاف توقع بجائے گرنے کے ہوا ہی میں جمے رہے اور پورے فلنگ اسٹیشن کو پار کر کے ٹیلوں کی طرف جا رہے تھے اور پھر وہ اتنے تیز اڑے کہ نگاہوں سے بہت جلد اوجھل ہو گئے۔

ادھر جب تیتر اڑ رہے تھے تو ڈاکٹر حسین نعرہ لگا رہے تھے۔ واہ وا! شاندار! سلیپنگ پلس کا اثر بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اور اسی وقت چاروں طرف بیٹھے ہوئے تیتر بھی ہوش میں آنا شروع ہو گئے تھے اور اپنی ٹانگوں پر کھڑے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ گردنوں کو گھما پھرا اور ہلا رہے تھے۔ دو ایک نے بھاگنا شروع کیا تو ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی بھاگنے لگے۔ اور جب سرجنٹ نے ان کو بھگانے کے لیے اپنے بازو ہلائے تو سب کے سب پھرّا مار کر اوپر ہوا میں چلے گئے۔ فلنگ اسٹیشن کا چکر کاٹ کر آگے بڑھتے چلے گئے اور پھر پہلے جھنڈ کی طرح نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئے۔ اب ہم نے نیچے نگاہیں کر کے ادھر ادھر دیکھا تو وہاں ایک بھی تیتر باقی نہیں رہا تھا۔ بڑی عجیب بات یہ تھی کہ ان کا رخ نہ سڑک کی طرف تھا، نہ میدانوں کی طرف۔ نہ شہباز صاحب کے جنگل کی طرف تھا۔ سب مخالف سمت میں اڑے تھے۔ مین روڈ پر تقریباً بیس کاروں اور لاریوں کی قطار ایک دوسرے سے جڑی کھڑی تھیں اور ان کے پاس لوگ کھڑے ہوئے اس عجیب و غریب نظارے کے بارے میں جو ابھی انھوں نے دیکھا تھا باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ سرجنٹ مہتاب علی شہباز صاحب کو روانہ کر کے اب ٹریفک کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ آپ لوگ ہائی وے پر اس طرح راستہ روک کر کھڑے نہ ہو جیئے۔ آگے چلیے۔ دوسرے لوگوں کو گزرنے کا موقع دیجیے۔ جلدی کیجیے۔

(باقی آئندہ)

درخت ہم سب کے بہت پُرانے دوست اور رفیق ہیں، لیکن ہم انسانوں کا سلوک ان سے آج کل کچھ اچھا نہیں۔ ہم اپنے اس بے لوث دوست اور ہمدرد کے احسانات کو بھُلا کر اس کے ساتھ تکلیف دہ سلوک کر رہے ہیں، لیکن اس کے نتیجے ہمارے لیے نقصان دہ ہیں اور ہمیں طرح طرح کے صحت کے مسائل اور معاشی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ درخت، جنگل، پارک اور باغات ہر ملک اور معاشرے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ یہ درخت کھیتوں، چراگاہوں اور سبزہ زاروں کی بھی حفاظت اور ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔

ہر مذہب نے ہرے درخت کو کاٹنے سے منع کیا ہے، کیونکہ ان سے انسانوں اور جان داروں کو ان گنت فائدے ہیں۔ وہ ہمیں سایہ، سبزہ، خوبصورت پھول، مزے دار پھل، خوشبوئیں، بہار، جڑی بوٹیاں، کئی قسم کی لکڑی، دوائیں اور غذائیں عطا کرتے ہیں۔

درخت ایک ایسا رفیق ہے جو دوست دشمن سب کو اپنے سائے سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ درختوں کے احسانات یوں تو بے شمار اور مختلف نوعیت کے ہیں، لیکن ہماری زندگی پر ان کا یہ احسان کیا کم ہے کہ وہ ہوا کو صاف ستھرا اور آکسیجن سے بھرپور رکھتے ہیں۔ درخت دن کے وقت آکسیجن چھوڑتے اور رات کے وقت کاربن ڈائی آکسائڈ بناتے ہیں۔ دن میں وہ کاربن ڈائی آکسائڈ جذب کرتے ہیں اور رات میں یہ گیس خارج کرتے ہیں۔ جس سے زمین پر نظامِ حیات جاری اور متوازن رہتا ہے۔ درختوں کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ وہ بارش کے لیے بادلوں کو جمع کرتے اور نمی کو جذب کرتے ہیں، جس سے آبپاشی، شجرکاری، زراعت اور پینے کے لیے ٹھنڈا، میٹھا اور صاف شفاف پانی ملتا ہے۔

درخت ماحول کی حفاظت کرتے ہیں اور ہوا کی ساری کثافت اور آلودگی جذب کرکے اُسے پھر سے انسانوں اور دوسرے جان داروں کے لیے کارآمد اور زندگی بخش بنا دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہوا انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کی زندگی اور صحت کے لیے بھی لازمی ہے۔

درختوں اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ درختوں سے ہم لحمیات (پُروٹین)، حیاتین اور معدنیات حاصل کرتے ہیں۔ یہ اجزا گوشت اور دودھ دینے والے جانوروں کے لیے بھی بہت مفید ہیں۔ ان کے پتے، ٹہنیاں، پھل، شاخیں اور چھالیں بے شمار فائدوں سے مالا مال ہوتی ہیں۔ خشک موسموں میں درخت انسانوں کے لیے خاص طور پر مفید ہوتے ہیں۔ ان سے ہم کو جلانے کے لیے لکڑی اور کوئلا بھی ملتا ہے۔

افریقہ کے ساحلی علاقے میں تو یہ توانائی کی نوّے فی صدی سے زائد ضروریات پوری کرتے ہیں۔ ان کی لکڑی

تعمیرات، باڑھیں لگانے، پُل بنانے اور بہت سے آلے اور برتن بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔ ان کے ریشوں سے کئی ملکوں میں رسیاں بنائی جاتی ہیں۔ بعض درختوں کے پتوں، چھالوں، پھلیوں اور مختلف قسم کی گھاس سے چمڑا رنگنے کا کام لیا جاتا ہے۔ افریقہ کے درختوں سے عمدہ قسم کی دوائیں، رنگ، گوند اور میوے حاصل کیے جاتے ہیں۔

درختوں کے سائے میں نہ صرف مسافر اور تھکے ماندے لوگ آرام کرتے ہیں بلکہ بچے بھی کھیلتے کودتے رہتے ہیں۔ ان کے سائے میں پھول مہکتے ہیں اور نرم وخوبصورت سبزہ لہلہاتا ہے اور پھل دار پودے اور بیج والی غذائیں اُگتی ہیں۔

درخت اُس وقت سے انسان کا دوست ہے جب انسان جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ سب سے پرانا رفیق اُس وقت سے دوست اور ساتھی ہے جب نیلے آسمان کی چھت تلے انسان کا گہوارہ زمین پر تھا۔ ماہرین کی رائے ہے کہ ہر خطے میں ۲۵ سے ۲۸ فی صد جنگلات کا ہونا ضروری ہے۔ جب کچھ نہ ہو تو بھی درخت ہی ساتھی اور مددگار ہوتے ہیں۔ صدیوں تک انسان نے درختوں کی لکڑیوں سے ہتھیار، گھر، اوزار، زیورات اور ایندھن حاصل کیا ہے۔ پتھر کے دور سے پہلے اور اس کے بعد بھی انسانوں کا سب سے بڑا محسن درخت ہی رہا ہے۔ درخت کھیتوں اور وادیوں میں مٹی کو پانی اور تیز ہوا کے ساتھ منتقل ہو جانے اور ضائع ہونے سے روکتے ہیں۔ اس طرح زراعت کے لیے زرخیز مٹی ان درختوں کی وجہ سے کھیتوں اور وادیوں میں جمع رہتی ہے۔ درخت خود درختوں کی بھی حفاظت اور نشوونما کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے نہروں، جھیلوں اور دریاؤں کے کنارے مستحکم رہتے ہیں اور زمین میں کٹاؤ نہیں ہوتا۔ صحرائے اعظم افریقہ سے ہر سال چھے کروڑ سے بیس کروڑ ٹن ریت اُڑ اُڑ کر آس پاس کے علاقوں میں پھیلتی ہے۔ اس کا علاج ماہرین نے یہ بتایا ہے کہ اس صحرا کے اطراف جنگل جھاڑیاں اور درخت لگائے جائیں تاکہ ریت اُڑنے کا سلسلہ ختم ہو جائے اور مزید علاقے ریگستان کی زد میں نہ آئیں۔

م۔ ندیم

ایک تھا چوہا

ایک تھا چوہا اور ایک تھی چوہیا، اور ان کے ایک درجن بچے تھے۔ یہ سب شہر کے ایک گھنے آبادی والے گندے محلّے کے ایک چھوٹے سے مکان کی تاریک کوٹھری میں رہتے تھے۔ یہ مکان ایک گندی گلی کے نکڑ پر واقع تھا۔ وہاں پر ایک پانی کا نل بھی لگا ہوا تھا۔ جب برسات آتی تو ساری گلی میں پانی بھر جاتا تھا۔ وہاں بجلی کا ایک کھمبا بھی تھا لیکن شریر بچے اکثر بلب توڑ دیا کرتے تھے اس لیے وہاں رات کو اندھیرا ہی رہتا تھا۔ گلی میں کئی جگہ گڈھے بھی تھے۔ قصّہ مختصر یہ کہ شہر کی دوسری گلیوں کی طرح اس محلّے کی اور وہاں رہنے والوں کی حالت بھی خستہ تھی۔

بچے اسکول نہ جاکر صبح سے شام تک کھیلتے رہتے تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ بچوّں میں لڑائی ہوتی تو ان کی مائیں بھی ایک دوسرے سے لڑ پڑتیں اور خوب چلاتیں اور چیخ پکار مچاتیں، نتیجے میں کبھی کبھی مردوں میں بھی ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی۔

یوں تو شہر میں نیتاؤں اور افسروں کی کمی نہ تھی لیکن اس گندی بستی میں کوئی نہیں آتا تھا۔ اور نہ ہی اس کی گندگی دور کرنے کی طرف کوئی توجہ دیتا تھا۔ ہاں پانچ سال میں ایک بار جب الیکشن کا موسم آتا تب نیتا لوگ اس گندی بستی میں ضرور آتے تھے۔ وہ اس بستی کے ایک ایک دروازے پر جاتے اور ہاتھ جوڑ کر ووٹ کی

مزمل منزل۔ سِول لائن، علی گڑھ

بھیک مانگتے۔ان نیتاؤں کی تقریریں بھی ہوتی تھیں سب کا مطلب ایک ہی ہوتا۔

”بھائیو! مجھے آپ کی تکلیفوں کا احساس ہے۔ آپ لوگوں کی تکلیفیں دیکھ کر میرا دل روتا ہے۔ آپ لوگ مجھے ووٹ دیں۔ میں جیت جاؤں تو آپ کی اس گندی بستی کی ٹوٹی پھوٹی گلیوں کو درست کرا دوں گا۔ آپ کے بچوّں کے لیے اسکول کھلوا دوں گا۔ محلّے میں ایک شفاخانہ کھلوا دوں گا۔ بہت کچھ کروں گا۔ بس آپ مجھے ووٹ دے کر تو دیکھیں۔“

جب الیکشن ختم ہو جاتا تو پھر اگلے پانچ سالوں تک کوئی نیتا ادھر نہیں آتا تھا۔ اور لوگ بھول جاتے تھے کہ انھوں نے کسی کو ووٹ دیا تھا اور کسی نے ان کے محلّے کو سدھارنے کا وعدہ بھی کیا تھا!

تو گندی بستی کے ایک گھر میں چوہے میاں اور ان کا خاندان مزے سے رہتے تھے جس گھر کی تاریک کوٹھری میں یہ خاندان رہتا تھا، اس گھر کے لوگ صفائی ستھرائی سے کوسوں دور تھے۔ گھر بہت چھوٹا سا تھا۔ اس میں آٹھ آدمی رہتے تھے، ساتھ میں مرغیاں اور بکریاں بھی پلی ہوئی تھیں۔ صفائی نام کی کوئی چیز وہاں نہیں پائی جاتی تھی۔ چاروں طرف مکھیاں بھنکتی تھیں اور چوہے ڈنڈ پیلا کرتے تھے۔ چوہے میاں

اور ان کے بچے بے فکری کے ساتھ سارے گھروں
دوڑ لگایا کرتے تھے۔ باورچی خانے میں، آٹا، دال
چاول اور کھانا کھلا پڑا رہتا تھا، چوہے میاں کا سارا
خاندان کھا کھا کر خوب موٹا ہو رہا تھا۔ گھر کے
لوگوں نے کبھی چوہوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی!

لیکن چند دنوں سے ایک بڑے میاں چوہوں
اور انسانوں پر اپنا غصہ اتارنے لگے تھے۔ یہ بڑے
میاں جو ایک دفتر میں ملازم تھے۔ اور صبح جا کر شام
کو تھک ہار کر آتے تھے، اب ریٹائر ہو گئے تھے۔
اور اب ان کو کوئی کام نہیں تھا اس لیے کبھی بیوی
پر کبھی بچوں پر غصہ اتارتے، اور بڑبڑاتے رہتے
تھے۔ اور اب انھوں نے چوہوں کی طرف بھی توجہ دی
تھی۔ ایک دن صبح کے وقت بیوی نے بڑے میاں
کے لیے ناشتہ میں گھی کا پراٹھا تیار کیا اور چائے
وغیرہ کے ساتھ ان کی چارپائی پر رکھ دیا۔ بڑے میاں
منہ ہاتھ دھونے چلے گئے۔ چوہے میاں نے دیکھا
کہ تازہ تازہ پراٹھا اور حلوہ وغیرہ رکھا ہے تو جھٹ
چوہیا اور بچوں کو بلا لائے۔ جب تک بڑے میاں
منہ ہاتھ دھوکر آئیں تب تک پراٹھا اور حلوہ چوہے
صاف کر گئے۔ یہ دیکھ کر بڑے میاں کا پارہ ایک
دم چڑھ گیا۔ انھوں نے چلا چلا کر سارا گھر سر پر
اٹھا لیا اور قسم کھائی کہ چوہوں کو مار کر ہی دم لیں
گے۔

بیوی نے ان کے لیے دوسرا پراٹھا تیار کیا
بڑی مشکل سے بڑے میاں کا غصہ کم ہوا۔ لیکن
چوہوں پر ان کا قہر نازل ہو گیا۔ وہ ناشتہ کر کے
سیدھے شہر کے بازار گئے اور وہاں سے ایک مضبوط
چوہے دان خرید کر لائے۔ پراٹھے کا ٹکڑا اس میں
لگا کر کوٹھری کے اندر رکھ دیا اور خود کان لگا کر
قریب ہی بیٹھ گئے۔

چوہے میاں نے اس سے پہلے چوہے دان کبھی
نہیں دیکھا تھا۔ لکڑی کا خوبصورت گھر دیکھ کر وہ
اس کے اندر جا پہنچے اور یہ دیکھ کر ان کا دل باغ
باغ ہو گیا کہ اس میں پراٹھے کا ٹکڑا بھی رکھا تھا۔
اس پر منہ مارا تو کھٹ سے دروازہ بند ہو گیا۔
پراٹھا کھانا بھول گئے۔ بہت گھبرائے، بہت اچھلے
کودے، دوڑے بھاگے لیکن باہر نہ نکل سکے۔

بڑے میاں نے جو کھٹ سے آواز سنی فوراً
اندر آن کر دیکھا کہ ایک موٹا تازہ چوہا بند ہے۔
بہت خوش ہوئے۔

"کم بخت تجھے پراٹھا کھانے کا مزہ چکھاؤں گا۔"
وہ دانت پیس کر بولے۔

چوہے میاں کا دل دہل گیا کہ اب بڑے میاں
زندہ نہ چھوڑیں گے۔ بڑے میاں چوہے دان اٹھا کر
گھر سے باہر نکلے اور چلتے چلے گئے۔ گلی کے آخر میں
ایک گندے پانی کا تالاب تھا جہاں محلے کی نالیوں
کا سارا پانی اکٹھا ہوتا تھا اور اس گندے پانی
کی بدبو سارے محلے پر چھائی رہتی تھی۔

بڑے میاں نے کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔
کچھ سوچا اور پھر ایک اونچی سی جگہ پر کھڑے ہو کر
چوہے دان کا منہ کھول کر چوہے کو پانی میں چھوڑ دیا
بڑے میاں کا خیال تھا کہ چوہا پانی میں ڈوب جائے
گا لیکن چوہا تھا چالاک اس نے ایک ڈبکی لگائی اور
پھر تیرتا ہوا کنارے پر پہنچ گیا۔ بڑے میاں نے
یہ دیکھا تو ایک اینٹ اٹھا کر اس کو مارنے دوڑے
چوہے میاں جان بچا کر قریب کے ایک مکان میں
جا گھسے۔ مالک مکان بڑے میاں پر غصہ ہو کر بولا۔
"کیوں بڈھے، چوہے چھوڑنے کو میرا ہی گھر
رہ گیا تھا۔" بڑے میاں ہاتھ نچا کر بولے زبان سنبھال
کر بات کر، چوہا ہی تو ہے کوئی ہاتھی تو نہیں ہے۔"
آپس میں خوب تو تو میں میں ہوئی، پھر گالی گلوچ
اور بعد میں مار پیٹ تک نوبت آگئی۔ بڑے میاں

کے لڑکے اور رشتہ دار آگئے۔ مالک مکان کے بیٹے اور پڑوسی سبھی اکٹھا ہوگئے۔ اور پھر سارا محلہ وہاں اکٹھا ہوگیا۔ اب وہاں دو گروہ ہوگئے۔ ایک بڑے میاں کا حمایتی دوسرا مالک مکان کا، جس کے گھر چوہا گھسا تھا۔ دونوں گروہوں میں لڑائی ہونے لگی۔ اینٹ پتھر پھینکے جانے لگے، لاٹھیاں چلنے لگیں۔ پولیس آگئی۔ دونوں طرف کے لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ زخمیوں کو اسپتال پہنچا یا گیا۔ دوسرے دن اخباروں میں خبر چھپی۔

"چوہے نے محلّے میں لڑائی کرائی۔ کئی آدمی زخمی۔ بیس گرفتار، پانچ کے وارنٹ، باقی فرار۔ محلّے میں پولیس کا پہرہ۔ شہر میں چوہوں کی بھرمار۔" بڑے میاں کے سر پر چوٹ آئی تھی وہ اسپتال میں پڑے تھے۔ انھوں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی تو چوہوں کو گالیاں دینے لگے۔

چوہے میاں محلّے میں اتنا بڑا ہنگامہ دیکھ کر دل ہی دل میں انسانوں کی حماقت پر ہنس رہے تھے اور خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اللہ نے ان کو چوہا بنایا انسان نہ بنایا۔ لیکن ان کو اخبار والوں پر غصّہ آرہا تھا کہ چوہوں کو فضول میں بدنام کرتے ہیں۔ انسان آپس میں لڑتے ہیں اور الزام دھرتے ہیں بے چارے چوہوں پر!

اپنی محنت کے سہارے مزدور!
جھونپڑوں کو ہیں سنوارے مزدور!
جی چُراتے نہیں محنت سے کبھی
کتنے اچھے ہیں ہمارے مزدور!
کارخانوں میں ہے رونق ان سے
اپنے کاموں پہ ہیں سارے مزدور!
ان کی عزّت نہ ہو کیوں کر دل میں
کام آتے ہیں ہمارے مزدور!
ہم جو بو آتے ہیں کھیتوں میں اناج
گھر میں لاتے ہیں بچارے مزدور!
کوٹھیاں ان کی بدولت ہی بنیں
ہیں جو شہروں کے کنارے مزدور!
مشکلیں راہ میں آتی ہی رہیں
مگر ہمّت نہیں ہارے مزدور!
وہ چلے کام پہ دیکھو شوکت!
اپنے سینہ کو ابھارے مزدور

گانو جدہاں، جونپور، یوپی

شیر، چوہے اور بلّی

کہتے ہیں کہ چین کی سرحد پر ایک نہایت تازہ و پاکیزہ سبزہ زار تھا۔ اس سبزہ زار کو ایک بے حد خوفناک شیر نے اپنا پایۂ تخت بنا رکھا تھا اور ارد گرد کے تمام درندوں اور جنگلی جانوروں کو اپنا فرماں بردار بنا لیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جب وہ شیر بوڑھا ہوگیا تو بھوک سے پریشان رہنے لگا۔ بڑھاپے کی وجہ سے شیر کے پنجے نرم پڑ گئے تھے اور اس کے دانتوں میں سوراخ ہو گئے تھے۔ جب بھی وہ گوشت کھاتا تھا تو گوشت کے ٹکڑے اس کے دانتوں میں پھنس کر رہ جاتے۔ اسی سبزہ زار میں چوہے بھی بہت تھے۔ جب شیر سو جاتا تو چوہے ان ٹکڑوں کو دانتوں سے کھینچ کر نکالتے جس سے شیر کی نیند حرام ہو جاتی۔ شیر اپنے رعب کے باوجود ان چوہوں کے ہاتھوں تنگ آچکا تھا۔

اور یہ کوئی نئی بات نہیں، کیوں کہ اکثر تو ایک بڑا انسان کسی معمولی انسان سے عاجز آجاتا ہے۔ دریا اپنی گہرائی کے باوجود مینڈک ایسی حقیر چیز کے لیے دوڑ کا میدان ہے۔ کہتے ہیں کہ جب شیر کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو چیونٹیاں اس کے چمٹ جاتی ہیں اور اکثر شیر کا بچہ ان ہی چیونٹیوں کے ہاتھوں موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ شیر یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، لیکن اپنے بچے کو اس ظلم سے نجات نہیں دلا سکتا۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب اس لیے ہے کہ طاقت ور لوگ اپنی بے بسی کو جانیں اور اپنی طاقت پر گھمنڈ نہ کریں۔

غرض درندوں کا سلطان چوہوں کے معاملے میں مجبور ہوکر رہ گیا۔ آخر ایک دن اس نے بھیڑیے سے مشورہ کیا۔ وہ بھیڑیا بھی بڑا کائیاں تھا۔ کہنے لگا: "ہر درد کا درماں اور ہر زہر کا تریاق موجود ہے۔ جو کام کسی حیلے سے ہو سکتا ہے وہ طاقت سے نہیں ہو سکتا اور جو معاملے تدبیر سے نہ نمٹے وہ دبدبے سے ختم ہو جاتا ہے۔ گھر میں کوڑے کرکٹ کو جھاڑو سے دور کیا جاتا ہے، لکڑی سے نہیں۔ بلّی اس

بارگاہِ عالی کی ادنا رعیت ہے۔ حضور، چوہوں کو مار بھگانے کا کام بلّی کے سپرد کر دیں۔"

شیر کو بھیڑیے کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اس نے بلّی کو حاضر کیے جانے کا حکم صادر کیا۔ جب بلّی اس کے حضور میں پہنچی اور زمین بوسی کی رسم ادا کر چکی تو شیر نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بلّی بولی، "اگرچہ عالم پناہ، اس لونڈی کو اپنی خاد ماؤں کی فہرست سے خارج رکھتے ہیں، لیکن اس حقیر کو آپ کی رشتے داری کا فخر حاصل ہے۔ جہاں پناہ نے یہ تو سنا ہو گا کہ چوہوں نے ایک بار ایک بزرگ کو اسی طرح سے پریشان کر رکھا تھا۔ لہٰذا بزرگ کو حکم ہوا کہ شیر کے ماتھے پر ہاتھ رکھو۔ بزرگ نے جوں ہی شیر کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو شیر کو چھینک آ گئی اور فوراً دو بلیاں اس کے دونوں نتھنوں سے گر پڑیں۔ انھوں نے جلد چوہوں کا صفایا کر دیا۔ لہٰذا

اگر حضور پہرے داری اور چوکی داری اس لونڈی کے ذمے لگا دیں تو جس طرح اس خادمہ کے اسلاف نے کیا تھا یہ لونڈی بھی اس مہم کو سر انجام دے گی۔"

چناں چہ شیر نے دربار کی پاسبانی بلّی کے سپرد کر دی اور بلّی نے اس کام کو اطمینان سے انجام دینا شروع کر دیا۔ ادھر چوہوں نے جو بلّی کو دیکھا تو وہ تمام تتر بتر ہو گئے اور شیر ان سے محفوظ ہو گیا۔ وہ بلّی کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آنے لگا۔ اگرچہ بلّی نے چوہوں پر خوف و ہراس کے دروازے کھول رکھے تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بڑی نرمی و مہربانی سے بھی کام لے رہی تھی اور ان کو مکمل طور پر ختم کرنے سے بچ رہی تھی۔ دل میں کہتی تھی کہ اگر انھیں پورے طور پر ختم کر دیا تو شیر کو اس سلسلے میں میری کوئی ضرورت نہ رہے گی اور اس کے احسان و انعام کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔

جب کچھ مدت اس طرح گزر گئی تو ایک دن بلّی اپنے ایک بچے کو شیر کے پاس لے کر آئی اور کہنے لگی، "یہ میرا بچّہ ہے، اگر حضور اجازت دیں تو کبھی کبھار اسے اپنی جگہ پر کھڑا کر جایا کروں اور خود دوسرے بچوں کو دیکھ آیا کروں۔" شیر نے کہا، "ٹھیک ہے۔" چناں چہ اس رات بلّی نے اسے اپنی جگہ پر کھڑا کر کے خود گھر چلی گئی۔

بلّی کا بچّہ اپنی ماں کی حکمتِ عملی سے واقف نہ تھا۔ اسے کیا خبر کہ وہ چوہوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتی ہے۔ چناں چہ جو بھی چوہا باہر نکلتا وہ اسے پھاڑ کر رکھ دیتا، یہاں تک کہ اس رات تمام چوہے مارے گئے اور ان کی قوم میں سے ایک بھی نہ بچا۔ صبح کے وقت بلّی اپنے گھر سے نکلی۔ اس نے چوہوں کا جو یہ حشر دیکھا تو اپنے بچّے کو لعنت ملامت کرنے لگی اور بولی، "مجھ کو جس بات کا خوف تھا وہ آخر ہو کر ہی رہی۔ اب اگر بادشاہ سلامت کی عنایتیں ہم پر کم ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ ہر مہربانی کے پس پردہ کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے۔ زیادہ تر لوگ کسی کی غم خواری اپنے کسی مقصد کی خاطر کرتے ہیں اور جب ان کا وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو ان کی عنایتیں و غم خواری بھی کم ہو جاتی ہے۔"

چنانچہ جب کچھ دن اسی طرح گزر گئے اور شیر چوہوں کی مصیبت سے نجات پا گیا تو ایک دن شیر نے سوچا کہ بلّی کو تو محض چوہوں کو دور رکھنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ اب کہ چوہوں کا معاملہ نمٹ چکا ہے تو بلّی سے بھی معذرت کر لینی چاہیے۔ اس بنا پر اس نے بلّی کو پہرے داری سے چھٹی دے دی۔

بلّی اپنے بچّے پر برس پڑی کہ یہ سب تیرا ہی کیا ہوا ہے۔ اگر تو ان چوہوں کو ختم نہ کرتا اور شیر کو فراغت حاصل نہ ہو جاتی تو آج وہ مجھے اس منصب سے علاحدہ نہ کرتا۔

بلّی کا بچّہ چوہوں کے اس قتلِ عام پر بے حد پشیمان ہوا۔

پیامی ادبی معماء 7

بمبئی کے فساد کی وجہ سے بہت بچے اس میں حصہ نہ لے سکے اس لیے ان کی خواہش پر معماء کی تاریخ ۱۵ جون سے بڑھا کر ۱۵ جولائی کر دی گئی ہے (اڈیٹر)

بچوں کے لیے نئی اور دلچسپ کتابیں

کہانیاں، معلوماتی، سوانح

کتاب	قیمت
چمپاوت کا آدم خور شیر	۱/۵۰
چھوٹا لڑکا	۱/۵۰
نیلا ہیرا	۴/۵۰
چیونٹی رانی	۱/۵۰
بھیڑ میں جگنو کیا خاک	۱/۵۰
بی مینڈکی اور کوا	۱/۵۰
مچھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
لومڑی کا گھر	۱/۵۰
بندر اور نائی	۲/۵۰
جادو کا گھر	۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
ہیتو جیتو	۱/۵۰
پانچ بونے	۱/۵۰
تاک دنا دن نا کے سے	۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے	۱/۵۰
پان کھاکر طبلہ بجاکر رام ناچا	۱/۵۰
پکڑو دم کتے کو	۱/۵۰
لال مرغی	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (اول)	۲/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (دوم)	۲/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (اول)	-/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (دوم)	-/۵۰
گلد بوچو ہیا اور غبارے	۱/۵۰
ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰
آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰

کتاب	قیمت
محمد شفیع الدین نیر	۷/۵۰
ہار کی تلاش	۶/۰۰
موم کا محل	۴/۰
اس نے کیا کرنہ جانا	۱/۲۰
خربوزہ شہزادے کا سرن گیا	۱/۵۰
ایک بجوری تیل میں	۱/۵۰
چوہی کی عادت	۲/۰۰
دادا نہرو	۵/۰۰
بچوں کے اقبال	۴/۵۰
دم کٹا سانپ	۱/۰۰
پہیلیاں	-/۸۰
تین اناڑی	۲/۰۰
میگھ نگر کا راجا	۱/۲۵
سندر چنار	/۷۵
کھیل سنسار	۴/۵۰
جوہر قابل	۳/۰۰
میر انیس	۲/۰۰
چنبیلی	۱/۲۰
شہزادہ اور ٹھگ	۲/۰۰
خرگوش کی چال	۲/۵۰
چٹانوں کی کہانی	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰
خرگوش کا سپنا	۵/۰۰
شیر خاں	۱/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
بہادر	۲/۵۰

کتاب	قیمت
میاں دھیچوں کے بچے	۱/۵۰
لومڑی کے بچے	۱/۵۰
تانبیل خاں	۱/۵۰
صحت کی الف بے	۳/۰۰
دھنک	۳/۰۰
گلا بوچو ہیا اور پری زاد	۲/۰۰
جلو مرغابی	۳/۰۰
وطن کے جاں نثار	۳/۰۰
سرکس	۱/۵۰

مذہبی کتابیں

کتاب	قیمت
ہمارا دین (اول)	۶/۰۰
ہمارا دین (دوم، سوم) فی حصہ	۶/۰۰
یسرنا القرآن	۲/۲۵
اسلام کیسے شروع ہوا	۴/۵۰
ہمارے رسول	۳/۰۰
ہمارے نبی	۱/۵۰
اسلامی عقائد و مسائل مذہب	۶/۰۰
قرآن پاک کیا ہے	۳/۰۰
اللہ کا گھر	۳/۰۰
عقائد اسلام	۱/۵۰
حضرت نظام الدین	۲/۰۰
چار یار	۴/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰۰
سرکار دو عالم	۳/۰۰
اسلام کیسے پھیلا (حصہ اول)	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا (حصہ دوم)	۴/۵۰
خلفاء اربعہ	۳/۷۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جب شہد کی مکھی کاٹتی ہے

تحقیق کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے آج کل برطانیہ میں شہد کی مکھی کے کاٹنے کے مثبت اثرات پر تحقیق ہو رہی ہے اور جو نتائج سامنے آئے ہیں، وہ بڑے دلچسپ ہیں۔ توقع ہے کہ جلد ہی شہد کی مکھی کے زہر کی تحقیق کے نتیجے میں چند ایسی دوائیں ضرور ایجاد ہو جائیں گی جن سے انفلوئنزا اور گٹھیا جیسے امراض پر قابو پایا جا سکے گا۔ شہد کی مکھی کا کاٹنا انتہائی تکلیف دہ عمل ہے مگر وہ جو زہر انسانی خلیوں میں اتار دیتی ہے اس کے اپنے اثرات ہوتے ہیں۔ گہرے اور دور رس زندہ خلیے شہد کی مکھی کے زہر کے زیر اثر خارجی حرکات پر اپنے دروازے جس طرح کھولتے اور بند کرتے ہیں اس کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔

یہ تحقیق برطانیہ کی Essex یونی ورسٹی کے رچرڈ شیری نے کی ہے جو عرصے سے انسانی خلیوں پر شہد کی مکھی کے زہر کے اثرات پر مطالعہ کر رہے ہیں، اب تک خیال یہ تھا کہ یہ زہر خلیوں کے گرد چربی دار جھلی کو تحلیل کر کے بالآخر خلیوں کو ہی تباہ کر دیتا ہے شیری کا خیال ہے کہ اس زہر کے اثرات اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ دراصل خلیوں کی جھلی پر چربی دار Molecules کی ایک ایسی قطار ہوتی ہے جس پر پروٹین کے ناہموار سے ابھار ہوتے ہیں۔ یہ پروٹین ایک طرح کے راستے کا کام کرتی ہے۔ اس راستے سے غذا کے ٹکڑے جسم کے بے کار اجزا اور ہارمون آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس کی مدد سے خلیوں کے مختلف دروازے ضرورت کے مطابق کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔

شیری کی تحقیق کے مطابق شہد کی مکھی کا زہر چربی کو تحلیل کرنے کے بجائے خلیوں میں جمع پروٹین کو متاثر کرتا ہے یہ زہر پروٹین کو ادھر سے ادھر کرتا ہے اور ان کی ترتیب بدل دیتا ہے۔ اس طرح یہ زہر خلیوں میں کیمیاوی مادوں کے بہاؤ کو متاثر کرتا ہے گٹھیا کے مرض میں رسولی خلیے

جنہیں مستولی خلیے بھی کہتے ہیں Histamines خارج کرتے ہیں جن کی مدد سے ورم ہو جاتا ہے اور درد ہونے لگتا ہے خلیوں کو متحرک کرنے کا کام اطباء Immunoglobulins کے انجکشن کے ذریعہ کرتے ہیں مگر شیری اور ڈاکٹر ڈینس اوسٹن ورتھ کا خیال ہے کہ جو کام اس انجکشن کے ذریعے لیا جاتا ہے، وہی کام زیادہ بہتر طور پر شہد کی مکھی کے زہر سے لیا جا سکتا ہے۔ یہ زہر بھی خلیوں میں پروٹین کی ترتیب و ترکیب کو بدلتا اور متاثر کرتا ہے۔ بعض دوسرے زہروں سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے مگر شہد کی مکھی کے زہر کی بات ہی کچھ اور ہے۔ (ترجمہ)

س: کیا کیوی اور پنگوئن پرندے ہیں اور کیا یہ ہندستان میں بھی پائے جاتے ہیں؟

(جواد اصغر بلگرامی)

ج: کیوی (KIWI) اوسٹریلیا کا ایک پرندہ ہے جس کی چونچ لمبی ہوتی ہے۔ اس کی تصویر آپ نے پہلے بھی کہیں پر دیکھی ہوگی۔ پنگوئن جنوبی قطب کے آس پاس نہایت سرد علاقے کا ایک پرندہ ہے۔ جس کے بال سیاہ اور پیٹ کا نچلا حصہ سفید ہوتا ہے۔ یہ پرندہ اُڑ نہیں سکتا بلکہ پُھدک پُھدک کر آگے بڑھتا ہے یہ پرندہ ہندستان میں نہیں ہوتا۔

س: برفانی انسان کا کیا واقعی وجود ہے؟ وضاحت سے تحریر فرمائیں۔

(سید رضی محمد نقوی)

ج: دُنیا کی بہت سی ایسی ہستیوں پر افسانے شائع ہوچکے ہیں جن کا وجود ہونے نہ ہونے کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ برفانی انسان بھی اسی قسم کی مخلوق ہے۔ اس کے متعلق ہمالیہ کے رہنے والے گورکھے اور شرپا عقیدت کے ساتھ طرح طرح کے قصے بیان کرتے ہیں اور اپنے آبا واجداد میں سے بعض کا نام بھی لیتے ہیں کہ انھوں نے اس دیو قامت انسان کو دیکھا تھا۔ لیکن ابھی تک کسی مہذب انسان کے اُسے دیکھنے یا تصویر لینے کے متعلق کوئی حقیقی واقعہ پڑھنے یا سُننے میں نہیں آیا۔ بعض سیاح بندوقیں لے کر ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں تک بھی پہنچے، لیکن خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ بعض نے یہاں تک لکھا کہ انھوں نے برف پر پیروں کے بہت بڑے بڑے نشان بھی دیکھے جو اسی مخلوق کے ہو سکتے ہیں۔ اب اس پر ایک فلم بھی بن گئی ہے۔ جس میں اُس مخلوق کو نہایت شہ زور دکھایا ہے لیکن یقین کے ساتھ اس کے موجود ہونے کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ غالباً افسانہ ہی افسانہ ہے اور اس کی تصویریں بھی فرضی ہیں۔

س: سردی میں پانی کیوں ٹھنڈا ہوتا ہے؟

(طارق محمود)

ج: اس لیے کہ پانی بھی دوسری چیزوں کی طرح سردی گرمی کا اثر قبول کرتا ہے۔ اگرچہ پانی حرارت کا اچھا موصل نہیں ہے۔ یعنی وہ دیر میں گرم ہوتا ہے اور دیر میں ہی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ لیکن جب موسم سرما میں ہمارے ہاں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے تو دوسری چیزوں کی طرح وہ بھی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

س: نوبیل پرائز سے کیا مُراد ہے؟ وہ کس سلسلے میں دیا جاتا ہے اور کس صورت میں دیا جاتا ہے نیز یہ بتائیے کہ اب تک کتنے اشخاص یہ پرائز حاصل کر چکے ہیں؟

(محمد قیصر خاں)

ج: ایلفرڈ نوبیل سوئیڈن کا ایک کیمیا داں تھا جس نے ڈائنامائٹ ایجاد کی جو دھماکے پیدا کرنے اور پہاڑ توڑنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اُس نے اس ایجاد سے بے انتہا دولت کمائی جس کی آمدنی سے ہر سال پانچ انعامات ادب، سائنس، امن اور دیگر علوم پر نہایت باکمال لوگوں کو دیے جاتے ہیں جن کا انتخاب ایک کمیٹی کرتی ہے۔ اس انعام کی رقم بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک تمغا بھی دیا جاتا ہے۔ نوبل پرائز دنیا کا سب سے اہم اور وقیع انعام ہے۔ اب تک بہت سے قابل افراد کو یہ انعام مل چکا ہے۔

● ایک بچی (قسائی سے) آپ اس بکرے کو کہاں لے جا رہے ہیں

قسائی: ذبح کرنے کے لیے۔

بچی: اُف وہ! میں سمجھی آپ اسے اسکول چھوڑنے لے جا رہے ہیں

● محمد ہارون (اکولہ)

● ایک سیاح نے ایک مقامی شخص سے پوچھا: کیسے گزر رہی ہے؟ مقامی بولا جناب مزے سے گزر رہی ہے۔ مجھے درخت کاٹنے تھے طوفان آیا سب گر پڑے اور میں اس زحمت سے بچ گیا۔

سیاح: خوب۔

مقامی: گھاس جلانی تھی، بجلی گری سب جل گئی اور مجھے تکلیف نہ کرنی پڑی۔

سیاح: بہت خوب اب کیا ارادے ہیں؟

مقامی: بس زلزلے کا انتظار کر رہا ہوں کہ نیچے کی زمین اوپر ہو جائے اور میں آلو اکھاڑنے کی زحمت سے بچ جاؤں۔

● عذرا خان

پھلواری شریف۔ پٹنہ

ایک انگریز ہندستان آیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی مگر پیسے نہیں تھے۔ وہ حلوائی کی دکان پر گیا اور حلوہ کھانے لگا۔ حلوائی اسے قاضی کے پاس لے گیا۔ قاضی نے اس کے لیے سزا تجویز کی کہ اسے گدھے پر بٹھا کر بچوں کو ساتھ کر دیا جائے تاکہ بچے تالیاں اور ڈھول بجاتے جائیں۔

انگریز جب واپس انگلستان گیا تو دوستوں نے پوچھا ہندستان کیسا ملک ہے؟ انگریز نے جواب دیا:

ہندستان بہت اچھا ملک ہے حلوہ مفت کھانے کو ملا۔ ڈم ڈم کی سواری مفت کی اور ہر جگہ بچوں نے شاندار استقبال کیا۔

● شاہد سیّد (بمبئی)

● ایک دوست دوسرے سے: اگر کسی اسٹیشن پر گاڑی صرف ایک منٹ کے لیے رکتی ہو اور وہاں انسان کا دل چائے پینے کو چاہے تو کیا کرنا چاہیے؟

دوسرے نے جواب دیا: آسان سی بات ہے گارڈ کو ساتھ لے جانا چاہیے۔

● ریحان احمد (کٹیہار)

● اُستاد (شاگرد کے باپ سے): آپ کا بیٹا کلاس میں بہت شور کرتا ہے۔ اسے سمجھائیے گا۔

شاگرد کا باپ: جناب اسی لیے تو میں اپنے دوسرے بیٹے کو بھی داخل کرانے لایا ہوں ان دونوں بچوں نے تو پورے محلے کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔

● نازنسرین و ناز پروین
(پتیا نہ کلٹی)

دوست:- آج میں نے آپ کی دولت مندی کی بہت تعریف کی۔

نیا دوست:- مگر کس سے؟ دوست:- انکم ٹیکس آفیسر سے۔

● محمد ارشاد عالم آوگانوی (نالندہ)

(شیام کے والد صاحب) شیام تمہاری بری حرکتوں سے میرے نام پر دھبّہ پڑ گیا ہے۔

شیام- کوئی بات نہیں پتا جی۔ میں دھبّے کو ربر سے مٹا دوں گا۔

● ظہیر اعجاز (دبانگل)

"بچوں کی کوششیں" میں انعام الرحمٰن کی تقریر اس شمارے کی جان ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ پیامیوں اور دوسرے طلبہ کے لیے ایک مشعل راہ ہے۔ اسے پڑھ کر ان کے اندر بھی ایسے مقابلوں میں حصّہ لینے کا حوصلہ جاگے گا کم از کم ایسے اور "دشمن کا علاج" جیسے مضامین "پیام تعلیم" کے ہر شمارے میں شائع کرنے کی کوشش کیجیے۔ "بچوں کی کوششیں" میں "ضمیر کی آواز" "ترانہ انسان" اور "گیارہ چیزیں یاد رکھیے" پسند آئیں۔ سبزیوں اور پھلوں کے مشاعرے کے بعد اب پھر کوئی مشاعرہ کروایئے۔

● جاوید نہال حشمی آئی۔ سی
(فرسٹ ایئر) ہگلی محسن کالج، چنسورہ

مارچ ۱۹۸۴ء کا "پیام تعلیم" نظر سے گزرا ٹائیٹل بہت خوبصورت تھا۔ اس بار سبھی کہانیاں تقریباً اچھی تھیں۔ رئیس صدیقی صاحب کا مضمون "بچوں کے نیر صاحب" بہت پسند آیا امتہ الرحمٰن محسنی کی اس بار "دو شکاری" کی قسط بھی بہت شاندار ہے میری طرف سے انھیں مبارکباد قبول ہو۔ "دو شکاری" کی کامیابی کا راز ان کے قلم میں پوشیدہ ہے۔ رحمٰن حمیدی کی "لالچ کا انجام" اور محمد آصف زبیری کی "چالاکی" بھی بہت مزیدار رہے۔ مرغوب زماں کی نظم "تعویذ" بہت اچھی لگی۔

● محمد شکیل راوت
مکان ۳۹۷ محلہ کچہ کوٹ مالیر کوٹلہ

ڈاکٹر قمر احمد رضوی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے جغرافیہ جیسے خشک مضمون کو خاصا دلچسپ بنادیا ہے۔ اس بات کا ثبوت ان کا مضمون "سفید ریگستان" ہے۔ براعظم انٹارکٹیکا سے ان کی گفتگو بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ سبھی کہانیاں اثر انگیز ہیں "دو شکاری" کی قسط لاجواب ہے۔ "مصریوں کی شادی" بھی خوب رہی۔ جناب ڈاکٹر شمشاد ادیب سہارنپوری کی کہانی "سپاہی راجا" واقعی مزے دار ہے۔

یہ تو تھا تصویر کا ایک رُخ۔ حق تو یہ ہے کہ اس کا دوسرا رُخ بھی دکھاتا چلوں۔ پیام تعلیم جیسے عمدہ رسالے میں کھیل کود کے کالم کی کمی کھٹکتی ہے۔ میری ناقص رائے میں کھیل کی دنیا پر مختصر ہی سہی لیکن مستقل کالم رکھیں۔

"اطہر پرویز نمبر" کے ذریعہ ہمیں اپنے ممتاز ادیب کو جاننے کا موقع ملے گا۔

● سہیل ارشد
انڈال۔ بردوان۔ (مغربی بنگال)

میں "پیام تعلیم" کا مطالعہ کرنے کے لیے بیقرار رہتا ہوں جب تک تمام کالموں کا مطالعہ نہیں کر لیتا چین سے نہیں بیٹھتا۔

"پیام تعلیم" دن بہ دن ترقی کرتا جا رہا ہے۔ یہ سب آپ کی محنت اور مضامین کے انتخاب کا کمال ہی ہے اس کے تمام مضامین قابل تعریف ہیں خاص کر "گدگدیاں"، "قلمی دوستی" "آدھی ملاقات" وغیرہ۔ "پیام تعلیم" کی یہ ترقی اور کامیابی ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ہمارا پسندیدہ رسالہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے اور کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومے۔ آمین

یم امتیاز احمد شبنم۔ وانمباڑی ع ا

بچوں کی کوششیں

نکھٹو دیو

جاپان میں ایک پہاڑ کے دامن میں ایک گانو تھا پہاڑ پر ایک بہت ظالم دیو رہتا تھا وہ گانو والوں کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ ایک دن جب کسان اپنے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کسی نے ان کی سبزیوں کو خراب کر دیا ہے اور ساری کیاریوں کو اُجاڑ دیا ہے۔ وہ بہت غصہ ہوئے اور سب کے سب چلاتے ہوئے پہاڑ کے نیچے جمع ہوئے تب وہ دیو باہر آیا اور کہنے لگا کہ اسے روز ایک انسان کھانے کے لیے ملنا چاہیے۔ اس کی وجہ پوچھنے پر دیو نے کہا چونکہ میں سب سے بڑا دیو ہوں اس لیے میں ہر کام کر سکتا ہوں۔ تب سارے کسان اس سے کہنے لگے کہ اگر وہ صبح سورج نکلنے سے پہلے سے سورج ڈوبنے تک پہاڑ کی چوٹی تک ایک سیڑھی بنا دے تو اسے وہ لوگ سب سے بڑا دیو مان لیں گے۔

دیو تیار ہو گیا اور پھر اپنے گھر جا کر سو گیا سورج ڈوبنے پر اٹھا اور جا کر گانو کے سارے مرغوں کا سر کاٹ کر آ گیا اور پھر بہت تیزی سے سیڑھی بنانی شروع کی مگر جب وہ مرغوں کے سر کاٹ رہا تھا تو ایک پری نے اسے دیکھ لیا اور بعد میں جا کر سب کے سر جوڑ دیے۔ ادھر دیو خوش تھا کہ اب میں آرام سے کام کر سکوں گا اور لوگ اس وقت تک نہیں اٹھیں گے جب تک مرغے نہیں بولیں گے۔

مگر جب سیڑھی پوری ہونے میں دو تین پتھر کی کمی رہی سورج نکل آیا اور سارے مرغے بولنے لگے دیو چلایا کہ ہائے میرا وعدہ پورا نہ ہو سکا پھر وہ وہاں سے دور چلا گیا اور کبھی نہ آیا سارے کسان خوشی خوشی رہنے لگے کبھی کبھی وہ پہاڑ پر جاتے اور وہاں سے نیچے کا نظارہ کرتے تھے۔

ریاض الدین
(درجہ ہشتم) جامعہ ملیہ اسلامیہ
مڈل اسکول

محبت

سردیوں کا موسم ہے۔ ہمارے محلّے میں ایک نیا ڈاکیا آیا ہے اس کا نام عامر ہے ــــ وہ سرکاری نوکری کرتا ہے۔ سرکاری نوکر ہونے کے باوجود اس کی تنخواہ کم تھی مگر وہ اس میں بھی اللہ کا شکر ادا کیا کرتا تھا۔ وہ اپنا کام بہت خوش اسلوبی سے کیا کرتا جس سے اس کے اسٹاف کے لوگ اس سے خوش رہنے لگے اور محلّے کے بچّے بھی اس سے خوش ہوتے تھے۔ وہ محلّے والوں سے خوش رہتا اس کے اندر محبّت کوٹ کوٹ کر

بھری تھی وہ ہر ایک سے بہت محبت کرتا تھا ہر روز ڈاک خانے سے واپس آتے ہوئے اپنے محلّوں کے بچّوں سے ضرور مل لیتا پھر اس کے بعد گھر واپس جاتا۔ وہ بچّوں کے لیے ہر روز چیزیں لاکر ان کو دیا کرتا۔ اور بچّے بھی خوش ہوتے اور خوش ہوکر لیتے تھے۔ تاکہ عامر کا دل نہ ٹوٹ جائے، اس خیال سے وہ چیزیں اپنے ماں باپ کو دکھاکر کھالیتے تھے۔ جب وہ شام کو لیٹنے کے لیے اپنے بستر پر جاتا تو سوچنے لگتا کہ کہیں میرا تبادلہ ہو گیا تو پھر ان بچّوں کا کیا ہوگا، جو مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ میں بھی ان کو بہت چاہتا ہوں اور میرا کیا ہوگا وہ اپنے خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ ایک آدمی کو قریب دیکھ کر مڑ گیا پھر اس نے محبت کر کے سلام کیا اور کہا کہ آپ کون ہیں کہ میں نے آپ کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس شخص نے کہا جو تو دعا مانگ رہا تھا، وہ تیری دعا قبول ہوگئی جو مانگنا ہے اپنے خدا سے مانگ لے۔ پھر عامر نے سوچا کہ کیا مانگا جائے اس نے کہا کہ پھر لیں۔ میں مانگ لوں گا۔

ایک دن شام کے وقت عامر اپنی ڈاک دینے جا رہا تھا کہ راستے میں طوفان آگیا طوفان بہت سخت تھا، اور پھر اس کے بعد بہت زوروں کی بارش ہوئی اسی طوفانی بارش میں وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا ادھر کسی بچّے نے عامر کو دیکھا اس نے عامر کو ہوش میں لانے کے لیے پانی تلاش کیا۔ پانی تو بہت تھا ابھی بارش جو ہوئی تھی مگر اس بچّے کے پاس کوئی برتن نہیں تھا، جس میں وہ پانی بھرے اس نے دونوں ہاتھوں میں پانی بھر کر اس کے منہ پر ڈالا ——— عامر کو ہوش آنے لگا۔ جب اس کو پوری طرح ہوش آگیا تو بچّے سے پوچھا کہ میں کیسے گر پڑا بچّے نے بتایا کہ آپ پہلے سے گرے پڑے تھے میں ادھر نکلا اور آپ کو بے ہوش پڑا پایا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ عامر نے اس کو بہت پیار کیا اور بہت سی دعائیں دیں۔ دیکھو بچو، اگر ہم بچّوں سے محبت کریں گے تو بچّے ہم سے محبت کریں گے عامر بچّوں سے کتنی محبت کرتا تھا اور بڑوں کی عزّت کرتا تھا اس لیے بچہ ہی اس کے کام آیا۔ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم بھی بچّوں سے محبّت کرتے تھے اور بڑوں کی عزّت کرتے تھے عامر میں بھی کچھ باتیں ایسی ہی تھیں وہ بڑوں کی عزّت کرنا جانتا تھا اس لیے کہتے ہیں جب ہم دوسروں کی عزّت کریں گے تو لوگ ہماری عزّت کریں گے

رعنا واحد اٹاوہ
جامعہ نگر کوارٹر باغ ۱۱۰ ای
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جواہر لال نہرو

نہرو ایک طرح سے خود ہندستان تھے یہ ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پنڈت موتی لال نہرو اور والدہ سروپ رانی دیوی نے ان کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے کی آپ کے والد پنڈت موتی لال نہرو الہ آباد میں ایک کامیاب بیرسٹر رہے گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ آپ مئی ۱۹۰۵ء کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ گئے وہاں سے ۱۹۱۲ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ہندستان واپس آئے اور الہ باد میں وکالت شروع کی وکالت میں آپ کا دل نہ لگا تب کانگریس میں شریک ہوئے۔ اور پھر ۱۹۱۳ء میں یو۔ پی۔ (اتر پردیش) کانگریس میں حصّہ لیا۔ آپ نے ۱۹۱۵ء میں الہ آباد میں پہلی تقریر کی جو اخباروں میں انگریز حکومت کے خلاف چھپی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں آپ کا بیاہ کملا نام کی ایک دیوی سے ہوا اُن سے ان کی

ایک بیٹی نے جنم لیا جو آج ہندستان کی وزیر اعظم ہیں آپ آزادی کی لڑائی میں کئی بار جیل گئے۔ انھوں نے ملک کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ مل کر انگریز حکومت پر نکتہ چینی کی اور آخر کار ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرالیا آپ ہندستان کے سب سے پہلے وزیر اعظم بنے آپ نے منادی کرائی کی ہر ہندستانی شہری کا آزادی پر برابر کا حق ہے اور ہر ہندستانی شہری کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کا اختیار ہے چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی حکومت عوام کے خلاف قدم اٹھائے یا عوام کو ان کے حقوق سے محروم کرے یا عوام پر کسی قسم کا ظلم وستم کرے تو عوام کو حق ہے کہ وہ اس حکومت کو بدل دیں یا ختم کر دیں۔

ہم میں سے ہزار ہا لوگ ایسے ہیں جنھوں نے آزادی میں سانس لیا اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے غلامی میں سانس لیا۔ جنھوں نے آزادی میں میں سانس لیا ہے وہ آزادی کی قدر نہیں کرتے اور وہ لوگ جنھوں نے غلامی میں سانس لیا ہے، وہ آزادی کی قدر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آزادی کتنی محنت و مشقت سے ملی ہے ہمیں چاہیے کہ لوگوں میں آزادی کی قدر کرنے کا جذبہ پیدا کریں اور وطن والوں کے دلوں سے کینہ نکال پھینکیں اور یگانگت محبت اور خلوص پیدا کریں۔

۲۷ مئی ۶۴ء کو اس سورج نے ڈوبنے سے پہلے قوم کو آخری بار مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "کون ہے جو میری جگہ لے گا"، اور اس وقت ۵۴ کروڑ انسانوں نے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں رندھے ہوئے گلے سے جواب دیا تھا کہ ہم کوشش کریں گے۔ اب جبکہ تاریخ کا جبر اپنی طاقت کے ساتھ اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ ملک کا وہ جیالا بیٹا جس نے سارے ہندستان کو ایک رشتے میں پرو دیا تھا اور ایک خوش حال ہندستان کی نئی عمارت بنا رہا تھا، قوم کا وہ سیاست داں جس نے اپنی حق گوئی اور بے باکی کی بنا پر ساری دنیا میں ہندستان کا سکہ جما دیا تھا۔ اب ہمارے درمیان نہیں رہ گیا تو ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ سب کام اب ہم کو خود کرنے ہیں ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو وہ عہد آفریں شخصیت جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ نئے ہندستان کی تعمیر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی اب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نہرو نے ہمیں کیا کچھ دیا ہے جواہر لال کی موت کے بعد ان کی کام کی میز پر ایک چھوٹے سے پیڈ پر امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی نظم کا ایک ٹکڑا ملا جس کا اردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

"میرا یہ جنگل بہت خوبصورت ہیں، تاریک ہیں کتنے گنجان ہیں مگر ان سے وابستہ میرے کئی عہد و پیمان ہیں ابھی نیند آنے سے پہلے کئی میل جانا ہے مجھ کو ابھی نیند آنے سے پہلے کئی میل جانا ہے مجھ کو!"

● محمد انور — دہلی

زہر کی پیاس

کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اسے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دن صبح کو ناشتہ کرنے کے بعد بادشاہ اپنے وزیر اور دو غلاموں کے ساتھ جنگل گیا۔ بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکا لیکن شکار نہیں ملا۔ اتفاق سے بادشاہ کی نظر ایک ہرن پر پڑی۔ بادشاہ اس کا پیچھا کرنے لگا۔ اور اس طرح وہ بہت دور نکل گیا۔ مگر ہرن کو ہاتھ نہ آنا تھا نہ آیا۔ وزیر اور غلام اسی جگہ چھوٹ گئے تھے جہاں سے بادشاہ نے ہرن کا پیچھا کیا تھا۔ دوپہر

کا وقت تھا اور گرمی بھی خوب پڑ رہی تھی۔ بادشاہ کو بہت زوروں کی پیاس لگی۔ ادھر ادھر دیکھا لیکن پانی کہیں نہیں ملا۔ آخر وہ تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اسی دوران اس کے سامنے پانی کا ایک قطرہ گرا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ اسی طرح پانی گرنے لگا۔ بادشاہ نے، جو پیاس سے بے حال ہو رہا تھا فوراً درخت سے پتّا توڑا اور اس کا دونا بنایا اور پانی چھاننا شروع کیا۔ جب دونا بھر گیا تو بادشاہ نے اسے پینا چاہا۔ لیکن جیسے ہی دونا منہ تک لے گیا اس کے وفادار گھوڑے نے پانو مار کر سارا پانی گرا دیا۔ گھوڑے کی اس حرکت سے بادشاہ بہت ناراض ہوا اور اپنا خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ گھوڑے نے اسی وقت زمین پر گر کر دم توڑ دیا۔ اب بادشاہ نے اوپر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ درخت پر ایک سانپ چڑیا کے بچے کو کھا رہا ہے۔ اور اس کے منہ سے پانی کے قطرے گر رہے ہیں۔ بادشاہ اسی زہریلے پانی کو پینے جا رہا تھا۔ اب بادشاہ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اسی لیے گھوڑے نے اس پانی کو گرا دیا تھا جسے وہ پینا چاہ رہا تھا۔ بادشاہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ دیوانوں کی طرح چلانے لگا کہ "جس نے میری جان بچائی اسے ہی مارا۔ جس نے میری جان بچائی اسی کی جان لے لی" اور غش کھا کر گر پڑا۔

سلطان چودھری
انڈال ضلع بردوان۔ مغربی بنگال۔

سچی کہانی

ایک مرتبہ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس کہیں سے گوشت آیا۔ گوشت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس لیے اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے گوشت کو خادمہ سے طاق میں رکھوا دیا کہ شاید حضور صلے اللہ علیہ وسلم نوش فرمائیں۔ اتنے میں ایک سائل آیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ بھیجو اللہ کے نام پر خدا برکت کرے۔ گھر سے جواب آیا خدا تجھے بھی برکت دے۔ اس لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ گھر میں کچھ موجود نہیں۔ وہ سائل چلا گیا۔ اتنے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اور فرمایا اُمّ سلمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) تمہارے پاس کوئی کھانے کی چیز ہے؟ آپ نے کہا "ہاں ہے" اور خادمہ سے طاق پر سے گوشت لینے کو بھیجا۔ وہ خادمہ گوشت لینے گئی تو دیکھتی ہے وہاں گوشت کا نام و نشان نہیں ہے صرف وہاں سفید پتھر کا ٹکڑا پڑا ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے سائل کو گوشت نہ دیا اس لیے وہ گوشت پتھر بن گیا۔

فائدہ غور کیجیے خدا کے نام پر نہ دینے کی یہ نحوست ہوئی کہ گوشت کی صورت بگڑ گئی اور وہ پتھر بن گیا۔ اس طرح جو شخص سائل سے بہانہ کر کے خود کھاتا ہے۔ وہ ایک قسم کا پتھر کھاتا ہے اور سنگدل ہو جاتا ہے۔

(احادیث سے نقل)

● ایم سیف الدین انصاری۔ گاندھی سینٹری پبلک اسکول۔ الٰہ آباد۔

دوراندیشی

ایک تالاب میں دو خالی گھڑے تیر رہے تھے، ایک تھا مٹی کا گھڑا اور ایک تھا تانبے کا۔ دونوں الگ الگ خاموشی کے ساتھ تیر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تانبے کے گھڑے نے مٹی کے گھڑے سے کہا۔ بھائی، اس تالاب میں ہم دونوں ہی تیر رہے ہیں، آپ بھی خاموش ہیں اور میں بھی خاموش ہوں آؤ

ہم دونوں ساتھ مل کر تیریں گے باتیں بھی ہوں گی
اور مزہ بھی آئے گا۔ آؤ ہم دونوں دوست بن جائیں،
ذرا قریب آؤ۔ تانبے کے گھڑے کی باتیں سن کر
مٹی کے گھڑے نے جواب دیا۔ بھائی بات تو آپ
نے بہت اچھی کہی۔ لیکن آپ میں اور مجھ میں فرق
اتنا ہے کہ آپ ایک سخت دھات سے بنے ہوئے
ہیں اور میں مٹی کا بنا ہوا ہوں اگر آپ اور میں
قریب ہو کر تیریں اور اتفاقاً موجوں کے جھکولوں سے
آپ اور میں ٹکرا گئے تو بھائی نقصان میرا ہی ہوگا
کیونکہ میں مٹی کا بنا ہوا ہوں اور آپ سخت دھات کے
بنے ہوئے ہو آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا لیکن میں ٹوٹ
پھوٹ جاؤں گا۔ لہٰذا آپ مجھے معاف رکھیں میں دور
ہی اچھا ہوں۔ کمزور کو طاقتور سے دور رہی رہنا چاہیے۔

محمد ساجد تصدق حسین
جماعت ہفتم دارود
قلعہ محلہ مقام دارود ضلع ایوت محل

"تتلی رانی"

تتلی رانی بولو بولو
کون دیش سے آئی ہو
اتنا سندر روپ تمہارا
سب کا دل لبھاتی ہو
کون تمہارے ان پروں میں
بھر دیتا ہے رنگ برنگے؟
رنگ برنگے ان پروں کو
رنگ دیتا ہے کون بتا؟

یم امتیاز شبنم
۱۰۰۲، نئی گلی۔ وانمباڑی ۱

"میرا گھوڑا"

سب سے اچھا اور نرالا
میرا گھوڑا، پیارا پیارا

چھوٹے کان اور لمبے بال
موٹی آنکھیں کتنی لال

اونچا، لمبا، طاقت ور
ہوا میں اڑتا ہے فر فر

ہم سب کے کام آتا ہے
چاہو جہاں پہنچتا ہے

گھاس چنا یہ کھاتا ہے
دن بھر دوڑ لگاتا ہے

جب دولہا بن جاؤں گا
اس کو خوب سجاؤں گا

ساتھ رہیں گے سارے براتی
میں گھوڑے پر، پیدل ساتھی

ایوب عبداللطیف نلا معدو
۲۴۴ شکر پیٹھ۔ شولا پور۔

میرا سماج عزیزوں کے لیے

میرے عزیز دوستو! کبھی آپ نے کوئی
ایسا کام کیا ہے جو عام طور پر لوگ نہیں کرتے
آپ پر انگلیاں اٹھیں گی۔ اگر آپ نے نئے کٹ کے

کپڑے پہن لیے۔ نئے طرز کے بال رکھ لیے کوئی
نئی بات کہہ دی، کسی رسم رواج کی مخالفت
کی تو لوگ اعتراض کریں گے اور مذاق اڑائیں گے
اس کو دبا ما تنگ کرنا اور ہوسکے تو مٹا دینا ٹھیک
سمجھتے ہیں۔ جن سے کسی دوسرے کا نقصان نہیں ہوتا۔

وہ زمانہ کا رونا نہیں رونے۔ اپنا کام کرتے
رہتے ہیں۔ اسی بات کو ایک شاعر نے یوں کہا ہے

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے، زمانہ سے ہم نہیں

لیکن سماج کے خلاف کامیاب ہونے کے لیئے طلب
چاہیے۔

طلب نہ ہو تو کسی در سے کچھ نہیں ملتا اگر طلب
ہو تو دونوں جہاں سے ملتا ہے۔

شمس الدین
مکان ۹۸۷ گلی مدرسے والی بازار مٹیا محل
جامع مسجد دہلی - ۶

چرواہا اور گھڑا

کہتے ہیں کہ ایک مالدار کے پاس ایک چرواہا تھا،
جو جنگل میں بکری چراتا تھا اور اس نے اس کے لیے
روزی متعین کیا جس میں کچھ گھی تھا تو چرواہا گھی باقی
رکھتا تھا اور اسے ایک مٹکے میں ذخیرہ کرتا تھا جو طاق
میں لٹکا ہوا تھا ایک بار وہ ڈنڈے پر ٹیک
لگائے ہوئے سوچنے لگا کہ اسے کیا کرے جو
اس کے پاس گھی اکٹھا ہے تو اپنے دل میں سوچا میں کہ
اسے بازار لیجاؤں گا اور اسے بیچوں گا۔ اور اس
کی قیمت سے ایک بھیڑ خریدوں گا وہ میرے
لیے ایک دوسری بھیڑ پیدا کرے گی پھر وہ بڑی ہوگی
اور میرے لیے اپنے ماں کے ساتھ ایک دوسری بھیڑ
پیدا کرے گی ——— ایسے ہی میرے
پاس ایک بڑا ریوڑ ہو جائے گا جو میرے پاس
جو بکری موجود ہے اس کے مالک کو حوالے کر دوں گا
اور اپنے لیے ایک ملازم رکھوں گا جو میری بکری چرائے گا
اور ایک عالیشان محل بناؤں گا اور اسے بہترین
بستروں اور جڑاؤ دار برتنوں اور خوشنما نقوش
سے آراستہ کروں گا اور جب میرا بیٹا ہوشیار
ہوگا تو اس کے لیے ایک ادیب حکیم استاد حاضر
کروں گا جو اسے ادب اور حکمت سکھائے اور اسے
اپنی فرماں برداری اور احترام کا حکم دوں گا اور اگر اسے
نے حکم نہ مانا تو ڈنڈے سے ماروں گا اور اپنا ڈنڈا اٹھایا
تو گھڑے کو لگا اور اسے توڑ دیا گھی اس کے سر داڑھی
اور کپڑوں پر ہر طرف پھیل کر گرا۔ اس کی وجہ سے بڑا
غمزدہ ہوا کہتے ہوئے کہ شاید اس کا بدلہ ہے جو
اپنے خیالات پر کان دھرتا ہے۔

انوار احمد
بن ابوالحسن ڈومن پورہ مئوناتھ بھنجن
اعظم گڑھ۔

"گیت"

اسکول سے جب میں لوٹی گھر
ابو تھے بیٹھے صوفے پر
امی بولیں مجھ سے بڑھ کر
بیٹی آئی اسکول سے پڑھ کر
میں بولی امی سے لپٹ کر
جاؤں میں؟ خالہ کے گھر
ذرا زور سے بولے ابو
کہیں نہ جانا دیکھو شبنو
بڑی تیز ہے بیٹی! دھوپ
کالا پڑ جائے گا، روپ
مجھ سے امی بولیں ہنس کر
لیجاؤں گی تجھ کو پکچر

شبانہ جمیل۔ اردو مڈل اسکول گیولی گیا (بہار)

● ایک بچہ (قسائی سے) آپ اس بکرے کو کہاں لے جا رہے ہیں

قسائی: ذبح کرنے کے لیے۔

بچہ: اُفوہ! میں سمجھی آپ اسے اسکول چھوڑنے لے جا رہے ہیں

● محمد ہارون (اکولہ)

● ایک سیاح نے ایک مقامی شخص سے پوچھا: کیسے گزر رہی ہے؟ مقامی بولا جناب مزے سے گزر رہی ہے۔ مجھے درخت کاٹنے تھے طوفان آیا سب گر پڑے اور میں اس زحمت سے بچ گیا۔

سیاح: خوب۔

مقامی: گھاس جلانی تھی، بجلی گری سب جل گئی اور مجھے تکلیف نہ کرنی پڑی۔

سیاح: بہت خوب اب کیا ارادے ہیں؟

مقامی: بس زلزلے کا انتظار کر رہا ہوں کہ نیچے کی زمین اوپر ہو جائے اور میں آلو اکھاڑنے کی زحمت سے بچ جاؤں۔

● عذرا عرفان

پھلواری شریف۔ پٹنہ

ایک انگریز ہندستان آیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی مگر پیسے نہیں تھے۔ وہ حلوائی کی دکان پر گیا اور حلوہ کھانے لگا۔ حلوائی اسے قاضی کے پاس لے گیا۔ قاضی نے اس کے لیے سزا تجویز کی کہ اسے گدھے پر بٹھا کر بچوں کو ساتھ کر دیا جائے تاکہ بچے تالیاں اور ڈھول بجاتے جائیں۔

انگریز جب واپس انگلستان گیا تو دوستوں نے پوچھا ہندستان کیسا ملک ہے؟ انگریز نے جواب دیا:

ہندستان بہت اچھا ملک ہے حلوہ مفت کھانے کو ملا۔ ڈم ڈم کی سواری مفت کی اور ہر جگہ بچوں نے شاندار استقبال کیا۔

● شاہد سعید (بمبئی)

● ایک دوست دوسرے سے: اگر کسی اسٹیشن پر گاڑی صرف ایک منٹ کے لیے رکتی ہو اور وہاں انسان کا دل چاہے پینے کو چاہے تو کیا کرنا چاہیے؟

دوسرے نے جواب دیا: آسان سی بات ہے گارڈ کو ساتھ لے جانا چاہیے۔

● ریحان احمد (کٹیہار)

● اُستاد (شاگرد کے باپ سے): آپ کا بیٹا کلاس میں بہت شور کرتا ہے۔ اسے سمجھائیے گا۔

شاگرد کا باپ: جناب اسی لیے تو میں اپنے دوسرے بیٹے کو بھی داخل کرانے لایا ہوں ان دونوں بچوں نے تو پورے محلے کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔

● ناز نصرین و ناز پروین (بتیا نہ کلٹی)

دوست: آج میں نے آپ کی دولت مندی کی بہت تعریف کی۔

نیا دوست: مگر کس سے؟ دوست: انکم ٹیکس آفیسر سے۔

● محمد ارشاد عالم آدگانوی (مالندم)

(شیام کے والد صاحب) شیام تمھاری بری حرکتوں سے میرے نام پر دھبہ پڑ گیا ہے۔

شیام: کوئی بات نہیں پتا جی۔ میں دھبے کو ربر سے مٹا دوں گا۔

● ظہیر اعجاز (بانکا)

"بچوں کی کوششیں" میں انعام الرحمٰن کی تقریر
اس شمارے کی جان ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے
کم ہے۔ یہ پیامیوں اور دوسرے طلبہ کے لیے
ایک مشعل راہ ہے۔ اسے پڑھ کر ان کے اندر بھی
ایسے مقابلوں میں حصّہ لینے کا حوصلہ جاگے گا
کم از کم ایسے اور "دشمن کا علاج" جیسے مضامین
"پیام تعلیم" کے ہر شمارے میں شائع کرنے کی
کوشش کیجیے۔ "بچوں کی کوششیں" میں "ضمیر کی
آواز" "ترانۂ انسان" اور "گیارہ چیزیں یاد رکھیے"
پسند آئیں۔ سبزیوں اور پھلوں کے مشاعرے کے بعد
اب پھر کوئی مشاعرہ کروایئے۔

● جاوید نہال حشمی آئی۔ سی
(فرسٹ ایئر) ہگلی محسن کالج، چنسورہ

مارچ ۱۹۸۴ء کا "پیام تعلیم" نظر سے گزرا
ٹائیٹل بہت خوبصورت تھا۔ اس بار بھی کہانیاں
تقریباً اچھی تھیں۔ رئیس صدیقی صاحب کا مضمون
"بچوں کے نیّر صاحب" بہت پسند آیا امۃ الرحمٰن محسنی
کی اس بار "دو شکاری" کی قسط بھی بہت شاندار رہی
میری طرف سے انھیں مبارکباد قبول ہو۔ "دو شکاری"
کی کامیابی کا راز ان کے قلم میں پوشیدہ ہے۔ رحمٰن
حمیدی کی "لالچ کا انجام" اور محمد آصف زہری کی
"چالاکی" بھی بہت مزیدار رہے۔ مرغوب زماں کی نظم

"تعویذ" بہت اچھی لگی۔

● محمد شکیل راوت
مکان ۳۹۷ محلہ کچہ کوٹ مالیر کوٹلہ

ڈاکٹر قمر احمد رضوی قابل مبارکباد ہیں کہ
انھوں نے جغرافیہ جیسے خشک مضمون کو خاصا دلچسپ
بنادیا ہے اس بات کا ثبوت ان کا مضمون
"سفید ریگستان" ہے۔ براعظم انٹارکٹیکا سے ان
کی گفتگو بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ سبھی کہانیاں
اثر انگیز ہیں "دو شکاری" کی قسط لاجواب ہے۔
"مصریوں کی شادی" بھی خوب رہی۔ جناب ڈاکٹر
شمشاد ادیب سہارنپوری کی کہانی "سپاہی راجا"
واقعی مزے دار ہے۔

یہ تو تھا تصویر کا ایک رخ۔ حق تو یہ ہے
کہ اس کا دوسرا رخ بھی دکھاتا چلوں۔ پیام تعلیم
جیسے عمدہ رسالے میں کھیل کود کے کالم کی کمی کھٹکتی
ہے۔ میری ناقص رائے میں کھیل کی دنیا پر مختصر ہی
سہی لیکن مستقل کالم رکھیں۔
"اطہر پرویز نمبر" کے ذریعہ ہمیں اپنے ممتاز
ادیب کو جاننے کا موقع ملے گا۔

● سہیل ارشد
انڈال۔ بردوان۔ (مغربی بنگال)

میں "پیام تعلیم" کا مطالعہ کرنے کے لیے بیقرار رہتا ہوں
جب تک تمام کالموں کا مطالعہ نہیں کر لیتا چین سے نہیں بیٹھتا۔
"پیام تعلیم" دن بہ دن ترقی کرتا جا رہا ہے۔ یہ سب آپ
کی محنت اور مضامین کے انتخاب کا کمال ہی ہے، اس کے تمام
مضامین قابل تعریف ہیں خاص کر گدگدیاں، قلمی دوستی
آدھی ملاقات" وغیرہ۔ "پیام تعلیم" کی یہ ترقی اور کامیابی
ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ ہمارا
پسندیدہ رسالہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے اور
کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومے۔ آمین

یم امتیاز احمد شبنم۔ وانمباڑی ۱

نکھٹو دیو

جاپان میں ایک پہاڑ کے دامن میں ایک گانو تھا پہاڑ پر ایک بہت ظالم دیو رہتا تھا وہ گانو والوں کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ایک دن جب کسان اپنے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کسی نے ان کی سبزیوں کو خراب کر دیا ہے اور ساری کیاریوں کو اجاڑ دیا ہے۔وہ بہت غصہ ہوئے اور سب کے سب چلاتے ہوئے پہاڑ کے نیچے جمع ہوئے تب وہ دیو باہر آیا اور کہنے لگا کہ اسے روز ایک انسان کھانے کے لیے ملنا چاہیے اس کی وجہ پوچھنے پر دیو نے کہا چونکہ میں سب سے بڑا دیو ہوں اس لیے میں ہر کام کر سکتا ہوں۔تب سارے کسان اس سے کہنے لگے کہ اگر وہ صبح سورج نکلنے سے پہلے سے سورج ڈوبنے تک پہاڑ کی چوٹی تک ایک سیڑھی بنا دے تو اسے وہ لوگ سب سے بڑا دیو مان لیں گے۔

دیو تیار ہو گیا اور پھر اپنے گھر جا کر سو گیا سورج ڈوبنے پر اٹھا اور جا کر گانو کے سارے مرغوں کا سر کاٹ کر آ گیا اور پھر بہت تیزی سے سیڑھی بنانی شروع کی مگر جب وہ مرغوں کے سر کاٹ رہا تھا تو ایک پری نے اسے دیکھ لیا اور بعد میں جا کر سب کے سر جوڑ دیے۔ادھر دیو خوش تھا کہ اب میں آرام سے کام کر سکوں گا اور لوگ اس وقت تک نہیں اٹھیں گے جب تک مرغے نہیں بولیں گے۔

مگر جب سیڑھی پوری ہونے میں دو تین پتھر کی کمی رہی سورج نکل آیا اور سارے مرغے بولنے لگے دیو چلایا کہ ہائے میرا وعدہ پورا نہ ہو سکا پھر وہ وہاں سے دور چلا گیا اور کبھی نہ آیا سارے گانو خوشی خوشی رہنے لگے کبھی کبھی وہ پہاڑ پر جاتے اور وہاں سے نیچے کا نظارہ کرتے تھے۔

ریاض الدین
(درجہ ہشتم) جامعہ ملیہ اسلامیہ
مڈل اسکول

محبت

سردیوں کا موسم ہے۔ہمارے محلے میں ایک نیا ڈاکیا آیا ہے اس کا نام عامر ہے — وہ سرکاری نوکری کرتا ہے۔سرکاری نوکر ہونے کے باوجود اس کی تنخواہ کم تھی مگر وہ اس میں بھی اللہ کا شکر ادا کیا کرتا تھا۔وہ اپنا کام بہت خوش اسلوبی سے کیا کرتا جس سے اس کے اسٹاف کے لوگ اس سے خوش رہنے لگے اور محلے کے بچے بھی اس سے خوش ہوتے تھے۔وہ محلے والوں سے خوش رہتا اس کے اندر محبت کوٹ کوٹ کر

بھری تھی وہ ہر ایک سے بہت محبت کرتا تھا ہر روز
ڈاک خانے سے واپس آتے ہوئے اپنے محلوں کے
بچوں سے ضرور مل لیتا پھر اس کے بعد گھر واپس جاتا۔
وہ بچوں کے لیے ہر روز چیزیں لا کر ان کو دیا کرتا۔
اور بچے بھی خوش ہوتے اور خوش ہو کر لیتے
تھے۔ تاکہ عامر کا دل نہ ٹوٹ جائے اس خیال سے
وہ چیزیں اپنے ماں باپ کو دکھا کر کھا لیتے تھے۔ جب
وہ شام کو لیٹنے کے لیے اپنے بستر پر جاتا تو
سوچنے لگتا کہ کہیں میرا تبادلہ ہو گیا تو پھر ان بچوں کا
کیا ہوگا، جو مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ میں
بھی ان کو بہت چاہتا ہوں اور میرا کیا ہوگا وہ اپنے
خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ ایک آدمی کو قریب
دیکھ کر ٹھٹھک گیا پھر اس نے محبت کر کے سلام کیا
اور کہا کہ آپ کون ہیں میں نے آپ کو اس سے پہلے
کبھی نہیں دیکھا۔ اس شخص نے کہا جو تو دعا مانگ
رہا تھا وہ تیری دعا قبول ہو گئی جو مانگنا ہے اپنے
خدا سے مانگ لے۔ پھر عامر نے سوچا کہ کیا مانگا جائے
اس نے کہا کہ پھر بعد میں مانگ لوں گا۔

ایک دن شام کے وقت عامر اپنی ڈاک
دینے جا رہا تھا کہ راستے میں طوفان آ گیا طوفان
بہت سخت تھا، اور پھر اس کے بعد بہت
زوروں کی بارش ہوئی اسی طوفانی بارش میں
وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا ادھر کسی بچے نے عامر
کو دیکھا اس نے عامر کو ہوش میں لانے کے
لیے پانی تلاش کیا۔ پانی تو بہت تھا ابھی بارش
جو ہوئی تھی مگر اس بچے کے پاس کوئی برتن نہیں
تھا، جس میں وہ پانی بھرے اس نے دونوں
ہاتھوں میں پانی بھر کر اس کے منہ پر ڈالا ——
عامر کو ہوش آنے لگا۔ جب اس کو پوری طرح
ہوش آ گیا تو بچے سے پوچھا کہ میں کیسے گر پڑا بچے
نے بتایا کہ آپ پہلے سے گرے پڑے تھے میں ادھر
نکلا اور آپ کو بے ہوش پڑا پایا تو مجھ سے نہ
رہا گیا۔ عامر نے اس کو بہت پیار کیا اور بہت سی دعائیں
دیں۔ دیکھو بچو اگر ہم بچوں سے محبت کریں گے تو
بچے ہم سے محبت کریں گے عامر بچوں سے کتنی
محبت کرتا تھا اور بڑوں کی عزت کرتا تھا اس لیے
بچہ ہی اس کے کام آیا۔ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ
وسلم بھی بچوں سے محبت کرتے تھے اور بڑوں
کی عزت کرتے تھے عامر میں بھی کچھ باتیں ایسی ہی
تھیں وہ بڑوں کی عزت کرنا جانتا تھا اس لیے کہتے
ہیں جب ہم دوسروں کی عزت کریں گے تو لوگ
ہماری عزت کریں گے

رعنا واحد اٹاوہ
جامعہ نگر کوارٹر ع ۱۱۰/۱
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جواہر لال نہرو

نہرو ایک طرح سے خود ہندستان تھے یہ ۱۴ نومبر
سنہ ۱۸۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد
پنڈت موتی لال نہرو اور والدہ سروپ رانی دیوی
نے ان کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے کی آپ
کے والد پنڈت موتی لال نہرو الہ آباد میں ایک
کامیاب بیرسٹر تھے گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل
تھی۔ آپ مئی سنہ ۱۹۰۵ء کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کے
لیے انگلینڈ گئے۔ وہاں سے سنہ ۱۹۱۲ء میں بیرسٹری کا
امتحان پاس کر کے ہندستان واپس آئے اور الہ آباد
میں وکالت شروع کی۔ وکالت میں آپ کا دل نہ لگا تب
کانگریس میں شریک ہوئے۔ اور پھر سنہ ۱۹۱۳ء میں
یو۔ پی۔ (اتر پردیش) کانگریس میں حصہ لیا۔ آپ
نے سنہ ۱۹۱۵ء میں الہ آباد میں پہلی تقریر کی جو اخباروں
میں انگریز حکومت کے خلاف چھپی تھی۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں آپ
کا بیاہ کملا نام کی ایک دیوی سے ہوا ان سے ان کی

ایک بیٹی نے جنم لیا جو آج ہندستان کی وزیر اعظم ہیں آپ آزادی کی لڑائی میں کئی بار جیل گئے۔ انھوں نے ملک کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ مل کر انگریز حکومت پر نکتہ چینی کی اور آخر کار ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرالیا آپ ہندستان کے سب سے پہلے وزیر اعظم بنے آپ نے منادی کرائی کی ہر ہندستانی شہری کا آزادی پر برابر کا حق ہے اور ہر ہندستانی شہری کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کا اختیار ہے چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی حکومت عوام کے خلاف قدم اٹھائے یا عوام کو ان کے حقوق سے محروم کرے یا عوام پر کسی قسم کا ظلم وستم کرے تو عوام کو حق ہے کہ وہ اس حکومت کو بدل دیں یا ختم کر دیں۔

ہم میں سے ہزار ہا لوگ ایسے ہیں جنھوں نے آزادی میں سانس لیا اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے غلامی میں سانس لیا۔ جنھوں نے آزادی میں سانس لیا ہے وہ آزادی کی قدر نہیں کرتے اور وہ لوگ جنھوں نے غلامی میں سانس لیا ہے، وہ آزادی کی قدر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آزادی کتنی محنت ومشقت سے ملی ہے ہمیں چاہیے کہ لوگوں میں آزادی کی قدر کرنے کا جذبہ پیدا کریں اور وطن والوں کے دلوں سے کینہ نکال پھینکیں اور یگانگت محبت اور خلوص پیدا کریں۔

۲۷ مئی ۶۴ء کو اس سورج نے ڈوبنے سے پہلے قوم کو آخری بار مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "کون ہے جو میری جگہ لے گا"، اور اس وقت ۴۵ کروڑ انسانوں نے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں رندھے ہوئے گلے سے جواب دیا تھا کہ ہم کوشش کریں گے۔ اب جبکہ تاریخ کا جبر اپنی طاقت کے ساتھ اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ ملک کا وہ جیالا بیٹا جس نے سارے ہندستان کو ایک رشتے میں پرو دیا تھا اور ایک خوش حال ہندستان کی نئی عمارت بنا رہا تھا، قوم کا وہ سیاست داں جس نے اپنی حق گوئی اور بے باکی کی بنا پر ساری دنیا میں ہندستان کا سکہ جما دیا تھا۔ اب ہمارے درمیان نہیں رہ گیا تو ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ سب کام اب ہم کو خود کرنے ہیں ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو وہ عہد آفریں شخصیت جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ نئے ہندستان کی تعمیر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی اب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نہرو نے ہمیں کیا کچھ دیا ہے۔ جواہر لال کی موت کے بعد ان کی کام کی میز پر ایک چھوٹے سے پیڈ پر امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی نظم کا ایک ٹکڑا ملا جس کا اردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

"میرا یہ جنگل بہت خوبصورت ہیں، تاریک ہیں کتنے گنجان ہیں مگر ان سے وابستہ میرے کئی عہد و پیمان ہیں ابھی نیند آنے سے پہلے کئی میل جانا ہے مجھ کو ابھی نیند آنے سے پہلے کئی میل جانا ہے مجھ کو۔"

● محمد انور — دہلی

زہر کی پیاس

کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اسے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دن صبح کو ناشتہ کرنے کے بعد بادشاہ اپنے وزیر اور دو غلاموں کے ساتھ جنگل گیا۔ بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکا لیکن شکار نہیں ملا۔ اتفاق سے بادشاہ کی نظر ایک ہرن پر پڑی۔ بادشاہ اس کا پیچھا کرنے لگا۔ اور اسی طرح وہ بہت دور نکل گیا۔ مگر ہرن کو ہاتھ نہ آنا تھا نہ آیا۔ وزیر اور غلام اسی جگہ چھوٹ گئے تھے جہاں سے بادشاہ نے ہرن کا پیچھا کیا تھا۔ دوپہر

کا وقت تھا اور گرمی بھی خوب پڑ رہی تھی۔ بادشاہ
کو بہت زوروں کی پیاس لگی۔ ادھر ادھر دیکھا لیکن
پانی کہیں نہیں ملا۔ آخر وہ تھک کر ایک درخت کے
نیچے بیٹھ گیا۔ اسی دوران اس کے سامنے پانی کا ایک
قطرہ گرا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ اسی طرح پانی گرنے
لگا۔ بادشاہ نے، جو پیاس سے بے حال ہو رہا تھا فوراً
درخت سے پتّا توڑا اور اس کا دونا بنایا اور پانی
چھاننا شروع کیا۔ جب دونا بھر گیا تو بادشاہ نے
اسے پینا چاہا۔ لیکن جیسے ہی دونا منہ تک لے گیا
اس کے وفادار گھوڑے نے پانو مار کر سارا پانی
گرا دیا۔ گھوڑے کی اس حرکت سے بادشاہ بہت ناراض
ہوا اور اپنا خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ گھوڑے
نے اسی وقت زمین پر گر کر دم توڑ دیا۔ اب بادشاہ
نے اوپر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ درخت پر
ایک سانپ چڑیا کے بچّے کو کھا رہا ہے۔ اور اس کے
منھ سے پانی کے قطرے گر رہے ہیں۔ بادشاہ اسی زہریلے
پانی کو پینے جا رہا تھا۔ اب بادشاہ کی سمجھ میں یہ بات
آئی کہ اسی لیے گھوڑے نے اس پانی کو گرا دیا تھا جسے
وہ پینا چاہ رہا تھا۔ بادشاہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ
دیوانوں کی طرح چلانے لگا کہ "جس نے میری جان
بچائی اسے ہی مارا، جس نے میری جان بچائی اسی کی
جان لے لی"، اور غش کھا کر گر پڑا۔

سلطان چودھری
انڈال ضلع بردوان۔ مغربی بنگال۔

سچّی کہانی

ایک مرتبہ حضرت امِ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے
پاس کہیں سے گوشت آیا۔ گوشت آنحضرت صلے اللہ
علیہ وسلم کو بہت اچھا لگتا تھا اس لیے امِ سلمہ رضی اللہ عنہا
نے گوشت کو خادمہ سے طاق میں رکھوا دیا کہ شاید
حضور صلے اللہ علیہ وسلم نوش فرمائیں۔ اتنے میں
ایک سائل آیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر آواز
دی کہ بھیجو اللہ کے نام پر خدا برکت کرے۔ گھر سے
جواب آیا خدا تجھے بھی برکت دے۔ اس لفظ میں یہ
اشارہ ہے کہ گھر میں کچھ موجود نہیں۔ وہ سائل چلا
گیا۔ اتنے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف
لائے۔ اور فرمایا امِ سلمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) تمہارے
پاس کوئی کھانے کی چیز ہے؟ آپ نے کہا: ہاں ہے۔
اور خادمہ سے طاق پر سے گوشت لینے کو بھیجا۔
وہ خادمہ گوشت لینے گئی تو دیکھتی ہے وہاں
گوشت کا نام و نشان نہیں ہے صرف وہاں سفید
پتھر کا ٹکڑا پڑا ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے سائل
کو گوشت نہ دیا اس لیے وہ گوشت پتھر بن گیا۔

فائدہ غور کیجیے خدا کے نام پر نہ دینے کی
یہ نحوست ہوئی کہ گوشت کی صورت بگڑ گئی
اور وہ پتھر بن گیا۔ اس طرح جو شخص سائل سے
بہانہ کر کے خود کھاتا ہے۔ وہ ایک قسم کا پتھر
کھاتا ہے اور سنگدل ہو جاتا ہے۔

(احادیث سے نقل)

● ایم سیف الدین انصاری۔ گاندھی سینٹری
پبلک اسکول۔ الہ آباد۔

دور اندیشی

ایک تالاب میں دو خالی گھڑے تیر رہے تھے،
ایک تھا مٹّی کا گھڑا اور ایک تھا تانبے کا۔ دونوں
الگ الگ خاموشی کے ساتھ تیر رہے تھے۔ تھوڑی
دیر بعد تانبے کے گھڑے نے مٹّی کے گھڑے سے
کہا۔ بھائی اس تالاب میں ہم دونوں ہی تیر رہے ہیں،
آپ بھی خاموش ہیں اور میں بھی خاموش ہوں آؤ

ہم دونوں ساتھ مل کر رہیں گے باتیں بھی ہوں گی
اور مزہ بھی آئے گا۔ آؤ ہم دونوں دوست بن جائیں،
آؤ ذرا قریب آؤ۔ تانبے کے گھڑے کی باتیں سن کر
مٹی کے گھڑے نے جواب دیا۔ بھائی بات تو آپ
نے بہت اچھی کہی۔ لیکن آپ میں اور مجھ میں فرق
اتنا ہے کہ آپ ایک سخت دھات سے بنے ہوئے
ہیں اور میں مٹی کا بنا ہوا ہوں اگر آپ اور میں
قریب ہو کر رہیں اور اتفاقاً موجوں کے جھکولوں سے
آپ اور میں ٹکرا گئے تو بھائی نقصان میرا ہی ہوگا
کیونکہ میں مٹی کا بنا ہوا ہوں اور آپ سخت دھات کے
بنے ہوئے ہو آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا لیکن میں ٹوٹ
پھوٹ جاؤں گا۔ لہٰذا آپ مجھے معاف رکھیں میں دور
ہی اچھا ہوں۔ کمزور کو طاقتور سے دور ہی رہنا چاہیے۔

محمد ساجد تصدق حسین
جماعت ہفتم داروہ
قلعہ محلہ مقام داروہ ضلع ایوت محل

" تتلی رانی "

تتلی رانی بولو بولو
کون دیش سے آئی ہو
اتنا سندر روپ تمہارا
سب کا دل لبھاتی ہو
کون تمہارے ان پروں میں
بھر دیتا ہے رنگ برنگے ؟
رنگ برنگے ان پروں کو
رنگ دیتا ہے کون بتا؟

یم امتیاز شبنم
۱۰۰/۳ نئی گلی۔ وانمباڑی ع ا

" میرا گھوڑا "

سب سے اچھا اور نرالا
میرا گھوڑا، پیارا پیارا

چھوٹے کان اور لمبے بال
موٹی آنکھیں کتنی لال

اونچا، لمبا، طاقت ور
ہوا میں اڑتا ہے فر فر

ہم سب کے کام آتا ہے
چاہو جہاں پہنچاتا ہے

گھاس چنا یہ کھاتا ہے
دن بھر دوڑ لگاتا ہے

جب دولھا بن جاؤں گا
اس کو خوب سجاؤں گا

ساتھ رہیں گے سارے براتی
میں گھوڑے پر، پیدل ساتھی

ایوب عبداللطیف: نلا معدو
۵۴۴ شکر پیٹھ۔ شولا پور۔

میرا سماج عزیزوں کے لیے

میرے عزیز دوستو! کبھی آپ نے کوئی
ایسا کام کیا ہے جو عام طور پر لوگ نہیں کرتے
آپ پر انگلیاں اٹھیں گی۔ اگر آپ نے نئے کٹ سے

کپڑے پہن لیے۔ نئے طرز کے بال رکھ لیے کوئی نئی بات کہہ دی کسی رسم رواج کی مخالفت کی تو لوگ اعتراض کریں گے اور مذاق اڑائیں گے اس کو دبا نا تنگ کرنا اور ہو سکے تو مٹا دینا ٹھیک سمجھتے ہیں۔ جن سے کسی دوسرے کا نقصان نہیں ہوتا۔

وہ زمانہ کا رونا نہیں روتے۔ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اسی بات کو ایک شاعر نے یوں کہا ہے

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے، زمانہ سے ہم نہیں

لیکن سماج کے خلاف کامیاب ہونے کے لیے طلب چاہیے۔

طلب نہ ہو تو کسی در سے کچھ نہیں ملتا اگر طلب ہو تو دونوں جہاں سے ملتا ہے۔

شمس الدین
مکان ۹۸۷ گلی مدرسے والی بازار مٹیا محل
جامع مسجد دہلی - ۶

چرواہا اور گھڑا

کہتے ہیں کہ ایک مالدار کے پاس ایک چرواہا تھا، جو جنگل میں بکری چراتا تھا اور اس نے اس کے لیے روزی متعین کیا جس میں کچھ گھی تھا تو چرواہا گھی باقی رکھتا تھا اور اسے ایک مٹکے میں ذخیرہ کرتا تھا جو طاق میں لٹکا ہوا تھا ایک بار وہ ڈنڈے پر ٹیک لگائے ہوئے سوچنے لگا کہ اسے کیا کرے جو اس کے پاس گھی اکٹھا ہے تو اپنے دل میں سوچا میں کل اسے بازار لیجاؤں گا اور اسے بیچوں گا۔ اور اس کی قیمت سے ایک بھیڑ خرید دوں گا وہ میرے لیے ایک دوسری بھیڑ پیدا کرے گی پھر وہ بڑی ہوگی اور میرے لیے اپنے ماں کے ساتھ ایک دوسری بھیڑ پیدا کرے گی ——— ایسے ہی میرے پاس ایک بڑا ریوڑ ہو جائے گا جو میرے پاس جو بکری موجود ہے اس کے مالک کو حوالے کر دوں گا اور اپنے لیے ایک ملازم رکھوں گا جو میری بکری چرائے اور ایک عالیشان محل بناؤں گا اور اسے بہترین بستروں اور جڑاؤ دار برتنوں اور خوشنما نقوش سے آراستہ کروں گا اور جب میرا بیٹا ہوشیار ہوگا تو اس کے لیے ایک ادیب حکیم استاد حاضر کروں گا جو اسے ادب اور حکمت سکھائے اور اسے اپنی فرماں برداری اور احترام کا حکم دوں گا اور اگر اسے نے حکم نہ مانا تو ڈنڈے سے ماروں گا اور اپنا ڈنڈا اٹھایا تو گھڑے کو لگا اور اسے توڑ دیا گھی اس کے سر داڑھی اور کپڑوں پر ہر طرف پھیل کر گرا۔ اس کی وجہ سے بڑا غمزدہ ہوا کہتے ہوئے کہ شاید اس کا بدلہ ہے جو اپنے خیالات پر کان دھرتا ہے۔

انوار احمد
بن ابوالحسن ڈومن پورہ مئوناتھ بھنجن
اعظم گڑھ۔

"گیت"

اسکول سے جب میں لوٹی گھر
ابو تھے بیٹھے صوفے پر
امی بولیں مجھ سے بڑھ کر
بیٹی آئی اسکول سے پڑھ کر
میں بولی امی سے لپٹ کر
جاؤں میں ؟ خالہ کے گھر
ذرا زور سے بولے ابو
کہیں نہ جانا دیکھو شبنو
بڑی تیز ہے بیٹی! دھوپ
کالا پڑ جائے گا، روپ
مجھ سے امی بولیں ہنس کر
لیجاؤں گی تجھ کو پکچر

شبانہ جمیل۔ اردو مڈل اسکول گیولا گیا (بہار)

ہوشیار! یہاں خطرناک قسم کے سانپ پائے جاتے ہیں
یار چھوٹو، اب بتاؤ، ہم تو ان سانپوں کے چچازاد بھائی ہیں بھلا وہ کیوں کاٹنے لگے۔
چھوٹو اور لمبو
کہانی اور تصاویر: جاوید نہال حشمی

ارے باپ رے!!

ب... بچاؤ... بچاؤ... چھوٹو... تم کہاں بھاگ رہے ہو!!
ایک منٹ لمبو، ابھی آیا۔

ارے یار، اتنا گھبرا کیوں رہے ہو، بولو کیا بات ہے۔
میں کیا بتاؤں۔ دیکھ نہیں رہے ہو کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اب تو میں ہل بھی نہیں سکتا ذرا سی حرکت بھی میری جان لے سکتی ہے اب بتاؤ، تم کہاں گئے تھے؟

لمبو، تم تو بڑے ڈرپوک نکلے۔ کانپ تو یوں رہے ہو جیسے سر پر موت کھڑی ہے۔ ارے ہمت سے کام لو یار، ابھی ابھی پولیس کو فون کر کے آ رہا ہوں۔

پیامی ادبی معمّا نمبر ۸

دفتر پیامِ تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ
۲۵ / اگست ۱۹۸۴ء

150 روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ کچھ نہیں آپ جتنے چاہیں حل بھیج سکتے ہیں لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

پہلا انعام: بالکل صحیح حل پر مبلغ 100 روپے **دوسرا انعام:** ایک غلطی والے حل پر مبلغ 50 روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبر وار لکھیے۔

۱۔ ــــــ کی خرابی تمام جسم کی صحت کو خراب کر دیتی ہے۔ (دانتوں / پیٹ)
۲۔ پھر ــــــ ترقی کرتے کرتے امیر البحری کے عہدے پر پہنچا۔ (رفتہ رفتہ / آہستہ آہستہ)
۳۔ موتی نے نانی اماں کو سارا ــــــ سنایا۔ (واقعہ / قصہ)
۴۔ طریقہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی ــــــ کرے۔ (عبادت / اطاعت)
۵۔ لکھنؤ کی شاعری کے خلاف ایک ــــــ تھا۔ (اعلان / جہاد)
۶۔ بہادر وہ جو غصے کے وقت اپنے آپ کو ــــــ لیتا ہے۔ (سنبھال / روک)
۷۔ میں ــــــ کی بات کر رہا ہوں اور تو زبان چلاتی ہے۔ (قاعدے / ایمان)
۸۔ اور جو ال ــــــ کے مفت ملتا ہے، اُڑا دیتا ہے۔ (بلامشقت / بلا محنت)

ضروری اطلاع

چند مجبوریوں کی وجہ سے پیامی ادبی معمّا نمبر ۷ کے نتیجے کا اعلان اس ماہ میں نہیں کیا جا سکا۔ اگست کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں صحیح جواب صفحہ ۳ کی کتابوں میں ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمّے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے:

پیامی ادبی معمّا نمبر ۸ ماہنامہ پیامِ تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

ٹوکن پیامی ادبی معمّا نمبر 8

میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام . . . .

پتا . . . .

مستقبل کا محمد علی کلے

مہاراشٹر کالج کے طالب علم شیخ ریاض نے اپنی عمدہ باکسنگ کے تحت ٹاٹا انوی ٹیوشن آف ریسرچ باکسنگ چمپین شپ میں دوسرا انعام حاصل کیا۔ انہیں مقابلے میں رنراپ قرار دیا گیا ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ مستقبل کے محمد علی کلے بن جائیں۔

شیخ ریاض

پاؤں سے لکھتا ہے

نگینہ۔ ۷ جون۔ مقامی انٹر کالج میں ایک ایسا امیدوار ہائی اسکول کا امتحان دے رہا ہے جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے پاؤں میں قلم پکڑ کر لکھتا ہے اور منہ میں پرکار دبا کر جیومیٹری وغیرہ کے پرچے حل کرنے کی غرض سے دائرے کھینچتا ہے۔

خون سے لکھی ہوئی کتاب

جاپان کے شہنشاہ "سوتوکو" نے ایک کتاب اپنے ہی خون سے لکھی تھی۔ کتاب ۱۳۵ صفحات پر مشتمل تھی شہنشاہ نے یہ کتاب ان تین برسوں میں لکھی جب وہ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

پھول: دنیا میں سب سے کم عرصے کے لیے کھلنے والے پھول ایمیزن کا کنول ہے یہ صرف آدھے گھنٹے میں کھل کر مرجھا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ عرصے تک کھلا رہنے والا پھول استوائی آرچڈ ہے یہ ۸۰ دن کھلا رہتا ہے۔

صوفی بانکوٹی یادگار نقرئی کپ

یہ تصویر اس خوبصورت اور قیمتی نقرئی کپ کی ہے جو بزم اردو چپلون (مہاراشٹر) کی طرف سے ارض کوکن کے مشہور اردو شاعر اور معلم صوفی بانکوٹی مرحوم (وفات ۱۹۷۶ء) کی یاد میں دیے جانے والے غزل خوانی کے خصوصی انعام کے لیے تقریباً ایک ہزار روپے کی لاگت سے بنوایا گیا ہے۔ خالص چاندی کا یہ یادگار کپ بمبئی کے ایک ماہر اور تجربہ کار جوہری نے بطور خاص بزم اردو کے لیے تیار کیا ہے (دائیں طرف کی تصویر صوفی مرحوم کی ہے)

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd. No. D(SE)-043 July, 1984

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

بچوں کی مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
ہمارا دین (اول، دوم، سوم)	سید شہاب الدین دسنوی (فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول، دوم)	عبدالواحد سندھی (فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امراء	〃 〃	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اول، دوم)	〃 〃 (فی حصہ)	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	〃 〃	۳/۰۰
اسلام کیسے شروع ہوا	〃 〃	۴/۵۰
رسول پاک	〃 〃	۳/۵
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۳/
رسول پاک کے اخلاق	〃 〃	۳/
اللہ کے خلیل	〃 〃	۲/۵۰
قصص القرآن	تالیف حمیدہ سید ناظرہ سیف الدین	۴/۵
مصباح القرآن	〃 〃	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
عقائد اسلام	〃 〃	۱/۵۰
[illegible]	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
[illegible]	〃 〃	۱/۵۰
[illegible]	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۲/۰۵
نبیوں کے قصے	〃 〃	۲/۲۵
ہمارے رسولؐ	〃 〃	۲/۰۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۲/۰۰
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی	۱/۵۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان	۲/۰۰

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی ۲

بچوں کی دل چسپی کے
یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی
ہو چکے ہیں۔
قیمت : ۲/۲۵
گاندھی باباکی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی
کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز
پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت : ۲/۰۰
اردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن
صحیح اردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے،
یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار
کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت
بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ
بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت : ۲/۰۰
جب اور اب (آصف مجیب)
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال پہلے کی ایسی
باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔ قیمت : ۱/۷۵
عصمت چغتائی
تین نٹ کھٹ لڑکوں کی
ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان
قیمت ۲/-
ترجمہ: قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمن
الہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی، لیکن اب تو
اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال
ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی
قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(سیفی پریمی)
کہاوت اور کہانی
روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور
کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے
کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت : ۲/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا
بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں
سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے
ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ
بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰
دہلی ۶
بمبئی ۳
علی گڑھ ۱
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

اگست ۸۴ء   جلد ۲۱   شمارہ ۸

ایڈیٹر ـــ ولی شاہجہانپوری

قیمت: ۲/۵۰ روپے / سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

میری اہلیہ کے انتقال پر بہت سارے کرم فرماؤں نے اظہارِ افسوس اور ہمدردی کے خطوط ارسال کیے ہیں. موجودہ حالت میں میرے لیے سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں ہے. میں ان تمام احباب کا شکرگزار ہوں۔

اگست کا شمارہ حاضر ہے. یہ مہینا ہماری آزادی کا مہینا ہے۔ اس موقع پر اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، شاعر اور نقاد ڈاکٹر جاوید وششٹ نے ایک خوبصورت نظم عنایت فرمائی ہے جو آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہماری بزم میں پہلی بار شرکت فرمائی ہے، ہم ان کے ممنون ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمیں ان کا تعاون برابر حاصل رہے گا ـــ نئی نسل کے مقبول ترین شاعر ندا فاضلی نے بھی پہلی بار پیامِ تعلیم کو ایک دلچسپ گیت سے نوازا ہے. ہم اس امید کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ ہمیں آیندہ بھی اپنی گراں مایہ تخلیقات سے نوازتے رہیں گے۔

تایا جان (یوسف ناظم صاحب) نے اس مرتبہ تایا جانوں کی تعریف بہت دلچسپ انداز میں کی ہے. آپ پڑھ کر خوش ہوں گے. اس کے علاوہ ریاض احمد خاں اور محمد شاہد عظیم کی کہانیاں، ناوک حمزہ پوری اور الف قدم صاحبان کی نظمیں بھی آپ کو پسند آئیں گی۔ دوشکاری کی قسطیں اس شمارے میں ختم ہو رہی ہیں۔ اس کہانی کے سلسلے میں پسندیدگی کے بہت سارے خطوط موصول ہوئے ہیں اس لیے ہم امتہ الرحمٰن محسنی صاحبہ سے شکریے کے ساتھ امید کرتے ہیں کہ پیامِ تعلیم سے اپنا تعلق منقطع نہیں کریں گی۔

ولی شاہجہانپوری

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

ندا فاضلی

پہیلیوں کا گیت

اَٹکن بٹکن دہی چٹاکن کھی کھی، بھوں بھوں، میاؤں
ایک پہیلی بڑے مزے کی پوچھوں تم بتلاؤ

۱ - ہلتا جلتا پربت جیسا
پنکھوں جیسے کان
جنگل ہو یا بستی، اس کی
سب سے اونچی شان
اونچا پورا ایک جانور
چہرے سے بھگوان
بولو کیا ؟

اٹکن بٹکن دہی چٹاکن کھی کھی، بھوں بھوں، میاؤں
ایک پہیلی بڑے مزے کی پوچھوں تم بتلاؤ

۲ - سر پہ کوئی تاج نہ پگڑی
اوڑھے سدا دوشالا
رات اندھیری جب بھی نکلے
آنکھیں کریں اُجالا
جنگل کا اک راجا ایسا
بلّی جس کی خالا
بولو کیا ؟

اٹکن بٹکن دہی چٹاکن کھی کھی، بھوں بھوں، میاؤں
ایک پہیلی بڑے مزے کی پوچھوں تم بتلاؤ

۳ - جو دیکھے وہ نقل اُتارے
سب کا جی بہلائے
وقت پڑے تو سینا لے کر
دشمن سے ٹکرائے
رامائن میں کتھا کہ جس کی
ہر پنڈت دُہرائے
بولو کیا ؟

۱۰۲ - امر پارک روڈ نمبر ۴ ورلی، بمبئی ۵۲

۱ - ہاتھی ۲ - شیر ۳ - بندر

جاوید وششٹ

ہمارا جھنڈا

یہ جھنڈا پیارا پیارا ہے
من موہن دیس دُلارا ہے
یہ آزادی کا تارا ہے
یہ جھنڈا پیارا پیارا ہے!

یہ آن ہے اپنی مرتا ہے
یہ قوم کو زندہ کرتا ہے
یہ جیون کا اُجیارا ہے
یہ جھنڈا پیارا پیارا ہے!

دھج اس کی سب سے نیاری ہے
یہ پربت کی پھلواری ہے
یہ گنگا کا نظارا ہے
یہ جھنڈا پیارا پیارا ہے!

یہ لہر لہر لہراتا ہے
یہ چم چم شان دکھاتا ہے
یہ دیپک ہے یہ تارا ہے
یہ جھنڈا پیارا پیارا ہے!

یہ پرچم اپنی آن ہے
ہر جیون کی اُبھلاش ہے
کہتا ہے راج ہمارا ہے
یہ جھنڈا پیارا پیارا ہے!

یہ چکر اشوک کا پیار بھرا
ہے ستیہ اہنسا کا جھرنا
جھرنے میں ترنگا دھارا ہے
یہ جھنڈا پیارا پیارا ہے!

جب لاگ ہوئی ہے تن من سے
جب جنگ چھڑی ہے دشمن سے
رن بھومی میں للکارا ہے
یہ جھنڈا پیارا پیارا ہے!

اے ویرو! کچھ کرنا سیکھو!
جینا سیکھو، مرنا سیکھو!
'جے ہند' ہمارا نعرا ہے
یہ جھنڈا پیارا پیارا ہے!

شعبۂ اُردو، ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ایسا نہیں ہے کہ دنیا میں اب تایا جان کم ہو گئے ہیں لیکن اب یہ آسانی سے ہاتھ نہیں آتے۔ پہلے کی بات اور تھی۔ بڑے بڑے گھر تھے۔ دالان پیش دالان۔ زمین سے لے کر آسمان تک پھیلا ہوا آنگن۔ اس میں بے ترتیبی سے لگے ہوئے اور اُگے ہوئے درخت۔ (ہارسنگھار کا درخت ضروری ہوتا تھا) نیم کے درخت کا سایہ۔ اس میں پڑا ہوا جھولا۔ جھولے میں بھی ایک موٹی سوزنی اٹکی ہوئی، آرام سے بیٹھنے کے لیے (ایسی کرسی پھر کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔) آنگن میں بچوں کا شور۔ آنکھ مچولی۔ لنگڑی وغیرہ وغیرہ اور پھر شان سے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تایا جان۔ یوں تو گھروں میں دادا جان بھی ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب ان کی عمر رعب گانٹھنے کی نہیں رہی تھی۔ کبھی کبھی بچوں سے ہنس بول لیے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر بچوں کو دو چار پیسے دے دیے۔ کبھی لکڑی ہاتھ میں لے کر ایک آدھ گھنٹہ باہر گھوم آئے۔ ورنہ پھر بس اخبار کا مطالعہ — جب بھی نماز سے فرصت ملی، اخبار اٹھا لیا، کتنا ہی پرانا اخبار کیوں نہ ہو ضرور پڑھیں گے۔ اخبار کی پیشانی سے لے کر جہاں لکھا ہوتا ہے۔ ہندستان کا سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار . . . یہاں سے اخبار کی ایڑی تک جہاں چھپا ہوتا ہے "عبدالحق پرنٹر و پبلشر نے ثریا آرٹ پریس سے چھپوا کر محلہ بلی ماران سے شائع کیا۔ (بلی ماران کو کچھ لوگ بِلّی ماران بھی پڑھا کرتے تھے) اور پھر دادا جان احتیاط یہ کرتے تھے کہ اخبار کی کوئی سطر ان سے چھوٹ نہ جائے۔ کبھی کبھی اخبار میں ایک ہی خبر دو جگہ چھپ جاتی تھی اور دادا جان غصّے میں کسی بچّے کو ڈانٹ دیتے تھے ورنہ صرف لاحول ولاقوۃ کہنے پر بات ٹل جاتی تھی۔

تایا جان کا رعب البتہ دیکھنے کا ہوتا تھا۔ دادا جان کی موجودگی میں بھی انھیں گھر کا سب سے بڑا مانا جاتا تھا۔ ان کی حیثیت پرائم منسٹر کی ہوتی تھی۔ درخت کے پتّے کو بھی ہلنا ہوتا تو تایا جان سے پوچھ کر ہلتا تھا۔ ہمارے ابا جان بھی سہمے سہمے رہتے تھے اور چچاؤں کی تو حقیقت ہی کیا تھی۔ شطرنج میں جیسے پیادے ہوتے ہیں بس چچاؤں کا یہی حال ہوتا تھا۔ تایا جان کی موجودگی میں گھر میں صرف ایک چیز ہوتی تھی اور اس چیز کا نام تھا سنّاٹا۔ ایسی گہری خاموشی کہ کوئی بچّہ یا بڑا ادھر سے ادھر جاتا تو تایا جان سمجھ جاتے یہ کس کی چاپ ہے اور فوراً آواز آتی۔ امجد میاں کہاں جا رہے ہو؟۔ دیکھتے نہیں کتنی دھوپ پڑ رہی ہے اور امجد میاں یعنی تمھارے منجھلے چچا چوں چرا کیے بغیر، کسی کمرے میں گم ہو جاتے۔

معلوم نہیں اس زمانے کے تایاؤں کی آواز بھی کیسے اتنی گرج دار ہوتی تھی کسی سے محبت سے بھی بات کرتے تو ایسا معلوم ہوتا ڈانٹ رہے ہیں۔ کسی نوکر سے کبھی گھر

کے سودے کا حساب پوچھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی عادی
چور اچکے پر جرح کر رہے ہوں۔ نانی جان آکر بیچ بچاؤ کرتیں تو
بیچارے چمن میاں کی گلو خلاصی ہوتی۔ ہماری نظر سے تو جتنے
بھی تایا گزرے ہیں اسی قسم کے بارعب اور دبدبے والے
تایا گزرے ہیں کسی تایا کو ہنستے بولتے ہم نے دیکھا ہی نہیں۔
ہاں ان تایاؤں کی بات الگ تھی جو مہمان بن کر کسی چھوٹے
بھائی کے یہاں جاتے تھے۔ اب یہی ہو گیا ہے بڑے بڑے
خاندان ایک جگہ رہ نہیں سکتے۔ دادا جان کے گھر میں بس
ایک دو فرد رہ گئے ہیں۔ خود تمھارے ابا، ریلوے کی ملازمت
کی وجہ سے جبلپور میں رہنے لگے ہیں۔ منجھلے چچا ٹاٹا نگر میں سپروائزر
ہیں۔ سنجھلے چچا تو ہندوستان ہی سے باہر ہیں۔ چھوٹے چچا
نے مراد آباد میں اپنا مطب لگا لیا ہے۔ اب تایا جان کا کبھی
جی چاہا تو کسی کے ہاں مہمان چلے گئے اور مہمان تایا رعب
نہیں گانٹھ سکتے۔ خود ہی سوچتے ہیں کہ کچھ دنوں کے لیے آیا
ہوں کیا کسی کو ڈانٹوں۔ مہمان بن کر تایا جان تایا بالکل نہیں
لگتے، چچا معلوم ہوتے ہیں۔ خود ہی بڑھ بڑھ کر کام کریں گے۔
ارے امجد میاں تم جاؤ اپنی ڈیوٹی پر۔ آج منّے کو اسپتال لے
جانا ہے میں لے کر چلا جاؤں گا۔ آتے وقت اچھن کو اسکول سے
بھی لیتا آؤں گا۔ ہاں، ہاں جاؤ تم۔ میں کوئی مہمان تھوڑا ہی
ہوں اور باہر جاؤں گا تو تفریح ہو جائے گی ــــ ورنہ یہی
تایا جان اپنے گھر میں تھے تو کیسا حکم چلاتے تھے خود نانی جان
کا کیا غضب کا رعب تھا۔ جتنا بڑا پاندان اتنا ہی بڑا رعب۔
دیورانیاں آگے پیچھے پھر رہی ہیں۔ بھابی جان بھابی جان کہتے ان کے حلق
سوکھ جاتے (حلق سوکھنے پر تھوڑا پانی پی لیتی تھیں) کوئی ان
کی چھالیہ کتر رہی ہے تو کوئی ان کے ڈبے میں چینٹ ڈال
رہی ہے۔ بیٹیاں، بھتیجیاں سر میں بادام کا تیل انڈیل رہی
ہیں تو دوچار ان کے لیے پاپڑ بیل رہی ہیں۔ نانی جان گھر کے
سارے کام دیوروں سے لیتی تھیں (تایا جان کی تائید جو
حاصل تھی) اپنے بیٹوں سے کبھی یہ کہتیں کہ صمد پاشا! ذرا حکیم صاحب
کے پاس جا کر بدہضمی کی دوا تو لے آنا۔ نشاط میاں سے کبھی
فرمائش ہوتی کہ آج خالہ جان کے گھر جا کر خیریت تو پوچھ آؤ

لیکن چچاؤں پر حکم چلاتے کبھی نہ تھکتیں۔ اے امجد میاں کب
سے تمھیں آواز دے رہی ہوں۔ کمرے میں جاتے ہو تو باہر
ہی نہیں آتے۔ حکیم صاحب کے ہاں جا کر اپنے بھائی صاحب
کی دوا لے آؤ۔ ان سے کہنا اچھی دوا دیں ورنہ ہم حکیم بدل
دیں گے۔ پچھلی مرتبہ بتایا تھا کہ انھیں خوب یخنی پلاؤ ــ اور
جب بھی یخنی پلانے کا وقت آتا حکیم جی خود آکر آدھی سے
زیادہ یخنی پی جاتے۔ کچھ خاص فائدہ نہیں ہوا۔ وید جی ان
سے دو جوتے آگے تھے۔ بتایا خوب پھل کھلاؤ۔ خیریت
پوچھنے جب بھی تشریف لاتے انگور اور سیب کا نام ونشان
تک گھر میں نہیں ملتا۔ بس رہنے دو۔ لیکن یہ ان سے جا کر
مت کہنا۔ بس یہی کہیو بھوک ابھی کھلی نہیں ہے ــ اور
ہاں صمد پاشا نے شیروانی سلنے کے لیے دی تھی۔ درزی سے
پوچھتے آنا کہ کب تیار ہو گی ــــ امجد میاں نے ادھر گھر سے
قدم باہر نکالا اور نانی جان کو تمھارے اچھن چچا کی یاد آئی۔
یہ اچھن کہاں چلے گئے یہ لڑکا گھر میں تو رہتا ہی نہیں۔ ان
کے بھائی صاحب کو خبر ہو گئی تو میرے سر ہو جائیں گے کہ
ان کے بھائیوں کا خیال نہیں رکھتی۔

اور ابھی ۱۲ بجے نہیں کہ تایا جان کی بھوک اچانک کھل گئی۔
تایا جان کو جب بھوک لگتی تھی تو بس لگی ہی رہتی تھی۔
بھوک کھلتے ہی ان کا منہ بھی کھل جاتا تھا، اور پھول جھڑنے
شروع ہو جاتے تھے۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ کسی تایا جان
کی بھوک اور کسی بچے کی بھوک میں کوئی فرق نہیں ہوتا
بس فرق ہوتا ہے تو یہ کہ بچہ، فر فر تقریر نہیں کر سکتا صرف
رو سکتا ہے۔

تایاؤں میں ہم نے یہ عادت بھی دیکھی کہ جب انھیں
نہانا نہیں ہوتا پانی ضرور گرم کروا تے ہیں۔ پانی رکھے
رکھے ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو پوچھتے ہیں یہ ٹھنڈا کیسے ہو گیا۔
ارے دو گھنٹے پانی رکھا رہے گا تو ٹھنڈا ہو گا ہی، گرم تو
ہونے سے رہا۔ آپ دیوان خانے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر
دوستوں کے ساتھ حقہ نوش فرمائیں گے تو پانی ٹھنڈا ہی
نہیں برف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن گھر میں کس کی مجال ہے

جو سائنس کا یہ معمولی فارمولا تایا جان کو سمجھا سکے۔ اور اگر کبھی گرم پانی سے صحیح وقت پر نہا لیتے لیکن پائجامے میں ازار بند نہیں ملا تو سمجھو محلے بھر کی خیر نہیں۔ تایا جان کو ایسا شدید صدمہ پہنچتا ہے گویا ان کا کوئی لختِ جگر نورِ نظر بازار میں کھو گیا ہو اور اب ڈھونڈے نہیں مل رہا ہے۔ وہ شور وہ شور کہ گھر کی دیواریں ہلنے لگتی تھیں۔ (وہ تو غنیمت پرانے زمانے کی اینٹ چونے کی دیواریں تھیں جو سب کچھ سہہ لیتی تھیں) اب ہر شخص ایک ایک ازار بند لیے حمام کی طرف دوڑ رہا ہے — اسے کہتے ہیں تایا جان۔

تایا جان کے برخلاف چچاؤں پر اتنی محبت آتی تھی کہ انھیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ چچا تو بالکل نہیں لگتے تھے۔ چچاؤں کی پیٹھ گھوڑے سواری کے بھی بہت کام آتی تھی۔ کاندھے پر چڑھنا اور زیادہ اچھا معلوم ہوتا تھا اور چچا میاں ہیں کہ خفا ہونے کی بجائے خوش ہو رہے ہیں۔ کچھ چچاؤں کو تو ہم نے بھتیجوں سے بھی عمر میں کم دیکھا ہے اور جو چچا بھتیجے سے عمر میں ایک مرتبہ پیچھے رہ جاتا ہے عمر بھر پیچھے ہی رہتا ہے۔ اب کوئی عمر تعلیم، یا کھیل تو ہے نہیں کہ پڑھ لکھ کر یا کھیل کود کر بھتیجے سے آگے نکل گئے۔ عمر کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ یہ پتھر کی لکیر کی طرح ہوتا ہے۔ ایسے چچا جو عمر میں کسی بھتیجے سے چھوٹے ہوں، گھروں میں عجیب عجیب نظر آتے تھے۔ رشتہ برائے نام ہوتا تھا۔ بس یوں سمجھو چچا کے نام کی تختی۔ پیٹھ پر لگی رہتی تھی اور فائدہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ بھتیجے صاحب کی عزت کرنی پڑتی تھی لیکن چچاؤں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ یہ سب باتیں وہ ہنسی خوشی سہہ لیتے ہیں۔ بچوں میں بچہ اور بڑوں میں بڑا بننے کی ان میں کچھ ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ انھیں دیکھو تو شبہ ہوتا ہے کہ یہ اصلی چچا ہیں یا کسی ڈرامے میں پارٹ کر رہے ہیں۔ ابھی تو للّٰہ دمیاں کے ساتھ جھاڑ پر چڑھ کر کچے امرود کھا رہے تھے اور اب ابّا میاں کے سامنے کیسے مؤدب بیٹھے ہیں۔ پکے ایکٹر ہیں ایکٹر — اب ابا میاں کو بھی بھلا کیا ضرورت ہے چچا میاں سے پوچھ تاچھ کرنے کی۔ لیکن گھر میں کوئی تایا جان نہ ہوں تو ابا جان ہی سب سے بڑے ہوتے ہیں اور بڑوں کو ایک کام بہت اچھا آتا ہے رعب گانٹھنا۔ اور حق بات پوچھی جائے تو رعب صرف تایا جان کو زیب دیتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے یہ لوگ بنائے ہی اسی کام کے لیے گئے ہیں۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تایا جان کے رعب کے فائدے بہت سے تھے۔ بچے کھیلتے کودتے تھے، لڑتے جھگڑتے تھے لیکن پڑھائی کے معاملے میں سب کے سب سیدھے رہتے تھے۔ اٹین شن۔ امتحان ہوتا تو صمد پاشا اپنی جماعت میں اوّل آئے اور نشاط میاں کو تقریری مقابلے میں دوسرا انعام مل گیا۔ ادھر فہمیدہ بی بی نے اپنے اسکول کے پکوان کے مقابلے میں اپنے کمال کا وہ مظاہرہ کیا کہ ان کی صدر معلّمہ ان کی تیار کی ہوئی ڈش پوری کی پوری صاف کر گئیں اور انعام میں غصتی دسترخوان کے ساتھ ساتھ باورچی خانے کے سامان کا ایک سیٹ بھی عطا کر دیا۔ گھر میں فیل ہونے کا تو کسی نے نام ہی نہیں سنا۔ اب اسے تم بچوں کی محنت اور لگن کا پھل کہو یا تایا جان کے رعب اور دبدبے کا نتیجہ۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس راستے پر سب کو تایا جان کے ڈنڈے نے ہی لگایا اور یہی تایا جان عید کے دن کتنے اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اس دن تو ان کے چہرے پر خدا جانے کہاں سے اتنی معصومیت آجاتی تھی۔ یہ سالانہ معصومیت ہوتی تھی اور اس معصومیت کے ساتھ فیاضی بھی۔ بچے قطار باندھ کر کھڑے ہیں (گویا کسی بس میں سوار ہونا ہے) نام بہ نام تایا جان کی خدمت میں پیش ہو رہے ہیں (گویا حاضری دے رہے ہوں) اور تایا جان ہر کسی کو عیدی بانٹ رہے ہیں۔ اور اس عیدی کے ساتھ ڈھیر ساری دعائیں۔ بس عید کے دن تایا جان اتنے اچھے معلوم ہوتے تھے کہ دل سے دعا نکلتی تھی کہ خدا کرے یہ سال بھر ایسے ہی موڈ میں رہیں۔

تو سچ مچ تایا جان ایسے ہوا کرتے تھے۔ ہم تو فقط نام کے تایا ہیں۔ کوئی پوچھے آپ کس کام آتے ہیں تو ہم سے کوئی جواب نہ بن پڑے اور اب سب معاملے الٹے ہو گئے ہیں۔ آج کے تایا جان تو بچوں سے عیدی لینے لگے ہیں چھپ کر پان کھانے کے لیے۔

سزا

مرزا ادیب

سمیعہ اور مبین۔ یہ دونوں بہن بھائی اپنی پھوپھی کے بیٹے ماجد کے گھر گئے تو ماجد نے انھیں اپنے کمرے میں لے جاکر کئی اچھی اچھی اور خوبصورت چیزیں دکھائیں۔ ان میں طرح طرح کے گل دان تھے، کئی قسم کے باجے تھے اور رنگین تصویروں والی کتابیں بھی تھیں۔ دونوں بہن بھائی یہ ساری چیزیں دیکھ چکے اور ان کی تعریف بھی کر چکے تو سمیعہ بولی:

"ماجد! بس یہی چیزیں ہیں تمھارے پاس؟"

ماجد بولا:

"نہیں، ایک اور شے بھی ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو کہو گے یہ تو ایک معمولی چیز ہے، مگر میں نے اُسے حاصل کرنے میں تین دن صرف کر دیے تھے۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئی تھی۔"

سمیعہ اور مبین کا اشتیاق بڑھ گیا، مگر ماجد تھا کہ وہ انھیں یہ عجیب و غریب شے دکھاتا ہی تھا، کہتا تھا کہ تم اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوگے۔ آخر جب دونوں نے بہت اصرار کیا تو ماجد نے اپنی میز کی سب سے آخری دراز کھولی۔ اس میں سے ایک کتاب نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ سمیعہ اور مبین بے چینی سے اس کی حرکت دیکھ رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر ماجد کی انگلیاں رک گئیں۔

"یہ دیکھو!" اس نے کتاب کا ایک صفحہ انھیں دکھایا۔

اس صفحے پر ایک بہت خوبصورت تتلی اس طرح پڑی تھی جیسے کسی مصور نے کاغذ پر کئی رنگ بکھیر دیے ہوں۔ لگتا تھا مردہ نہیں ہے زندہ ہے، ابھی کتاب میں سے نکل کر اڑ جائے گی۔

"یہ تو بہت ہی خوب صورت تتلی ہے۔ کتنے رنگین پر ہیں اس کے!" سمیعہ کہنے لگی۔

"اور پھر کتنی نازک ہے!" مبین بولا۔

ماجد انھیں بتانے لگا کہ سات آٹھ روز ہوئے
وہ ایک باغ میں گیا تھا — اس باغ میں جا بجا
پودوں پر گلاب کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے پھول
اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اس نے ایک پودے
پر بھی تتلی دیکھی اور اس کا جی چاہا کہ اسے پکڑے،
لیکن تتلی اڑ گئی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ وہاں
سے اڑ کر ایک اور پودے پر چلی گئی۔ دیر تک وہ
اس کے پیچھے بھاگتا رہا اور وہ ایک پودے سے
دوسرے پودے اور تیسرے پودے پر جاتی رہی۔
اس دن مایوس ہو کر گھر واپس آگیا۔ دوسرے روز
پہنچا تو دو تین تتلیوں کو دیکھا۔ خوبصورتی میں ایک
سے ایک بڑھ کر۔ اس نے ایک تتلی کو پکڑنے کی
کوشش لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ تیسرے روز کہیں
جا کر ایک تتلی ہاتھ آئی اور وہ اسے مٹھی میں دبا کر
گھر آگیا اور اسے کتاب میں بند کر دیا۔

سمیعہ اور مبین نے اس کی ہمت کی تعریف
کی اور دونوں اپنے گھر آگئے۔

انھیں وہ تتلی اس قدر پسند آئی تھی کہ دونوں
کے اندر یہ خواہش پیدا ہو گئی کہ وہ بھی کسی باغ
میں جائیں اور ایسی ہی خوبصورت تتلی پکڑ کر اپنی
کتاب میں رکھ لیں اور اسی روز وہ ایک قریبی
باغ میں چلے گئے۔

اس باغ میں پھولوں سے لدے ہوئے
پودے تو درجنوں کے حساب سے تھے مگر تتلی
کہیں نہیں تھی۔ کافی دیر کے بعد ایک تتلی آئی
اور چند پودوں کا چکر لگا کر نہ جانے کہاں
غائب ہو گئی۔

سمیعہ اور مبین اسے تلاش ہی کرتے رہے،
مگر کہیں بھی نہ مل سکی۔

دوسرے روز بھی یہی کچھ ہوا اور جب تیسرے
روز بھی وہ کسی تتلی کو نہ دیکھ سکے تو سمیعہ کہنے
لگی،

"مبین! اس باغ میں تو تتلیاں آتی ہی
نہیں ہیں۔"

مبین کو اس بات سے اتفاق نہیں تھا
وہ کہتا تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ باغ میں
اتنے سارے پھول تو ہوں اور تتلی ایک بھی
نہ آئے۔

سمیعہ کو ایک تجویز سوجھی:

"مبین! ہم اس باغ میں کیوں نہ جائیں
جس باغ میں ماجد کو وہ نہایت پیاری تتلی ملی
تھی۔"

مبین کو بہن کی یہ تجویز پسند آگئی۔ دونوں
اسی وقت اس کے ہاں جا پہنچے۔

ماجد کہنے لگا:

"تتلیاں تو ہر باغ میں ہوتی ہیں، مگر تم
کوئی پکڑ ہی نہیں سکتے۔ میں نے کئی گھنٹے کوشش
کی تھی جب کہیں جا کر اسے پکڑنے میں کامیاب
ہوا تھا۔ شاید تم ایسی کوشش کر ہی نہیں سکے۔"

دونوں بہن بھائی یہ لفظ سن کر ماجد سے
ناراض ہو گئے اور وہ ہنسنے لگا۔

"اچھا، اگر تم اس باغ میں جانا چاہتے ہو
تو میں تمھیں اس کا پتا بتائے دیتا ہوں۔"

اور ماجد نے انھیں اس باغ کا پتا بتا دیا۔

وہ اسی شام وہاں چلے گئے۔ ایک پودے
پر ایک بھونرا منڈلا رہا تھا۔

"مبین! تتلی تو ملے گی نہیں۔ آؤ بھونرا ہی
پکڑ لیں۔"

"واہ۔ ہم بھلا بھونرا کیوں پکڑیں۔ یہ ہمارے
کس کام کا۔ اس میں تو خوب صورتی نام کو بھی
نہیں۔ ہم تتلی ہی پکڑیں گے۔"

"ضرور پکڑیں گے۔" سمیعہ نے جوش سے کہا۔

اس دن تو وہ کوئی تتلی دیکھ ہی نہ سکے۔
دوسرے روز اسکول کی چھٹی تھی اور انھوں نے طے کر لیا تھا۔ ناشتا کر کے فوراً باغ میں چلے جائیں گے اور جب تک تتلی نہیں پکڑ لیں گے گھر کا رُخ نہیں کریں گے۔
جلدی جلدی تیار ہو کر وہ باغ میں چلے گئے۔
عجیب اتفاق تھا کہ اس وقت وہاں ایک چھوڑ تین چار تتلیاں ادھر اُدھر اُڑ رہی تھیں۔
"مبین ہم یہ پکڑیں گے۔ یہ سنہری پروں والی۔ ہائے اللہ کتنی پیاری ہے۔"
"ہاں بہت ہی پیاری ہے۔ تم اُدھر سے آؤ اور میں اُدھر سے۔"
دونوں آہستہ آہستہ تتلی کی طرف بڑھنے لگے اور کرنا خدا کا یہ ہوا کہ تتلی سمیعہ کی مٹھی میں بند ہو گئی۔
وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔
"ہماری تتلی ماجد کی تتلی سے زیادہ خوبصورت ہے۔"
"ہم اُسے دکھائیں گے تو وہ حیران رہ جائے گا۔"
مبین نے جیب سے رومال نکالا اور اس میں تتلی کو بند کر لیا۔
وہ اپنے گھر کو جانے ہی والے تھے کہ ماجد کی چھوٹی بہن بینا بھاگی بھاگی آئی۔
"آپ کو بھائی جان بلاتے ہیں۔"
"نہیں، اس وقت ہم نہیں آ سکتے۔ ہم نے نہایت خوبصورت تتلی پکڑی ہے۔" مبین نے کہا۔
"بھائی جان کہتے ہیں فوراً آئیے۔ بے حد ضروری کام ہے۔" بینا بولی۔
سمیعہ اور مبین بینا کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ماجد کے گھر پہنچ گئے۔
انھوں نے دیکھا کہ وہ پلنگ پر لیٹا ہے اور سینے تک ایک چادر اوڑھ رکھی ہے۔
"سمیعہ! خدا کے لیے تتلی مت پکڑو۔"
سمیعہ نے قہقہہ لگا کر کہا:
"ہم نے تو ابھی ابھی پکڑی ہے۔ تمھاری تتلی سے بہت زیادہ خوبصورت ہے۔"
"کہاں ہے؟" ماجد کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سخت گھبرایا ہوا ہے۔
"یہ ہمارے پاس!" سمیعہ نے کہا۔

"دکھاؤ تو!"
سمیعہ نے رومال دکھایا، جس کے اندر تتلی بند تھی۔
ماجد نے اسی لمحے رومال کھول دیا، تتلی اُڑ گئی۔
"یہ تم نے کیا کیا ہے۔ وہ ہماری تتلی تھی۔ تم نے اسے کیوں اڑا دیا۔ اتنی مشکل سے ہم نے پکڑی تھی۔ تم حاسد ہو، ہماری خوبصورت تتلی دیکھ نہیں سکے۔"

سمیعہ نے غصے سے کہا:
"تمھیں کیا حق تھا کہ ہماری تتلی اڑا دو۔ ہم اسے کتاب میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ ہماری تتلی تھی، تمھاری نہیں تھی۔"
سمیعہ اور نبین نے دیکھا کہ ماجد کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ وہ اس کی یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سوچنے لگے کہ ماجد کو یکایک ہو کیا گیا ہے۔ کیوں رونے لگا ہے۔ "سمیعہ! ذرا میری ٹانگوں سے چادر ہٹا دو۔"
سمیعہ نے چادر ہٹا دی۔ ماجد کی دونوں ٹانگوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔
"کل میں سڑک پر جا رہا تھا کہ ایک رکشا تیزی سے آیا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور اسے روکتا۔ وہ مجھ سے ٹکرا گیا اور میں کئی فیٹ دور جا پڑا۔ دونوں ٹانگوں کے علاوہ پیٹھ اور بازوؤں پر بھی زخم آئے ہیں۔"
سمیعہ اور نبین اس کے زخم دیکھ کر افسوس کرنے لگے۔
"جانتے ہو یہ کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ میں نے اللہ کی ایک مخلوق پر ظلم کیا تھا۔ اس کی جان لے لی تھی۔ ابا امی بار بار یہی کہتے ہیں کہ تمھیں اس کی سزا ملی ہے۔ تم ہرگز یہ ظلم نہ کرنا۔ کہیں تمھارا بھی ویسا حال نہ ہو جو میرا ہوا ہے، اسی لیے میں نے تمھاری تتلی اڑا دی ہے۔"
اس وقت سمیعہ اور نبین نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ کبھی تتلی نہیں پکڑیں گے۔

ناوک حمزہ پوری

مولا! وہ پانی برسا دے

خشک ہیں ندیاں خشک ہیں نالے
پڑے ہیں اب جینے کے لالے
قحط کا خطرہ دور بھگا دے
مولا وہ پانی برسا دے

جو دھرتی کو جل تھل کر دے
کھیتوں کھیتوں پانی بھر دے
اوسر کو زرخیز بنا دے
مولا وہ پانی برسا دے

ہر سو چھا جائے ہریالی
گھر گھر میں آئے خوش حالی
دل یوں کسانوں کے گرما دے
مولا وہ پانی برسا دے

کھیتوں میں لہرائیں پودے
دل میں شمعِ محبت لو دے
تن کی من کی پیاس بجھا دے
مولا وہ پانی برسا دے

نفرت کی دیوار جو ڈھا دے
الفت سے گھر بار سجا دے
پریم کا وہ ساگر لہرا دے
مولا وہ پانی برسا دے

قومی اردو ٹائمز ([illegible])

مرغ کی جیت

ریاض احمد خاں

ایک سرسبز و شاداب جنگل میں پہاڑ کے بیچ شیشم کا ایک پیڑ تھا۔ اس پیڑ پر کئی برسوں سے ایک جنگلی مرغ رہا کرتا تھا جو ہر روز صبح صادق کے وقت اذان دیا کرتا تھا۔ اس کی آواز میں اتنی کشش تھی اتنا میٹھا پن تھا کہ اذان کی آواز سن کر سب ہی پرندے بیدار ہو جایا کرتے اور سونے جنگل میں ان کی چہچہاہٹ سے زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے، اپنی اسی اذان کی وجہ سے مرغ تمام جنگلی پرندوں میں مقبول تھا اور ہر پرندہ اس کی عزت کرتا تھا۔

جنگل کے چوپائے جیسے نیل، سانبھر، ہرن، چیتل، لومڑی وغیرہ مرغ کی مقبولیت سے جلنے لگے۔ لومڑی نے سب جنگلی جانوروں کی ایک میٹنگ بلائی اور کہا کہ یہ مرغ ہر روز صبح چیخ چیخ کر ہماری نیندیں حرام کر دیتا ہے۔ اس سے کہا جائے کہ یہ صبح کو چیخنا بند کرے۔ لومڑی تو اتنا کہہ کر الگ ہو گئی دوسرے جانوروں نے یہ فیصلہ کیا کہ مرغ اور دوسرے پرندوں کو جمع کریں اور مرغ سے احتجاج کریں کہ وہ صبح کو چیخنا بند کرے تاکہ دوسروں کی نیند حرام نہ ہو۔ اس تجویز سے لومڑی کو بھی آگاہ کیا گیا۔ لومڑی یہ سن کر خوش ہوئی اور سب جانوروں کو مخاطب کر کے کہنے لگی کہ اب بہت جلد آپ لوگ صبح خواب خرگوش کے مزے اٹھائیں گے۔

ایک دن میٹنگ کا طے ہوا۔ ایک طرف تو جنگل کے تمام پرندے جیسے توتا، مینا، بلبل، فاختہ، قمری، کوئل وغیرہ جمع ہوئے اور دوسری طرف نیل، سانبھر، چیتل، ہرن، خرگوش، لومڑی وغیرہ۔ ان دونوں کے درمیان مرغ تھا جو خدا کی صناعی کا بہترین نمونہ تھا۔ سر پر کلغی کا تاج، سنہرے بیچ رنگی پر اور خوبصورت سی لمبی دم جو اس کی شان و شوکت میں اضافہ کر رہی تھی۔ ادھر سے لومڑی آئی اور کہنے لگی کہ "مرغے" تم کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم آدھی رات سے چیخنا چلانا شروع کر دو اور ہم سب کی نیند خراب کر دو۔ اس لیے اب ہمارا یعنی سب جانوروں کا فیصلہ ہے کہ کل سے تمہارا صبح کے وقت چیخنا چلانا بند ہو جائے۔"

مرغ نے لومڑی کو جواب دینے کے لیے اپنی چونچ کھولی ہی تھی کہ توتا بیچ میں آ بیٹھا اور کہنے لگا۔ "چالاک لومڑی" مرغ چیختا نہیں ہے بلکہ وہ تو اذان دیتا ہے کہ قدرت نے اس کے ذمہ یہ کام کر دیا ہے۔ وہ خود خدا کو یاد کرتا ہے اور ہم سب کو صبح کے وقت اٹھا کر خدا کی یاد میں مصروف ہونے کو کہتا ہے۔"

توتے کی بات سن کر لومڑی چراغ پا ہو گئی اور کہنے لگی "مٹھو میاں تمہیں تو ٹیں ٹیں کرنے کی عادت

۴۲ - ۴۵ حبیب ولا۔ لور نسبٹ روڈ مجگاؤں، بمبئی ۱۰

ہے جس کی وجہ سے تم دنیا بھر میں بدنام ہو۔ اگر اللہ کی یاد ہی کرنا ہے تو خاموشی سے پیڑ کی شاخ پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرو دوسروں کو کیوں پریشان کرتے ہو۔"

مرغ معمر تھا اور سمجھدار بھی۔ لومڑی اور توتے کی گفتگو کو کاٹتے ہوئے کہنے لگا: "اگر میری اذان سے تمہاری نیندیں حرام ہوئی جا رہی ہیں تو میں کل سے اذان نہیں دوں گا۔" مرغ کی یہ بات سن کر سب پرندوں نے مل کر اس سے احتجاج کرنا چاہا مگر مرغ کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے خاموش رہے۔ میٹنگ ختم ہوگئی۔ جنگلی جانور کودتے پھاندتے چلے گئے ادھر تمام پرندے خاموش بیٹھے رہے۔ خاموش اس لیے کہ لومڑی کی فتح ہوگئی تھی اور پرندے ہار گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کوئل اڑ گئی اس کے بعد بلبل اور آخر میں توتا بھی ٹیں ٹیں کرتا اڑ گیا۔ مرغ نے پر پھڑ پھڑائے جمائی لی اور پھر وہ بھی اپنے شیشم کے پیڑ پر جا کر اداس بیٹھ گیا۔

اسی طرح تمام دن گزرا اور شام ہوئی۔ حسب معمول پرندوں کے غول کے غول آتے اور اطراف کے درختوں پر بیٹھ کر شور مچاتے رہے اور جب سورج غروب ہوگیا اور اندھیرا پھیل گیا تب تمام پرندے بھی خاموش ہوگئے۔ آہستہ آہستہ رات گزر رہی تھی۔ صبح صادق ہونے کے قریب تھی کہ مرغ نے اپنے پر پھڑ پھڑا کے جھرجھری لی اور اذان دینے کو اپنی چونچ کھولی ہی تھی کہ اسے لومڑی کو دیا ہوا وعدہ یاد آگیا اس لیے اس نے اذان نہیں دی۔

جنگل کے جانور مرغ کی اذان سے ہی بیدار ہو جایا کرتے تھے مگر آج خوابِ غفلت میں پڑے رہے۔ جنگل میں اس قدر خاموشی تھی لگتا تھا جیسے صبح ہونے میں بہت دیر ہے۔ اسی خاموشی میں ایک طرف سے ایک شیر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ جنگلی جانور بے خبر پڑے سو رہے ہیں اور انھیں آسانی سے شکار کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ واپس اپنے بھٹ میں گیا اور اپنے بھائی اور ماں باپ کو ساتھ لے آیا۔ چاروں شیروں نے ان سوتے ہوئے جنگلی جانوروں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر فوراً ہی ان پر جھپٹ پڑے تھوڑی دیر میں انھوں نے سب سوتے ہوئے جنگلی جانوروں کو مار ڈالا۔

جب سورج نکلا اور اس کی روشنی پھیل گئی تب پرندوں نے درختوں پر سے یہ خوفناک منظر دیکھا اور لرز گئے۔ توتا، مینا، بلبل، کوئل سب کے سب مرغ کے پاس آئے۔ مرغ رنجیدہ تھا کیونکہ وہ خون خرابہ پسند نہ کرتا تھا۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ جو حکم خدا ہے وہ ہر حال میں ہو کر رہے گا۔ سب پرندوں نے مرغ سے التجا کی کہ وہ حسب معمول صبح اذان دیا کرے۔

دن گزرا اور اسی طرح رات گزری۔ صبح صادق کے وقت مرغ نے انگڑائی لی پھر پر پھڑ پھڑائے اور بڑی کو نجدار آواز میں اذان دینے لگا تھوڑی ہی دیر میں جنگل کا ہر پرندہ چہچہانے لگا اور خاموش جنگل میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔

محمد شاہد عظیم

آخری سبق

جب دوسری بس بھی دھول اڑاتی ہوئی تیزی کے ساتھ گزر گئی تو شمی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے، کچھ دیر پہلے جب دور سے بس آتی دکھائی دی تو اسے ڈھارس بندھی کہ اس بس میں ضرور جگہ مل جائے گی بس آئی اور رکے بغیر چلی گئی، بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی بعض تو لٹک رہے تھے.

آدھے گھنٹے پہلے جب شمی کتابوں اور کاپیوں کا بھاری بوجھ سنبھالے بس اسٹاپ پر پہنچی تو اس کی بس جا چکی تھی بس کب کسی کا انتظار کرتی ہے!! آج بسوں نے گویا اس اسٹاپ پر نہ رکنے کی قسم کھا رکھی تھی، کچھ دیر بعد وہ بسوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے بے حال ہو گئی، اس کے کپڑوں اور جوتوں تک پر گرد جم گئی۔ شمی نے ایک دو نہیں پانچ مرتبہ بسوں میں سوار ہونے کی ناکام کوشش کی. لیکن اس ننھی سی جان کو کون پوچھتا، یہاں ہر ایک کو بس اپنی فکر تھی جلدی گھر جانے کی دور سے ایک اور بس آتی دکھائی دی، شمی دوڑ لگانے کے لیے تیار ہو گئی، ایک تو کتابوں اور کاپیوں کا بوجھ دوسرے بس چھوٹ جانے کا اندیشہ وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑی، ایک شخص کو شاید رحم آ گیا اس نے لپک کر شمی کو اٹھا لیا ”چچ چچ“ کہیں چوٹ تو نہیں آئی بیٹی، ابھی وہ کوئی جواب دینے بھی نہیں پائی تھی کہ کسی نے اسے بس میں کھینچ لیا کنڈکٹر سامنے ہی کھڑا تھا۔ ”ٹکٹ“ —— شمی نے پیسوں کے لیے بستے میں ہاتھ ڈالا، یہ کیا، اس کا دل دھک سے ہو گیا، چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، پیسے شاید کہیں گر گئے تھے، کنڈکٹر دوسروں کو ٹکٹ دے کر پلٹا تو وہ ابھی بستا ٹٹول رہی تھی، ”بے بی جلدی سے پیسے نکالو“، اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ”پیسے گر گئے“ ”گر گئے، تم ابھی بس سے اتر جاؤ“ کنڈکٹر جیسے غرایا۔ ایک مسافر کو شمی کی حالت دیکھ کر رحم آ گیا اس نے کنڈکٹر کے ہاتھ میں کوئی سکہ تھما دیا۔ ”کہاں جانا ہے“، ”کوٹھی“ شمی تھکی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بس حیدر گوڑہ جا رہی ہے تم کوانٹی پر اتر جانا“، کنڈکٹر اسے کوانٹی کا ٹکٹ تھما کر ہجوم میں گھس گیا۔ یہ جان کر کہ بس کوٹھی نہیں جا رہی ہے شمی کی جیسے جان نکل گئی۔ اب تو رات بھی ہونے لگی تھی.

شمی تھی تو صرف دس سال کی لیکن اپنی کلاس میں سب سے زیادہ ہوشیار تھی ہمیشہ فرسٹ ڈویژن لاتی، اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ سہیلی کے گھر جا کر کھیلنا اسے اس قدر مہنگا پڑے گا، بے بسی اور پریشانی کا خیال کر کے شمی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے، اس کا جی چاہا کہ خوب زور زور سے روئے دو تین اسٹاپ تیزی سے گزر گئے، بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی ”کنڈکٹر چلایا“ ”کوانٹی“ شمی اپنا بستا سنبھال کر نیچے اتر گئی اسے یہیں سے کوٹھی کی بس پکڑنی

۲۲/۱۱۲-۲-۱۸ ریلوے اسٹیشن روڈ فلک نما حیدر آباد

تھی۔ غلط بس میں بیٹھنے کی وجہ سے وہ غلط جگہ آگئی تھی۔ اس
نے پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اسٹاپ
پر دو تین مسافر اور تھے۔ اتنے میں ایک دبلا پتلا شخص
جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اس کے قریب آیا، کیوں
بیٹی راستہ بھول گئیں، آؤ تمھیں گھر پہنچا دیں، اس کے
لہجے میں بلا کی مٹھاس تھی۔ وہ شخص جو اچانک سامنے آگیا
تھا اسے سچ مچ رحمت کا فرشتہ معلوم ہوا بے اختیار
اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے ساتھ چلی جائے شمی نے
گھر کا بتایا، وہ کہنے لگا: اب کوٹھی کی بس نہیں آئے گی
رکشا سے چلیں گے، آؤ بیٹی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک
طرف چلنے لگا۔ لیکن اچانک ہی نہ جانے کیوں شمی کو
اس شخص سے خوف محسوس ہونے لگا۔ دراصل اسے
اچانک اپنی سہیلی کشٹی یاد آگئی، جو راستہ بھٹک گئی تھی اسے
بعض لوگوں نے، ایک اجنبی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا
تھا پھر وہ گھر لوٹ کر نہیں آئی۔ اس کے قدم من من بھر
کے ہوگئے وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ جانے کی سوچ رہی
تھی کہ ایک حیرت انگیز بات ہوئی، شمی کے ڈیڈی سامنے
سے اسکوٹر پر آرہے تھے، اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں
آیا، ڈیڈی، نے اسکوٹر سے اتر کر اسے چمٹا لیا —— وہ
بے اختیار رونے لگی "نہ رو پگلی اچھا ہوا جو تو یہاں مل گئی
ورنہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنا پڑتا، تو اسکول سے کہاں
چلی گئی تھی"۔ بھلا وہ کیا جواب دیتی، روتے روتے ہچکیاں
جو بندھ گئی تھیں۔ شمی نے دیکھا وہ دبلا پتلا آدمی تیزی
سے آگے جا رہا تھا۔

ممی نے بتایا کہ جب وہ چھ بجے تک بھی گھر نہیں
پہنچی تو سب لوگ پریشان ہوگئے بھیا، انکل اور
ڈیڈی اس کی تلاش میں نکل گئے دادا کو کچھ اور نہ سوجھی
تو انھوں نے ٹیلی فون پر ہی پولس میں رپورٹ درج کرا
دی۔ اس کے اسکول کا ٹیلی فون شاید خراب تھا، دادا
دو تین بار ٹیلی فون کر کے ہار گئے، ڈیڈی جب شمی کو
گھر لائے تو سب کے چہروں پر رونق سی آگئی، سب نے
اسے گھیر لیا، ہر کوئی سوالات کر رہا تھا، ڈیڈی نے یہ
کہہ کر سب کو خاموش کرا دیا۔ ذرا سانس تو لینے دو ابھی
بتاتا ہوں۔ پھر ڈیڈی نے ساری بپتا سنائی۔ امی نے
جلدی منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے بدلوائے اور گرم گرم دودھ
کا گلاس شمی کے ہاتھوں میں تھما کر بولیں "دودھ پی کر سو
جاؤ"، شمی جب بستر پر لیٹی تو نیند جیسے اس کی آنکھوں
سے کوسوں دور تھی۔ سارا جسم تھکن سے چور تھا پیر
الگ درد کر رہے تھے، آج کا دن اسے ہمیشہ یاد رہے گا۔
شمی نے عہد کیا کہ وہ اسکول چھوٹنے کے بعد کھیلنے کے
لیے کسی سہیلی کے گھر نہیں جائے گی بلکہ سیدھے گھر آئے گی۔
اسے یاد آیا پڑوسی لڑکی لتا کی اس سے کہہ رہی تھی شمی تو
بھی میری طرح ماہانہ بس پاس بنوا لے، پیسے بچ جاتے
ہیں اور پھر پیسے کھو جانے پر بس سے اتار دیے جانے
کا خطرہ بھی نہیں رہتا، چھٹے پیسوں کے لیے کنڈکٹر کی
جھڑکیاں بھی نہیں سننا پڑتیں۔ شمی نے سوچا وہ کل ہی
بس پاس بنوا لے گی اور روز روز ٹکٹ خریدنے کی مصیبت
سے بچ جائے گی۔

وہ ہر روز بس آنے سے قبل اسٹاپ پر پہنچ کر
قطار میں کھڑی ہو جائے گی۔ نہ بس چھوٹنے کا خطرہ
رہے گا اور نہ بسوں کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت۔ شمی
نے اپنی دونوں زخمی کہنیوں کو دیکھا جن سے خون رس
رہا تھا آج سب سے بڑی بھول یہ ہوئی کہ وہ نمبر دیکھے
بغیر بس میں بیٹھ گئی، غلط بس نے اسے غلط جگہ اور وہ
بھی بیچ راستے میں اتار دیا۔ شمی کو یاد آیا، بس میں چڑھنے
میں بھی تو بڑی مشکل ہوئی تھی وہ اگر اگلے دروازے سے
جو عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے بس میں سوار ہوتی
تو اسے زور لگانا ہی نہیں پڑتا۔ آج کھینچا تانی میں پیسے
الگ گم ہوگئے نیا فراک بھی پھٹ گیا۔ افوہ وہ آج
کتنی حماقتیں کر بیٹھی، صبح بھی جب بس میں جگہ نہیں

ملی وہ دوسرے بچوں کے ساتھ فٹ بورڈ پر کھڑی رہی کنڈکٹر نے منع بھی کیا تھا اگر وہ چلتی بس سے گر جاتی تو ——— وہ اس کے آگے نہیں سوچ سکی۔ اسے نہ جانے کیوں اچانک منو یاد آگیا جو اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ گول مٹول، پیارا پیارا منو، اسے بھگوان نے اچانک اپنے پاس بلا لیا۔ اسے ٹیچر کا یہ جملہ اب تک یاد تھا، منو چلتی بس سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ ٹیچر کلاس میں ہمیشہ یہ نصیحت کرتی تھیں کہ چلتی بس میں ہرگز سوار ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی اترنا چاہیے۔ شمی نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ ٹیچر کی نصیحت پر عمل کرے گی۔ شمی کو آج کے واقعات پر ہنسی بھی آئی رونا بھی آیا۔ پھر نہ جانے وہ دبلا پتلا بڑی بڑی مونچھوں والا اجنبی اچانک سامنے آگیا "راستہ بھول گئیں؟ چلو ہم تمھیں گھر پہنچا دیتے ہیں۔ اجنبی نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا شمی کی بے اختیار چیخ نکل گئی، ممی بچاؤ بچاؤ ——— چیخ سن کر ممی جلدی سے کمرے میں داخل ہوئیں دیکھا تو شمی بستر پر پڑی پسینا پسینا ہو رہی تھی، ڈر و خوف کے مارے اس کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی، ممی نے بے اختیار اسے لپٹا لیا، میں یہاں ہوں بیٹی، ڈرو نہیں، وہ اس دن اسکول سے آتے ہی سو گئی تھی، شمی جب سب کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہی تھی اسے اپنا خواب اچھی طرح یاد تھا۔ پہلے سبق کی طرح۔

انتظار الرحمٰن محسنی

دو شکاری

اٹھارویں اور آخری قسط

سرجنٹ مہتاب کے حکم سے کبھی کوئی سرتابی نہیں کرتا۔ چند منٹوں میں لوگ کاروں لاریوں ٹرکوں پر بیٹھ گئے اور گاڑیاں حرکت میں آگئیں۔ تھوڑی دیر میں سڑک صاف ہوگئی۔

اب وہاں صرف ہم چار رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر حسین، مہتاب علی، ابّو اور میں۔ مہتاب علی ہمارے پٹرول پمپ کے پاس آکر بولے "ہاں تو واجد! میں نے تو اپنی پوری زندگی میں تیتروں کا ایسا عجیب منظر پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا"۔

"ہاں! مگر دیکھا تم نے کیسا حسین منظر تھا" ڈاکٹر حسین نے کہا "کیوں واجد میاں تمھیں کیسا لگا؟"

جناب! بے حد دلچسپ اور عجیب منظر تھا" میں نے کہا۔

"مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان میں سے ایک بھی ہمارے پاس نہ رہا" ابو نے کہا "میرا دل اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب میں نے ان کو پریم میں سے اڑتے دیکھا تھا۔ اور سمجھ لیا تھا کہ اب وہ ہم سے گئیں"۔

"لیکن واجد! سب سے پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ اتنی بے شمار چڑیاں پکڑی کیسے ہیں؟" مہتاب علی نے پوچھا "یہ راز میں تم سے معلوم کرنا چاہتا ہوں"۔

ابو نے وہ راز بہت مختصر کرکے بتایا۔ مگر سننے میں ایک دلچسپ کہانی ہی لگتی تھی۔ مہتاب علی جب سن رہے تھے تو اظہار مسرت و حیرت میں نعرے بھی لگاتے جا رہے تھے۔ جب کہانی ختم ہوگئی تو اپنی پولس مین والی لمبی انگلی سے میرے چہرے کی طرف اشارہ کرکے کہا "میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے کبھی خیال و گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ اتنے چھوٹے سے لڑکے کے دماغ میں ایسی عجیب و انوکھی ترکیب بھی آسکتی ہے۔ بیٹے میں تم کو اس ترکیب کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں"۔

ڈاکٹر حسین نے کہا "دیکھیے گا خدا نے چاہا تو یہ ننھا واجد ایک دن بڑا اور مشہور موجد بنے گا"۔

باوجود اس کے کہ ابّو کی باتوں نے مجھے شرما اور ہسلا رکھا تھا۔ ان دونوں کی تعریفوں کے بہت سے لفظ مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تعریفوں کے جواب میں مجھے کیسے شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ میرے پیچھے سے ایک خاتون کی آواز آئی "خدا کا شکر ہے کہ سارا ہنگامہ ختم ہوگیا ہے"۔

اور یہ زبیدہ بیگم تھیں جو کہ اپنے بچے نصرت کو گود میں لیے بڑی چوکنا اور آہستہ چلتی ہوئی ہمارے گھر کے اندر سے آرہی تھیں۔ ہمارے پاس آکر اطمینان کا سانس لے کر بولیں کیا ہنگامہ تھا۔ میں نے تو اس سے پہلے اس قسم کا واقعہ دیکھا ہی نہیں تھا اب یہ کیسا چوروں اور پیچھا کرنے والوں کا جلسہ

مسکن دودھ پور علی گڑھ

ہو رہا ہے؟ مہتاب صاحب آداب!
"آداب عرض کرتا ہوں بیگم صاحبہ" اسر جنٹ مہتاب علی نے مسکرا کر کہا۔
اور منّا اب کیسا ہے؟ ابّو نے پوچھا۔
منّا اب کچھ بہتر ہے۔ واجد صاحب۔ شکریہ! بیگم زبیدہ نے کہا۔ پتا نہیں منّا پھر سے پہلے جیسا ہو بھی سکے گا۔ مجھے فکر ہے۔ اوہ! نہیں! وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ بچے بہت سخت جان ہوتے ہیں۔
"خوب رہی! بیگم بولیں۔ "نازک سے بچے اور سخت جان! خیر مجھے اس سے کوئی بحث نہیں۔ مجھے تو بس یہ چاہیے کہ میرا منّا جلد از جلد ٹھیک ہو جائے"۔ سرجنٹ مہتاب علی نے اپنی سائیکل اٹھائی اور کہا۔ ہاں تو خاتون و حضرات! اب مجھے چلنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اور کہیں تو کسی نے کوئی شرارت اور ہنگامہ نہیں کھڑا کر رکھا ہے"۔
ابو نے دو قدم بڑھ کر کہا: "مہتاب علی! تمھیں یہاں آکر جو پریشانی اور تکلیف اٹھانی پڑی اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ تمھاری بر وقت مدد اور زحمت کے لیے میں بہت مشکور ہوں"۔
"زحمت! مجھے تو اس سارے ہنگامہ میں بے حد تفریح ہوئی ہے۔ لیکن واجد! یہ سوچ کر بہت ہی افسوس ہو رہا ہے کہ اتنی موٹی، خوبصورت اور بہت سی چڑیاں کیسے سب ہاتھ سے نکل گئیں میرے ذہن میں بھنے ہوئے تیتروں کے گوشت سے زیادہ لذیذ کوئی چیز نہیں ہے"۔
زبیدہ بیگم بولیں: "سرجنٹ اس خبر سے فاروق کو تم سے بھی زیادہ رنج ہوگا کیونکہ بستر سے اٹھنے کے بعد سے وہ ان ہی کی باتیں کرکے مزے لے رہے تھے۔ کہ آج رات کے کھانے پر بھنے ہوئے تیتر کھانے کو ملیں گے"۔
رات تک تو وہ بھول بھی جائیں گے۔" ڈاکٹر نے کہا۔
"نہیں نہیں وہ بالکل نہیں بھولیں گے" بیگم بولیں "کیونکہ رات کے کھانے پر انھیں سبزیاں ملیں گی اور سبزیاں انھیں بالکل پسند نہیں ہیں"۔
"لیکن! بیگم صاحبہ"! ابو بولے "یقیناً آپ نے سب تیتر پریم میں نہیں بھرے ہوں گے۔ جبکہ میں ایک درجن آپ کے لیے کہہ آیا تھا"۔
آپ نے مجھ سے کہا تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اپنا حصہ رکھنا بالکل بھول گئی۔ میں اس وقت بے حد جوش میں تھی۔ اور یہ سوچ کر مزا لے رہی تھی اور ہنس رہی تھی کہ ایک سو بیس تیتروں کو پریم میں بھرے ہوئے اور منّے نصرت کو ان پر بٹھائے ہوئے بڑے سکون و اطمینان سے بھری پری گلیوں سڑکوں میں سے ایسی ٹہلتی ہوئی گزروں گی جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اس طرح نکل بھاگیں گے۔ اور بیچارے فاروق کو بجائے تیتروں کے بھنے گوشت کے، آلو گوبھی کی سبزی کھانی پڑے گی۔
"چلو میرے ساتھ میں تم کو ایک چیز دکھاؤں۔ ڈاکٹر حسین۔ بیگم زبیدہ کے قریب آکر بولے۔ اور وہ بیگم کو لے کر ابو کی ورک شاپ کی طرف گئے اور پھر ہم تینوں کو وہاں آنے کا اشارہ کیا۔
ورک شاپ میں ایک بہت ہی غیر متوقع منظر ہم کو دیکھنے کو ملا۔ ابّو کی بینچ پر اوزار رکھنے کی الماری میں کرسیوں کے ہتھوں پر اعلا درجے کے حسین تیتر بیٹھے تھے جو گنتی میں چھ تھے۔
خاتون و حضرات! ڈاکٹر کے جھریوں بھرے چہرے پر مسرت کی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی وہ کہہ رہے تھے "دیکھیے یہ کیا چیز ہے؟ اور وہاں کا منظر ہم دیکھنے والوں کے لیے حیرت انگیز تھا۔
ہاں تو زبیدہ بیگم! انھوں نے اعلان کیا۔ فاروق

...دوست کرنے کے لیے دو اس میں سے
...کے ہیں۔ اور دو ان میں سے سرجنٹ مہتاب علی
...لیے۔ آج صبح ہی صبح جو بہترین خدمات انھوں نے
...کام دی ہیں۔ اور دو واجد اور دانی کے لیے جو
...ن سے زیادہ کے حق دار تھے۔

اور ڈاکٹر آپ کے لیے؟۔ ابو نے پوچھا۔ آپ نے اپنے لیے کچھ نہیں رکھا۔؟

"میری بیوی کو تیتروں کے پر نوچے بغیر ہی سارا دن بہت کام رہتا ہے۔ اس کام کے لیے ان کے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ اور سب سے زیادہ حق تو تمھارا اور دانی کا ہے جو کہ اتنی مشکلیں اٹھا کر جنگل سے لائے تھے۔"

ابو نے کہا: مگر ڈاکٹر یہ بتائیے آپ نے ان کو کب اور کیسے یہاں ہانکا تھا؟۔

میں نے ان کو قطعی نہیں ہانکا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ہاں دماغ میں ایک کھٹک سی ضرور تھی۔ کیسی کھٹک؟ ابو نے پوچھا۔ یہ کھلی ہوئی موٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ کچھ تیتروں نے ایک سے زیادہ کشمشیں نگلیں ہیں اور کچھ جو بہت پھرتیلی ہوں گی وہ آدھی درجن تک کھا سکتی ہیں اور زیادہ بھی تو اس صورت میں ان کے حصے میں سونے کی دوا کی خوراک بھی زیادہ آئی ہو گی اور وہ ابھی تک زیادہ نشے کے اثر سے نکل نہیں سکیں۔"

آہا! سمجھ میں آگیا۔ بالکل ٹھیک! ہم سب نے نعرہ لگایا۔

تو جب آپ سب تیتروں کے جھنڈ کو شہباز صاحب کی کار میں دھکیلنے میں مصروف تھے۔ میں آنکھ بچا کر اندر آیا اور پریم کی تلی میں پڑی ہوئی چادر کے پیچھے جھانک کر دیکھا تو یہ سب موجود تھیں۔

کیسی حیرت انگیز بات ہے! مہتاب علی نے کہا۔ آج صبح سے بہت ہی عجیب انوکھی باتیں دیکھنے میں آرہی ہیں۔ ہاں تو۔ ڈاکٹر نے کہا: نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سب سے زیادہ لالچی چڑیاں تھیں۔ اگر یہ صرف اپنا ہی حصہ کھاتیں تو یہ بھی دوسروں کی طرح اڑ چکی ہوتیں۔ آپ نے بڑی سہولت سے اس معمہ کو حل کر دیا ہے۔ ابو نے کہا: بہت عمدہ!"

بیگم زبیدہ نے ڈاکٹر کے قریب آکر کہا۔ محترم آدمی! آپ نے جس طرح سب کو مطمئن اور خوش کیا اور عمدگی سے گتھیاں سلجھائیں اس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اور اب بہت دیر ہو گئی ہے میں چلتی ہوں۔"

"آؤ تو پھر میں تم کو گھر تک چھوڑ دوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اس پریم کو تو یہیں چھوڑ دو یہ پھر آجائے گا۔ اور مہتاب تمھاری چڑیاں بھی ہم تمھارے گھر پہنچا دیں گے۔ اچھا نہیں لگتا کہ قانون کا ہاتھ پوری بستی میں تیتروں کا ایک گچھا اپنی سائکل کے ہینڈل میں لٹکائے گھومے۔"

"بہت بہت شکریہ! ڈاکٹر صاحب آپ نے میری مشکل بھی آسان کر دی۔ اس زحمت کا میں پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔" میں نے اور ابو نے چار تیتروں کو ایک ستلی میں باندھ کر ڈاکٹر کی کار میں رکھ دیا۔ ڈاکٹر ڈرائیونگ سیٹ پر اور بیگم زبیدہ نصرت کو لیے ہوئے ان کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئیں گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے ابو سے کہا۔ "واجد رنجیدہ مت ہونا تمھارا یہ کارنامہ ایک بڑی فتح ہے۔"

اس کے بعد سرجنٹ مہتاب علی اپنی سائکل پر سوار ہوئے۔ خدا حافظ کہتے ہاتھ ہلاتے قصبے کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ وہ کالی سائکل پر کمر سیدھی کیے سینہ آگے کو نکالے سر اٹھائے اس وقار اور شاہانہ انداز سے نیچے تلے پیر مار رہے تھے جیسے وہ کالی سائکل پر نہیں بلکہ ایک اعلا درجہ کی گھوڑی پر بیٹھے ہوں۔

ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ آئے ہوئے لوگ جا چکے تھے۔ سارا گرد و پیش اچانک اجاڑ اور خاموش لگنے لگا تھا۔ اب وہاں ابّو اور میں ورک شاپ کے سامنے کھڑے تھے۔

ابّو نے اپنی جھلملاتی سنہری آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ہاں تو دانی! سب ہنگامہ ختم ہوا!

"مگر ابو! کیا بڑھیا تماشا تھا بڑا مزہ آرہا تھا" میں نے کہا۔ ہاں تماشا ہی سا لگ رہا تھا ابو نے کہا" اور ابو! پورے وقت بہت ہی تفریح رہی" ہاں دانی بہت مزہ آرہا تھا۔ بڑا اچھا اور دلچسپ تجربہ رہا۔

انھوں نے ایک ہاتھ میرے گلے میں ڈال لیا اور ہم آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چلنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے ہم آج بھی اپنے پمپوں کو تالا لگا کر باقی دن چھٹی منائیں۔ اور آرام کریں۔

آپ کا مطلب ہے کہ پورے دن کے لیے بند کردیں گے؟

"ہاں ہاں! آج سنیچر کا دن ہے اور پھر ہم کیوں نہ چھٹی منائیں" انھوں نے کہا۔

"لیکن ابو! ہمارے پمپ تو سنیچر اتوار کو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں؟"

"ہاں ہمیشہ تو کھلے رہتے ہیں۔ لیکن شاید آج نہ کھلے رہیں۔ اور اس کے بجائے ہم کوئی دوسرا کام کریں جو دلچسپ اور تفریحی ہو میں سوچ رہا تھا کہ آگے دہ کیا کہتے ہیں۔ اور کیا پروگرام بناتے ہیں۔

اب ہم زینہ طے کرکے اپنے گھر کے سامنے والے چھوٹے سے چبوترے پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے تھے۔ کرنے کے لیے کچھ نہ ہو صرف باتیں کرنا ہوں تو خوشگوار موسم میں یہ جگہ بیٹھنے کے لیے بہترین ہوتی ہے۔ وہ آرام سے بیٹھ کر کہنے لگے "یہاں سے تین میل دور ایک ٹیلہ ہے اس کی بائیں طرف نیچے اتر کر شیشم کے جنگل کے بیچوں بیچ سے ایک ندی گزرتی ہے بہت ہی خاموش اور پرسکون جگہ ہے"۔ ندی؟ میں نے پوچھا۔ انھوں نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سر ہلا کر کہا "اس ندی میں بے شمار سنگھاڑا مچھلیاں بھری ہوئی ہیں"۔

"سچ! ابو کیا سچ مچ ہم وہاں جا سکتے ہیں؟" میں نے جوشیلے لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہیں! ہم وہاں جا کر ڈاکٹر حسین کی بتائی ہوئی ترکیب سے انھیں پکڑنے کی کوشش کریں گے"۔

"کیا آپ مجھے بھی پکڑنا سکھائیں گے؟ مجھے خود مچھلیاں پکڑنے کا تجربہ نہیں ہے۔ میری لائن ہمیشہ میتر رہے ہیں۔ لیکن ہر کام سیکھا جا سکتا ہے"!

کیا اب ہم وہیں جائیں گے؟ میں نے اسی جذبے اور جوش سے سوال کیا۔

میں سوچ رہا ہوں۔ ہم پہلے شہر جا کر تنور ر خرید لیں۔ تم کو یاد نہیں آج ہم کو بجلی کا اوون خریدنا تھا

لیکن ابو یہ تو تب کی بات تھی جب ہمارا خیال تھا کہ ہمارے پاس ڈھیروں ڈھیر تیتر ہوں گے۔ اور اب بھی تو ڈاکٹر حسین کے دیے ہوئے دو تیتر ہمارے پاس موجود ہیں جن کو اس میں بھونا اور پکایا جا سکتا ہے اور کیا پتا ہفتہ دس دن بعد پھر ہماری قسمت ساتھ دے اور ہمارے پاس پھر بہت سے تیتر آجائیں۔ اور تیتروں پر ہی کیا موقوف ہے۔ اس میں مرغ بکرے کا گوشت چاہے سب ہی کچھ پکایا جا سکتا ہے بجائے گرم کیے ہوئے ڈبوں کے کھانوں کی یہ سب چیزیں پکا کر کھایا کریں گے۔

"ابو! کیا اوون آج ہی ہمارے یہاں وہ بھیج دیں گے؟"

کیوں نہیں دانی! وہ آج بھی بھیج سکتے ہیں لیکن پہلے ہمیں خود جا کر دیکھنا ہوگا۔ کیا ہم ٹیلیفون پر ان کو آرڈر نہیں دے سکتے؟ میں نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں!" ابو نے کہا "لیکن ڈسپلے منٹ

پیا کی مدد سے مختلف قسم کے تنور ہم دیکھیں گے اور پھر دیکھ بھال کر اپنے مطلب کا خریدیں گے۔"
"ٹھیک ہے! اُون خریدنے کے جوش اور بے صبری میں طرح طرح کے کھانوں کا تصور میں مزہ لیتے ہوئے میں نے اُٹھ کر کہا "پھر تو چلیے!" ابّو بھی اُٹھ گئے جانے کے لیے تیار ہو کر ابو نے کہا "شہر سے آ کر قسمت آزمائی کے لیے ہم ندی پر جائیں گے شاید ہمیں کوئی بڑی سی سنگھاڑا مچھلی مل ہی جائے
ابّو جب چل رہے تھے تو ان کے پیر کی دھات سخت پکی سڑک کی سطح پر کھٹ کھٹ بج رہی تھی اور پر کالے بادل گرج رہے تھے۔ ابّو نے کہا "ہاں پیارے کیا سوچ رہے ہو؟"
"میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے نئے تنور میں تیتر پکا کر کیوں نہ ہم ڈاکٹر حسین اور ان کی بیگم کو بھی اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دیدیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟
ارے واہ۔ خدا کی قسم کیا بہترین خیال تمہارے دماغ میں آیا ہے۔ ابّو نے خوش ہو کر کہا۔ ان کے اعزاز میں دعوت ضرور ہوگی کیا عمدہ تجویز تمہارے دماغ میں آئی ہے۔ اگر ابّو! کیا ہمارے کمرے میں چار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہو سکے گی؟ میں نے تھوڑا سوچ کر کہا میرا خیال ہے ہو جائے گی۔ بالکل ہو جائے گی۔ اور کرسیوں کا کیا ہوگا۔ وہ تو ہمارے پاس کل دو ہی ہیں؟۔
دانی یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ تم اور میں بکسوں پر بیٹھ جائیں گے۔" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ بغیر میز پوش کی میز پر ڈاکٹر اور ان کی بیگم کو کھانا نہیں کھلایا جا سکتا۔ اور میز پوش ہمارے پاس ہے نہیں۔ پھر کیا ہو؟ میں نے پس و پیش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ فکر نہ کرو! ابّو نے کہا۔ ہم اپنے پلنگوں کی ایک سفید صاف چادر کو اس کام کے لیے استعمال کر لیں گے۔ میز پوش ایک طرح کی چادر ہی تو ہوتی ہے۔" اور چمچے بھی ہمارے پاس صرف دو ہی ہیں!"
"دو چمچے ہم اور خرید لیں گے۔ پرانے ہم استعمال کریں گے۔ نئے مہمان کو دیں گے۔"
"بہت عمدہ۔ بہت اچھا!" اور میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ انھوں نے میری مٹھی کو اپنی بڑی انگلیوں میں لے لیا اور دبایا۔ اور اب ہم قصبہ کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں ہم کوئی طرح کے تنور دیکھ کر اپنے مناسب حال ایک پسند کرنا تھا اور خریدنا تھا۔ پھر وہاں سے گھر واپس آنا تھا اور دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ سینڈوچ لے کر ہم کو شیشم کے جنگل میں جا کر ندی کے کنارے ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر مچھلی پکڑنے کی کوشش کرنا تھا۔ شاید کوئی بڑی سی مچھلی ہمارے ہاتھ آ ہی جائے۔
اور پھر کچھ اور۔۔۔ اور پھر کچھ۔۔۔۔ اور پھر کچھ اور۔

رحمان حمیدی

نفرت اور محبت

برروش، خوشحال گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کے والد ڈویژنل ریلوے آفس میں افسر تھے۔ وہ ساتویں درجے کا طالب علم تھا مگر تھا بے حد شریر۔ وہ بہت زیادہ گرم مزاج بھی تھا۔ وہ بات بات پر ناراض ہو جاتا تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا کرنے لگتا۔ غصے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور اس کا گندمی چہرہ، ٹماٹر کی طرح لال ہو جاتا۔ ہر وقت وہ بدلہ لینے کے لیے بے چین رہتا۔ وہ ہمیشہ تاک میں لگا رہتا اور جوں ہی اسے موقع ملتا، وہ دھوکے سے مار کر بھاگ جاتا۔ اس کے درجے کے سبھی لڑکے اس سے پریشان رہتے۔ کلاس کے کئی ساتھیوں سے اس کی مارپیٹ ہو چکی تھی۔ محلے میں بھی کئی بڑے لوگوں سے اس کی جھڑپ ہو چکی تھی۔ آئے دن برروش کے گھر شکایت آیا کرتی۔ جس کی وجہ سے اس کے والدین کو بڑی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ آہستہ آہستہ سارے لوگوں کو اس سے نفرت ہوگئی۔ اسکول اور محلے کے لڑکوں نے اس سے بول چال بند کر دی۔ ہر آدمی اس سے دور رہنے لگا۔ چند ہی برسوں میں سارے لوگوں کو اس سے نفرت ہوگئی۔ ماں باپ اور بھائی بہن بھی برروش کے مزاج اور عادت کی وجہ سے متنفر تھے۔ چند ہی برسوں میں برروش سبھی کی نگاہوں سے گر چکا تھا لیکن اسے اس کا بالکل احساس نہ تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھا۔ اس کے مزاج اور عادت میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔ وہ نفرت کا جواب اور زیادہ نفرت سے دینے لگا۔

برروش لوگوں سے کہتا "مجھے اپنے گھر والوں پر بھی غصہ آتا ہے۔ وہ سب مجھے مارتے ہیں۔ میں بھی انھیں مارنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ مجھ سے بڑے ہیں۔ مجھ سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اسی لیے میں مجبور ہوں، لیکن ایک نہ ایک دن میں ضرور بدلہ لوں گا ــــ!"

برروش اپنی بے بسی اور احساسِ شکست سے اس قدر بے چین ہوا کہ پڑھنے لکھنے میں بھی اس کا جی بالکل نہ لگتا۔

فریدی صاحب، برروش کے کلاس ٹیچر تھے۔ وہ اس کی بری عادتوں اور انتقامی جذبے کا انہماک سے مطالعہ کر رہے تھے۔ جب حد سے زیادہ اس کی شعلہ مزاجی بڑھی اور اسکول کے سارے مدرسین اس کے نکال دیے جانے کی باتیں کرنے لگے تو ایک دن انھوں نے برروش کو اپنے گھر پر بلایا اور نہایت شفقت اور محبت سے پوچھا۔

"برروش! تمھیں سب سے زیادہ نفرت کس سے ہے ــــ؟"

برروش نے نہایت بے باکی سے جواب دیا۔ "مجھے سب سے زیادہ نفرت اپنے بھائی سے ہے کیونکہ وہ مجھے بات بات پر مارتے ہیں۔ ہر وقت مجھے ڈانٹتے رہتے ہیں اور مجھے ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

فریدی صاحب نے پوچھا۔ "تم اُن کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہتے ہو ـــــــ؟؟"

برروش نے فوراً جواب دیا: "میں اپنی شکست کا بدلہ لینا

دلبستان، چیرا گودام، گموہ (بہار)

چاہتا ہوں ــــــــ!"

فریدی صاحب نے سمجھایا: میرے مشورے پر عمل کرو، تم نہایت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے ــــــ۔"

پرویش نے خوشی سے اُچھل کر کہا۔ "مجھے ضرور مشورہ دیجیے۔ میں اپنی کامیابی کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا ــــــ!!"

فریدی صاحب نے کہا۔ "تھوڑی سی گیلی مٹی لے آؤ ــ!"

پرویش دوڑ کر گیلی مٹی لے آیا۔ فریدی صاحب نے دیوار پر چاک سے ایک تصویر بنا دی اور پرویش سے کہا۔ "یہ تمھارے بھائی کی تصویر ہے۔ تم گیلی مٹی سے گولے بنا بنا کر اس پر مارو ــ!!"

پرویش اس تصویر پر گیلی مٹی کے گولے بنا بنا کر مارنے لگا۔ اس عمل سے اس کو بڑی تسکین ملی۔ وہ چند روز تک اسی طرح دیوار پر تصویر بنا کر مٹی کے گولے مارتا رہا۔ اس عمل سے اسے بڑا سکون ملا۔ اس نے خوش ہو کر فریدی صاحب سے کہا۔

"میں نے چُن چُن کر بدلہ لے لیا ہے۔ اب ان سے میری نفرت ختم ہو چکی ہے ــــــ!"

فریدی صاحب نے سمجھایا۔ "یہ اچھی بات ہے کہ تمھاری نفرت ختم ہو چکی ہے۔ اب تم میل محبت سے رہنے کی عادت ڈالو ــــ!"

پرویش، فریدی صاحب کے مشورے پر عمل کرنے لگا۔ اگر کسی سے پرویش کا لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو وہ بلیک بورڈ پر اس کی تصویر بنا کر گیلی مٹی کے گولے مارتا اور پھر چند روز بعد اس لڑکے سے اس کی گہری دوستی ہو جاتی۔ اس ترکیب پر عمل کرنے سے اس کے اندر حیرت انگیز تبدیلی آ گئی۔ چند ماہ کے اندر وہ بالکل بدل گیا۔ وہ ہر وقت خوش رہنے لگا۔ اس کے چہرے پر شادابی پھیلی رہتی۔ اس کی شکست خوردہ ذہنیت کو زبردست سکون و طمانیت ملی۔ اس کی شعلہ مزاجی میں نرمی اور اپنائیت آ گئی۔ وہ خوب دل لگا کر پڑھنے لگا اور اپنے کلاس میں فرسٹ آنے لگا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آنے لگا۔ والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے لگا۔

اب پرویش اپنے محلے اور اپنی کلاس کا سب سے اچھا اور ہونہار لڑکا ہو گیا تھا۔

الف قدم

برسات

آگئی دیکھو اب برسات
کھا گئی گرمی اس سے مات
بھر گئے ندی نالے سارے
جل تھل ہو گئے کھیت ہمارے
اُودے کالے آئے بادل
پانی بھر کر لائے بادل
بادل گرجے پانی برسے
کوئی نہ نکلے اپنے گھر سے
ٹر ٹر ٹر ٹر مینڈک بولے
جھینگر کانوں میں رس گھولے
باغوں میں اب پھول کھلے گا
دہقانوں کو دھان ملے گا
ہریالی ہے چاروں اُور
گائے پپیہا ناچے مور
ساون کی ہے کالی رات
سوجھے نہیں ہاتھ کو ہاتھ
آم گیا آیا امرود
دیتا ہے یہ سب معبود

لوکو بازار۔ گووہ۔ دھنباد

سکندر ضمیر

کاغذ کی کہانی

کاغذ آج کے زمانے کی بہت اہم ہی چیز نہیں سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کاغذ آج ہی نہیں ہزاروں سال پہلے سے ہے۔ قدیم زمانے میں عرب میں اور دنیا کی دوسری جگہوں میں چمڑے پر لکھا جاتا تھا۔ قدیم زمانے میں ہندستان میں تاڑ کے پتّوں پر تحریریں لکھی جاتی تھیں سنسکرت کے پنڈت تاڑ کے پتّوں پر اپنی مقدس کتابیں دھرم کے گرنتھ لکھتے تھے۔ اڑیسہ، بنگال، تامل ناڈ، بہار وغیرہ میں بھی مقدس کتابیں تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی ملتی ہیں۔

جس طرح آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں دنیا میں ترقی ہوئی اور آج ریڈیو سے دنیا کے کسی بھی مقام کی آواز سن سکتے ہیں، گھر بیٹھے ٹیلی ویژن پر دور دراز مقامات کے لوگوں کی تصویریں دیکھتے ہیں، اسی طرح لکھنے کے سامان بنانے میں بھی بتدریج ترقی کی سب سے پہلے نیپال اور کشمیر میں کاغذ ایجاد ہوا۔ اس وقت کاغذ بہت بھدّا اور کھردرا ہوتا تھا۔ پھر بھی اس کی قیمت خاصی تھی لیکن ایک خوبی اس کاغذ میں یہ تھی جو آج کے کاغذ میں نہیں ہوتی اس کاغذ میں دیمک نہیں لگتی تھی۔ یہ تقریباً ایک ہزار سال سے بھی پہلے کی بات ہے۔ اب ہندستان نے کاغذ بنانے کے فن میں بہت ترقی کی ہے۔ کاغذ اب مشینوں سے بنایا جاتا ہے۔ ٹیٹاگڑھ، پونا، لکھنؤ، وغیرہ مقامات کاغذ بنانے میں مشہور ہیں۔ اب کاغذ بنانے کے کارخانے کاغذ بنانے کے لیے بانس، بڑی گھاس کا استعمال کرتے تھے۔ انھیں گلا کر ان کی لگدی بناتے ہیں۔ اس لگدی کو پھیلا کر سکھایا جاتا ہے پھر اور ترقی ہوئی تو اسپیٹی، دھیور اور لوبخ نامی گھاسوں سے کاغذ بننے لگا۔ جس چیز کا کاغذ بناتے ہیں کاغذ کا رنگ ویسا ہی ہوتا ہے پھر اسے تیزاب اور بلیچنگ پوڈر سے صاف کر کے سفید بنایا جاتا ہے۔

بنگال، بہار، اڑیسہ، اتر پردیش کے جنگلوں میں بڑی گھاس زیادہ پائی جاتی ہے۔ پرانے کپڑے، خراب سن، جوٹ، ردّی کاغذ، درختوں کے ریشے اور طرح طرح کے پودوں سے لگدی بنائی جاتی ہے ابھی حال ہی میں نیر و.ی کے ایک ہندستانی سائنس داں نے کہا ہے کہ جل کمبھی جسے اب تک بے مصرف سمجھا جاتا ہے اس سے بھی اب کاغذ بنانے کا کام لیا جائے گا۔ اسی کام میں برابر ترقی ہو رہی ہے ہمارے ملک میں اسّی ہزار ٹن اخباری کاغذ کی سالانہ کھپت ہے۔

بچّو! یہ ہے اس کاغذ کی کہانی جس سے آپ کی کاپیاں بنتی ہیں۔ جس پر آپ کی کتابیں چھپتی ہیں اسکول کے سالانہ فنکشن میں آپ جس کی بنی ہوئی رنگ برنگی جھنڈیاں لگاتے ہیں

بچوں کے لیے نئی اور دلچسپ کتابیں

کہانیاں، معلوماتی، سوانح

کتاب	قیمت
چمپاوت کا آدم خور شیر	۱/۵۰
جھوٹا لڑکا	۱/۵۰
نیلا ہیرا	۴/۵۰
چیونٹی رانی	۱/۵۰
پھر میں چگوں کیا خاک	۱/۵۰
بی مینڈکی اور کوّا	۱/۵۰
پھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
لومڑی کا گھر	۱/۵۰
بندر اور نائی	۲/۵۰
جادو کا گھر	۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
ہیتو جیتو	۱/۵۰
پانچ بونے	۱/۵۰
تاک دنا دن تاک سے	۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے	۱/۵۰
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	۱/۵۰
پکڑو دم کٹے کو	۱/۵۰
لال مرغی	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (اول)	۲/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (دوم)	۲/۵۰
الوکھا عجائب خانہ (اول)	-/۵۰
الوکھا عجائب خانہ (سوم، چہارم فی حصہ)	-/۵۰
گلو بوجھو بھیا اور غبارے	۱/۵۰
ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰
آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰

کتاب	قیمت
محمد شفیع الدین نیرّ	۷/۵۰
ہار کی تلاش	۶/۰۰
موم کا محل	۴/۰۰
اس نے کیا کرنا جانا	۱/۲۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	۱/۵۰
ایک کچوری تیل میں	۱/۵۰
چوری کی عادت	۲/۰۰
دادا نہرو	۵/۰۰
بچوں کے اقبال	۴/۵۰
دم کٹا سانپ	۱/۰۰
پہیلیاں	-/۸۰
تین اناڑی	۳/۰۰
میگھ نگر کا راجا	۱/۲۵
سندر چنار	-/۷۵
کھیل سنسار (نظمیں)	۴/۵۰
جوہر قابل	۳/۰۰
میر انیس	۲/۰۰
چنبیلی	۱/۲۰
شہزادہ اور ٹھگ	۲/۰۰
خرگوش کی چال	۲/۵۰
چٹانوں کی کہانی	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰
خرگوش کا سپنا	۵/۰۰
شیر خاں	۱/۵۰
بھیڑیے کے بچّے	۱/۵۰
بہادر	۲/۵۰

کتاب	قیمت
میاں دھینچوں کے بچے	۱/۵۰
لومڑی کے بچے	۱/۵۰
تانبیل خاں	۱/۵۰
صحت کی الف بے	۳/۰۰
دھنک (نظمیں)	۳/۰۰
گلا بوجھو بھیا اور پری زاد	۲/۰۰
جلوہ غالب	۳/۰۰
وطن کے جاں نثار	۳/۰۰
سرکس	۱/۵۰

مذہبی کتابیں

کتاب	قیمت
ہمارا دین (اول)	۶/۰۰
ہمارا دین (دوم، سوم) فی حصہ	۶/۰۰
یسرّنا القرآن	۲/۲۵
اسلام کیسے شروع ہوا	۴/۵۰
ہمارے رسول	۳/۰۰
ہمارے نبی	۱/۵۰
اسلامی عقائد و مسائل مذہب	۶/۰۰
قرآن پاک کیا ہے	۳/۰۰
اللہ کا گھر	۳/۰۰
عقائدِ اسلام	۱/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء	۲/۰۰
چار یار	۴/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰۰
سرکارِ دو عالم	۳/۰۰
اسلام کیسے پھیلا (حصہ اول)	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا (حصہ دوم)	۴/۵۰
خلفاء اربعہ	۳/۷۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے کہ اچانک ڈاکیہ خط لے کر آتا ہے اور پکارتا ہے کہ جناب خیریت نامہ لے لو۔ ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے۔ جناب ایسی بارش میں آنے کی کیا ضرورت تھی ڈاک کے ذریعے بھیج دیتے۔

شگفتہ جاوید ڈالی گنج لکھنؤ

مالی : (باغ میں ایک لڑکے کو آم توڑتے ہوئے دیکھ کر) ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟

لڑکا : آپ کے کچھ آم گر گئے تھے انھیں اٹھا کر درخت میں لٹکا رہا ہوں۔

محمد ظہیرالدین شوخ ۔ کلتی ۔ بردوان

ایک صاحب تین منزلہ عمارت پر کام کر رہے تھے، نیچے ایک فقیر نے آواز لگائی۔ بھائی صاحب ذرا نیچے آئیے۔

وہ صاحب کام چھوڑ کر نیچے آئے۔ فقیر بولا "بابا اللہ کے نام پر ایک پیسا دے دو۔" ان صاحب نے فقیر سے کہا۔ آپ میرے ساتھ اوپر آئیے۔ تیسری منزل پر پہنچ کر اپنا کام شروع کرتے ہوئے ان صاحب نے فقیر سے کہا "بابا معاف کرو۔"

محمد شمس الحسن
چونا بازار اورنگ آباد

ایک اندھا فقیر گلی میں آواز لگا رہا تھا کہ "اللہ کے نام پر ایک کیک دے دو" ایک لڑکی نے پوچھا "بابا! کیا بات ہے؟ کل آپ روٹی مانگ رہے تھے اور آج کیک مانگ رہے ہو" فقیر نے جواب دیا "بیٹی آج میری سالگرہ کا دن ہے"

قمرالعارفین رضوی
ہسپورہ ۔ اورنگ آباد

ایک صاحب بڑی تیزی سے جا رہے تھے کہ ایک سڑک پر لڑکے کی پتنگ کے دھاگے سے ان کا کان کٹ گیا۔ لڑکا بھاگ گیا، وہ صاحب اپنا کان ڈھونڈنے لگے۔ ایک اور آدمی ادھر گزرا۔ پہلے آدمی کے کہنے پر وہ بھی کان ڈھونڈنے لگا۔ اتفاق سے دونوں کی نظر کمزور تھی۔ کچھ دیر کے بعد دوسرے صاحب کے ہاتھ کوئی چیز آئی انھوں نے پہلے آدمی کو آواز دی کہ یہ دیکھو پہلا آدمی بولا بھائی یہ میرا کان نہیں ہے۔ میری کان پر تو پنسل اٹکی ہوئی تھی۔

ابوالعامر ۔ بمبئی

جج (ملزم سے) تمھیں چوری کرنے میں کیا ملتا ہے؟

ملزم : حضور آپ سے ملنے کا موقع۔

ادھر ادھر سے

روشن جوتے

امریکی سائنس دانوں نے حال ہی میں ایسے حیرت انگیز جوتے تیار کیے ہیں جن کے آگے بلب اور نیچے پہیے لگے ہوتے ہیں۔ جوتوں کے اوپر ایک بیٹری لگی ہوئی ہے جو رات کے وقت بلب کی روشنی میں راستہ دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ جوتے پہن کر آدمی تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکے گا۔

چوروں کی پسند

ڈربن (جنوبی افریقہ) یہاں کی ایک بستی کے چوروں کو دھوتیاں بہت پسند ہیں خاص طور پر پجاریوں کی!

دھوتیوں کی چوری کی روک تھام کے لیے ایک مندر کے پجاریوں نے اس کے دروازے بند رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چوروں نے شیوا مندر کے ٹرسٹوں کی تقریباً ساری دھوتیاں چرالی تھیں جس کی وجہ سے پوجا کے موقع پر باندھنے کے لیے بھی دھوتیاں ان کے پاس نہیں رہ گئی تھیں۔

جاوید احمد خاں — عمر ۱۰ سال

مشغلہ:۔ اچھی اچھی کتابیں اور رسالے پڑھنا قلمی دوستی کرنا۔

پتا:۔ گلزاری مسجد بارسی تاکلی۔ ضلع اکولہ ۴۴۴۴۰۱

نسیمی وسیم احمد — عمر ۱۴ سال

مشغلہ:۔ کرکٹ کھیلنا، لطیفے پڑھنا قرآن پڑھنا۔

پتا:۔ آزاد نگر پولیس اسٹیشن کے سامنے مکان نمبر ۲۱۵ پلاٹ نمبر ۱۳۔ مالیگاؤں۔

محمد شفیق — عمر ۱۲ سال

مشغلہ:۔ اسکول پابندی سے جانا۔ نماز پڑھنا۔

پتا:۔ سیراث عبدالرحیم پولیس چوکی ﷺ شیگاؤں

پرویز اختر محمد رمضان انصاری — عمر ۱۳ سال

مشغلہ:۔ کرکٹ کھیلنا، نماز پڑھنا، کہانیاں پڑھنا قلمی دوستی کرنا۔

پتا:۔ بیت کی چال ۲۔ روم نمبر ۷ مدنپورہ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

محمد عرفان ولد محمد ہارون — عمر: ۵ سال

مشغلہ:۔ جامع مسجد پورہ اسکول روڈ جانا

مشغلہ:۔ جامع مسجد پورہ اسکول روڈ ماتا۔

دوستی اور اس کی اہمیت

آج کل اسکولوں اور کالجوں میں صرف پڑھائی نہیں ہوتی بلکہ طرح طرح کے مشاغل بھی ہوتے ہیں مثلاً بیت بازی، نظم خوانی، تقریری اور تحریری مقابلوں کا اہتمام وغیرہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ڈرامے اور سنگیت کا پروگرام بھی رکھا جاتا ہے ان سرگرمیوں کا مقصد محض کوشش نہیں بلکہ بچے کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنا، نکھارنا اور سنوارنا ہوتا ہے وہ اگر ایک طرف جسمانی لحاظ سے صحت مند اور چاق و چوبند بنیں تو دوسری طرف ذہنی اعتبار سے بھی تندرست و توانا ہوں۔

پیامی ساتھیو! طلبہ و طالبات کو یہ سہولتیں میسر ہیں لیکن ایک کام ایسا بھی ہے جس کی قطعی ذمہ داری صرف ہم پر ہے۔ اور وہ ہے دوستی، اچھا دوست، اچھا ساتھی، وفادار ساتھی کا انتخاب صرف ہم پر موقوف ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ دوستی کا رشتہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ ماں۔ باپ۔ بہن۔ بھائی۔ اور دوسرے رشتے داروں کا چننا ہمارے بس میں نہیں چونکہ یہ رشتے پیدائشی ہیں۔ لیکن دوستی کا رشتہ صرف ہمارے انتخاب کا حاصل ہے۔

دوستی کا پودا امیری غریبی کا محتاج نہیں لیکن اس کے لیے ہم مزاج ہونا ضروری ہے۔ بڑی چیز ذہنی اشتراک ہے۔

پیامی ساتھیو! انسان کی زندگی میں دکھ سکھ برابر آتے رہتے ہیں۔ دوستی کا بندھن دونوں ہی صورتوں خوشگوار ثابت ہوتا ہے۔ دوستوں سے بات چیت کرکے دکھ تقسیم ہو جاتا ہے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ خوشی کی حالت میں دوستوں سے ملیں تو خوشی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ زندگی میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو انسان اپنے رشتہ داروں سے بھی چھپاتا ہے لیکن اپنے دوست کے سامنے بے کھٹکے بیان کر دیتا ہے اس رشتہ کی یہ خصوصیت جو ہمیں بہت سی نفسیاتی الجھنوں سے بچاتی ہے۔ اگر ہم اپنے غم میں کسی کو شریک نہ کریں تو ہمارے اندر عجیب گھٹن، بے چینی اور اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کی شدت سے ہم طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

دوستوں کا حلقہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو لیکن اس کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ وقت، دوستی کے پودے کی آبیاری کرتا ہے اسے ہرا بھرا رکھتا اس میں نکہت رنگ پیدا کرتا ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ دوستی کی بنیادیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں لیکن

[illegible] مطلب پرستی۔ اس سرسبز و شاداب پودے کے [illegible] نہایت مہلک عناصر ہیں۔ دوستی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے اتنا ہی نازک بھی اس لیے ہمیں اپنی گفتگو، خیالات اور عمل میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے "انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینے کو۔"

ضبط و تحمل کے علاوہ مساوات کا پورا دھیان رکھنا چاہیے۔ زندہ دلی اور دوست کی بہبودی کا جذبہ لازمی عناصر ہیں۔ اگر ہم نے ان اصولوں کو اپنایا تو نہ صرف ساری زندگی خوشگوار گزرے گی بلکہ بہتر سماج کی تشکیل ہوگی تاریخ کے اوراق، کہانیوں اور فلموں تک میں اس انسانی قدر کو سراہا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسانی اقدار میں "دوستی" کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔

مظہر آصف انصاری

درجہ یازدہم۔ جامعہ ملیہ ہائر سیکنڈری اسکول

پھول کی رانی

میری عزیز بہن شاہین کے نام

میری بہنا پھول کی رانی
سب کے لیے دلچسپ کہانی
جسم ہے اس کا کومل کومل
جیسے ملائم گھاس کے مخمل
چہرہ اس کا نکھرا نکھرا
پھول پہ جیسے اوس کا قطرہ
آنکھیں اس کی چنچل چنچل
گھر میں مچائے ہردم ہلچل
بال ہیں جیسے بادل کالے
اس پہ بھی وہ گھونگر والے
رنگ ہے اس کا جیسے چندن
ممی لٹائیں اس پر تن من
ابّو اس پر جائیں واری۔ لگتی ہے ہم سب کو پیاری
واری جائیں نانا نانی۔ سچ مچ لگے ہے پھول کی رانی

از سید عبدالقدوس

متعلم بنگا ایم ای اسکول بھدرک

آدم خور جنگل

کسی زمانے میں جاپان کی ایک چھوٹی سی سلطنت تھی وہاں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا وہ بہت ظالم اور مغرور تھا وہ خود کو بہت طاقتور سمجھتا تھا اس میں ایک بڑی سی خرابی یہ تھی کہ بوڑھے لوگوں کو فالتو چیز سمجھتا تھا اس کا کہنا تھا یہ نہ کچھ کام کر سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ سوچ سکتے ہیں ساٹھ سال کے بعد انہیں مر جانا چاہیے اس لیے اس کا حکم تھا کہ جب کوئی ساٹھ سال کا ہو جائے تو پہاڑ پر لے جا کر اسے گھنے جنگل میں چھوڑ دیا جائے وہ جنگل جنگلی جانوروں سے بھرا پڑا تھا اور اتنا گھنا تھا کہ سورج کی روشنی مشکل سے پہنچ پاتی تھی۔

جب کسی خاندان کا کوئی شخص ساٹھ سال کا ہو جاتا تو لوگ خوب روتے دھوتے اور اس کو جنگل میں چھوڑ آتے۔ لوگ اس جنگل سے اس قدر خوف زدہ رہنے لگے کہ اس کا نام ہی آدم خور جنگل پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ سلطنت میں ایک بھی بزرگ (ضعیف) نہیں بچا بادشاہ کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اب ہمارے یہاں کوئی بھی بیکار شخص نہیں رہا۔

اسی سلطنت میں ایک کسان تھا وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا اس کو اپنی ماں سے اس قدر محبت تھی کہ کوئی بھی کام ان کی مرضی یا رائے کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔

دنیا میں عجب تماشا ہے عمر بڑھتی ہے زندگی گھٹتی ہے کسان کی ماں بھی ساٹھ برس کی ہوگئیں ایک دن اس کی ماں نے کہا " بیٹا میں اب ساٹھ سال کی ہوگئی تو مجھے" آدم خور جنگل میں لے چل کچھ دن کی اور زندگی ہے میری وجہ سے بادشاہ تجھ کو کوئی سزا دے یہ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔ کسان بہت پریشان ہوا دن کا چین رات کی نیند اڑ گئی ماں نے بے حد اصرار کیا وہ چل نہیں پاتی تھی اس لیے اس کو کندھے پر لے کر چلا سارے راستے روتا رہا جب گھنا جنگل شروع ہوا تو اس کی ماں پیڑ کی شاخ توڑ توڑ کر ڈالنے لگی بیٹے نے پوچھا۔ ماں یہ کیا؟ ماں نے کہا مجھے اندیشہ ہوا کہ واپسی میں تو راستہ نہ بھٹک جائے ان شاخوں کے سہارے واپس گھر چلے جانا کسان تڑپ گیا اور بولا۔ ماں! تم اب بھی میری بھلائی کی بات سوچ رہی ہو اور میں تم کو موت کے منہ میں لے جا رہا ہوں میں کبھی بھی تم کو اس خوفناک جنگل میں نہیں چھوڑوں گا ماں کو لے کر واپس وہ اپنے گھر آگیا۔ اس نے ماں کے رہنے کو زمین دوز کمرہ بنا دیا وہاں رہتے ہوئے ایک سال گزر گیا۔

جاپان کے پڑوس میں ناصر نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا اس نے چڑھائی کر دی ظالم بادشاہ نے اپنی جان اور رعایا کی امان کے لیے درخواست کی بادشاہ نے آزادی کی شرط رکھی

ظالم بادشاہ نے شرط قبول کرلی۔ شرط یہ تھی کہ سوالوں کا صحیح جواب مل جائے۔ ناصر بادشاہ کا پہلا سوال تھا کہ ایک ہزار دھاگوں کا ایک بنڈل بنا کر آگ میں ڈال دو اور آگ بجھنے تک اس میں پڑا رہنے دو اور بنڈل کو بغیر جلے مجھ کو دو ظالم بادشاہ بہت پریشان ہوا اس نے اعلان کروادیا جو اس کا حل بتلائے گا میں اس کو مالا مال کر دوں گا کسان کو جب اس کا علم ہوا اس نے اپنی ماں سے کہا ماں نے کہا یہ تو بہت آسان ہے دھاگوں کا بنڈل بنا کر سمندر کے کھارے پانی میں ڈال دو کچھ دن بعد اس کو دھوپ میں سکھالو پھر آگ میں ڈال دو وہ نہیں جلے گا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نمک آگ میں نہیں جلتا۔ کسان نے یہ طریقہ بادشاہ کو بتایا وہ بہت خوش ہوا اور اسے مالا مال کر دیا۔

کچھ دن بعد ناصر بادشاہ نے دوسرا سوال بھیجا کہ ایک پتلا پائپ ہے جس میں سات موڑ ہیں ان میں سے ایک ریشمی دھاگا بغیر توڑے گزار دو پھر اسی طرح ہوا۔ ظالم بادشاہ نے اپنی سلطنت میں اعلان کروایا اور تحفے تحائف دینے کا وعدہ کیا کسان نے اپنی ماں کو بتایا اس نے کہا یہ تو بہت آسان ہے سات موڑ کے پائپ کو ایک کھلے میدان میں ڈال دو اس کے ایک سر پر خوب ساری شکر ڈال دو اور ایک بڑی چیونٹی پر ریشم کا دھاگا لپیٹ کر اس کو پائپ کے دوسرے سرے پر چھوڑ دو۔ وہ دھاگے کو شکر والے سرے پر لے جائے گی کسان اپنی ماں کی عقلمندی پر بہت خوش ہوا۔ اور بادشاہ کو طریقہ بتایا وہ یہ سن کر خوشی سے پھولا نہیں سمایا اور اس کو قیمتی تحفے دیے۔

ناصر بادشاہ نے اب آخری اور سب سے مشکل سوال بھیجا ذرا سنیے۔ ایک ایسا ڈرم بناؤ جو بغیر چھوئے بجے۔ پھر شاہی اعلان ہوا۔ کسان نے اپنی ماں کو خبر دی وہ مسکرائی اور بولی یہ تو اور زیادہ آسان ہے ایک معمولی ڈرم بنا کر اس میں خوب ساری شہد کی مکھیاں بھر دو یہ بغیر چھوئے بجتا رہے گا۔ کسان نے یہ طریقہ بادشاہ کو بتایا تو اس نے اپنے گلے کی قیمتی مالا اتار کر کسان کو انعام میں دے دی آخر کار یہ لوگ آزاد کر دیے گئے۔

[illegible] بادشاہ کو کچھ کھٹکا ہوا اس نے کسان کو بلاکر کہا تم اتنے عقلمند تو لگتے نہیں ہو سچ سچ بتاؤ یہ طریقے تمہیں کون بتاتا تھا۔ کسان خوف سے کانپنے لگا ہمت کرکے اس نے بتایا کہ اس نے اپنی ماں کو گھر کے اندر چھپا رکھا ہے اسی نے یہ طریقے بتائے تھے۔
آپ کا خیال یہ ہے کہ بادشاہ غصہ ہوا؟ نہیں وہ بہت خوش ہوا اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا بوڑھے لوگوں کی قدر کرنے لگا۔ اس کو بزرگوں کے قیمتی تجربوں کا اندازہ ہو گیا۔
اس دن سے بوڑھوں کو "آدم خور جنگل" میں لے جانے کا رواج ختم ہو گیا۔

شگفتہ یاسمین
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔

بدلہ

پھوپھی کے گھر شادی تھی۔ دن بھر لوگ کام کرتے کرتے تھک کر چور ہو گئے تھے۔ رات کے دس بج رہے تھے میں سونے کے کمرے میں پہنچا تو کمرہ سونے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ طبیعت جھنجھلا گئی دیکھا تو ایک جگہ تھوڑی سی جگہ خالی تھی، اسی کو غنیمت سمجھ کر سونے کا ارادہ کیا۔ سونے سے پہلے ضروریات سے فارغ ہونے چلا گیا۔ آیا تو دیکھا کہ وہ جگہ بھی ایک مہمان لڑکے کے بے ڈھنگے پن سے سونے کی وجہ سے اور تنگ ہو گئی ہے میں نے غصے سے اس کے پیر کو ایک طرف کر دیا میرے ایسا کرنے سے اس کی نیند ٹوٹ گئی اس نے میری طرف دیکھا، لیکن کچھ نہیں کہا میں اطمینان سے لیٹ گیا۔ ابھی نیند آئی تھی کہ پیٹھ پر ایک لات پڑی جو درد سے بلبلا کر دیکھا تو لڑکا بڑبڑا رہا تھا گول گول گول" میں نے بھی اسے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ لیٹ کر تھوڑی دیر میں سو گیا۔ اطمینان کر لینے کے بعد میں نے بھی اسے ایک لات رسید کر دی بیچارہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لیکن میں اس درمیان میں آنکھیں بند کیے بڑبڑانے لگا گول اتار دیا۔ اب دونوں ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ کر چکے تھے اس لیے دونوں سمٹ سمٹا کر لیٹ گیے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں کے خراٹے ہوا میں گونج رہے تھے

محمد نواب عتیق اطہر زاہدی
رانی گنج بردوان (ویسٹ بنگال)

محمود غزنوی اور حضرت خرقانی

سلطان محمود غزنوی کہیں جا رہا تھا۔ خرقان کے قریب پہنچا تو وہاں کے مشہور بزرگ حضرت ابوالحسن خرقانی سے ملاقات کرنی چاہی۔ ایک قاصد کو شیخ کی خدمت میں بھیج کر کہلایا کہ سلطان خرقان کے قریب مقیم ہے آپ تشریف لا کر ملاقات کریں۔ شیخ نے ملاقات سے انکار کیا۔ قاصد نے آیۂ کریمہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کی طرف توجہ دلائی۔ شیخ نے فرمایا "محمود سے کہہ دینا کہ اولی الامر کا معاملہ تو دور ہے ابھی اطیعوا اللہ کے مرحلے سے گزر کر اطیعوا الرسول تک نہیں پہنچ سکا ہوں" قاصد واپس گیا اور سلطان سے کل باتیں عرض کر دیں۔ سلطان شیخ کی باتیں سن کر آب دیدہ ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان نے اپنے غلام ایاز کو اپنا لباس پہنا دیا اور غلام ایاز کے کپڑے خود نے پہن لیے اور اس طرح شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر السلام علیکم کہا۔ شیخ نے وعلیکم السلام کہہ کر جواب دیا۔ سلطان نے

نے ایاز کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ آپ نے بادشاہ کی تعظیم نہیں کی۔ شیخ نے فرمایا۔ یہ تو ایک جال ہے۔ سلطان نے کہا کاش آپ جیسے پرندے اس جال میں پھنستے۔ شیخ نے سلطان محمود کو جو اپنے غلام کے لباس میں تھا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بیٹھا لیا اور ایاز کی طرف، جو شاہی لباس میں تھا، رخ بھی نہ کیا۔

سلطان نے عرض کیا، "کچھ نصیحت فرمائیے۔ شیخ نے فرمایا۔ چار باتوں کا خیال رکھنا۔ (۱) ممنوعات شرعیہ سے بچنا (۲) نماز جماعت سے پڑھنا (۳) سخاوت و فیاضی سے کام لینا، (۴) اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر مہربانی رکھنا۔"

سلطان محمود نے اشرفیوں کا ایک توڑا شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔ شیخ نے جو کی روٹی سلطان کے سامنے رکھ دی۔ محمود نے ایک نوالہ کھایا تھا کہ حلق میں اٹک گیا۔ شیخ نے فرمایا "شاید نوالہ حلق میں اٹک رہا ہے۔" محمود نے کہا "ہاں" یہی بات ہے۔ شیخ نے فرمایا: اسی طرح تمھاری اشرفیاں بھی میرے حلق میں اٹک جائیں گی۔ اس لیے تم انھیں لے جاؤ۔ محمود کی خواہش پر شیخ نے اسے اپنا خرقہ عطا کیا۔

سلطان محمود واپس جانے کے لیے کھڑا ہوا تو شیخ بھی کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے کہا۔ حضرت جب میں آیا تھا تو آپ نے تعظیم نہیں دی اب آپ کے کھڑے ہونے کا سبب کیا ہے؟ شیخ نے فرمایا جب تم آئے تھے تو شاہی کر و فر کے ساتھ آئے تھے اور اب درویشی اور انکسار کے ساتھ واپس جا رہے ہو اس لیے میں نے تمھاری تعظیم کو ضروری سمجھا۔"

نصیر احمد

محلہ پیر بہوڑ پٹنہ

کامیابی

عظیم سقراط کا نام کس نے نہیں سنا۔ ان کے خیالات ایسے تھے کہ اس دور کے رہنماؤں کے گلے نہیں اترے انھوں نے مقدمے کا سوانگ رچایا۔ اقتدار کا سہارا انھیں تھا ہی۔ بس، سقراط کو موت سے سزا سنا دی گئی۔

سقراط پر جان چھڑکنے والے بھی بہت تھے۔ انھوں نے ایک منصوبہ بنایا۔ موت سے پہلی رات دو شاگرد جیل میں گھس۔ سقراط سے بولے: "آپ کیوں جان دے رہے ہیں۔ چپکے سے جیل سے نکل چلیے۔"

سقراط خاموش رہے۔ انھوں نے جواب دیا۔ "موت سے ڈر کر کیا میں اپنی راہ سے بھٹک جاؤں؟ میں جیل سے نکل کر کبھی نہیں بھاگوں گا۔ میرے خیالات صحیح ہیں۔ میں ان کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دوں گا۔ تم مجھے چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ۔"

سقراط معمولی مبلغ تھے۔ مگر اس طرح عظیم مفکر بن گئے۔

حکمراں نپولین بے مثال فاتح تھا۔ بڑھ چلا اور بڑھتا ہی گیا۔ یورپ کو روند ڈالا۔ مگر وہ دن بھی آیا جب اسے بری طرح مات کھانی پڑی۔ نپولین کو قیدی بنا لیا گیا ـــــ ہٹلر ہارا تو زندگی سے ہار گیا۔ اس نے جان دے دی۔ مگر نپولین نے جوانمردی کے ساتھ ہار قبول کی۔ برسوں تک قیدی بن کر بھی جیا اس ہار نے ہی اسے زندۂ جاوید کر دیا۔

کیا یہ الجھن بھری پہیلی سی ہو گئی۔ ہم زندگی میں کردار اعلا رکھیں۔ ایسا نہ کر پائیں تو خیالات تو اونچا رکھیں ہی۔ زندگی میں کوئی خواب سجائیں۔ اس کی تکمیل کے لیے محنت سے جٹ جائیں۔ ہار بھی کھانی پڑے تو پرواہ نہیں۔

امتحان دیا۔ فیل ہو گئے۔ گھر سے بھاگ نکلے۔

بہت ڈے سے امتحان سے ہی ہم نے ہار مان لی۔ تو کی بھر ہار نا ہو گا ہمیں چاہیے کہ ہم اونچے خیالات بلند حوصلے رکھیں۔ انشاءاللہ کامیابی یقیناً ہمارے ہم ہوے گی۔

شگفتہ جاوید
ڈالی گنج - لکھنؤ

دوا

بہت دنوں کی بات ہے کہ آدمی بازار میں کچھ دوائیں بیچنے گیا۔ لوگوں نے کہا کہ تم کیا بیچتے ہو اس نے کہا کہ میں بال صاف کرنے کی دوا بیچتا ہوں وہاں پر ایک ملا جی کھڑے سنتے انھوں نے کہا کیا بھائی واقعی یہ بال صاف کر دیتی ہے تو اس نے جواب دیا جی۔ تو ملا جی نے ان سے دو تین سستی دوائیں خریدلی پھر اس کے بعد وہ دوائیں لے کر دوسرے شہر گئے جب دوسرے شہر پہنچے تو دیکھا ایک سیٹھ بیٹھا ہے جس کے بہت بڑی بڑی مونچھیں ہیں تو ملا جی وہاں پہنچے تو سیٹھ نے کہا کیا بات ہے ملا جی نے کہا میں دوا بیچتا ہوں اور ایسی دوا ہے اگر آپ اس کو مونچھ پر لیں گے تو مونچھ کڑی ہو جائے گی سیٹھ نے کہا تم تو میرے کام کی دوا بیچتے ہو اور سیٹھ بہت خوش ہوا اور اس نے کہا کہ دیکھو پہلے تم ایک خوراک دوا لگا دو تب میں خریدوں گا۔ ملا جی نے جواب دیا دیکھیے سیٹھ جی ہم دوا ضرور لگائیں گے لیکن آدھی مونچھ پر کیوں کہ اگر مونچھ کڑی نہ ہوتی۔ تو ہم کو آپ ڈانٹیں گے اس لیے آدھی مونچھ پر لگا رہے ہیں تو سیٹھ نے کہا ٹھیک ہے تم لگاؤ ملا جی نے دوا شیشی سے نکال کر سیٹھ کی مونچھ میں لگا دی اور ہاتھ دھونے گئے اور ان سے کہا میں ابھی آتا ہوں۔ تب آپ کی مونچھ اینٹھوں گا تو کڑی ہو جائے گی۔ سیٹھ نے کہا ٹھیک ہے جائیے ہاتھ دھو کر آئیے اور ملا جی ادھر ہی سے روانہ ہو گئے

انتظار کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی سیٹھ نے کہا لاؤ میں اپنے ہاتھ سے اینٹھوں تب کڑی ہو جاتی وہ اب نہیں آئے گا سیٹھ نے جب مونچھ پکڑ کر اینٹھا تو اس کے ہاتھ میں آ گئی اور اس نے ملا کو بہت برا بھلا کہا اور مونچھیں مونڈوا دی۔؟

محمد عارف

"کرنیں"

سورج کی ڈولی میں بیٹھی
صبح سویرے آتی کرنیں

کتنے رنگ گلے مل جاتے
ہنستی اور ہنساتی کرنیں

پریوں جیسا چنچل دل ہے
دن بھر ناچ دکھاتی کرنیں

جب جب چھاتے کالے بادل
چھپ جاتی شرماتی کرنیں

گھاس سے اوس کے موتی چن کر
اتراتی اٹھلاتی کرنیں

میدانوں میں باغیچوں میں
پکنک خوب مناتی کرنیں

عطیہ صدیقی
گورنمنٹ ہاؤسنگ کالونی۔ گونڈہ

کیا آپ جانتے ہیں

نام شاعر	سال ولادت	مقام ولادت	سال وفات	مقام وفات	عمر
امیر خسرو دہلوی	۱۲۵۳ء	پٹیالی ضلع ایٹہ	۱۳۲۴ء	دہلی	۷۱ سال
مرزا رفیع سودا	۱۷۱۳ء	دہلی	۱۷۸۰ء	لکھنؤ	۶۷ "
میر تقی میر	۱۷۲۲ء	آگرہ	۱۸۱۰ء	لکھنؤ	۸۸ "
نظیر اکبر آبادی	۱۷۳۵ء	آگرہ	۱۸۳۰ء	آگرہ	۹۵ "
بہادر شاہ ظفر	۱۷۷۵ء	دہلی	۱۸۶۳ء	رنگون	۸۸ "
آتش	۱۷۷۷ء	فیض آباد	۱۸۴۶ء	لکھنؤ	۶۷ "
ذوق	۱۷۸۹ء	دہلی	۱۸۵۴ء	دہلی	۶۵ "
مرزا غالب	۱۷۹۶ء	آگرہ	۱۸۶۹ء	دہلی	۷۳ "
مومن	۱۸۰۰ء	دہلی	۱۸۵۱ء	دہلی	۵۱ "
میر انیس	۱۸۰۱ء	فیض آباد	۱۸۷۴ء	لکھنؤ	۷۳ "
امیر مینائی	۱۸۲۸ء	لکھنؤ	۱۹۰۰ء	حیدرآباد	۷۲ "
داغ دہلوی	۱۸۳۱ء	دہلی	۱۹۰۵ء	حیدرآباد	۷۴ "
محمد حسین آزاد	۱۸۳۲ء	دہلی	۱۹۱۰ء	دہلی	۷۸ "
الطاف حسین حالی	۱۸۳۷ء	پانی پت	۱۹۱۴ء	پانی پت	۷۷ "
اکبر الہ آبادی	۱۸۴۶ء	بارہ ضلع الہ آباد	۱۹۲۱ء	الہ آباد	۷۵ "
شاد عظیم آبادی	۱۸۴۶ء	پٹنہ	۱۹۲۷ء	پٹنہ	۸۱ "
نظم طباطبائی	۱۸۵۳ء	لکھنؤ	۱۹۲۸ء	حیدرآباد	۷۵ "
ڈاکٹر اقبال	۱۸۷۵ء	سیالکوٹ	۱۹۳۸ء	لاہور	۶۳ "
حسرت موہانی	۱۸۷۸ء	اناؤ	۱۹۵۱ء	لکھنؤ	۷۳ "
مولانا محمد علی جوہر	۱۸۷۸ء	رام پور	۱۹۳۱ء	لندن	۵۳ "
فانی بدایونی	۱۸۷۹ء	بدایوں	۱۹۴۱ء	حیدرآباد	۶۲ "
ساغر نظامی	۱۹۰۵ء	علی گڑھ	۱۹۸۴ء	دہلی	۷۹ "
جاں نثار اختر	۱۹۱۴ء	گوالیار	۱۹۷۶ء	بمبئی	۶۲ "

احسان عتیق صدیقی

سرسید نگر علی گڑھ

پیامی ادبی معمّا نمبر 9

دفتر پیام تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ
۱۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء

150 روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ کچھ نہیں آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

پہلا انعام : بالکل صحیح حل پر مبلغ 100 روپے دوسرا انعام : ایک غلطی والے حل پر مبلغ 50 روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبر وار لکھیے۔

۱۔ بادشاہ کے ـــــ دشمن دیوار پھاند کر ان کے مکان میں گھس آئے۔ (دو / چار)
۲۔ عبداللہ کے بابا ـــــ بیمار ہو گئے۔ (اچانک / یکایک)
۳۔ جب شام ہوتی ہے تو ـــــ نکلتا ہے۔ (دن / سورج)
۴۔ اس میں محاورے کا ـــــ بھی ہے۔ (استعمال / نمک)
۵۔ لنگڑا آم تو اسی ـــــ میں تھا، کھو بیٹھے۔ (لفافے / تھیلے)
۶۔ ـــــ کے بسنے والے اچھے اچھے گیت زبانی یاد کر لیتے ہیں۔ (مصر / عرب / افریقہ)
۷۔ اس سے ـــــ لینے کی کوشش کی ہے جو صرف بڑوں کا حصّہ ہے۔ (مزہ / لطف)
۸۔ ـــــ مفید بھی ہو سکتی ہے اور مضر بھی (غریبی / امیری / تنہائی)

ادھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں صحیح جواب صفحہ ۳۵ کی کتابوں میں ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے:

پیامی ادبی معمّا نمبر 9 ماہنامہ پیامِ تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

ٹوکن پیامی ادبی معمّا نمبر 9

میں اڈیٹر پیام تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام ......

پتا ......

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں

پیامی ادبی معمّا نمبر ۹ کا صحیح جواب
ذیل کی کتابوں میں ہی ملے گا

کتاب	مصنف	قیمت
ننھا فرشتہ	فہمیدہ عتیق	۴/۰
رنگوں کی بستی	سہیل انور	۳/۵۰
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں	یوسف ناظم	۲/۰
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحیٰ فاروقی	۴/۰
ایک کھلا راز	مسعود احمد برکاتی	۳/۰
میر انیس	محمد حسین حسّان	۲/۰
بچوں کے اقبال	مرتبہ : اطہر پرویز	۴/۵۰
سرخ جوتے	بیگم قدسیہ زیدی	۲/۵۰
کھیل سنسار	سطوت رسول	۴/۵۰
شفیع الدین نیّر	اطہر پرویز	۷/۵۰
شرارت	محمد حسین حسّان	۲/۰
بابا ناصح	ڈاکٹر رشید الوحیدی	۲/۰
سلام و صمصام	ڈاکٹر رشید الوحیدی	۴/۵۰
صحت کے ۹۹ نکتے	مسعود احمد برکاتی	۱/۵۰
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
اللہ کے صفی	خلیل احمد جامعی	۲/۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	ادارہ	۲/۰
جدید پہیلیاں	راج کنور	۶/۰
دُم کٹا سانپ	محمد قاسم صدیقی	۱/۰
قرآن پاک کیا ہے	عبدالواحد سندھی	۳/۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۳/۰

کتابیں حاصل کرنے کے پتے :
۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵
۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶
۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
۴۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

پیامی اَدبی مُعمّے کا شاندار نتیجہ

صحیح حل : ۱۔ مرمت۔ سلام و صمصام صد ۲۵، سطر ۵۔ ۲۔ آفتوں۔ سلام و صمصام صد ۹۱، سطر ۴۔ ۳۔ رحمت۔ ہمارے نبی صد ۴۶، سطر ۹۔ ۴۔ بال۔ عقائدِ اسلام صد ۴۹، سطر ۴۔ ۵۔ اللہ۔ رسول پاک صد ۱۳، سطر ۱۔ ۶۔ قیمتی۔ بابا ناصح صد ۳۲، سطر ۶۔ ۷۔ دوڑ۔ شرارت صد ۱۱، سطر ۳۔ ۸۔ دنیا۔ ہمارا دین اول، صد ۱۷، سطر ۲۔

بالکل صحیح حل پر پہلا انعام حاصل کرنے والے ۸ خوش نصیب

فی کس ۱۲/۵۰ روپے تقسیم کیے گئے۔

۱۔ ابرار علی خاں، فلاور کالج، باغ پاتو۔ پٹنہ
۲۔ عاصمہ خاتون، ۱۳۵۰۔ پہاڑی املی۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶
۳۔ سیدہ رعنا خلیل، ۱۳۵۰۔ پہاڑی املی۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶
۴۔ شائستہ خلیل، ۱۳۵۰۔ پہاڑی املی۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶
۵۔ سید عترت فاطمہ، ۱۳۵۰۔ پہاڑی املی۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶
۶۔ محمد سلیم اللہ شریف، ۱۶/۱۸۲-۲-۱۹، رنمست پورہ۔ حیدرآباد
۷۔ خلیق احمد، کمرہ نمبر ۴۳۹ اے ونگ، منسٹری آف لا لیجسلیٹو ڈپارٹمنٹ شاستری بھون۔ نئی دہلی ۱
۸۔ محمد عمران کیرآف مونیما خاتون۔ آئی ۸۲۔ رامیشور پور روڈ۔ گارڈن ریچ۔ مٹیا برج۔ کلکتہ۔

ایک غلطی کا کوئی حل موصول نہیں ہوا۔ اس لیے دو غلطی والے ۸ حل پر فی کس ۶/۲۵ روپے تقسیم کیے گئے۔

۱۔ راحت سراج۔ شرپوردھن۔ رائے گڑھ۔
۲۔ تبسم چنگیزی۔ کھوریا بازار۔ گورکھ پور۔
۳۔ نواب الدین۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶۔
۴۔ ستیہ پال۔ گلک۔ کٹھوعہ۔
۵۔ محمد نور عالم۔ دلاور پور۔ مونگیر۔
۶۔ فہمیدہ بانو۔ پائپ روڈ۔ کرلا۔
۷۔ عائشہ رومان۔ رائے پیٹھ۔ مدراس۔
۸۔ سید احمد رضوان۔ ۳ نیکل۔ بنگلور۔

کیوں چھنو میاں؟ آج تم نے روزہ رکھا ہے یا نہیں؟
میں؟ اور روزہ نہ رکھوں؟ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ پچھلے سال میں نے پورے تیس روزے رکھے تھے اور دیکھ لینا اس بار بھی پورے تیس روزے رکھوں گا۔ اور ہاں اپنی کہو، تمہارا چہرہ تو بتلا رہا ہے کہ تم نے غضب کیا روزہ نہیں رکھا۔
ہونہہ! کس خیال میں ہیں جناب۔ مجھے اپنے آپ سے کم سمجھتے ہو کیا؟ پچھلے سال میں نے بھی پورے روزے رکھے تھے اور اس بار بھی روزے سے ہوں۔
کہانی: احمد کمال حشمی
تصاویر: جاوید نہال حشمی
اچھا خیر اب اجازت دو۔ مجھے ایک ضروری کام سے اُدھر جانا ہے۔
ٹھیک ہے، مجھے بھی ادھر بازار جانا ہے۔ افطار کیلئے کیلا وغیرہ لینے ہیں۔
ذرا دیکھو تو چھنو آ تو نہیں رہا!
چھنو شاید اب ادھر نہ آئے سالا
ہوٹل فردوس
؟؟؟
؟؟؟
"اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ بھوک بھی تو بڑے زور کی لگی ہے"

بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
پھر میں چگوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت : ۱/۵۰
پان کھاکر، طبلہ بجاکر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت : ۱/۵۰
تاک دِنا دن تا کے سے
چھوٹے بچوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت : ۱/۵۰
پکڑ ڈرم کے ٹکو
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰
پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰
ہیتو جیتو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے انھیں
کی زبان میں۔ قیمت: ۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچوں کے لیے اچھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت ۲/۵۰
بی بینڈکی اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰
جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
کہانیاں سبھی سب
کی سب مزے دار
قیمت ۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت :
۱/۵۰
دہلی ۶
بمبئی ۳
علی گڑھ ۱
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd. No. D(SE)-043 August, 1984

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی ۲

پیام تعلیم

پان کھا کر، طبلہ بجا کر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت : ۱/۵۰
پھر میں چگوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت : ۱/۵۰
تاک دِنا دِن تا کے سے
چھوٹے بچوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت : ۱/۵۰
بکڑ ڈم کٹے کو
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰
پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰
ہتو جتو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت: ۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچوں کے لیے انھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت: ۲/۵۰
بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
بی بینڈکی اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰
جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
کہانیاں سبھی سب
کی سب مزے دار
قیمت ۱/۵۰
دہلی ۶
بمبئی ۳
علی گڑھ ۲
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
مدورانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت : ۱/۵۰
بندر اور نائی

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دِلّی ۲۵

ستمبر ۱۹۸۴ء جلد ۲۱ شمارہ ۹

اڈیٹر — ولی شاہجہانپوری

قیمت: ۲/۵۰ روپے سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

عید الاضحیٰ کی مُبارکباد قبول کیجیے۔

اگست ہی میں میں نے اُن احباب کا شکریہ ادا کیا تھا جنھوں نے بربنائے خلوص میری اہلیہ کے انتقال پر تعزیتی خطوط لکھ کر میرے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا سلسلہ ابھی ٹوٹا نہیں تھا کہ ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ میرے چھوٹے بھائی مظفر شاہجہانپوری کی وفات کے بعد شروع ہوا، جس نے ۲۵ جولائی کو اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس مرتبہ بھی ان تمام احباب کا شکریہ پیامِ تعلیم ہی کے ذریعے ادا کرنے پر مجبور ہوں، اس لیے کہ ذہنی پریشانی کے ساتھ لکھنے میں بھی تکلف محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ معاف کرتے ہوئے ہدیۂ تشکر قبول کر لیا جائے گا۔

اس شمارے میں مسعود احمد برکاتی صاحب نے بڑا اچھا اور مفید مشورہ دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اس مشورے پر عمل کریں گے۔

فہمیدہ عتیق صاحبہ، اقبال احمد اور رئیس صدیقی صاحبان اور ڈاکٹر خلیل اللہ اور ظہیر کیفی کی کہانیاں اور ترجمہ بھی خوب ہیں۔

نظموں میں ظفر گورکھپوری صاحب کی نظم بڑی نصیحت آمیز ہے تو شان الحق صاحب نے بھی ایک بُری عادت کی طرف اشارہ کرکے اس کو ترک کرنے کی تلقین کی ہے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

ظفر گورکھپوری

موجوں کی نصیحت

(امتحان میں ناکام ہونے والے بچے کو)

صورت پیاری پیاری ہے   عادت کے بھی اچھے ہو
مُنہ لٹکائے بیٹھے ہو   ایسے کیسے بچے ہو

لیکن ہم یہ جانتے ہیں   اک دن منزل پالیں گے
کاٹ کے پتھر کی چھاتی   اپنی راہ بنا لیں گے

ہم کو دیکھو، آج تلک   دوست نہ کوئی یار مِلا
تم نے دُکھ پایا اک بار   اور ہمیں سو بار مِلا

انساں ہوکر تم منّے   اِس درجہ رنجور ہوئے
تم پہ آخر بیتی کیا   جو اتنے مجبور ہوئے

اِک معمولی صدمے سے   تم اتنے بے حال ہوئے
یہ تو مُنّے سوچو تم   ہم کتنے پامال ہوئے

اتنا ہی نا! فیل ہوئے   یہ تو کوئی بات نہیں
آج اگرچہ مات ہوئی   کل تو منّے مات نہیں

بیچ سمندر سے چلنا   ساحل ساحل ڈٹ جانا
محنت کناروں سے رٹنا   ہار کے پیچھے ہٹ جانا

کل کی باتیں سوچو کچھ   کام کرو کچھ ہمّت سے
مایوسی پر ڈالو خاک   پڑھو لکھو پھر محنت سے

ہمت کرکے پھر بڑھنا   پھر ٹکرانا ساحل سے
پھر اپنی تقدیر میں ہار   پھر مایوسی منزل سے

کوشش کرنا اپنا کام   کھُل جاتی ہے خود ہر راہ
کوشش کرنے والوں کو   سب کچھ دیتا ہے اللہ

ایف ۱/۱۲ نیو میونسپل کالونی دیونار۔ بمبئی ۸۸

شان الحق حقّی

ننّھے میاں کی چکھا چکھی

ننھے میاں کی دیکھو عادت
چکھیں گے ہر چیز کو حضرت

چیز جو دیکھی رکھی مُنہ میں
ہاتھ لگی اور پہنچی مُنہ میں

جاتی ہے ہر چیز ہی مُنہ میں
یہ بھی مُنہ میں وہ بھی مُنہ میں

تنکا مُنہ میں، تیلی مُنہ میں
پنسل مُنہ میں، چابی مُنہ میں

کپڑا مُنہ میں، لکڑی مُنہ میں
دھاگا مُنہ میں، گٹّی مُنہ میں

گڑیا مُنہ میں، پھرکی مُنہ میں
گھوڑا مُنہ میں، ہاتھی مُنہ میں

جی چاہا تو چُسنی مُنہ میں
کچھ نہ ہوا تو، انگلی مُنہ میں

کوئی یہ پوچھے بھائی یہ کیا ہے
کاغذ میں بھی کوئی مزہ ہے

باجے کو بھی کوئی کھاتا ہے
موٹر کون نگل سکتا ہے

یہ جو تم نے ابھی کُترا ہے
خالی گتّے کا ٹکڑا ہے

مُنہ کھولو کیا مُنہ میں لیا ہے
جانے کنکر ہے یا کیا ہے

مٹھی کھولو، ہاتھ میں کیا ہے
ہے ہے، کانچ کا اِک ٹکڑا ہے

دیکھو ربڑ کتنا میلا ہے
تم نے ابھی جو مُنہ میں لیا ہے

بسکٹ کھاؤ، میوہ کھاؤ
گندی چیز نہ بھیّا کھاؤ

سمجھیں گے اس بات کو جا کر
ہوں گے جب یہ میرے برابر

(بشکریہ ہمدرد نونہال)

پروفیسر رشید احمد صدیقی (مرحوم)

توتا کہانی

بچو! تم جانتے ہو یہ ہرے ہرے توتے باغ کے پھلوں کو کتنا نقصان پہنچاتے ہیں! بے چارے باغ کے رکھوالے دن رات ان کو اڑاتے پھرتے ہیں، لیکن یہ ہیں کہ پھلوں کو برابر کُتر کُتر کر ضائع کرتے رہتے ہیں۔ توتے کی ایک عجیب خاصیت یہ ہے کہ اکثر یہ باغوں میں اترنے سے پہلے باغ کے باہر کسی بلند درخت یا مقام پر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ کر، پھر باغ پر حملہ کرتے ہیں۔ جیسے دشمن کی فوج قلعہ سے باہر رُک کر پہلے یہ دیکھتی ہے کہ قلعہ پر کس مقام پر حملہ کیا جائے۔

باغ کے رکھوالے توتوں کی اس خاصیت سے خوب واقف ہوتے ہیں اس لیے وہ باغ کے چاروں طرف اونچے اونچے بانس گاڑ کر اس کے سروں کو لمبی لمبی رسی سے باندھ دیتے ہیں۔ اس طور پر سارے باغ کے گرد بلندی پر رسی کا ایک حلقہ بن جاتا ہے۔ رسی میں پتلے پتلے بانس یا نرکل کے چھوٹے بڑے ٹکڑے پرو دیتے ہیں۔ اس طور پر کہ وہ رسی پر پھرکی کے طور پر گھوم جایا کریں۔ باغ پر حملہ کرنے والے توتے جیسا کہ ان کی عادت ہے، پہلے اس رسی میں پروئی ہوئی نلکیوں پر بیٹھتے ہیں۔ نلکیاں گھوم جاتی ہیں اور یہ پنجوں سے نلکیوں کو مضبوط تھامے ہوئے خود بھی الٹ جاتے ہیں۔ پھر کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے ٹیں ٹیں کر کے سارا باغ سر پر اٹھالیں گے، مگر نرکل کو نہیں چھوڑیں گے۔ ان کو شاید یہ خطرہ ہوتا ہے کہ نرکل چھوٹ گیا تو زمین پر گر کر مر جائیں گے، اتنے میں باغ کے رکھوالے آتے ہیں اور رسی کو نیچا کر ان کو پکڑ لیتے ہیں اور ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔

ہماری تمھاری جان سے دور ایک دن کوئی بھٹکتا ہوا فیلسوف بھی وہاں جا پہنچا۔ جانتے ہو فیلسوف کسے کہتے ہیں؟ بعض لوگ تو فیلسوف کو بہت عقلمند اور بعض لوگ مذاقاً اتنا ہی بڑا بے وقوف سمجھتے ہیں۔ فیلسوف نے یہ حالت دیکھی تو اس کو بڑا رنج ہوا، اس نے سوچا کہ توتے جاہل ہیں، اگر ان کو اپنی بے وقوفی معلوم ہو جائے تو پھر ان پر یہ آفت نہ آئے گی۔

چنانچہ وہ اپنے گھر آیا اور بہت سارے توتوں کے بچے خریدے اور ان کو تعلیم دینے لگا۔ تم کو تو معلوم ہے توتوں کو جو کچھ پڑھا دیجیے ویسا ہی وہ پڑھنے یا دہرانے لگتے ہیں۔ فیلسوف نے ان کو یہ سبق یاد کرایا۔

"ہم پردار جانور ہیں، شکاری کے نرکل پر کبھی نہ بیٹھیں گے، اگر ہم بیٹھیں گے تو پر پھڑ پھڑا کر اڑ جائیں گے"۔ توتوں کے بچے پڑھ کر جوان ہوئے اور ان کو یہ سبق خوب ازبر ہو گیا، جو لوگ کبھی کبھار فیلسوف کے گھر کی طرف نکل جاتے ہیں تو ان کو فیلسوف اور توتے دیکھ کر پرانے زمانے کے دیہاتی مدرسوں کے مدرس اور طالب علم پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے یاد آجاتے ہیں۔ ایک دن فیلسوف کو خیال آیا کہ اب توتوں کو سبق خوب یاد ہو گیا ہے چنانچہ اس نے ان کو چھوڑ دیا، سارے توتے فیلسوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹیں ٹیں کرتے اِدھر اُدھر نکل گئے۔

کچھ دن بعد فیلسوف کا گزر اسی باغ کی طرف ہوا

جہاں اس نے توتوں کو پہلے گرفتار دیکھا تھا اور توتوں کو تعلیم دینے کا خیال آیا تھا، وہاں جا کر کیا دیکھتا ہے کہ اس کے سارے شاگرد توتے رسیّوں میں پروئی نلکیوں سے لٹکے ہوئے ہیں اور چیخ چیخ کر پڑھ رہے ہیں۔

"ہم پردار جانور ہیں شکاری کے نرغل پر کبھی نہ بیٹھیں گے اور اگر بیٹھ گئے تو پر پھڑپھڑا کر اُڑ جائیں گے۔"

فلسوف یہ ماجرا دیکھ کر گھر واپس آیا۔ دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ فلسوف بھی ایک رسّی سے لٹکا ہوا ہے، لیکن توتوں کے مانند پاؤں سے نہیں بلکہ آدمیوں کے مانند سر سے!!

بقیہ صفحہ ۱۲

مل چکی تھی۔ گھر واپس آتے وقت احمد نے بتایا کہ توتوں کا ڈراما بڑا مزے دار تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تھا تو ڈراما شروع ہوئے بس تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ دراصل احمد ہی اکبر صاحب اور ہم دونوں کے ابّاؤں کو ساتھ لایا تھا۔ اس طرح ڈرپوک چوہے نے ہم دونوں بہادروں کو مصیبت سے نکالا تھا۔

مسعود احمد برکاتی

اپنی ڈائری لکھا کرو

آج تمھیں ایک مشورہ دوں؟ دل چسپ اور کار آمد مشورہ۔ کیا تم ڈائری لکھتے ہو؟ نہیں لکھتے تو آج ہی سے شروع کردو۔ ایک سادہ کاپی لو اچھے سے کاغذ کی، خوب صورت جلد والی۔ تھوڑا سا حاشیہ چھوڑ دو۔ حاشیہ تو تم اپنے اسکول، کالج کی کاپیوں پر بھی چھوڑتے ہو۔ یہ حاشیہ اس لیے ہوتا ہے کہ کاغذ کے کنارے کسی وجہ سے پھٹ بھی جائیں تو اس پر لکھی ہوئی تحریر خراب نہ ہو، محفوظ رہے۔

ہاں تو اب تم صفحے کی پہلی سطر پر تاریخ لکھو، دن بھی لکھ لو، بلکہ عیسوی یا انگریزی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہجری یا چاند کی تاریخ بھی لکھ لو۔

دوسری سطر سے لکھنا شروع کرو۔ لکھو کہ تم صبح کس وقت اٹھے۔ اٹھنے کے بعد جو کام روز مرّہ کے ہیں۔ مثلاً نہانا دھونا، کپڑے بدلنا، نماز پڑھنا

ناشتہ کرنا، مدرسے جانا، وہاں سے آنا، کھانا کھانا، آرام کرنا، کھیلنا، پھر پڑھنا یا گھر کا کام کرنا۔ یہ سب کام معمولات کہلاتے ہیں۔ ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں، یہ تو روزانہ ہی کرتے ہو۔ لکھنا چاہو تو یہ بھی لکھ لو، مگر کام بڑھ جائے گا۔

اس لیے ڈائری میں وہ باتیں لکھو جو عام طور پر روزانہ نہیں ہوتیں۔ مثلاً کسی دن تم مدرسے نہیں گئے۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی

یا صبح جاگے دیر سے بجے یا کوئی عزیز باہر سے
آگیا تھا، یا اس دن چھٹی ہی تھی۔ تو ایسی باتیں
ضرور لکھو۔ مثلاً اس طرح:
"آج صبح میں ۷ بجے اٹھا، روزانہ ساڑھے پانچ
بجے اٹھتا ہوں۔ دیر سے اٹھنے کی وجہ سے نماز بھی
قضا ہو گئی۔ ٹہلنے جانے کا وقت بھی نہیں رہا،
لیکن میں جلدی جلدی تیار ہو گیا۔ اور بھاگم بھاگ
اسکول پہنچ گیا۔"

کسی دن کوئی عزیز آجائے تو اس کا ذکر
بھی ڈائری میں ہونا چاہیے۔ ان سے جو باتیں ہوئیں
مختصراً وہ بھی لکھ سکتے ہو، اس کے ساتھ کہیں
تفریح کو گئے تو وہ بھی لکھو۔ کس جگہ گئے تھے، وہ
جگہ کیسی تھی، وہاں جاکر کیا دیکھا، مزہ آیا یا نہیں
تفریح میں کون کون ساتھ تھا۔

موسم کا حال بھی لکھ لیا کرو۔ آج گرمی زیادہ
تھی۔ یا آج سردی زیادہ تھی، درجۂ حرارت اتنے
ڈگری سنٹی گریڈ تھا، یا آج اتنے ملی میٹر بارش
ہوئی۔

امی یا ابا یا بھیا کے ساتھ بازار جانا ہو تو وہ
بھی لکھ سکتے ہو۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ جو
چیزیں خریدی ہوں ان کا بھاؤ لکھ لوگے۔ چیزوں
کی قیمتیں بھی تمھاری ڈائری میں محفوظ ہو جائیں
گی۔ مثلاً آج سے ۴۰-۵۰ سال پہلے کی کسی ڈائری
میں اگر لکھا ہو کہ گیہوں ایک روپے کے ۱۲-۱۲
سیر ملتے تھے، گوشت دو آنے سیر تھا، لٹھا ململ ۳-
۴ آنے گز مل جاتا تھا۔ گھی ایک روپے میں ایک
سیر آجاتا تھا۔ سونا بیس روپے تولہ تھا، مزدور کو
تین آنے، راج کو چھ آٹھ آنے روزانہ دیے جاتے
تھے۔ دودھ ڈیڑھ آنے سیر تھا، تو ہمیں کتنی
حیرت ہوگی۔ بلکہ شاید حسرت بھی ہو کہ کاش
اب بھی چیزیں اتنی سستی ہوتیں۔

اچھا تو اور کیا کیا لکھو گے۔ اپنی ڈائری میں
کسی عزیز یا دوست کے ہاں شادی میں گئے
تو اس کا حال بھی مزے لے لے کر لکھو۔ کس کے
ہاں شادی تھی؟ دولھا کا نام کیا تھا، دلھن
کس کی بیٹی تھی۔ اسی طرح کہیں سال گرہ میں
جاؤ یا خود تمھارے ہاں کسی کی سال گرہ ہو،
خدانخواستہ کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہو، یہ سب
باتیں بھی لکھ لو۔

اپنے امتحانات کی تاریخیں بھی لکھو۔ کس
کلاس کا امتحان دیا، پرچے کیسے ہوئے، کتنے نمبر
ملنے کی امید ہے۔

کسی دوسرے شہر سے کوئی عزیز آئے یا تم
خود کسی دوسرے شہر میں جاؤ تو وہاں کا حال
لکھو۔ راستہ کیسا کٹا، درمیان میں کون کون سے
اسٹیشن آئے۔ کرایہ کتنا لگا، راستے میں کوئی
خاص واقعہ پیش آیا ہو۔ وہاں کتنے دن ٹھہرے
وہاں کا موسم کیسا تھا۔ اس شہر میں پہلی بار
گئے تھے تو اس شہر کی خاص خاص باتیں تاریخی
عمارتوں، باغات، سیر تفریح کے مقامات کا حال
لکھو۔ وہاں لوگ کیسے تھے، ان کا سلوک تمھارے
ساتھ کیسا رہا۔ یہ سب باتیں مختصر مختصر لکھ لو۔

تمھارے ابا کی تنخواہ بڑھی ہو یا ان کا تبادلہ
کسی دوسرے محکمے یا شہر میں ہوا ہو، یا انھوں نے
کوئی بڑی چیز مثلاً موٹر یا سائیکل خریدی ہو یا
مکان خریدا ہو یا مکان بدلا ہو تو وہ بھی لکھ لو۔

اسی طرح جو بھی کوئی نئی بات ہو، ملک میں
کوئی اہم واقعہ ہوا ہو، حکومت بدلی ہو، کسی بڑے
آدمی کا، کسی ادیب، شاعر، لیڈر، عالم کا انتقال
ہوا ہو وہ بھی نوٹ کر لو۔

ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر کسی نے تمھارے
ساتھ بھلائی کی ہے تو وہ بھی لکھ لو، لیکن اگر

[illegible] کی بات ہے تو وہ نہ لکھو، بلکہ وہ تو دل سے
بھلا دو۔ بھلائی یاد رکھنے اور پھیلانے کی چیز ہے
اور برائی کو بھول جانا اچھا ہے۔ تمہارے علم میں
کوئی ایسا واقعہ آئے جس سے کوئی اخلاقی سبق
ملتا ہو تو وہ بھی لکھ لو۔ کوئی بہت اچھا قول یا
شعر سنا ہو تو وہ لکھ سکتے ہو۔

ایک اور بات بھی بتا دوں! ڈائری روزانہ
لکھنا چاہیے۔ عادت بھی روز لکھنے سے ہی پڑتی ہے
لیکن اگر کسی دن اتفاق سے ڈائری نہ لکھ سکے
یا لکھنے کے قابل کوئی بات ہی نہ ہوئی اس دن
چھوڑ بھی سکتے ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی دن
ڈائری لکھنے سے رہ جائے تو اس سے بددل ہو کر
بالکل ہی چھوڑ نہ دینا چاہیے۔ ناغہ ہو جانے میں
اتنا حرج نہیں ہے جتنا کسی اچھے کام کو ہمیشہ
کے لیے چھوڑ دینے میں ہے۔

اس طرح جب تم بڑے ہوگے، بوڑھے
ہوگے تو تمھارے پاس تمھارا، تمھارے خاندان
کا، ملک کے اہم واقعات، چیزوں کی قیمتوں کا،
موسموں کا رکارڈ تیار ہوگا۔ یہ گویا ایک تاریخی کتاب
ہوگی۔ سبق آموز، معلوماتی کتاب۔ اس کتاب سے
خود تمھیں بھی بہت سے فائدے ہوں گے، دوسرے
بھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

ڈائری لکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تمھیں
لکھنے کی عادت اور مشق ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ
اس کی مشق کی بدولت ایک بہت اچھے لکھنے
والے، بہت بڑے ادیب بن جاؤ، خوب مشہور
ہو جاؤ۔ تمھیں معلوم ہے کہ بڑے آدمیوں کی،
مشہور لوگوں کی زندگی سے لوگوں کو کتنی دلچسپی ہوتی ہے۔ ان
کے حالات کی کتنی تلاش ہوتی ہے۔ تم بھی بڑے آدمی بن گئے
تو تمھاری ڈائری سے لوگوں کو کتنی سہولت اور دلچسپی ہوگی۔
اس وقت تمھاری ڈائری کی بڑی قدر ہوگی۔

صالو رانی

ساغر شولاپوری

ننھی منّی پیاری پیاری
گڑیا جیسی صالو رانی

کومل کومل انگ ہے اس کا
چندن جیسا رنگ ہے اس کا

کاجل جب آنکھوں میں لگائے
انکھیوں میں جھٹ پانی آئے

بھوک اُسے جس وقت ستاتی
رو رو کر طوفان مچاتی

ماں اُس کو سینے سے لگاتی
خوشی خوشی پھر دودھ پلاتی

جب بھی آئیں دادی — نانی
خوش ہوتی ہے صالو رانی

آغوں آغوں شور مچائے
سارے گھر کا دل بہلائے

۰۳۴ بیگم پیٹھ ۔ شولاپور

عیدالاضحیٰ

امتیاز شبنم

بقرعید ایک اسلامی تیوہار ہے ۔ یہ تیوہار اسلامی مہینا ذی الحجہ کی ۱۰ تاریخ کومنایا جاتا ہے ۔

بقرعید کیوں مناتے ہیں ؟ بقرعید میں جانوروں کی قربانی کیوں کرتے ہیں ؟ اس کو سمجھنے کے لئے آج سے چار ہزار سال پہلے کا واقعہ سنئے" آپ نے تو حضرت ابراہیمؑ کا نام تو سنا ہوگا ۔ وہی جن کو خلیل اللہ کہتے ہیں یعنی اللہ کا دوست ، ابراہیم علیہ السلام کی کوئی اولاد نہ تھی ۔ انھوں نے اللہ سے دعا کی اے اللہ مجھ کو ایک خوبصورت سا بیٹا عطا فرما اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ایک خوبصورت حسین ، نیک اور فرماں بردار بیٹا عطا فرمایا ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا نام اسماعیلؑ رکھا ۔ اب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو دنیا کا امام بنانا چاہا ، ایک دن انھوں نے خواب میں دیکھا کہ اپنے چہیتے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے اور اللہ ان کے بیٹے کی قربانی چاہتا ہے ۔

حضرت ابراہیم کو اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی ویسے تو ہر باپ کو اپنے بیٹے سے محبت ہوتی ہے ۔ مگر اسماعیل علیہ السلام تو بڑھاپے کی اولاد تھے ۔ اس لئے ابراہیم علیہ السلام کو بہت زیادہ محبت تھی ۔

حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کی قربانی کا فیصلہ کر لیا لیکن سوچا کہ پہلے بیٹے سے پوچھ لیں ۔ انھوں نے اسماعیل علیہ السلام سے پوچھا کہ بیٹا بتاؤ تمہاری کیا مرضی ہے ۔ حضرت اسماعیل کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو فوراً چیخنے چلانے لگتا ۔ مگر اسماعیلؑ بہت نیک تھے اس لیے وہ فوراً تیار ہوگئے اور بولے کہ ابا جان اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھ کو صبر کرنے والا پائیں گے ۔ ابراہیمؑ یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے اور بولے کہ بیٹا ایسا ہی ہو ۔

شہر سے دور لے جاکر ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرایا اور چھری پتھر پر رگڑ کر بیٹے کے گلے پر رکھنے ہی والے تھے کہ اللہ نے اسماعیل کو بچا لیا ۔ اللہ کا فرشتہ ایک دنبہ لے کر آموجود ہوا ۔ اور حضرت اسماعیلؑ کی جگہ رکھ دیا ۔ جسے حضرت ابراہیم نے ذبح کر دیا ۔ اللہ تعالیٰ کو محض امتحان لینا مقصود تھا ۔ ابراہیم امتحان میں کامیاب ہوئے اور اللہ تعالےٰ نے خلیل اللہ کے لقب سے نوازا " عیدالاضحیٰ اسی واقعہ کی یاد دلاتی ہے ۔

تمام بہنوں ، بھائیوں کو عید مبارک قبول ہو ۔

اقبال احمد

ڈرپوک چوہا

ٹن، ٹن، چھٹی کی گھنٹی بجی۔ لڑکوں نے کتابیں بستوں میں ڈالیں اور اچھلتے، کودتے شور مچاتے اس طرح کلاسوں سے باہر بھاگے جیسے بھوکی بھیڑوں کو کھانے کے لیے چھوڑا ہو۔

احمد، سعید اور میں نے تیز رفتار گھوڑوں کی طرح اپنے گانو کی طرف دوڑ لگا دی۔ گھر جانے کی تو ہمیں ہمیشہ ہی جلدی ہوتی تھی، لیکن آج بات ہی کچھ اور تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ پر لگ جائیں اور ہم ہوا میں تیرتے ہوئے پلک جھپکتے میں گھر پہنچ جائیں۔

شہر سے ایک آدمی آیا ہوا تھا جو گانو گانو پھر کر "بولتے توتوں" کا ڈراما دکھا کر پیسے بٹور رہا تھا۔ آج ہمارے گانو کی باری تھی اور ہم تینوں دوست اس ڈرامے کو شروع سے آخر تک دیکھنا چاہتے تھے۔

ہم ریس کے گھوڑے تو تھے نہیں کہ مسلسل تیز دوڑے جانے کے باوجود بھی نہ تھکیں۔ ایک چڑھائی چڑھنے کے بعد ہمارا سانس پھول گیا اور ہم بڑی طرح ہانپنے لگے۔ گھڑی بھر دم لینے کے لیے ایک بڑے پتھر پر ٹک گئے۔

اچانک میری نظر اکبر صاحب کی بڑی سی باڑھ پر پڑی۔ بجلی کی سی تیزی سے ایک ترکیب میرے ذہن میں کوندی۔ میں بڑی شان سے اٹھا اور اپنی ذہانت پر اتراتے ہوئے بولا:

"بھئی سنو! اگر ہم پچاس کلومیٹر کی رفتار سے بھی دوڑیں تو بھی وقت پر گھر نہیں پہنچ سکیں گے اور کافی ڈراما نکل چکا ہوگا۔ لہٰذا میں ایسی شاندار ترکیب بتاتا ہوں کہ ہمیں دوڑنا بھی نہیں پڑے گا اور ہم ڈراما شروع ہونے سے پہلے گھر بھی پہنچ جائیں گے۔"

"جلدی بتاؤ وہ ترکیب، دیر کیوں کر رہے ہو؟" احمد اور سعید نے اصرار کیا۔

میں کندھے اچکا کر ترکیب بتانے لگا:

"یہ جو اکبر صاحب کی باڑھ دیکھ رہے ہو نا۔ ہم اس میں شریف چوروں کی طرح کود پڑتے ہیں۔

اور چہل قدمی کرتے ہوئے دوسری طرف دیوار سے باہر چھلانگ لگا دیں گے اور چند میٹر چلنے کے بعد گھر پہنچ جائیں گے۔ کہو ہے نا چٹ پٹی ترکیب!"

سعید نے تالیاں بجا کر میری تجویز کی تائید کی، لیکن احمد منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔ پھر ہاتھ نچاتے ہوئے بولا، دیکھتے نہیں پھاٹک پر کتنے بڑے حرفوں میں لکھا ہے:

"اندر آنا منع ہے!"

میں نے زور سے ہاتھ گھماتے ہوئے کہا:

"اکبر صاحب یہاں کھڑے پہرہ دے رہے ہیں کیا؟ ہم دیوار سے کود جائیں گے۔ اگر اکبر صاحب نے آنے کی غلطی بھی کی تو ہم تینوں ان کے لیے کافی ہوں گے۔ آج کل ان کی ایک ٹانگ ویسے بھی زخمی ہے۔ انھیں آسانی سے گرایا جا سکے گا اور پھر ان ہی کی پگڑی سے ان کی ٹانگیں باندھ کر زمین پر ڈال دیا جائے گا۔ مزے دار ترکیب ہے نا؟"

سعید تو خوشی سے چلایا، "واہ! وا بڑا مزہ آئے گا۔"

لیکن احمد کتابیں سنبھالتے ہوئے بولا:

"نا بابا نا! تم ہی دونوں باڑھ میں چھلانگ لگا دو۔ میں تو لمبے راستے سے ہی گھر جاؤں گا۔ اکبر صاحب نہیں ہیں تو کیا! اللہ میاں تو دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں غلط کام ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔"

"تم تو سچ مچ ڈرپوک چوہے نکلے۔" میں نے حقارت سے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر کہا:

"ڈرپوک چوہا جان بچاکے بھاگا! ڈرپوک چوہا جان بچاکے بھاگا۔"

لیکن اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ جب ڈرپوک چوہا نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے اور سعید نے کمریں کسیں اور باڑھ میں نقب زنوں کی طرح چھلانگ لگا دی۔ جہاں نرم نرم سبزہ، ہری بھری گھاس۔ اونچے اونچے درختوں، بڑے بڑے پتھروں اور گڑھوں نے ہمارا پُرتپاک استقبال کیا۔ بہت سی گائیں یا بھینسیں دور یا تو گھاس چر رہی تھیں یا جگالی کے کام میں مصروف تھیں۔ ہمیں باڑھ میں چہل قدمی کرتے ہوئے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ ہم بولتے توتوں کا ڈراما شروع سے آخر تک دیکھ لیں گے اور ڈرپوک چوہا آدھا بھی نہ دیکھ سکے گا۔

اچانک دھم دھم کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ سعید مجھ سے لپٹ گیا۔ خوف سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ میں نے جیسے ہی مڑ کر دیکھا تو میرے پانو تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک خوف ناک گائے ہماری طرف دوڑی چلی آ رہی تھی۔ اس کا ارادہ ہرگز نیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے خیریت اسی میں جانی کہ سر پہ پانو رکھ کر پیچھے کی طرف بھاگ کھڑے ہوں اور واپس باڑھ کے باہر کود جائیں۔

لہٰذا ہم پوری رفتار سے دوڑنے لگے۔ بھلا گائے ہار ماننے والی کب تھی۔ اس نے بھی ہمارے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اچانک سعید ایک پتھر سے ٹکرایا اور

کیچڑ میں جاگرا۔ سارے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ بستہ دور جا گرا۔ کتابوں کے ورق اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

میں سعید کی یہ درگت دیکھ ہی رہا تھا کہ میری پیٹھ پر زور سے ایک نوک دار چیز لگی۔ میں درد سے تڑپ گیا۔ اسی طرح دو تین سینگ اور لگتے تو میں وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ بستہ پھینک کر میں قریب کے درخت کی طرف لپکا اور بڑی تیزی سے اس پر چڑھنے لگا۔ گائے غصّے سے آگے بڑھی اور مجھ پر ایک اور حملہ کیا۔ اس بار اس کا سینگ میرے پانو پر پڑا۔ پانو تو زخمی ہونے سے بچ گیا، لیکن جوتا اُتر کر گائے کے سینگ میں اٹک گیا۔ غصّے میں بھری گائے نے دو چار سینگ درخت کے تنے پر مارے، مگر اس سے نہ تو تنے کو کچھ ہوا اور نہ سینگ کو کوئی نقصان پہنچا، کیوں کہ مضبوطی میں دونوں ایک دوسرے کے ہم پلّہ تھے۔ البتّہ بے چارے میرے بے گناہ جوتے کا کچومر بن گیا، لیکن میں خیریت سے درخت پر جا بیٹھا۔ میری پیٹھ سے گرم گرم خون رس رہا تھا۔ درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میرے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ گائے کے سموں نے بستہ روند ڈالا تھا۔ وہ مڑا تڑا ایک گڑھے میں پڑا تھا۔

اتنے میں سعید پھر چیخا، جسے میں بھول ہی گیا تھا۔ وہ سر سے پانو تک کیچڑ میں لت پت رو رہا تھا۔ غصیلی گائے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے چیخ کر اس سے کہا کہ وہ بھی کسی درخت پر چڑھ جائے۔ گائے ابھی کچھ دور تھی اس نے میری ہدایت کے مطابق درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی شاخ کو چھونے ہی والا تھا کہ اچانک اس کا پانو پھسلا اور وہ دھڑام سے چاروں شانے چت نیچے گر گیا اور درد سے چلّا اٹھا۔ گائے ابھی کچھ دور تھی۔ اس نے دوبارہ درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس بار وہ درخت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن وہ درد سے بُری طرح کراہ رہا تھا۔ ہم دونوں الگ الگ درختوں پر قیدی بنے بیٹھے تھے۔ نیچے تین چار اور غصیلی گائیں ہمیں گھور رہی تھیں۔ میں خدا سے گڑگڑا کر دُعا مانگنے لگا کہ اکبر صاحب جلدی سے آجائیں۔ وقت گزرتا گیا۔ لیکن ہمیں ان خوف ناک گایوں سے کوئی بھی نجات دلانے نہ آیا۔ سعید کا حال یہ تھا کہ کبھی روتا، کبھی کراہتا اور کبھی مجھے بُرا بھلا کہنے لگتا۔

آخر خدا خدا کر کے باغ کا پھاٹک کھلا اور اکبر صاحب کے ساتھ سعید کے اور میرے ابّا اور احمد باڑے میں داخل ہوئے۔ اکبر صاحب نے حلق پھاڑ کر مخصوص آواز نکالی اور ڈنڈا گھما گھما کر گایوں کو دور بھگایا۔ پھر ہم درخت سے نیچے اُترے۔ شرم سے ہمارے سر جھکے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کے ابّا اور اکبر صاحب نے ہم سے کچھ نہیں کہا، کیوں کہ ہمیں پہلے ہی کافی سزا

باقی صفحہ ۵ پر

فہمیدہ عتیق

مسٹر گیدڑ اور مس مگرمچھ

مسٹر گیدڑ کو بہت دیر سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ اب دن ڈھل چکا تھا۔ اور بھوک انھیں پریشان کر رہی تھی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے ندی کے کنارے جا نکلے۔ ندی خاصی چوڑی اور گہری تھی۔ ندی کے دوسرے کنارے پر کسی بڑے جانور کی لاش پڑی نظر آ رہی تھی۔ مسٹر گیدڑ بھوکے تو تھے ہی بغیر محنت کیے مفت میں انھیں کھانے کے لیے بہت سا گوشت کیسے مل سکتا تھا۔ ندی کو پار کرنا مسٹر گیدڑ کو مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس لیے کہ انھیں تیرنا نہیں آتا تھا بھوک کی کمزوری نے انھیں اور بھی بے ہمت کر دیا تھا۔

چنانچہ وہ وہیں سستانے بیٹھ گئے۔ اور ندی کی دوسری طرف جانے کی ترکیب سوچنے لگے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ انھیں دور سے دریا کے بوڑھے مگرمچھ کی اکلوتی بیٹی آتی نظر آئی۔ گیدڑ کے ذہن میں ایک دم کچھ خیال آیا اور مارے خوشی کے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مس مگرمچھ جیسے ہی کنارے پر پہنچیں۔ مسٹر گیدڑ نے آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے انھیں خوش آمدید کہا۔ "ہیلو مس کیا حال ہے آج تو بڑی صاف ستھری اور خوبصورت نظر آ رہی ہو۔" مس مگرمچھ اپنی تعریف سن کر سوچنے لگیں۔ مسٹر گیدڑ تو بہت اچھے ہیں۔ میرے حسن کی تعریف کر رہے ہیں۔ انھوں نے ذرا سا شرمانے کی کوشش کی اور کہا "کیا واقعی میں بہت اچھی لگ رہی ہوں؟"

مسٹر گیدڑ نے کہا۔ "ہاں ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ کوئی تمھارے حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد تو مسٹر گیدڑ نے ان کی خوبصورتی کے گیت گانے شروع کر دیے۔ جب مسٹر گیدڑ نے دیکھا کہ مس مگرمچھ ان سے بہت خوش ہو رہی ہیں تو انھوں نے بڑی معصوم صورت بنا کر کہا۔ "دیکھیے مس مجھے بہت دیر سے بھوک لگ رہی ہے، شاید آپ نے بھی شام کا کھانا ابھی نہیں کھایا ہوگا۔ ایسا کرتے ہیں کہ وہ دور ندی کے دوسرے کنارے پر کسی بڑے جانور کی لاش پڑی نظر آ رہی ہے۔ وہاں چلتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ کمزوری کی وجہ سے میں تو دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ اور تیرنا مجھے آتا نہیں۔ اس لیے آپ ہی ہمت کر کے مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر ندی کے دوسرے کنارے تک لے چلیں وہاں دونوں مزے سے کھائیں پئیں گے؟

مس مگرمچھ نے شرماتے ہوئے کہا۔ "مگر میں غیر برادری والے کے ساتھ کیسے جا سکتی ہوں۔ ڈیڈی نے دیکھ لیا تو سخت ناراض ہوں گے۔ اگر ہماری شادی ہوگئی ہوتی تو الگ بات تھی۔"

مسٹر گیدڑ نے کہا۔ "تو چلو ہم دونوں اب شادی کر لیتے ہیں۔" یہ سن کر مس مگرمچھ بہت خوش ہوئیں اور کہا "کیا تم سچ مچ مجھ سے شادی کر لوگے؟" مسٹر گیدڑ نے کہا۔ "واہ اس میں جھوٹ

آر ۱۹۵ بلاک ۱۵ دستگیر کالونی فیڈرل بی ایریا، کراچی

بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ مجھے ندی کے دوسرے کنارے پر لے چلیں وہاں کچھ کھا پی لیں گے۔ پھر آپ واپس اس ہی کنارے پر لے آئیے۔ میں گاؤں جاکر قاضی کو بلا لاؤں گا۔ اور ہماری شادی ہو جائے گی۔"

مس مگرمچھ مسٹر گیدڑ کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر بہت خوش ہوئیں اور پیٹھ پر بٹھا کر ندی کے دوسرے کنارے کی طرف چل دیں۔ وہاں پہنچ کر دونوں نے خوب پیٹ بھر کر گوشت کھایا۔ ادھر ادھر کی سیر کی اور دونوں خوش خوش لوٹ آئے۔

مسٹر گیدڑ نے کہا: "اب میں قاضی کو بلا لاتا ہوں۔ آپ یہیں میرا انتظار کریں۔" یہ کہہ کر مسٹر گیدڑ تو دم دبا کر بھاگ گئے اور مس مگرمچھ انتظار کرتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد وہ ندی میں اتر گئیں۔ انھیں مسٹر گیدڑ کی چالاکی پر بڑا غصہ آیا۔ انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ مسٹر گیدڑ کو ضرور مزہ چکھاؤں گی۔

دوسرے روز شام کے وقت مس مگرمچھ ندی کے کنارے ایک درخت کی جڑ کے قریب چھپ کر بیٹھ گئیں کہ جب مسٹر گیدڑ پانی پینے آئیں گے تو ان کی ٹانگ پکڑ کر ندی میں پھینک دیں گی۔ اتنے میں مسٹر گیدڑ کو آتے دیکھا مس تیار ہو کر بیٹھ گئیں۔

جیسے ہی مسٹر گیدڑ پانی پینے ندی میں اترے، مس نے زور سے ٹانگ پکڑ لی۔ ادھر مسٹر گیدڑ نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ "میں ڈوبا مجھے بچاؤ بچاؤ مس مگرمچھ درخت کی جڑ چھوڑ کر مجھے بچاؤ میں ڈوبا ڈوبا۔" مس مگرمچھ یہ سمجھیں کہ غلطی سے میں نے بجائے ٹانگ کے درخت کی جڑ پکڑ لی ہے۔ جیسے ہی مس نے منہ کھولا مسٹر گیدڑ نے چھلانگ لگائی اور یہ کہتے ہوئے بھاگے "قاضی آئے گا۔ آئے گا۔ ذرا صبر تو کرو۔" اب تو مس مگرمچھ کو بڑا غصہ آیا۔

دوسرے روز مس مگرمچھ بدلہ لینے کے لیے مسٹر گیدڑ کے بھٹ کی طرف چل دیں جاکر دیکھا تو بھٹ خالی تھا۔ ایک طرف کونے میں چند ہڈیاں پڑی تھیں۔ مس مگرمچھ سانس روک کر ایک طرف لیٹ گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ جیسے ہی مسٹر گیدڑ آئیں گے وہ انھیں نگل جائیں گی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب مسٹر گیدڑ اپنے دوستوں سے گپ شپ کر کے واپس بھٹ کے قریب پہنچے تو دروازے کے قریب مس مگرمچھ کے قدموں اور دُم کے گھسٹنے کے نشانات دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ اور دروازے پر آواز لگائی: "میڈم ارے میڈم آج تھیں کیا ہو گیا ہے تم تو روزانہ میرے آنے پر خوشی سے باہر نکل آتی تھیں۔ کیا تم بیمار ہو کچھ بولو تو سہی۔"

مس مگرمچھ مسٹر گیدڑ کی سب چالاکی سمجھ گئی تھیں۔ وہ سانس روکے لیٹی رہیں۔ جب مسٹر گیدڑ نے دیکھا کہ چالاکی بے کار چلی گئی۔ تو انھوں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ "ہائے میڈم مر گئیں۔ ہائے میں کیا کروں۔" پھر وہ ایک دم چپ ہو گئے انھوں نے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے کہا: "مرنے والے مگرمچھ کی تو دم ہلتی رہتی ہے۔ میڈم کی دم ہلتی نظر نہیں آ رہی، شاید وہ ابھی زندہ ہیں میں ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔"

مس مگرمچھ نے جیسے ہی یہ سنا اپنے مرنے کا یقین دلانے کے لیے دُم ہلانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھتے ہی مسٹر گیدڑ زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے بھاگ نکلے وہ برابر کہے جا رہے تھے: "لو بھلا مرے ہوئے بھی دم ہلاتے ہیں۔"

اور مس مگرمچھ ایک مرتبہ پھر چالاک مسٹر گیدڑ سے بازی ہار گئیں۔

رئیس صدیقی

موت کے لمبے ہاتھ

ایک دن کا ذکر ہے۔ دوپہر کے وقت منظار ریاست کے راجا جنک کے پاس ان کا ایک خادم ہانپتے ہوئے آیا اور ہکلاتے ہوتے بولا۔

"حضور! ..... ابھی ..... ابھی بازار میں .... مجھے موت ... موت کی دیوی ..... دکھائی پڑی ... وہ ..... وہ مجھے بڑی دیر تک تکتی رہی ... مجھے ڈر لگ رہا ہے ..... کہ کہیں ....."

راجا جنک نے اس کے کانپتے ہوئے جسم پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بات کاٹتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"سنو! موت کی دیوی ظالم نہیں ہوتی۔ وہ بلا وجہ کسی کو نہیں ستاتی۔ اس کے پاس جس کی موت کا پروانہ ہوتا ہے۔ وہ اسی کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اور یہ کوئی خوف یا ڈر کی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ جس طرح ہم اپنے جسم کے کپڑے بدلتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہماری روح مقررہ وقت پر اپنا جسم بدل لیتی ہے۔ یاد رہے کہ سب کو ایک دن موت کی دیوی کے ساتھ سفر کرنا ہے۔ یعنی ہر جاندار کے لیے موت لازم ہے۔"

لیکن وہ خادم راجا کے سمجھانے سے اور زیادہ خوفزدہ ہوگیا اور پھٹی پھٹی آواز میں بولا:

"حضور! آپ کا اقبال بلند ہو۔ اگر میں یہاں رہوں گا تو موت کی دیوی یقیناً مجھے اپنے ساتھ لے جائے گی اور مجھے موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اس لیے میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ مجھے اپنے اصطبل سے ایک نہایت تیز رفتار گھوڑا دینے کی مہربانی کریں تاکہ میں اس پر سوار ہو کر جلد از جلد اجودھیا نگر پہنچ جاؤں اور ماتا سیتا دیوی کے قدموں میں رہ کر ساری عمر بتا دوں۔"

راجا کو اس کی معصومیت پر رحم اور بے وقوفی پر غصہ آیا لیکن اس کی خدمت کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے اسے ایک تیز رفتار گھوڑا دیدیا جس کا نام 'منوویگ' تھا۔ وہ اس پر سوار ہو کر خوش خوش اجودھیا کی طرف چل دیا۔

اچانک اسی وقت راجا کو اپنے کسی ذاتی اور خاص کام سے کہیں جانا پڑا۔ جب وہ اپنا کام پورا کر کے اپنے محل واپس آرہا تھا۔ تو راستے میں لے ایک گھر سے رونے پیٹنے کی آواز سنائی دی۔

پھر اس گھر سے اسے موت کی دیوی نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ راجا نے اس دیوی کو روک کر بڑے ادب سے پوچھا۔

"اے دیوی! کیا تم یہ بتانے کی مہربانی کرو گی کہ تم آج بازار میں میرے خادم کو کیوں گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں؟ موت کی دیوی نے وجہ بتاتے ہوئے جواب دیا۔

میں اسے اس لیے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی کہ

۳۸ گلی کبابیان۔ جامع مسجد دہلی ۶

یہ وہی آدمی ہے نا جس کو آج میرے ساتھ چلنا ہے۔ یا کوئی اور؟ کیوں کہ اس آدمی کا پتا اجودھیا نگر کے قلعہ کا دروازہ اور وقت شام لکھا ہے۔ اس لیے شبہ ہوا کہ کہیں اس آدمی کا پتا اور وقت لکھنے میں کوئی بھول تو نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ آدمی ابھی تک یہاں موجود تھا۔ اس کا شام تک اجودھیا نگر کے پاس ہونا کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

راجا نے نہایت افسوس بھرے لہجہ میں دیوی کی الجھن کو سلجھاتے ہوئے کہا: -" اے دیوی، پتا اور وقت بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ کیونکہ وہ تم سے خوف کھاکر میرا سب سے تیز رفتار گھوڑا لے کر اجودھیا نگر بھاگ گیا ہے۔ اور آج شام تک وہ یقیناً وہاں پہنچ جائے گا اور اس طرح اس نے خود اپنے آپ کو موت کے قریب کرلیا۔"

سچ ہے موت کے ہاتھ بڑے لمبے ہوتے ہیں!!!

برسات کی بہاریں

مہدی پرتاپگڑھی

چھائیں کالی کالی گھٹائیں
چلتی ہیں جاں بخش ہوائیں
آنے لگیں مینڈک کی صدائیں
کرنے لگا بادل من مانی
کتنا ٹوٹ کے برسا پانی

آم کوئی جب شاخ سے ٹپکا
غول اُدھر بچوں کا دوڑا
رُوکے لاکھ اُنھیں رکھوالا
کرتے ہیں اپنی من مانی
کتنا ٹوٹ کے برسا پانی

ہوگیا چاروں جانب جل تھل
جنگل میں ہوتا ہے منگل
جاگ اُٹھی شاخوں پر کونپل
پہنی سب نے خلوت دھانی
کتنا ٹوٹ کے برسا پانی

معرفت ایگزیکیوٹیو انجینئر ایریگیشن۔ پرتاپ گڑھ

پروفیسر کیلاش ناتھ کول
ترجمہ: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

شام کا وقت تھا۔ ایک جنگل میں خرگوش رہتا تھا۔ اس نے اپنے بل سے چرنے کے لیے سر نکالا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اسے دور تک کوئی دوسرا جانور نہیں دکھائی دیا۔ تب ہمت کرکے باہر نکل آیا اور بڑی ہوشیاری سے چاروں طرف دیکھتا ہوا جنگل کے باہر میدان میں آگیا۔ جس میں اچھی اچھی ہری ہری گھاس اُگی تھی اور اس نے گھاس کھانا شروع کیا۔ بیچ بیچ میں سر گھما کر دور تک دیکھتا رہتا تھا کہ کوئی خطرناک جانور تو نہیں آرہا ہے۔ خیریت تھی اس وقت میدان میں سناٹا تھا۔ اس لیے بے فکری کے ساتھ جنگل سے دور چرتا چرتا نکل گیا۔ وہ خطرے سے ہوشیار رہتا تھا مڑ مڑ کر چاروں طرف دیکھتا رہتا۔ ایک دفعہ جب وہ جنگل سے بہت دور نکل گیا تب اس نے مڑ کر دیکھا، تو اس کو ایک لومڑی جنگل کی طرف سے آتی دکھائی دی اب وہ اپنے بل کی طرف چھپنے کے لیے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ لومڑی نے ابھی تک خرگوش کو نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ گھاس میں چھپا رہتا تو ضروری نہیں تھا کہ لومڑی اس کی طرف آتی۔ لیکن وہ گھبرا گیا اور میدان میں دوسری طرف بھاگا تاکہ لومڑی اس کو پکڑ نہ سکے جب وہ بھاگا تو لومڑی نے خرگوش کو دیکھ لیا۔ مشہور کہاوت ہے "ہلتی ہوئی چیز آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے"

لومڑی کئی روز سے بھوکی تھی۔ وہ خرگوش کو پکڑنے کے لیے بھاگی خرگوش اپنی جان بچانے کے لیے میدان میں بھاگا جارہا تھا اور چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کررہا تھا۔ لیکن کوئی جگہ اس کو نہیں مل سکی۔ لومڑی بڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی اور خرگوش کے نزدیک پہنچی الٰہی تھی خرگوش کبھی دائیں طرف تو کبھی بائیں طرف بھاگتا تھا کہ لومڑی اس کے پاس نہ آسکے لیکن لومڑی برابر اس کے پاس آتی ہوئی نظر آئی تھی۔ خرگوش بھاگتے بھاگتے بہت تھک گیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ لومڑی اس کو پکڑ لے گی اور مار کر کھا جائے گی۔ اس نے بھاگنا یک دم بند کردیا اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کرکے خدا کو یاد کرنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ خدا اب تو ہی مجھے بچا سکتا ہے ورنہ یہ لومڑی مجھے کھا جائے گی۔

جانور ہلتی ہوئی چیز کو جاندار سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ان سے بڑے ہوتے ہیں تو ان پر حملہ کرتے ہیں اور مار کر کھا جاتے ہیں۔ جو چیز نہیں ہلتی ہے ان کے لیے بے جان ہوتی ہے۔ اس پر حملہ نہیں کرتے اگر ایک پتھر کا آدمی، گائے، بیل بکری

نمبر ۶۵ بالدہ روڈ۔ نشاط گنج۔ لکھنؤ۔

... میں رکھ دیے جائیں، جس میں شیر اور درندے ... ہیں۔ اس پر حملہ نہیں کریں گے۔ میں برسات کے موسم میں روشنی کے پاس بہت سے کیڑے اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ ان کو کھانے کے لیے چھپکلیاں بھی آجاتی ہیں تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اس پر حملہ نہیں کرتیں لیکن جب کیڑا ایک جگہ بیٹھنے کے بعد دیوار پر چلتا ہے تو چھپکلی ایک کر اس کو کھا جاتی ہے۔ اکثر بچے ایک پر کے پچھلی کانٹا لگانے ہیں اُسے دھاگے سے باندھ کر ایک لمبے بانس میں لپیٹ کر تالاب میں مچھلی کے سامنے ہلاتے ہیں۔ مچھلی اُسے کیڑا سمجھتی ہے اور اچھل کر پکڑ لیتی ہے اور کانٹا منہ میں پھنس جانے کی وجہ سے خود پکڑی جاتی ہے اسی طرح کانٹے سے مچھلی پکڑنے والے کانٹے کو پانی میں ہلانے کے لیے طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں اگر کانٹا نہیں ہے تو مچھلی اس میں لگے ہوئے کیڑے کو کھانے کے لیے نہیں آئے گی۔ یہ قدرت کا قانون ہے جس پر ساری دنیا چلتی ہے اس لیے جب خرگوش ایک دم رک گیا اور خدا کی عبادت میں ڈوب گیا۔ تو لومڑی کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی اس کو دکھائی نہیں دیا۔ لومڑی بھی رک گئی وہ حیران تھی کہ خرگوش کہاں چلا گیا ابھی تو سامنے تھا۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھ رہی تھی۔ لیکن بھاگتا ہوا خرگوش اس کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہت دیر کے بعد اس کو خرگوش جیسی چیز دکھائی دی لیکن وہ بھاگ نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ خرگوش نہیں ہو سکتا تھا۔ لومڑی بیٹھے بیٹھے یہی سوچ رہی تھی کہ آخر خرگوش کہاں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ادھر سے ایک جنگلی کتا گزر رہا تھا اس نے لومڑی کی بو سونگھی اور وہ لومڑی کی طرف چلا۔ جب میدان میں آیا تو لومڑی نے کتے کو دیکھا اور گھبرا گئی لیکن لومڑی بڑی چالاک مانی جاتی ہے۔ اس نے سوچا اگر بھاگوں گی تو وہ کتا مار کر کھائے گا۔ وہ بھاگی نہیں جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ کتا جب نزدیک آیا تو اس نے ایک نیا تماشا دیکھا کہ خرگوش اور لومڑی جیسی چیزیں دکھائی دے رہی ہیں لیکن دونوں ہل نہیں رہی ہیں۔ کتا ابھی سوچ رہا تھا کہ کیا کرے اتنے میں ایک بھیڑیا جنگل سے میدان کی طرف شکار کو نکلا کتے نے اس کو دیکھ لیا۔ پہلے خیال کیا کہ وہ بھاگے لیکن اس نے سوچا کہ بھیڑیا اس سے زیادہ تیز اور طاقتور ہے اور مار کر کھا جائے گا۔ وہ جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی بیٹھا رہا۔ بالکل نہیں ہلا اس نے بھیڑیے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بھیڑیے نے بڑے غور سے کتے کی طرف دیکھا اس کے پاس بیٹھی لومڑی کو دیکھا اور پھر خرگوش کو بھی دیکھا سب کے سب ایک دوسرے کے دشمن جانور دکھائی دیے۔ اس کو یقین نہیں آیا کہ وہ تینوں زندہ اصلی جانور ہیں وہ انھیں پتھر کی مورتیوں کی طرح دیکھتا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ ایسا تماشا تو آج تک دکھائی ہی نہیں دیا۔

بھیڑیے کے بعد جنگل سے باری باری شکاری جانور نکلتے گئے اور جب میدان میں آئے تو ان کے سامنے یہی تماشا تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن بیٹھے ہوئے تھے لیکن بھاگ نہیں رہے تھے اور ایک دوسرے کو مار کر کھانے کی کوشش بھی نہیں کر رہے تھے۔ جانور باری باری سے آتے تھے اور اس تماشے کے بارے میں سوچتے تھے تو خود بعد میں آنے والے زیادہ طاقتور دشمن کو دیکھ کر بیٹھے کے بیٹھے رہ جاتے تھے۔ بھاگنے کا دھیان چھوڑ دیتے تھے کیونکہ ان کو معلوم تھا جو بھاگے گا وہی دکھائی دے جائے گا۔

اور پھر اس سے طاقتور جانور اس کو مار ڈالے گا۔
خرگوش بیٹھا خدا کو یاد کرتا رہا اور چاروں طرف ایک دوسرے کے دشمنوں کو اس نے بٹھا کر ان کے شکار کے وقت کو ڈھلنے دیا ڈھیرے ڈھیرے بڑے بڑے دشمن جو وقت کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔
اس میدان سے ہٹتے گئے اور آخر میں خرگوش اپنے آپ کو اکیلا پا کر خاموشی سے اپنے گھر چلا گیا۔

اچھے لوگوں کی نماز

حاجی محمد سلیمان

نماز اسلام کا ستون ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ نماز سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی نے اللہ کی مرضی کو پورا کرنے کی کمر باندھ لی ہے۔ نماز اقرار بندگی بھی ہے اور دعا بھی۔ نماز میں بندہ اعلان کرتا ہے کہ اے مالک میں تیرا بندہ ہوں۔ تیرے ہی در کا بھکاری ہوں۔ تیرا ہی حکم مانوں گا اور تیری ہی بڑائی کے گیت گاؤں گا۔ چنانچہ اسلام میں شروع ہی سے نماز فرض قرار دی گئی ہے۔

نماز کسی بھی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہیے۔ آدمی صحت مند ہو یا بیمار۔ گھر پر ہو یا سفر میں، امن کی حالت میں ہو یا لڑائی کے میدان میں۔ نماز بہر حال پڑھنی چاہیے۔ اسی لیے اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ حضورؐ کے ارشادات اور حضورؐ کے عمل کو دیکھ کر صحابہ نے نماز کی طرف بڑی توجہ دی۔ اکثر صحابی فرض نمازوں کے علاوہ کثرت سے نفلی نمازیں پڑھتے تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے صحابی تھے کہ رات رات بھر نفل نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ ہم ذیل میں بعض صالح بزرگوں کی نمازوں کا حال لکھتے ہیں تاکہ ہمیں اور آپ کو نماز کا شوق پیدا ہو:-

(۱) حضرت اویس قرنی رح رات رات بھر نماز پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ رات نمازوں ہی کے لیے ہے میں چاہتا ہوں کہ نماز میں ایسے خلوص کے ساتھ سجدہ کروں کہ صبح ہو جائے اور مجھے خبر نہ ہو

(۲) حضرت خلف بن ایوب رح کے بارے میں مشہور ہے کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ کسی نے لکڑی گاڑ دی ہو۔

(۳) حضرت ابو الخیر رح کا سڑا ہوا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور انھیں خبر تک نہ ہوئی۔

(۴) حضرت ذوالنون مصری رح کھانا اس لیے کم کھاتے تھے کہ کہیں زیادہ کھانے سے زیادہ نیند نہ آجائے اور نماز میں خلل نہ پڑے۔

(۵) حضرت فضل الدین رح فرماتے تھے کہ اللہ کے حضور میں مجرم کی طرح جاتا ہوں۔ ڈرتا اور کانپتا رہتا ہوں کہ پتا نہیں مالک مجھے معاف فرمائے یا سزا دے۔

حاجی پورہ۔ ضلع آگرہ۔

ظہیر کیفی امروہوی

نقلی دھوبی

نورنگر کے سبھی بچے اور بڑے، عورتیں اور مرد اُسے نقلی دھوبی کہتے تھے۔ اس کا اصلی نام جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کا کام تو بس پوری بستی کے گندے میلے کپڑے دھونا تھا مگر یہ بات تعجب کی ہی تھی کہ وہ اکیلا رہتا تھا اور دن بھر یا تو کپڑے پریس کرتا رہتا یا پھر میلے کپڑے لے کر گھاٹ پر چلا جاتا اور شام کو اس وقت اپنے گھر لوٹ آتا جب بستی کی ساری روشنیاں جگمگا اٹھتی تھیں۔ گھر آکر بھی وہ کپڑوں کو گنتا، کبھی سلیقے سے تہہ کرتا، میلے کپڑوں کے ڈھیر میں اگر وہ اندھیرے میں بھی ہاتھ ڈالتا تو وہی کپڑا ڈھونڈ نکالتا جس کی اُسے تلاش ہوتی تھی۔ نقلی دھوبی ایماندار اور محنتی آدمی تھا لیکن پھر بھی لوگ اُسے بُرا بھلا کہنے سے نہ چوکتے تھے کسی کا کوئی کپڑا گم ہوا تو اسے بے ایمان کہنے والے بھی کم نہ تھے۔ مگر وہ کسی کی بات کا بُرا نہ مانتا کبھی غصّہ نہ ہوتا ایسے موقعوں پر نقلی دھوبی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بس اتنا ہی کہتا۔

غلطی ہوگئی صاحب۔۔۔ آپ کا کپڑا یہیں کہیں ڈھیر میں چھپ گیا، ڈھونڈ کر نکالوں گا—— پریشان نہ ہوں۔ اطمینان رکھیں۔ کہیں نہیں جائے گا۔ آپ کا کپڑا—— !"

بی ۲۲/۱۳/۷ اندر لوک دہلی ۳۵

کوئی ذرا تیکھا اور غصیلہ ہوتا تو وہ نقلی دھوبی کو بُرا بھلا کہنے لگتا۔ !" اے تُو تُو مورکھ کا مورکھ ہے جبھی تو تجھے سب نقلی دھوبی کہتے ہیں۔ ! نقلی دھوبی مسکراتے ہوئے، دھیرے سے کہتا:

"سو تو ہے صاب، پر اس میں ہم کیا کریں، آپ کا جو بھی کپڑا ہے ہم ضرور ڈھونڈ دیں گے۔

نقلی دھوبی عجیب آدمی تھا رات اور دن وہ اپنے کام میں لگا رہتا اکثر وہ اس وقت تک کپڑوں پر پریس کرتا رہتا جب نورنگر کے باسی لمبی تان کر سو جاتے مگر نقلی دھوبی جاگتا رہتا۔ وہ کس وقت کھانا بناتا، کس وقت کھاتا تھا اُسے کسی بھی شغل میں لگا ہوا بھی کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

مگر اس دن سب کو بڑی حیرت ہوئی جب نقلی دھوبی کا چھوٹا سا کمرہ بند پڑا نظر آیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے، نورنگر میں کوئی رشتہ دار سمبندھی، یار دوست بھی نہیں تھا جس سے اس کا اتا پتا چل سکتا، پھر بھی جانے کیوں بستی کے لوگوں کو اس کی تلاش تھی۔ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو نقلی دھوبی کے یوں اچانک گم ہو جانے پر یہ فکر اور اندیشہ ہو کہ ان کے کپڑے ان کے ہاتھ

سے نکل جائیں گے۔۔۔۔ بڑوں کے بارے میں تو ایسا سوچا جا سکتا تھا لیکن عورتیں اور بچے تو خاص طور پر نقلی دھوبی کے نہ آنے سے کچھ اداس اداس نظر آرہے تھے۔ اصلی بات یہ تھی کہ نقلی دھوبی کا نور نگر میں کوئی نہ تھا لیکن بچوں سے بڑا پیار تھا بچوں کو وہ ٹافیاں اور چاکلیٹ بانٹتا تھا۔ خاص خاص تیوہاروں پر تو وہ بچوں کو کھلونے بھی دیتا تھا اس کے کمرے میں بچوں کا ہجوم دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ سارے بچے اس کے اپنے ہوں۔ کوئی بچہ اپنے اسکول کی باتیں سناتا، کوئی سیر تماشے کی، تو کوئی اپنے ممی ڈیڈی کی باتیں کرتا۔۔۔ نقلی دھوبی بچوں کی باتیں غور سے سنتا۔ اور پھر انھیں بہت میٹھے لہجے میں سمجھاتا۔ "دیکھو بھئی چنو! وہ تو سب اچھا ہے پر تم دل لگا کر پڑھا کرو۔ کھیل کے وقت کھیل۔۔ اور پڑھائی لکھائی کے سمے لکھنا پڑھنا بھلا لگتا ہے نا!"

کوئی بچہ پوچھتا "آپ کا نام نقلی دھوبی کیوں ہے نقلی دھوبی۔۔۔"

سمی سمی۔۔۔ کر کے نقلی دھوبی ہنستا پھر اپنی ہنسی پر قابو پا کر کہتا "منو بیٹے! نام میں کیا دھرا ہے کام ہی سب کچھ ہوتا ہے دیکھو تمھارا نام کتنا پیارا ہے منو۔۔۔ پر بیٹے جب تک تم ٹھیک ٹھیک اپنا کام نہیں کرو گے تو بھلا نام کیا کرے گا۔۔۔"

وہ بڑے پیار سے منو اور چنو، عرشی، انجلا، ہیما، ریشم، راشد، بوبی، عارف، سہیل، ببو، عاطف گڈو، سمی، زیبا، راجو کو پچکارتے ہوئے سبھی کو بتاتا۔ "دیکھو بچو! ہم اصلی دھوبی نہیں ہیں اسی لیے ہمارا نام نقلی دھوبی پڑ گیا، پھر کیا نقلی دھوبی اچھے کپڑے نہیں دھوتا، یہ تمھارے اجلے اجلے کپڑے ہم ہی نے تو دھوتے ہیں نا بچو!" سب بچے حیرت سے نقلی دھوبی کو تکنے لگتے!۔۔۔ نقلی دھوبی وہاں سے اچانک چلا گیا تھا تو ہر ایک کو اسی کے بارے میں باتیں کرنے میں جانے کیوں دل چسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی اس کی ایمانداری کی تعریف کرتا۔ "بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ نقلی دھوبی کپڑے وقت پر دھو کر دیتا تھا۔ اور اگر کبھی کسی کا کوئی کپڑا گم بھی ہو جاتا تو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتا تھا جب تک وہ اسے ڈھونڈ نہ لے۔"

"پورے دس سال سے وہ ہماری بستی ہمارے نور نگر میں رہتا تھا مگر مجال ہے جو کبھی اس نے اپنی محنت کے علاوہ دس پیسے بھی زیادہ لیے ہوں۔"

دوسرے صاحب بھی نقلی دھوبی کی تعریف کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ تب ہی کسی نے آکر اطلاع دی کہ کل رات نقلی دھوبی کا ایکسی ڈینٹ ہو گیا، وہ زندہ ہے یا مردہ اس کی کسی کو بھی خبر نہ تھی لیکن یہ خبر سنتے ہی سارے نور نگر میں ہاہاکار مچ گئی ہر گھر میں نقلی دھوبی کے ایکسی ڈینٹ کی خبر اسی طرح پہنچ چکی تھی جیسے امتحان کے رزلٹ کی خبر سنتے ہی سنسنی سی پھیل جاتی ہے!

لیکن اتنی بڑی خبر سن کر بھی کسی نے یہ ضرورت محسوس نہ کی کہ وہ اس جگہ چلا جاتا جہاں نقلی دھوبی کا ایکسی ڈینٹ ہوا تھا یا اس کی سائکل اور کپڑوں کی گٹھری کی ہی خیر خبر لیتا۔ اگر کسی کو کچھ دل چسپی تھی تو اپنے اپنے کپڑوں کی ہی فکر ستا رہی تھی کہ کہیں وہ تو گم نہ ہو جائیں۔ دو دن تک جب نقلی دھوبی کی کوئی اور خیر خبر نہیں ملی تو اب سب کو یہ شبہہ ہوا کہ نقلی دھوبی ایکسیڈنٹ ہو جانے سے کہیں مر تو نہیں گیا ہے۔ یوں تو اس کا ایکسی ڈینٹ ہو جانا ہی تعجب کی بات تھی کیونکہ نقلی دھوبی جب کبھی کسی اور کالونی میں کپڑے پہنچانے اپنی سائکل پر جاتا تو وہ سائکل کو اس انداز اور رفتار سے چلاتا کہ پیدل چلنے

والا اس سے دو ہاتھ آگے ہی نظر آتا مگر نقلی دھوبی کو اس کی کوئی پروا ہی نہیں ہوتی تھی کہ اُسے جلدی اور تیز رفتار سے سائیکل چلانی ہے بہت اطمینان سے وہ سائیکل پر اس انداز میں بیٹھا دکھائی دیتا جیسے وہ سائیکل پر نہیں کسی کرسی پر بیٹھا ہوا ہو یا کسی فوٹوگرافر کے اسٹوڈیو میں نقلی اور فرضی بنے ہوئے اسکوٹر پر بیٹھا ہوا فوٹو کھنچوانے کے لیے تن کر بیٹھا ہو۔ بعض لوگوں کو بلکہ بچوں تک کو اس کے انداز پر ہنسی آجاتی تھی۔ مگر اب تو اس کی سائیکل اور خود نقلی دھوبی دونوں ہی جیسے اپنا وجود کھو بیٹھے تھے۔

جب تین دن، تین راتیں نقلی دھوبی کے ایکسیڈنٹ کی خبر کو گزر گئیں اور سب بچے بڑے عورتیں مرد اپنی اپنی دنیا میں گم ہو گئے تو چوتھے دن بہت ہی حیرت انگیز طور پر نقلی دھوبی اپنی پرانی دھرانی سائیکل پر بڑے اٹ پٹے انداز میں سوار لوز نگر میں جیسے ہی داخل ہوا اچانک ساری بستی کی خلقت بچے بڑے اور عورتیں اسے دیکھنا مڑ پڑے۔ نقلی دھوبی کے ماتھے پر ایک سفید پٹی بندھی تھی اور اس کی ایک کہنی پر بھی چوٹ کا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بستی کے پرانے باسی طرم خاں نے اپنی بگلا جیسی دودھیا اچکن کے بٹن اپنے لرزتے ہاتھوں سے جلدی جلدی بند کیے اور پھر سفید کلغی جیسی اپنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے انھوں نے نقلی دھوبی کو پھٹکارا۔

"کیوں بے — کہاں تھا —؟ سارا چوپٹ کر دیا، تجھے کہیں جانا تھا تو ہمارے کپڑے تو پہنچا کر جاتا۔۔ مجھے اپنے گاؤں میں شادی میں جانا تھا تیری وجہ سے نہیں جا سکا۔ ابے تو بڑا گدھا ہے —؟" کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے نقلی دھوبی بس اسی قدر بولا "سو ہے خاں صاحب، پر ہم کیا کرتے ریلوے کالونی میں کپڑے پہنچانے گیا تھا پر ہماری سائیکل کی چپیٹ میں ایک اسکول کا بالک آگیا وہ تو شکر ہے چوٹ لگنے سے بچ گیا لیکن ہم بس کے پہیے کے نیچے آتے آتے بچے، زخمی ضرور ہو گئے پر گھاؤ کا کیا ہے لگتے ہی رہتے ہیں، ٹھیک ہو جاتے ہیں ہاسپٹل سے چھٹی ملتے ہی تو ابھی ابھی لوٹا ہوں خاں صاحب آپ کے کپڑے تو کب کے تیار رکھے ہیں۔۔۔" خاں صاحب طرم خاں کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر بھی نقلی دھوبی نے نہایت نرم اور رسیلے لہجہ میں اپنی سناتا رہا اور کپڑے ان کے حوالے کر دیئے وہ اپنے کمرہ کے باہر اکٹھے ہجوم کو جیسے نظر انداز کرتے ہوئے پھر اپنے کام میں جٹ گیا۔

گدگدیاں

● ایک صاحب نے اپنے نوکر سے کہا کہ خالی تانگہ لے آؤ۔ نوکر تین گھنٹے بعد واپس آیا اور کہنے لگا: صاحب کوئی تانگہ خالی نہیں ہے ہر تانگہ پر ایک آدمی سوار ہے۔

محمد ہارون
کرانہ شاپ اکولہ

● ایک صاحب کسی نجومی کے پاس گئے اور ہاتھ دکھایا نجومی نے ہاتھ دیکھ کر کہا: آپ بیس سال اور غریبی میں مبتلا رہیں گے۔ "پھر کیا ہوگا؟" ان صاحب نے جلدی سے پوچھا۔ نجومی نے جواب دیا، پھر آپ اس کے عادی ہو جائیں گے۔

اقبال احمد
مدنپورہ۔ بمبئی ۸

● اختر: ابا جان! اب تو ہم مالا مال ہو جائیں گے
باپ: وہ کیسے؟
اختر: ہمارے ریاضی کے ماسٹر صاحب نے پیسوں سے روپے بنانا سکھا دیے ہیں۔

ماجد علی خاں
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

● ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ انگریزی کے مشہور ڈرامانگار جارج برناڈ شا کہیں تقریر کر رہے تھے۔ تقریر لمبی ہوگئی اور کچھ لوگ بور ہوگئے۔ اتنے میں ایک شخص نے ان کی طرف ایک لفافہ پھینکا۔ برناڈ شا نے لفافہ کھولا اس میں ایک پرزے پر لکھا تھا "نالائق"
برناڈ شا نے لفافہ جیب میں رکھا اور کہا: دوستو! کبھی کبھی لوگ خط لکھتے ہیں اور نام لکھنا بھول جاتے ہیں مگر جن صاحب نے یہ کاغذ کا پرزہ میرے پاس بھیجا ہے انھوں نے اپنا نام لکھ دیا اور خط لکھنا بھول گئے۔

قاضی شہاب ظہیر
معرفت عبدالمتین۔ سی۔ ایم۔ پی
ایف آفس۔ آسنسول۔

● قدیر (وسیم سے) تم جانتے ہو قیامت کے دن پل صراط پر چلنا ہوگا۔
وسیم: مجھے کوئی فکر نہیں کیونکہ میں سرکس میں دس برس تک ایک ہی رسے پر چلا ہوں۔

عابد
جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

● ایک آدمی نے ایک گنجے سے پوچھا۔ جناب آپ کو اس گنجے پن سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی۔ گنجے نے جواب دیا، تکلیف تو کچھ نہیں ہوتی البتہ وضو کرتے وقت یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ چہرہ کہاں تک ہے۔

محمد مشتاق۔
بلدانہ

● جج (ملزم سے) تمھیں چوری کرنے میں کیا ملتا ہے
ملزم: حضور آپ سے ملنے کا موقع۔

● ہوٹل والا (فوجی سے) یہ کیا؟ آدھا کھا رہے ہو آدھا پیکٹ میں بند کر کے جیب میں رکھ رہے ہو۔
فوجی: ارے بھائی جتنے دشمن مار سکا مار دیے باقی کو گرفتار کر رہا ہوں۔

بچوں کی کوششیں

دو دوست

کسی جنگل میں ایک بہت اونچا اور گھنا برگد کا درخت تھا۔ اس پر دو کبوتروں نے اپنا آشیانہ بنایا تھا۔ ایک کبوتر کا نام "چنگو" اور دوسرے کا نام "منگو" تھا۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ اڑتے تھے۔ ایک ساتھ کھیتوں اور باغوں کی سیر کرتے تھے۔ ایک دن چنگو نے منگو سے کہا۔ "آؤ ہم تم مل کر سیر پر چلیں۔ سفر میں بڑے فائدے ہیں۔ عجیب و غریب چیزیں دیکھنے میں آئیں گی۔ ایک جگہ رہتے رہتے دل گھبرا گیا ہے۔"

منگو نے جواب دیا: "اے دوست! سفر کی تکلیفوں سے تم واقف نہیں ہو۔ اگر تم کو معلوم ہوتا کہ سیر و سیاحت میں کتنی مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ تو تم ایسا ارادہ نہ کرتے۔" چنگو نے کہا "سفر میں محنت اور مشقت ضرور اٹھانا پڑے گی مگر دنیا کی سیر کرنے میں ایسی ایسی دلچسپ اور خوبصورت چیزیں دیکھنے کو ملیں گی، کہ سیر کی ساری تکلیفیں بھول جاؤ گے اور تم کو اطمینان اور راحت نصیب ہوگی۔" منگو نے اس کی بات نہ مانی اور کہنے لگا "بھائی! سفر کرنا اس وقت اچھا ہوتا ہے جب کوئی دوست یا عزیز ساتھ ہو اور کھانے پینے کا سامان پاس ہو، پردیس میں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ اس وقت تم ضد کر کے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ ہم دونوں یہاں فراغت اور اطمینان سے رہتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں کہ ہم پردیس کی مصیبتیں برداشت کریں۔ میں تمھارے ساتھ جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں، اب اگر تم میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو تو خوشی سے جاؤ!" چنگو نے اپنے دوست کی بات نہ مانی اور اکیلا سفر کے لیے اڑ گیا۔

جنگلوں، پہاڑوں کی سیر کرتا ہوا ایک ہرے بھرے میدان میں اُترا شام کا وقت تھا۔ اس نے سوچا، اب اسی جگہ قیام کروں گا اور کل صبح یہاں سے آگے بڑھوں گا۔ ابھی وہ اچھی طرح آرام بھی نہ کر پایا تھا کہ زور شور کی آندھی آگئی، بجلی چمکنے اور کڑکنے لگی اور تھوڑی دیر میں مینہ برسنے لگا۔ چنگو گھبرا کر پناہ کی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ بڑی مشکل سے ایک درخت کے پتّوں میں چھپ کر اس نے جان بچائی۔ دوسرے دن سویرے وہاں سے اُڑا۔ ابھی کچھ دور گیا تھا کہ ایک طاقت ور شکرہ اس کی طرف جھپٹا۔ چنگو کے ہوش و حواس گم ہو گئے، شکرے کے پنجے سے بچنا بہت مشکل تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں نے اپنے دوست کا کہنا مانا ہوتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستا۔ دل میں خدا سے دُعا مانگنے لگا کہ اگر اس مصیبت سے بچ جاؤں تو اپنے وطن واپس چلا جاؤں۔ اِدھر شکرہ اس پر حملہ کرنے جا رہا تھا کہ اُدھر سے ایک بڑا باز آگیا وہ بھی چنگو کا شکار کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے شکرے نے ہمت کر کے باز کا مقابلہ کیا۔ دونوں میں لڑائی ہونے لگی۔ یہ موقع دیکھ کر چنگو جلدی سے پتھروں کے اندر ایک سوراخ میں گھس گیا۔

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

دوسرے دن چنگو وہاں سے نکل کر اپنے وطن کی طرف لوٹا، راستے میں بھوک لگی تو ایک کھیت میں اُترا اور اناج کے دانے چن چن کر کھانے لگا۔ قریب ہی ایک کسان کا لڑکا غلیل لیے کھیل رہا تھا۔ اس نے نشانہ لگا کر چنگو کی طرف ایک غلّہ مارا، بیچارے کا ایک بازو زخمی ہوگیا۔ وہ اڑکر ایک قریب کے کنوئیں میں اتر گیا۔ دو تین دن میں جب چوٹ کی تکلیف کم ہوئی تو اپنے گھر کی راہ لی۔ جب وہ اپنے برگد والے پرانے آشیانے پر آیا تو اس کا دوست منگو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ چنگو نے اپنی ساری داستان اس کو سنائی اور کہا کہ میں نے سنا تھا سفر کرنے سے بڑا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ مجھ کو یہ تجربہ ہوا کہ بغیر دوست کی صلاح مشورے کے کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔

نشید الصباح۔ عرف نغمہ
مکان نمبر ۵ ۱۸ا۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی

بے بس

گرمی کے دن تھے اور دوپہر کا وقت۔ سڑکیں تپ رہی تھیں۔ لیکن وہ ہر چیز سے بے نیاز اس چلچلاتی دھوپ میں ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ اسے کئی دنوں سے کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ وہ بھوکا تھا اور کھانے کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ کھانا نہ ملنے کی وجہ سے اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے کھانے کو دیتا بھی کون ہے؟ اس کا کوئی بھی تو نہ تھا۔ وہ اتنی بڑی دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اس کے جتنے بھی ساتھی تھے۔ اس کا ان سے جھگڑا ہو چکا تھا۔ انھوں نے مل کر بےچارے کی خوب مرمت کی تھی۔ اور آخر میں مجبوراً اسے جان بچانے کی خاطر بھاگنا ہی پڑا تھا۔ اب وہ اس ظالم اور خود غرض سماج سے نفرت کرنے لگا تھا۔

چلتے چلتے وہ ایک قصاب کی دکان کے قریب پہنچ گیا۔ اور للچائی ہوئی نظروں سے اندر دیکھنے لگا۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے کچھ کھائے ہوئے ہے؟ ابھی وہ کھڑا اپنی بے بسی پر کڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی پیٹھ پر دکاندار کا ڈنڈا پڑا۔ اور وہ کربناک آواز میں بھونکتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا ہے!!

خالد اقبال حشمی
۲۸۔ این۔ سی، روڈ، نیا بازار کانکی نارہ

یارانہ

حیدر اور اسلم ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ اسلم کا کان حیدر کے ہاتھ میں تھا اور اسلم چلّا رہا تھا۔ "امّی ۔ ۔ ۔ ۔ ارے ۔ ۔ ۔ ۔ امّی ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھیے حیدر مار رہا ہے۔" حیدر ڈپٹ پڑا۔ "ماروں گا نہیں تو کیا پچکاروں گا؟ ایک تو غلطی کی اور دوسرے دھونس دکھاتا ہے۔ واہ رے وا!"

"الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۔ ۔ ۔ تو نے میری سفید پین سے سیاہی کیوں نکالی؟" حیدر اسلم کے کان کو ٹرانسسٹر کے ریگولیٹر کی طرح گھماتے ہوئے اپنے بڑے ہونے کا رعب جھاڑ رہا تھا۔ اسلم بھی کم نہیں تھا دس برس کا تھا تو کیا ہوا۔ حیدر سے صرف ایک ہی برس کا تو چھوٹا تھا۔ کان چھڑانے کی کوشش کرتا ہوا وہ ممیاتی آواز میں چیخ پڑا۔ "دیکھ حیدر چھوڑ دے میرا کان۔ ورنہ ابّا کے آتے ہی تیری شکایت کر دوں گا۔"

"تو کیا میں چپ بیٹھا رہوں گا۔ میں بھی کہہ دوں گا کہ ابّا! اسلم مجھے بھیا نہیں کہتا۔" حیدر نے گیدڑ بھبکی دی۔ اسلم تب تک کان چھڑانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ "ہونہہ! بھیا کہے میرا ٹھینگا میں تو ایک بار نہیں سو بار کہوں گا۔ حیدر۔ حیدر۔ حیدر۔" اس کھٹر پٹر کو سن کر امّی بھی آ گئی تھیں۔ "پھر جھگڑنے لگے تم دونوں۔ ایں ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کیوں اسلم کیا بات ہے؟ یہ شور کیسا مچا رکھا ہے؟" "امی! بھیا مجھے مار رہے تھے۔"

"ماروں گا نہیں تو پھر کیا کروں گا۔ امی اس نے میرے پین سے سیاہی نکالی ہے"۔ امی نے حیرانی سے کہا۔ "تو کیا ہوا تم اور سیاہی بھر لینا"۔ اسلم کو شہ مل گئی!" امی! بھیا نے میرے کان مروڑے ہیں۔" بھیا یعنی حیدر اس یک طرفہ بات چیت سے گھبرا گیا۔ اور ایک دفعہ پھر سے اسلم کو دھولیں دینے لگا۔ "دیکھ اسلم! میں کہتا ہوں چپ ہو جا۔۔۔ ورنہ مار بیٹھوں گا"۔ پھر وہ امی کو سناتا ہوا کہنے لگا۔" میرا پین سیاہی کی دوات ہے کیا۔ کہ جب چاہا سیاہی انڈیل لی؟" "امی! مجھے دوات سے سیاہی بھرنا نہیں آتا۔ سیاہی گر جاتی ہے"۔ ابھی اسلم کچھ اور بھی کہتا کہ امی کو یاد آگیا کہ پتیلی میں دودھ چولھے پر چڑھا ہے اور آنچ بھی تیز ہے۔ کہیں دودھ ابل کر گر پڑا تو۔۔۔ اس لیے انھوں نے جھگڑے کو فوراً اس طرح ختم کیا کہ۔ "اچھا بھئی، بند کرو یہ کھٹ پٹ۔ اسلم، تم آج سے بھیا کا پین نہیں چھوؤ گے اور حیدر تم جب بھی اسلم کہا کرے بڑی دوات سے اس کے پین میں سیاہی بھر دیا کرنا"۔ یہ جھگڑا تھا رات کا۔ اس رات اسلم تو خوش تھا لیکن حیدر ناراض تھا۔ کیونکہ فیصلہ یک طرفہ ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی شاید کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف سے کروٹیں لیے لیٹے تھے۔ حیدر اس قدر جھنجھلا گیا تھا کہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اسلم سے کبھی نہیں بولے گا۔ زندگی بھر نہیں۔ کھیلے گا بھی نہیں اس کے ساتھ۔ دوسرے دن بھی یہی حالت رہی۔ جب حیدر ہوم ورک کرنے بیٹھا تو اسلم باہر کھیلنے گیا تھا۔ حیدر اپنے کام میں مشغول تھا۔ تبھی اس کے کانوں میں رونے کی آواز پڑی۔ جو اسلم کے سوا اور کسی کی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ شاید اسے کسی نے مار دیا ہو۔ حیدر کا دل بے چین ہو اٹھا۔ اس نے سوچا کہ کل رات کو تو بڑا شیر بن رہا تھا اب کیوں رو رہا ہے۔ مگر مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ اسے چپ کرانے جاؤں۔ لیکن تبھی دل کے کونے سے آواز آئی کہ وہ تیرا بھائی ہے، اور اس خیال کے آتے ہی وہ دوڑ پڑا اسلم کے پاس۔ اس نے دیکھا اسلم رو رہا ہے۔ وہ بے قابو ہو گیا اور جلدی سے پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے اسلم! کس نے مارا؟" اسلم آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر روتا ہوا بولا۔

"اوں۔۔۔ اوں۔۔۔ انور میری گیند چھین کر بھاگ گیا ہے"۔ اتنا سننا تھا کہ آگے آگے حیدر اور پیچھے پیچھے اسلم دونوں بھاگتے ہوئے انور کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔

انور اسلم کی گیند سے کھیل رہا تھا۔ حیدر کا رواں رواں سلگ اٹھا دوڑ کر ایک تماچہ لگایا اس نے انور کے گال پر اور گیند چھین لی۔ کچھ ہی وقت کے بعد دونوں بھائی گلے میں باہیں ڈال کر ہپ! ہپ! ہرّا کا نعرہ لگاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے یہی ان کا "یارانہ" تھا اور یہی ان کا "جھگڑا"۔

حیدر علی
گورنمنٹ بوائز مڈل اسکول مٹیامحل
جامع مسجد سیکنڈ شفٹ دہلی ۶

چند حکایتیں

● ایک بارہ سنگھا نے چشمہ کے پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اپنے سینگوں کی شان اور اپنی خوبصورتی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن جب اس کی نظر اپنی پتلی پتلی ٹانگوں پر پڑی تو کہنے لگا کہ قدرت نے یہ کیسی بے جوڑ ٹانگیں مجھ کو بخشی ہیں۔ جو سینگوں کی خوبصورتی کو بھی آگ لگاتی ہیں۔ یہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ایک شکاری آپہنچا۔ بارہ سنگھا ایسا تیز بھاگا کہ شکاری کو اس کے تعاقب کی امید نہ رہی۔ لیکن تھوڑی دور جا کر جنگل کی جھاڑیوں میں اس کے سینگ پھنس گئے۔ اب وہ پکڑا گیا۔ پس وہ کہنے لگا۔ ہائے میری بدعقلی، جن سینگوں کو میں اچھا سمجھتا تھا۔ وہی میری ہلاکت کا سبب بنے۔ اور ٹانگوں کو برا جانتا تھا۔ وہی میری موت سے بچانے کا سبب ہوئی۔

جو چیز وقت پر کام آنے والی ہو اس کو عزیز رکھنا چاہیے۔ چاہے وہ بدنما کیوں نہ ہو۔ اس کو بیکار نہیں سمجھنا چاہیے۔

● ایک مرتبہ ہاتھ، پاؤں، منھ، زبان، دانت تمام اعضا پیٹ سے باغی ہو گئے۔ اور سب نے عہد کیا کہ دیکھو ہم سب پیٹ کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ اور رات دن

اس کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔ سب مل کر پیٹ سے کہنے لگے۔ اب ہم تمھاری خدمت کرتے کرتے تھک گئے ہیں. اب ہم آرام کریں گے۔ ہاتھ نے کہا "میں پیٹ کے واسطے کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں"۔ دانت نے کہا "مجھ کو پیٹ نے اپنی چکی بنا رکھا ہے" غرض اسی طرح پیٹ کا شکار ہوئے۔ اور سب نے عہد کیا کہ آیندہ پیٹ کی خدمت نہیں کریں گے۔

اور جب یہ لشکر پیٹ کے خلاف ہو گیا تو پیٹ کو ہر طرح کی تکلیف ہونے لگی۔ پیاس لگی تو ہاتھ پانی نہیں دیتے۔ پانو گھڑے تک نہیں جاتے۔ بھوک لگی تو ہاتھ روٹی نہیں توڑتے۔ منہ لقمہ نہیں لیتے۔ جب پیٹ کمزور ہوا تو باقی لشکر بھی کمزور ہو گیا۔ اور بھوکوں مرنے لگا۔ تو تمام لشکر نے پیٹ کے حضور میں جا کر اپنی خطا معاف کرائی۔ اور بدستور پیٹ کی خدمت کرنے لگے۔

حاصل:۔ بادشاہ اور آقا و نوکر دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ہم نوکر کو روپے دیتے ہیں تو وہ کام کرتا ہے۔ نہیں تو اس کو غرض نہیں۔ کسی کا احسان کسی پر نہیں۔

عبدالخالق بوز گانؤ
(ٹینک روڈ ناگپور)

آم

سب میووں میں اچھا آم
کھاتے ہیں سب خاص و عام
سب کے دل کو بھاتا ہے
باغ سے گھر میں آتا ہے
آپا جی جب آتی ہیں
آم کا تحفہ لاتی ہیں
لال پری ہے چوسنا ہے
ادھر سرولی لنگڑا ہے
دیکھو شان وسہری کی
اک اک قاش امرتی کی
رنگ برنگی صورت ہے
داس میں ڈوبی سیرت ہے
میاں قمر یہ شہرت ہے
آم اس دیس کی نعمت ہے

سید شہروز قمر شیر گھاٹوی
کیرآف. سید اعجاز اختر (برانچ منیجر)
رام بھاٹا۔ رائے گڑھ (ایم پی)

شجاعت

کسی ملک میں ایک گڈریا رہتا تھا۔ اس کے ایک لڑکا تھا۔ لڑکا ہر روز بکریاں چرانے کے لیے جنگل میں جایا کرتا تھا۔ گرمی کا موسم اور دوپہر کا وقت، سورج سر پر چمک رہا تھا۔ اسے نیند آنے لگی تو ایک درخت کے سایے تلے سو رہا۔ اس نے خواب دیکھا کہ میں ایران کا بادشاہ ہو گیا ہوں۔ جب نیند سے بیدار ہوا۔ تو اسے تعجب ہوا۔ شام کو تمام ماجرا اس نے اپنے والد کو سنایا. والد نے کہا کہ خواب پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔

دوسرے روز بھی وہ اسی جنگل میں بکریاں چرانے گیا۔ اور دوپہر کے وقت اسی درخت کے سایے میں سو گیا تب بھی اسے وہی خواب دکھائی دیا۔ اس نے بکریاں اسی جگہ چھوڑ دیں اور قسمت آزمائی کے لیے ایران کی طرف روانہ ہو گیا۔ اثنائے سفر میں اسے بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ راستے میں شام ہو گئی۔ فکر ہوئی کہاں قیام کرنا چاہیے۔ اُسے غیب سے آواز سنائی دی کہ سامنے ایک فقیر کی جھونپڑی ہے۔ وہاں قیام کرو۔ جب یہ جھونپڑی کے اندر داخل ہوا۔ اور اس کی ملاقات فقیر سے ہوئی تو اس نے آنے کی وجہ دریافت کی۔ لڑکے نے تمام قصہ سنادیا۔ فقیر نے اس لڑکے کو جادو کی پڑیا دی اور کہا کہ جس وقت تو اسے ہاتھ میں رکھے گا۔ اس وقت تیری فتح ہوگی۔

صبح پڑیا لے کر لڑکا وہاں سے روانہ ہوا۔ راستے

میں اسے چوروں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ان پر اسے فتح حاصل ہوئی۔ جب وہ ایران پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایران میں بادشاہ کے خلاف بغاوت ہوگئی ہے۔ وہ بادشاہ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ جب شاہی محل کے قریب پہنچا تو پہرہ داروں نے روکا۔ اس نے فوراً پڑیا ہاتھوں میں لی اور غائب ہوگیا۔

پہرہ دار سمجھے کہ یہ چھلاوا ہے۔ وہ شاہی محل میں داخل ہوا۔ بادشاہ نے آنے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے ماتحت حکام باغی ہوگئے ہیں۔ اس لیے آپ کی خدمت کے واسطے غلام حاضر ہوا ہے۔

بادشاہ نے کہا: "آپ جائیے اور حملہ کرکے انھیں مغلوب کیجیے"۔ لڑکا مغرب کی طرف گیا۔ دیکھا دشمن کی فوج قلعوں کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے جادو کی پڑیا ہاتھوں میں لی اور کہا کہ میری مدد کے لیے اسی وقت فوج آنی چاہیے۔ چنانچہ زمین کے اندر سے سپاہی نکلنے شروع ہوئے۔ غرض کہ ایک بڑی فوج زمین کے اندر سے نکلی اور اس لڑکے کی طرف سے لڑ کر دشمن کی فوج پر فتح پائی۔ لڑکا جب ایران واپس آیا۔ تو بادشاہ کو خوشخبری سنائی۔ تب بادشاہ اس سے بہت خوش ہوا۔ اور اپنی شہزادی کی شادی اس سے کردی اور اعلان کردیا کہ میرے بعد تخت کا وارث یہی ہوگا۔

عزیز بچو۔ اگر آپ بھی اس بچے کی طرح شجاعت اور ہمت سے کام کروگے تو ضروری ہے کہ تم بھی ایک نہ ایک روز اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگے۔

خالد ندیم
ضلع پریشد ہائی اسکول، بالاپور، ضلع آکولہ

حکایت

دو مرغابیاں ایک کچھوا کہیں
ہوئے ایک چشمہ پہ مسکن گزیں
ہوا چشمہ جب سوکھنے کے قریب
تو مرغابیوں نے کہا اے حبیب
ہمارا یہاں رہنا ممکن نہیں
کسی اور چشمے پہ جائیں کہیں
پئے رخصت آئے ہیں ہم تیرے پاس
نہیں اپنے رہنے کی اب کوئی آس
وہ بولا کہ مجھ میں یہ طاقت نہیں
تمھیں چھوڑ کر رہ سکوں جو کہیں
جواب اس کو مرغابیوں نے دیا
یہ ہے کیسے ممکن بتاؤ ذرا
نہ چل کر زمیں پر ہوں ہم کامیاب
ہوا پر نہ تم اڑ سکوگے جناب
بھلا ساتھ اپنا تمھارا ہو کیا
تو کچھوے نے پھر عاجزی سے کہا
تمھیں کوئی تدبیر سوچو ذرا
نہ چھوڑو یہاں مجھ کو بہر خدا
تو مرغابیاں پھر یہ کہنے لگیں
ہدایت پہ رہنا تو اے ہم نشیں
اڑیں لے کے جس دم تجھے جان لے
کریں شور و غل لوگ یہ دیکھ کے
مگر دوست تم بولنا کچھ نہیں
کہا اس نے منظور ہے بالیقیں
ہوا پر وہ کچھوے کو پھر لے چلیں
تو مخلوق کی ان پہ نظریں پڑیں
لگے کہنے اک دوسرے سے چلو
یہ نادر تماشا ذرا دیکھ لو
اڑائے لیے جاتی ہیں بے گماں
یہ دیکھو تو کچھوے کو مرغابیاں
وہ کچھ دیر چپ چاپ سنتا رہا
مگر ضبط کا جب نہ یارا رہا

کہا چاہتا تھا کہ کرنا ہے کیا
ادھر لفظ کیا منہ سے نکلا ہی تھا
کہ لکڑی گئی منہ سے کچھوے کے چھوٹ
زمیں پر گرا سر گیا اس کا پھوٹ
دی آواز مرغابیوں نے وہیں
یہ دیکھا نصیحت جو مانی نہیں
مآل اس حکایت کا ہے ہم نشیں
عمل جو نصیحت پہ کرتا نہیں

عظمیٰ عارف درجہ ششم
گورنمنٹ انٹر کالج ۔ کدورہ

دوسروں کی مدد

عزیز احمد اپنے شہر کے مشہور آدمیوں میں سے تھے۔ وہ غریبوں کی ہر وقت مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا۔ ایک دفعہ ان کی ماں بیمار پڑیں۔ چونکہ امیر تھیں اس لیے ہر طرح کے علاج کا انتظام کیا گیا۔ طرح طرح کی دوائیں منگائی گئیں۔ کھانے پینے کا بھی خاص خیال رکھا گیا۔

اتفاق سے گھر کا نوکر ذاکر بھی بیمار پڑ گیا۔ اور اس کو بھی وہی بیماری ہو گئی تھی جو عزیز احمد کی والدہ کو تھی۔ ذاکر بہت غریب تھا، بھر پیٹ کھانے کو مل جاتا اسی میں وہ خدا کا شکر ادا کرتا۔ وہ بے چارہ بازار سے دوا تک نہیں خرید سکتا تھا۔ عزیز احمد کی ماں کے لیے جو دوا آئی تھی وہ انھوں نے خود نہ کھا کر ذاکر کو کھلا دی۔ ذاکر دوا کھا کر تندرست ہو گیا اور خدا کی قدرت سے عزیز احمد کی ماں بھی اچھی ہونے لگیں۔ حالانکہ انھوں نے دوا نہیں کھائی تھی۔ یہ محض ان کی ہمدردی کا نتیجہ تھا کہ خدا نے ان کو بھی صحت دے دی۔

ہم لوگوں کو بھی چاہیے کہ وقت پر غریبوں اور مجبور انسانوں کی مدد کریں۔ اور ان سے دعائیں لیں۔

سید قمر العارفین رضوی
ہسپورہ ۔ اورنگ آباد۔ بہار

خونی جزیرہ

ایک مسافروں سے بھرا جہاز سمندر میں جا رہا تھا جس میں چالیس مسافر سوار تھے۔ جہاز کے بیچ سمندر میں پہنچنے پر بہت بڑا طوفان آیا۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی اور سب لوگ گھبرا گئے۔ جہاز کے کپتان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جہاز اپنا راستہ بھٹک گیا اور وہ ایک جزیرے کے پاس گیا۔ وہ جزیرہ جہاز کے راستہ میں نہیں تھا۔ لیکن طوفان کی وجہ سے چلا گیا تھا۔ جزیرے کو دیکھ کر لوگ بڑے خوش ہوئے اور سب لوگ جزیرے پر اتر گئے تھوڑی دیر بعد انھیں کچھ آدمیوں کے پیروں کی آواز آئی وہ مسافر ادھر ادھر دیکھنے لگے ایک طرف سے کچھ جنگلی آدمی نمودار ہوئے تو وہ گھبرا گئے اور بھاگنا چاہا تو ان کی کوشش ناکام رہی۔ جنگلی ان سب کو پکڑ لے گئے۔

محمد عمران
کلگانو ڈگراس ایوت محل

توبہ

ٹن ۔ ٹن ۔ ٹن ۔ ۔ ۔ ۔ درس گاہ کی گھنٹی بجی۔ بچوں کی چھٹی ہوئی۔ سب بچے کھیلنے لگے۔ شاداب کھیلنے لگا۔ شاداب کے ساتھی کھیلنے لگے۔

سب اچھلتے کودتے تھے۔ دوڑ لگاتے تھے۔ کھیلتے کودتے احاطے کے باہر نکل گئے۔ وہاں جامن کا ایک پیڑ تھا۔ سب بچے اس پیڑ کے پاس پہنچے۔ جامن کی ایک ڈال ٹوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ ڈالی میں جامنیں لگی ہوئی تھیں۔ کالی کالی میٹھی میٹھی جامنیں۔

شاداب نے جامنیں دیکھیں تو منہ میں پانی بھر آیا۔ ضبط نہ ہو سکا۔ بلا اجازت ایک جامن توڑ کر کھا لی۔ سب

ساتھی بول اٹھے۔

"ارے شاداب! تم نے یہ کیا غضب کیا؛ جامن والے سے پوچھا نہیں۔ بلا اجازت جامن کھالی۔ اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ جاکر جامن والے سے معافی مانگو۔"

اب تو میاں شاداب گھبرائے۔ حساب کتاب کا خیال آیا۔ سوچ کر کانپ اٹھے۔ دل میں بہت نادم ہوئے۔ دن کے بارہ بجے تھے۔ گرمی کا مہینا تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ جامن والے کا گھر بھی دور تھا۔ ہمت کر کے چل پڑے۔ دھوپ کی قطعاً پروا نہ کی۔ سیدھے اس کے گھر پہنچے۔ دل میں سوچا کہ آخرت کی سزا تو اس سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ اگر جامن والے سے معاف نہ کرایا، تو وہ سزا کون بھگتے گا!

شاداب نے جاکر جامن والے سے معافی مانگی۔ آیندہ کے لیے توبہ کی، پختہ عہد کیا کہ اب ایسا کبھی نہ کروں گا۔

شاداب کی دیانت دیکھ کر جامن والا بہت متاثر ہوا۔ شاداب کو شاباشی دی، دوسرے بچے بھی شاداب کی بہت عزت کرنے لگے۔

عطیہ صدیقی
D-۳۳ ہاؤسنگ کالونی گونڈہ۔ یوپی

عقلمند گدھا

ایک گدھا ایک کھیت میں ہری ہری گھاس چر رہا تھا اور چرنے میں اتنا مصروف تھا کہ وہ دنیا سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ ایک بھوکے بھیڑیے نے اسے دیکھا اور اسے مار کر کھانے کے لیے دوڑ پڑا۔ گدھا یہ منظر دیکھ کر ڈر گیا۔ اور اس کے ہوش و حواس کھو گئے جیسے کہ چہرے خون نہ نکلے لیکن وہ بھاگا نہیں وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا جب بھیڑیا اس کے نزدیک آیا تو گدھے نے ایک بھی دولتی اپنی پچھلی ٹانگوں سے پوری طاقت سے ماری۔ بھیڑیا زور سے چلاتے ہوئے لڑھکنے لگا تب چالاک گدھا کا تو کی اور جتنا تیز بھاگ سکتا تھا بھاگا۔ دیکھا بچو کمزور لوگوں کے دماغ میں بھی کبھی کبھی تدبیر کام کر جاتی ہے۔

ہم لوگوں کو چاہیے کہ کسی کو حقیر نہ سمجھیں۔

شہاب الدین عوزی
مومن پورہ۔ مئوناتھ بھنجن۔ اعظم گڑھ

سانپ مرجائے اور۔۔۔

کسی شہر میں ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ وہ ہر طرح سے خوش تھا۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے شہر میں امن و قانون خراب ہونے سے چوریاں ہونے لگی تھیں۔ اپنی دولت کو محفوظ رکھنے کا بڑا پیچیدہ مسئلہ درپیش ہوا۔ اس نے ایک روز اپنے ایک دوست سے الجھن بیان کرتے ہوئے کہا" اگر میں اپنی دولت کو ایک مضبوط بکس میں بند کرکے اسے جنگل میں گہرا گڈھا کھود کر چھپا دوں تو کیسا رہے گا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے دولت کی چوری کا اندیشہ نہیں رہے گا۔ لیکن اس سلسلے میں آپ کو یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ اس راز کو ظاہر نہ کریں گے۔ کیونکہ اس کا علم آپ کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہوگا۔ اور دولت کو دفن کرنے کے لیے آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

اگلے روز دونوں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق شہر سے باہر جنگل میں گئے اور دولت کو ایک محفوظ جگہ دیکھ کر گاڑ دیا۔ لیکن کچھ دن بعد اس کو روپے کی ضرورت پڑی تو وہ اکیلا ہی روپیا چھپائی ہوئی جگہ سے نکالنے کے لیے جنگل میں گیا۔ جب اس نے اس جگہ کو کھودا جہاں اس نے بکس دبایا تھا تو اس کی حیرانی کی حد نہ رہی کہ بکس وہاں سے غائب تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ دوست کی نیت خراب ہو گئی ہوگی اور وہ بکس نکال کر لے گیا۔ اب اس نے سوچا کہ اگر میں اس سے پوچھوں گا تو وہ اس بات کو کبھی نہیں مانے گا۔ کیونکہ اس سے اس کی بے عزتی ہوگی۔ اس لیے کوئی ایسی ترکیب سوچنی چاہیے۔ جس سے دولت بھی مل جائے اور دوست کے ساتھ تعلقات بھی اچھے رہیں۔

وہ اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ اور بولا کہ ہم نے نقدی تو سب جنگل میں چھپا دی تھی۔ اب میں زیورات بھی وہاں رکھ دینا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے چوری ہو جانے سے بہت زیادہ نقصان ہوگا۔ پہلے کی طرح تم بھی کل میرے ساتھ

چلنا۔ دوست نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اور ساتھ چلنے کا وعدہ بھی کیا۔ اس کے واپس چلے جانے کے بعد اس نے سوچا کہ جب ہم کل کو زیورات وہاں رکھنے کے لیے جائیں گے اور بکس وہاں سے غائب ہوگا تو میرے دوست کو فوراً مجھ پر ہی شک گزرے گا۔ اور راز فاش ہوجائے گا۔ اس لیے وہ بکس پہلے کی طرح وہاں ہی رکھ دینا چاہیے تاکہ اس کی قلعی نہ کھل سکے۔ اور پھر جب میرا دوست زیورات بھی رکھ دے گا تو نقدی زیورات پر اپنا قبضہ ہوگا۔ اس لیے وہ اس بکس کو دوبارہ اسی جگہ گاڑ آیا۔

اگلے روز وہ آدمی اکیلا ہی وہاں پہنچا۔ دیکھا کہ بکس اپنی جگہ موجود ہے بکس اٹھایا اور گھر آگیا۔

محمد شکیل راوت
مکان نمبر ۳۹۷ محلہ کچہ کوٹ۔ مالیر کوٹلہ

بی خالہ کو ذرا ان کے شکار تک پہنچا دیجیے

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں

پیامی ادبی معمّا نمبر ۹ کا صحیح جواب

ذیل کی کتابوں میں ہی ملے گا

کتاب	مصنف	قیمت
ننھا فرشتہ	فہمیدہ عتیق	۴/۰
رنگوں کی بستی	سہیل انور	۳/۵۰
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں	یوسف ناظم	۲/۰
نبیوں کے قصّے	خواجہ عبدالحیٰ فاروقی	۴/۰
ایک کھلا راز	مسعود احمد برکاتی	۳/۰
میر انیس	محمد حسین حسّان	۲/۰
بچوں کے اقبال	مرتبہ: اطہر پرویز	۴/۵۰
سرخ جوتے	بیگم قدسیہ زیدی	۲/۵۰
کھیل تماشا	سطوت رسول	۴/۵۰
شفیع الدین نیّر	اطہر پرویز	۷/۵۰
شرارت	محمد حسین حسّان	۲/۰
بابا ناصح	ڈاکٹر رشید الوحیدی	۲/۰
سلامہ وصمصامہ	ڈاکٹر رشید الوحیدی	۴/۵۰
صحت کے ۹۹ نکتے	مسعود احمد برکاتی	۱/۵۰
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
اللہ کے صفی	خلیل احمد جامعی	۲/۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	ادارہ	۲/۰
جدید پہیلیاں	راج کشور	۶/۰
دُم کٹا سانپ	محمد قاسم صدیقی	۱/۰
قرآن پاک کیا ہے	عبدالواحد سندھی	۳/۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۳/۰

کتابیں حاصل کرنے کے پتے:

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلّی ۲۵
۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی ۶
۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
۴۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

بچوں کے لیے نئی اور دلچسپ کتابیں

کہانیاں، معلوماتی، سوانح

کتاب	قیمت
چمپاوت کا آدم خور شیر	1/50
جھوٹا لڑکا	1/50
نیلا ہیرا	4/50
چیونٹی رانی	1/50
پھر میں چگوں کیا خاک	1/50
بی مینڈکی اور توتا	1/50
مچھیرا اور اس کی بیوی	2/50
لومڑی کا گھر	1/50
بندر اور نائی	2/50
جادو کا گھر	1/50
بچوں کی کہانیاں	1/50
ہپتو جپتو	1/50
پانچ بونے	1/50
تاک دِنا دِن تاکے سے	1/50
مدورانا پردیس چلے	1/50
پان کھاکر طبلہ بجاکر رام ناچا	1/50
پکڑو دم کٹے کو	1/50
لال مرغی	1/50
روٹی کس نے پکائی	1/50
جن حسن عبدالرحمٰن (اول)	2/50
جن حسن عبدالرحمٰن (دوم)	2/50
الوکھا عجائب خانہ (اول)	-/50
الوکھا عجائب خانہ (سوم، چہارم فی حصہ)	-/50
گدھا بوجھ بہیا اور غبارے	1/50
ایک طالب علم کی کہانی	2/00
آؤ ڈراما کریں	2/00

کتاب	قیمت
محمد شفیع الدین نیر	7/50
ہار کی تلاش	6/00
موم کا محل	4/00
اس نے کیا کرنہ جانا	1/20
خربوزہ شہزادے کا سرین گیا	1/50
ایک کٹوری تیل میں	1/50
چوری کی عادت	2/00
دادا نہرو	5/00
بچوں کے اقبال	4/50
دم کٹا سانپ	1/[illegible]
پہیلیاں	-/80
تین اناڑی	3/00
میگھ نگر کا راجا	1/25
سندر چنار	-/75
کھیل سنسار (نظمیں)	4/50
جوہر قابل	3/00
میرامن	2/00
چنبیلی	1/20
شہزادہ اور ٹھگ	2/00
خرگوش کی چال	2/50
چٹانوں کی کہانی	2/50
بھوتوں کا جہاز	6/00
خرگوش کا سپنا	5/00
شیر خاں	1/50
بھیڑیے کے بچے	1/50
بہادر	2/50

کتاب	قیمت
میاں ڈھینچوں کے بچے	1/50
لومڑی کے بچے	1/50
تانبیل خاں	1/50
صحت کی الف بے	3/00
دھنک (نظمیں)	3/00
گلا بوچو ہیا اور پری زاد	2/00
جلو مرغابی	3/00
وطن کے جاں نثار	3/00
سرکس	1/50

مذہبی کتابیں

کتاب	قیمت
ہمارا دین (اول)	6/00
ہمارا دین (دوم، سوم، فی حصہ)	6/00
یسرنا القرآن	2/25
اسلام کیسے شروع ہوا	4/50
ہمارے رسول	3/00
ہمارے نبی	1/50
اسلامی عقائد و مسائل مذہب	6/00
قرآن پاک کیا ہے	3/00
اللہ کا گھر	3/00
عقائد اسلام	1/50
حضرت نظام الدین اولیاء	2/00
چار یار	4/50
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول)	4/00
اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	4/00
سرکار دو عالم	3/00
اسلام کیسے پھیلا (حصہ اول)	4/50
اسلام کیسے پھیلا (حصہ دوم)	4/50
خلفاء اربعہ	3/75

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵

مرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

محمد عتیق امتیازی نمبروں سے کامیاب

محمد عتیق اس سال ایس ایس سی کے امتحان میں پورے ناگپور ڈویژن میں میرٹ میں چھٹے نمبر پر کامیاب ہوئے ہیں۔ عثمان آباد ہائی اسکول کے اس طالب علم کو ۷۰۰ نمبروں میں سے ۶۴۴ نمبر ملے ہیں اس طرح انھیں ۹۲ فیصد نمبر ملے۔ ہم ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

استاد کا احترام

آپ یقین کریں انیسویں صدی میں جرمنی کے ایک شہر الم میں اسکولوں کے اساتذہ کا احترام آنکھ میچ کر کیا جاتا تھا۔ مشہور سائنسدان آئن اسٹائن کو ایک مرتبہ اس لیے اسکول سے خارج کر دیا گیا تھا کہ اس نے استاد کا احترام آنکھ میچ کر نہیں کیا تھا۔

آدھی رات

ریاست ورٹمبرگ جرمنی کے گورنر بیرن ہرمن کو آدھی رات سے خاص محبت تھی عمر بھر وہ ایک وقت کھانا کھاتا اور وہ بھی آدھی رات کو۔ وہ تمام ملازمین کی تقرری کے کاغذات پر آدھی رات کو دستخط کرتا۔ اس نے اپنے پالتو کتے کا نام بھی آدھی رات رکھا۔ اس نے دو نوکروں کا نام بھی یہی رکھا تھا وہ اپنی چھٹیاں بھی ناروے کے جزیرے آدھی رات کا سورج پر گزارتا تھا۔

پانچ کروڑ سال پرانا پانی کا قطرہ

سوویت وسطی ایشیا کے علاقے پامیر میں پانی کا ایک قطرہ دستیاب ہوا ہے جو ۵ کروڑ سال پرانا ہے۔ پانی کا یہ قطرہ چٹان کے ایک چھوٹے سے شفاف کے بلوریں کنکر میں ملا ہے۔ اس کو قیمتی پتھر تلاش کرنے والے ماہرین ارضیات نے دریافت کیا ہے۔ پانی کے قطرے کی عمر کا اندازہ اس بلوریں کنکری کی عمر کے لحاظ سے لگایا گیا ہے۔ اس کو تاجک یونیورسٹی کے معدنیات کے میوزیم میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اس پر ابھی مزید تحقیق ہوگی۔

مولیدینہ اسکول کی شاندار کامیابی

مولیدینہ سکنڈری اور ہائر سکنڈری اسکول کے ۹۸ طلبہ نے امتحان میں شرکت کی اور ۸۷ طلبہ نے کامیابی حاصل کی۔
نمایاں کامیابی حاصل کرنے والوں میں پانچ نے ڈسٹنکشن اکیس نے فرسٹ کلاس ۵۲ نے سیکنڈ کلاس حاصل کیا۔

سرکس کے ٹکٹ

جنگ عظیم دوئم کے دوران فروری ۱۹۴۴ء میں مسٹر اور مسز ولیس نے تماشہ دیکھنے کی خاطر سرکس کے ٹکٹ خریدے اس روز مسلسل بمباری ہوئی جس کی وجہ سے سرکس بند ہوگیا پورے ۲۶ سال بعد ۱۹۷۰ء میں جب یہ سرکس دوبارہ شروع ہوا مسٹر ولیس اپنی بیوی کے ہمراہ ۲۶ سالہ پرانا ٹکٹ لیے جا پہنچے جہاں ان کی خوب عزت افزائی کی گئی۔

ضروری اطلاع

چند مجبوریوں کی وجہ سے پیامی ادبی معاملہ کے نتیجے کا اعلان اس ماہ نہیں کیا جا سکا
اکتوبر کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

پیامی ادبی معمّا نمبر 9

فیس داخلہ کچھ نہیں آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

150 روپے کے نقد انعامات

دفتر پیام تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۴ء

پہلا انعام : بالکل صحیح حل پر مبلغ 100 روپے دوسرا انعام : ایک غلطی والے حل پر مبلغ 50 روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبر وار لکھیے۔

۱۔ بادشاہ کے ـــــ دشمن دیوار پھاند کر ان کے مکان میں گھس آئے۔ (دو / چار)
۲۔ عبداللہ کے بابا ـــــ بیمار ہو گئے۔ (اچانک / یکایک)
۳۔ جب شام ہوتی ہے تو ـــــ نکلتا ہے۔ (دن / سورج)
۴۔ اس میں محاورے کا ـــــ بھی ہے۔ (استعمال / نمک)
۵۔ لنگڑا آم تو اسی ـــــ میں تھا، کھو جیے۔ (لفافے / تھیلے)
۶۔ ـــــ کے بسنے والے اچھے اچھے گیت زبانی یاد کر لیتے ہیں۔ (مصر / عرب / افریقہ)
۷۔ اس سے ـــــ لینے کی کوشش کی ہے جو صرف بچوں کا حصہ ہے۔ (مزہ / لطف)
۸۔ ـــــ مفید بھی ہو سکتی ہے اور مضر بھی (غریبی / امیری / تنہائی)

ادھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں صحیح جواب صفحہ ۳۱ کی کتابوں میں ملے گا

ٹوکن پیامی ادبی معمّا نمبر 9

میں اڈیٹر پیام تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام ....

پتا ....

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے:

پیامی ادبی معمّا نمبر 9 ماہنامہ پیام تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

صبا قمر
ننھے پیامی
تابش
کاشف
اور
سیما
ثانیہ نقوی

آزادی — ایک نعمت — ایک موقعہ

37 سال قبل ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں اور ہم آزاد ممالک کی صف میں شامل ہوگئے تھے
تب سے ہم نے زندگی کے تمام میدانوں میں بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی

- آج ہمارے کسان قوم کی ضرورت کے لئے کافی اناج پیدا کرتے ہیں۔

صنعتی پیداوار میں ہم نے دنیا کے تمام ملکوں میں ایک قابل فخر مقام حاصل کرلیا ہے۔

نیا بیس نکاتی پروگرام ہماری مسلسل عملی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے تاکہ سب کو سماجی اور اقتصادی انصاف مل سکے

صرف اسی نشانے پر کاربند رہ کر ہم اندرونی اور بیرونی خطرات کے خلاف اپنی آزادی اور ملکی سالمیت کا تحفظ اور دفاع کرسکتے ہیں۔

آیئے۔ آزادی کے 38 ویں سال میں داخل ہوتے ہوئے ہم کڑی محنت اور مل جل کر کام کرنے کا عہد کریں۔ تبھی ہم اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں

بچوں کی
کتابیں
(جگن ناتھ آزاد)
بچوں کی دل چسپی کے دو مزیدار ڈرامے.
یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی
ہو چکے ہیں۔
قیمت : ۲/۲۵
گاندھی باباکی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی
کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز
پیرایے میں لکھی گئی ہے.
قیمت: ۴/۰۰
اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن
صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے،
یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا.
قیمت ۴/۵۰
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ. مزیدار
کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت
بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے. آپ
بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت : ۲/۰۰
جب اور اب (آصف مجیب)
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال پہلے
باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔ قیمت:
تین اناڑی عصمت چغتائی
کلو، بلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی
شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان
میں لکھا گیا ہے۔ قیمت ۳/=
ترجمہ:
قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمٰن
الہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہوگئی، لیکن اب تو
اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال
ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی
قید سے آزادی دلائی ہے.
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(سیفی پریمی)
کہاوت اور کہانی
روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور
کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے
کہاوتیں وجود میں آئیں ۔
قیمت: ۲/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا
بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے. اس کتاب میں
سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے
ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ
بھر سکتے ہیں. قیمت ۱/۵۰
دہلی ۶
بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage

Regd. No. D(SE)-043 September, 1984

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

پیام تعلیم

اکتوبر ۱۹۸۴ء | جلد ۲۱ | شمارہ ۱۰

ایڈیٹر — ولی شاہجہانپوری

قیمت : ۲/۵۰ روپے / سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

۲۷ ستمبر کو ہم پندرھویں صدی ہجری کے پانچویں سال میں داخل ہو گئے۔ عام طور پر ہر نئے سال پر لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں لیکن ہجری سال کی ابتدا ایک ایسے الم ناک حادثے سے ہوئی کہ عام طور اس کی مبارکباد نہیں دی جاتی۔ یہ سانحہ ہے حضرت امام حسینؓ اور اُن کے خاندان کی شہادت کا۔ حضرت حسینؓ نے خود اپنی اور اپنے خاندان کی جانیں قربان کر دیں مگر باطل کے آگے سر نہ جھکایا۔ آپ کی اس قربانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم حق کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کو تیار رہیں۔

۳۰ ستمبر کو مکتبہ جامعہ کا کاروباری سال ختم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے اکتوبر کا شمارہ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ آپ کو انتظار کی جو زحمت ہوئی وہ رسالہ پڑھنے کے بعد دور ہو جائے گی۔

مولانا اجتبیٰ ندوی کا مضمون "مسجد اقصیٰ" کافی معلوماتی ہے اور اس وقت جبکہ اسی قبلۂ اول کو نابود کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں یہ مضمون وقت کی چیز ہے۔ محترمہ آصفہ مجیب کی کہانی "لال شہزادہ" اور سرور جمال صاحبہ کی "شہزادے کی شادی" دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

احمد وصی صاحب اور قاضی انصاری صاحب کی نظمیں خاصی دلچسپ ہیں۔

سید محمد حسن صاحب کا "ایک بے وقوف" پڑھیے اور لطف لیجیے۔

سید ابو تمیم نے "ماموں جان کے دانت" کی کہانی بڑے دلچسپ انداز میں سنائی ہے۔ رفیق عابد زاہدی صاحب کی کہانی "احسان فراموش" بھی دلچسپ ہے۔ "بد اچھا بدنام بُرا" کا تعارف ایس۔ ایس۔ عباس رضوی صاحب نے بہت عرصے کے بعد کرایا ہے۔

اس شمارے کے بارے میں اپنی رائے ضرور دیجیے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

حضرت فکر تونسوی

Shafi

احمد وصی

کام کی باتیں

آؤ تم کو آج بتا دیں
کیا پہچان ہے سچّے کی
یعنی اچھّے بچّے کی

جو ہر اک کو جگہ دیتا ہے
اپنے دل کی راہوں میں
وہ چڑھتا ہے نگاہوں میں

اچھی اچھی عادتیں جس کی
وہ ہر اک کو پیارا ہے
سب کی آنکھ کا تارا ہے

بڑوں کے ساتھ کبھی نہ اُلجھو
بحثوں اور جوابوں میں
یہ لکھا ہے کتابوں میں

اپنا کام جو آپ کرے گا
وہی بڑا بن پائے گا
وہی "بڑا پن" پائے گا

ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو
تم بھی اگر اپناؤ گے
بہت بڑے بن جاؤ گے

دودھ بھارتی۔ کوئنس روڈ۔ بمبئی ۲۰

بچوں کا پارک

امتہ الرحمٰن محسنی

ایک مرتبہ مسز نقوی ایک بڑے شہر میں گئیں۔ جب وہ واپس آئیں تو وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ سب اپنے اسکول کے بچوں کو سنایا۔ انھوں نے کہا کہ میں بچوں کا پارک دیکھنے گئی تھی۔ وہ بہت ہی اچھا بنایا گیا ہے۔ بہت سے جھولے ریت کے بھرے ہوئے بکس اور طرح طرح کے کھلونے میں نے وہاں دیکھے۔ کئی طرح کے جانور بھی بند پنجروں میں پلے ہوئے تھے۔ ایک پنجرے میں گھوڑا اور اس کا بچہ تھا۔ ایک میں مرغی اور اس کے بہت سے چوزے تھے۔ ایک میں خرگوش تھے۔ وہاں یہ سب جانور اس لیے رکھے گئے تھے کہ بچے پنجروں میں سے جھانک کر ان جانوروں کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔ دوسرے بڑے شہروں میں رہنے والے کئی بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں یہ جانور دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ ان کو دیکھیں اور معلوم کریں کہ ہمارے لیے دودھ اور انڈے کہاں سے آتے ہیں۔

ایک بکس میں خرگوش کے چھ بچے تھے اور بچو! تم بتا سکتے ہو ان کی ماں کون تھی؟ وہ ایک مرغی تھی! مجو! ان بچوں کو پال رہی تھی جب ان بچوں کی ماں مر گئی تو مرغی نے اس کے بچوں کو اپنا بنا لیا۔ وہ ان کو ایسے ہی اپنے پروں میں چھپاتی تھی۔ جیسے وہ اسی کے ہوں۔ خطرے کے وقت کٹ کٹا کر کے ان کو خبردار بھی کرتی تھی۔ خفا بھی ان پر اپنے ہی بچوں کی طرح ہوتی تھی۔ سونے کے وقت بلا کر پروں میں چھپا لیتی تھی۔ بچو! ذرا خیال کرو جب وہ بچے ریشمی گیندوں کی طرح اس کے گرد اچھلنے کودنے لگتے ہوں گے تو وہ کیا سوچتی ہوگی؟

بچے مسز نقوی کی یہ دلچسپ کہانی سن کر ہنسنے لگے۔ شمسی نے کہا اور جب وہ بچے کیڑے مکوڑے چننے کے لیے چوزوں کی طرح زمین کو کُھرچتے نہیں ہوں گے تب وہ کیا سوچتی ہوگی۔

مسز نقوی نے ہنس کر کہا۔ "میرا خیال ہے مرغی ماں اپنے خرگوش بچوں پر بہت بری طرح خفا ہوتی ہوگی۔"

ہاں تو بچو! میں نے ایسی دلچسپ اور عجیب بات پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ تم نے کبھی سنی ہوگی۔

●

"مسکن" دودھ پور، علی گڑھ

سید ابو تمیم، فرید آبادی (مرحوم)

ماموں جان کے دانت

ان کی عمر تو کچھ زیادہ نہیں تھی، یہی ساٹھ باسٹھ کے ہوں گے، اور مثل مشہور ہے، ساٹھا پاٹھا۔ وہ خوب صحت مند اور چونچال بھی ہیں۔ مگر بچارے کے دانت سب چوہے کے بل میں پہنچ گئے تھے۔

ہاں یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔ جب دانتوں نے ان کے منہ سے ہجرت کر کے چوہے کے بل میں رہایش اختیار کر لی تو ان کو چوکا بنوانا پڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت بڑھیا دندان ساز نے یہ چوکا بنایا ہے۔ دوسرے گاہکوں سے وہ ایسے چوکے کے تین سو روپے لیتا ہے، ان کا دوست تھا۔ تیس روپے میں بنا دیے۔

جب دانت کا چوکا نیا نیا منہ میں فٹ کیا جاتا ہے تو منہ والے پر کیا بیتتی ہے، اس کا حال تو وہ جانے یا اس کا خدا، ہاں دوسرے دیکھنے والے یہ دیکھتے ہیں کہ منہ والے کا منہ کچھ جوان جوان سا ہو گیا۔ جھرّیاں غائب غلّہ، کلّے کے بلّو جیسے گڑھے ابھرے ابھرے، اور سب سے عجیب بلکہ بہت نرالی بات یہ نظر آتی ہے کہ منہ والے کے دانت سفید جھاگ، جیسے چودھویں رات یا تو پیلے اودے، سبز، زردی مائل کا مجموعہ تھے، یا اب گویا سیاہ دیواروں پر قلعی پھر گئی ہے۔ پہلے پھپوندی جھلکتی تھی اب چاندی کا پانی بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ عجب تیری قدرت عجب تیرے کھیل۔

دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ نئے چوکے والا کبھی ہونٹ سیکڑتا ہے، کبھی پھیلاتا ہے، کبھی دونوں ہونٹ کواڑوں کی طرح بالکل برابر کر کے بند کرتا ہے، کبھی دانت پیسنے کی طرز میں منہ بناتا ہے۔ غرض ہونٹوں اور منہ سے سب کچھ یا بہت کچھ کرتا ہے۔ نہیں کرتا تو یہ کہ آرام سے ہونٹ بند نہیں رکھتا۔

تیسری بات ان دو سے نرالی، یہ ہوتی ہے کہ وہ چوکا دھونے کے بعد رکھتا کہیں ہے اور ضرورت پڑنے پر اسے ڈھونڈتا کہیں اور ہے۔

ماموں جان کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔ ہفتے میں دو دفعہ ان کے دانت کھو جاتے، اور ہفتے میں تین دفعہ مل جاتے۔ تین دفعہ اس طرح کہ چوکا تو ٹکا ہوتا منہ کے اندر ہی، مگر ان کو شبہہ یہ ہوتا کہ کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ بڑی ڈھونڈیا مچتی ..... غسل خانے کی ہر چیز الٹ پلٹ کر دیکھتے، لکھنے کی میز کی ساری درازیں نکال کر زمین پر الٹ دیتے، کپڑوں کی الماری کا ایک ایک خانہ اور خانے کا ایک ایک کپڑا جھاڑ کر رکھ دیتے۔

پر اس دفعہ دانت ایسے کھوئے کہ ملے ہی نہیں۔ دو دن، تین دن.... سات دن گزر گئے۔ گھر کا کوئی کونا نہیں بچا جہاں چوکا تلاش نہ کیا گیا ہو۔ ان کا بس چلتا تو گھر کی دیواریں توڑ کر یا چھت اکھیڑ کر چوکا تلاش کرتے، مگر کرایے کے مکان میں اصل مشکل، بلکہ تکلیف یہی ہوتی ہے کہ کرایہ دار نہ اس کی دیوار توڑ سکتا ہے نہ چھت اکھڑوا سکتا ہے.... ہاں، مجبوری....

کرایہ دار پر۔ مجھے اس وقت ایک قاضی نام کا کرایہ دار

یاد آ گئے ان کا بھی چوکا ایک دن سالم کھو یا رہا، دوسرے دن وہ اخبار میں "تلاش گم شدہ" کا اشتہار دینے رہے تھے کہ خیال آیا کہ مہترانی سے کام لیا جائے۔ ان کو کچھ ایسا شبہہ تھا کہ "کل صبح جب میں قدمچے پر بیٹھا ہوا تھا۔ بہت زور کی چھینک آ ئی تھی، شاید چھینک کے بلغم کے ساتھ چو کا بھی قدمچے میں گر پڑا ہو گا۔۔۔" ان کی مہترانی نے قدمچہ چھوڑ گھر کی ساری نالیوں بلکہ پڑوسیوں کی نالیوں تک میں بانس ڈال دیکھے۔ اونہہ، کس کا چوکا، کہاں کا چوکا۔

خیر وہ ایک دیگچی کے اندر ملا۔ ہوا یہ تھا کہ صبح منہ ہاتھ دھوتے وقت انھوں نے چوکا ایک کھڑکی کی دہلیز پر رکھا، اٹھانا بھول گئے اور دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ ان کی ایک لڑکی نے چوکا حفاظت کی خاطر ایک دیگچی میں رکھ دیا۔ دوسری لڑکی نے صبح کا کھانے پکانے کے لیے دیگچی کو اندر سے دیکھے بغیر اس کے اندر دال ڈالی، پانی ڈالا اور چولھے پر دیگچی رکھ دی۔ ہنڈیا پکتی رہی کھدر کھدر۔

آٹھویں دن ماموں جان کی بھابی اور ان کے ساتھ ان کے دو آفت کے پر کالے بچے مہمان آئے، یہ مہمان کوئی سال بھر بعد آئے تھے۔ ماموں جان نے، ان کے لڑکوں نے، ممانی جان نے، سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ ماموں جان چند منٹ تک خوش رہے، پھر اپنے دانتوں کو ٹٹا کر کے بسورنے لگے۔ یہ بات بالکل حق بہ جانب تھی، آٹھ دن سے روٹی کھانی مشکل ہو رہی تھی، اور آج بھابی کی خاطر میں، ممانی نے دسترخوان کے لیے کئی لذیذ کھانوں کا سامان شروع کر دیا تھا۔ لوٹی مرچوں کا قورما، ماموں جان کو دل و جان سے زیادہ پیارا ہے۔ وہی پکنے والا تھا۔۔ ہائے اللہ اب کیا ہو؟ صبر۔

ماموں ممانی اور بھابی ایک کمرے میں باتوں میں معروف ہو گئے۔ بھابی کے لڑکے نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔ "آؤ کوکو نانا جان کا گھر دیکھیں۔" بھائی نے کہا۔ "کوکو، تم پاگل ہو۔ کہیں بوڑھے لوگ گڑیاں کھیلتے ہیں۔" کوکو نے ساری بات نہیں سنی "تم پاگل ہو" سنتے ہی بھائی کے منھ پر تھوکا اور بھاگی۔ بھائی پیچھے دوڑا۔ اب چوہے بلی کی دوڑ شروع ہوئی اس گھر میں کئی کمرے ہیں، اس لیے کہ تین منزلہ ہے۔ پہلی اور دوسری منزل تک بھائی جان کوکو کو نہ پکڑ سکے۔ تیسری منزل کے بعد آسمان تھا۔ کوکو پکڑی گئی۔ فری اسٹائل کشتی سب بچے جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کشتی کی یہ قسم کسی سیانے نے دیوانے بچوں کی کشتی دیکھ کر ہی ایجاد کی ہے۔

تیسری منزل کی جب دری چاندنی، سکڑ سکڑا کر رہ گئی، تو کوکو نے سوچا کہ کسی نئے اکھاڑے میں اترنا چاہیے۔ کہنے لگی۔ "بھئی اب میں تھک گئی۔"

بھائی نے کہا۔ "توبہ کرو۔ اب نہ تھوکنا۔"

کوکو نے وعدہ کر لیا بیچ کی منزل میں دونوں پہنچے۔ یہیں ایک کمرے میں ماموں، ممانی اور بھابی بیٹھی تھیں۔ دوسرا کمرہ "اظہر کا کمرہ" تھا۔ بہت سجا سجایا، الماریاں، تصویریں، صوفہ قالین وغیرہ۔

کوکو نے اس کمرے کے اندر جھانک کر کہا۔ "آہا جی تو ڈھیر ساری تصویریں ہیں۔ آؤ منو بھائی، تصویریں دیکھیں۔" تصویریں دیکھتے دیکھتے دونوں میں فساد ہو گیا۔ کوکو کہتی تھی۔ "یہ چھوٹے بچے والی تصویر اتار دو۔"

منو کہتے تھے۔ "میرا ہاتھ وہاں تک نہیں جا سکتا۔" کوکو نے زور لگا کر ایک کرسی وہاں تک گھسیٹی۔ "لو اب تو ہاتھ چلا جائے گا۔"

منو بھائی نے اب یہ عذر کیا کہ "تصویر جس ستلی سے بندھی ہوئی ہے، وہ بہت موٹی ہے۔" اس پر فساد ہوا کوکو نے منو کو دھکا دیا۔ منو نے گرنے سے بچنے کو "کارنس" کا سہارا لیا۔ نہیں گرے، کوکو کی اسکیم فیل ہو رہی تھی، کوکو نے کرسی گرانی چاہی، منو نے ایک لات ماری، جو مناسب بات تھی، مگر لات کوکو کے لگنے کے بجائے کرسی کی کمر پر لگی، یعنی منو کے پاؤں میں چوٹ آئی، وہ لڑکھڑائے، کارنس پر ریشمی کپڑا بچھا ہوا تھا۔ منو نے اس کا سہارا لیا، کوکو نے دوسرا دھوکہ دیا۔ منو کے ساتھ ساتھ کارنس پر رکھا ہوا چینی کا مرتبان گرا، زور سے چھن کی آواز پر ماموں، ممانی

بھابھی دوڑے دوڑے پہنچے۔ مرتبان تو دس بارہ روپے کا ہوگا، مگر ماموں جان نے دیکھا اس کے ٹکڑوں کے پاس ان کا چوکا دانت نکوس رہا ہے۔ ماموں جان بہت خوش ہوئے، ممانی نے کہا "آئے ہائے" میری یاد پر پتھر پڑ گئے۔ پچھلی اتوار کو میں نے ہی احتیاط کے مارے یہ دانت اس مرتبان میں رکھے تھے۔"

ماموں جان بولے "اجی تم قورمہ پکاؤ۔"

میرا پیارا وطن

قاضی انصاری

یہ کوہ ہمالہ یہ گنگ وجمن
یہاں دل رُبا تاج کا بانکپن
بہاروں کے موسم ہیں جلوہ فگن
یہ میرا وطن میرا پیارا وطن

یہاں جو کسان اور مزدور ہیں
یہ سب کام میں اپنے مسرور ہیں
یہ محنت کشوں کا نرالا چمن
یہ میرا وطن میرا پیارا وطن

ملیں، کارخانے جو چلنے لگے
تمنا لیے لوگ بڑھنے لگے
ترقی کی راہوں پہ ہے گامزن
یہ میرا وطن میرا پیارا وطن

رسیلی زبانیں، نئی چال ہے
ہر اک صوبۂ ہند خوش حال ہے
ہے سارے مذاہب کی اک انجمن
یہ میرا وطن میرا پیارا وطن

سنورتی رہے پیار کی زندگی
دلوں میں رہے امن کی روشنی
مہکتے رہیں اس کے سرو سمن
یہ میرا وطن میرا پیارا وطن

لال شہزادہ

محترمہ آمنہ مجیب

ایک بادشاہ تھا۔ اللہ میاں نے اس کو سات بیٹے دیے تھے۔ چھوٹے بیٹے کو وہ سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ پیار سے اسے لال شہزادہ کہتا تھا۔ لال شہزادہ تھا بھی بڑا ہونہار۔ عادتیں بہت اچھی تھیں۔ سب کا کہنا ماننا، سب کی عزت کرتا۔ اسی وجہ سے سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سب کو دل سے عزیز تھا۔

جب بیٹے بڑے ہوئے، بادشاہ سلامت نے سب کی شادیاں ٹھہرائیں۔ خوب تیاریاں ہونے لگیں۔ خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ آخر برات کا دن آیا۔ سب شہزادوں کو دولھا بنایا گیا۔ سبھی اچھے لگ رہے تھے۔ مگر لال شہزادہ تو بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ ماں باپ صدقے ہو رہے تھے۔ اور سب بلائیں لے رہے تھے۔

پر اچانک ایک عجیب اتفاق ہوا۔ ادھر سے پریوں کا تخت گزر رہا تھا۔ انھوں نے جو اتنا سندر سماں دیکھا تو نیچے اتر آئیں اور لال شہزادہ کو تخت پر بٹھا کر اڑا لے گئیں۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ایک کہرام مچ گیا۔ ماں باپ پچھاڑیں کھانے لگے۔

سب سوچ میں تھے کہ شہزادہ کیسے ملے۔ بغیر دولھا کے برات کیسے جائے اور پھر دوسری سلطنت والوں کو، سسرال والوں کو کیا جواب دیں۔ بادشاہ کا وزیر بڑا سمجھ دار تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ برات جائے گی۔ دلھن والوں سے کہا جائے گا کہ دولھا اتفاق سے بیمار ہو گیا ہے۔ ہم ساتھ نہیں لا سکے، دلھن کو رخصت کر دیں۔

سب شہزادے اپنی اپنی دلھن لے آئے۔ چھوٹی دلھن کو دوسرے لوگ لے آئے۔ جب وہ محل میں اتری دیر تک انتظار کرتی رہی کہ کہیں تو اس کا بیمار دولھا نظر آتے۔ مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ کوئی کہتا: "اسے دیو لے گئے۔" کوئی کہتا: "اسے پریاں لے گئیں۔" دلھن سن سن کر پریشان ہوتی۔

ایک دن کیا ہوا کہ ایک فقیر آیا۔ اس نے پوچھا۔ "بیٹی تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

شہزادی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بولی، "میرا شہزادہ غائب ہے، قسمت پھوٹ گئی۔ اب یہ آس لگائے جی رہی ہوں کہ وہ آجائے۔"

فقیر کو بڑا ترس آیا۔ کہا، "چل بیٹی تو میرے ساتھ چل۔ میں کوشش کروں گا کہ تیرا شہزادہ تجھے مل جائے۔"

دلھن شہزادی فوراً تیار ہو گئی اور فقیر بابا کے ساتھ چل پڑی۔

چلتے چلتے بہت دن بیت گئے۔ جنگل بیابان، پہاڑ، ندی دریا پار کیے۔ ایک دن ایک بہت گھنے جنگل سے دونوں گزر رہے تھے کہ عجیب عجیب ڈراونی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ فقیر نے کہا، "بیٹی خبردار پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ پتھر بن جاؤ گی۔"

آخر تھوڑی دور چل کر ایک عالی شان سنہرا محل نظر آیا

فقیر نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: "آنکھیں بند کر لو۔" شہزادی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اُڑ رہی ہے۔ جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک نہایت حسین شہزادہ کرسی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا ہے۔ فقیر نے شہزادے سے کہا۔

"لے بچہ سنبھال اپنی امانت!" یہ کہہ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

شہزادہ اپنی دلھن کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اسے آرام سے بٹھایا لیکن فوراً پریشان سا معلوم ہونے لگا۔

شہزادی نے پوچھا: "کیا بات ہے، آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ کیسی مبارک گھڑی ہے کہ ہم ملے ہیں۔"

شہزادہ بولا: "ہاں شہزادی تم نے بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ آج خدا نے ہمیں ملایا ہے۔ ہزار ہزار شکر ہے۔ مگر مجھے یہ ڈر لگ رہا ہے کہ ابھی پری آئے گی اور تمھیں مار ڈالے گی۔ یہی سوچ رہا ہوں کہ تمھیں کیسے اس ظالم سے بچاؤں؟" پھر خوش ہو کر کہا: "ہاں ابھی مجھے فقیر بابا کی یاد آ گئی۔ جب پری کے آنے کا وقت آئے گا۔ میں تمھیں بتا دوں گا۔ تم بس اس درخت پر بیٹھ جانا۔ اس کی یہ تاثیر ہے کہ کوئی انسان اس پر بیٹھ جائے تو چڑیا بن جاتا ہے۔ اسے جب آدمی بنانا چاہیں تو درخت کا پھول توڑ کر چڑیا کی ناک میں لگا دیں۔ وہ پھر آدمی ہو جاتا ہے۔"

شہزادی خوشی سے بولی: "اچھا تب میں تو اطمینان سے تمھارے پاس رہ سکوں گی۔"

اور یوں اطمینان سے دونوں رہنے لگے۔ مگر کچھ دنوں اسی طرح رہتے رہتے شہزادی کا جی گھبرانے لگا۔ ایک دن اس نے کہا: "آخر شہزادے ہم لوگ کب تک ایسے رہیں گے۔ اب تم اپنی سلطنت واپس چلو۔ تمھارے لیے سب تڑپ رہے ہیں۔"

شہزادے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حسرت سے بولا۔ "میں آزاد ہوتا تو کب کا اپنے پیارے وطن اور ماں باپ کے پاس پہنچ چکا ہوتا۔ مصیبت یہی ہے کہ پری نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ کہیں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ بس ایک ترکیب ہے اگر تم کر سکو۔ تم میری سلطنت میں واپس جاؤ اور ابا جان سے کہو کہ وہاں خوب اچھا سا جشن کریں۔ اس میں سب پریوں کو بلائیں۔ جب یہ سب اکٹھی ہوں تو بڑی بھابھی اپنے بچے کے چٹکی لے لیں وہ رونے لگے گا۔ پریاں پوچھیں گی کہ یہ کیا ہوا تو کہیں کہ لال پری یہ ہار جو پہنے ہے یہی مانگ رہا ہے۔ تم بھی بچے کو سکھا دینا کہ ہار کے لیے مچل جائے۔ ہار میں ہیرے، موتی اور لعل جڑے ہیں، اس میں میری جان ہے۔ جب وہ ہار پری بچے کو دے گی میں تمھارے پاس آ جاؤں گا۔"

شہزادی یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور تن تنہا اتنے بڑے سفر کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ راستے میں اس نے بہت دکھ اور مصیبتیں جھیلیں اور محل پہنچ کر سب کو شہزادے کے ملنے کی خوش خبری سنائی۔ ہر طرف خوشی چھا گئی۔ شہزادے کی سلامتی اور جلد واپسی کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ جشن کی تیاریاں بڑے زوروں میں شروع ہوئیں۔ پریوں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔

اللہ اللہ! کیا شاندار جشن تھا۔ چپّہ چپّہ پر بہار تھی۔ محل خوب سجایا گیا تھا۔ پریوں کا جگمگٹ تھا۔ خوشی کے ترانے گونج رہے تھے پھر شہزادے نے جیسا بتایا تھا ویسا ہی کیا گیا۔ بچّہ ہار کے لیے مچل گیا۔ روتے روتے ہلکان ہو گیا۔ دوسری پریوں نے لال پری سے کہا: "اسے بہن دے دو نا۔ ہار کی کیا حقیقت ہے بچّہ ہلکان ہوا جا رہا ہے۔"

پری نے غصّے سے ہار اتار کر بچّے کے سامنے ڈال دیا اور فوراً اڑ گئی کہ شہزادے کو جا کر پکڑے اور آنے نہ دے، مگر شہزادہ اس سے پہلے محل میں آکر چھپ گیا۔ کب کے بچھڑے ماں باپ بھائی ملے۔ مارے خوشی کے سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سبھی خوش تھے۔ اور خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔ ●

سائرہ خان

ٹن، ٹن، ٹن، گجک لے لو، خستہ، کراری گجک۔

سردیوں کے دنوں میں جلد شام ہو جانے کی وجہ سے بچّے اپنے اپنے گھروں میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں یا بٹھا لیے جاتے ہیں اور شام ہی سے گلیاں سنسان ہو جاتی ہیں لحاف میں دبکے ہوئے راشد نے منہ باہر نکالا۔

"امّی، امّی! میں گزک لوں گا، امّی بڑھیا گزک۔"

"کیسی گزک، صبح سے شام تک کھیلتے ہوئے گزر جاتی ہے اور شام کو تمھیں گزک اور مونگ پھلی کی پڑ جاتی ہے۔" امّی نے کہا۔

"امّی، امّی! دلا دو نا۔" ارشد نے ضد کی۔

"اچھا جاؤ یہ روپیا لے لو، مگر راشد تم نے تو ہوم ورک بھی نہیں کیا ہے؟"

"امّی! میں بہت تھک گیا ہوں۔" راشد کا یہی روز کا معمول بنتا جا رہا تھا۔ وہ اسکول جاتے وقت سست رہتا۔ اسکول سے واپسی پر کتابوں کا بستہ ایک طرف پھینک دیتا۔ اور کھیلنے کے لیے گھر سے نکل جاتا۔ دن ڈھلے تک گلی کوچوں میں کھیلتا رہتا۔

اس کی امّی بھی سارا دن گھر کا کام کاج کر کے تھک جاتیں اور یوں راشد پر توجہ نہ دے پاتیں۔ راشد اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا پیار اور محبت نے اس کی عادتیں خراب کر دی تھیں۔ وہ بڑا ہو گیا تھا۔ مگر اس کی عادتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ماں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔

راشد کے امتحان قریب تھے۔ امتحان بھی میٹرک کا تھا۔ اس دفعہ راشد کی امّی نے راشد کو تنبیہ کی تھی کہ اگر وہ اس بار بھی فیل ہو گیا تو جیب خرچ وغیرہ بھی بند کر دیا جائے گا اور اس کو نوکری تلاش کرنی پڑے گی۔

راشد نے کئی بار پڑھنے کی کوشش کی مگر ایک تو امتحان کا خوف مسلّط تھا۔ دوسرے کتابوں سے دل چسپی نہ ہونے کے باعث ہر کتاب اُسے ایک پہاڑ نظر آتی۔ ویسے بھی اب وقت نہ رہا تھا۔ سارا سال یوں ہی مارا مارا پھرا۔ اب وہ سبق یاد کرنا بھی چاہتا تو نہ ہوتا۔ آخر تنگ آ کر راشد اپنے دوست سے ملنے چلا گیا تاکہ حل شدہ پرچوں اور گیس پیپر کی مدد سے کچھ کام چلا لے۔ اسی فکر میں وہ اپنے دوست احمر کے گھر جا پہنچا۔ احمر نے آج تک اسے پریشان نہ دیکھا تھا۔ احمر نے پوچھا تو راشد نے اپنی پریشانی بیان کر دی۔

احمر ہنستا رہا اور پھر راشد سے کہنے لگا۔ یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے؟ ارے بھئی، ابھی تو ایک ہفتہ امتحان میں باقی ہے۔"

راشد کو اپنی نالائقی اور بے توجہی پر سخت افسوس تھا۔ قیمتی وقت کے گزر جانے کا احساس اُسے بار بار پریشان کر رہا تھا۔ مگر کیا کرتا، گھبراہٹ طاری تھی۔

"بھائی احمر، اب وقت بہت کم بچا ہے اور مضامین کی تعداد تو دیکھو، پھر پرچوں کے درمیان صرف ایک ایک دن کا وقفہ ہے۔ متواتر پرچے ہوں گے۔" راشد نے کہا۔

"کیا امتحان امتحان کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اگر میں تمھیں کامیابی کا نسخہ بتا دوں تو ....؟"

سرورق نونہال کراچی

"ہاں ہاں بتاؤ" راشد نے بے تابی سے کہا۔

"ابھی بتا دوں ؟" احمر نے راشد کی پریشانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اُسے تنگ کیا۔ "نہیں پہلے فلم دیکھنے چلیں گے۔ جب ذرا فریش ہو جائیں گے تو پھر۔"

اور دونوں فلم دیکھنے چلے گئے۔ احمر تو اطمینان سے فلم دیکھتا رہا۔ مگر راشد بے چین تھا اور فکرمند بھی تھا۔ جب فلم دیکھ کر باہر نکلے تو احمر نے کام یابی کا نسخہ راشد کے حوالے کر دیا اور اسے اچھی طرح سمجھایا کہ اُسے آیندہ کیا کرنا ہے۔

راشد گھر آیا تو اس کی امی ناراض تھیں۔ رات ہو چکی تھی۔ راشد نے کتابیں اکٹھی کیں اور کمرہ بند کر لیا۔ رات کے وقت جب راشد کی امی کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ راشد کا کمرہ روشن ہے اور راشد پڑھ رہا ہے۔ ماں مطمئن ہو کر سو گئی۔ اس کے بعد راشد کا کمرہ اکثر بند رہتا۔ راشد کی امی اسے پڑھتا دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ انھوں نے تو اس کے لیے تحفے بھی خرید لیے تھے۔

امتحان کی صبح احمر راشد کو لینے آیا تو راشد کی امی نے سنا کہ احمر راشد سے پوچھ رہا ہے۔ "کیوں بھئی راشد تیاری مکمل ہو گئی ؟"

"ہاں دوست، اب کام یابی میرے قدم چومے گی، میں نے اپنی دائیں طرف دا سکٹ پائیں کا رتوس سٹ کر لیے ہیں اور بائیں طرف گولیاں ہیں، یہ چیزیں میں نے راتوں رات جاگ کر بہت محنت سے تیار کی ہیں اور جرابوں میں پوائنٹ کی پھلجھڑیاں ہیں۔ بس دوست کام چل جائے گا۔ پاس مارکس مل جانے چاہییں۔"

"چلو، چلیں، کام یابی کا یہ نسخہ بہترین ہے۔"

راشد نے امتحان دیا اور کام یاب بھی ہو گیا۔ مگر زندگی کی وہ کام یابی جو علم کا مقصد ہے اُسے حاصل نہ ہو سکی۔ آج کل راشد ایک معمولی حیثیت سے ملازمت کر رہا ہے۔ کیوں کہ چور راستے سے کام یابی حاصل کرنے والوں میں علم اور صلاحیت کی کمی رہتی ہے اور ان پر ترقی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ ان کی محنت، لگن، جدوجہد کی طاقت اور شوق ختم ہو جاتا ہے۔ راشد کی نا اہلی اور کام چوری کی عادت اب اُس کی فطرت بن چکی ہے۔

جو بچے کام یابی کا یہ نسخہ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں، انھیں کیا پتا کہ آگے چل کر زندگی میں یہی چور راستہ انھیں ایسی جگہ لے جا کر چھوڑتا ہے۔ جہاں سے پھر کوئی کام یابی اُن کا مقدر نہیں بدل سکتی۔ کام یابی کے اس سستے نسخے نے راشد کی قابلیت، صلاحیت اور ماں کی آرزوؤں کو بھی بجھا دیا۔

سرور جمال
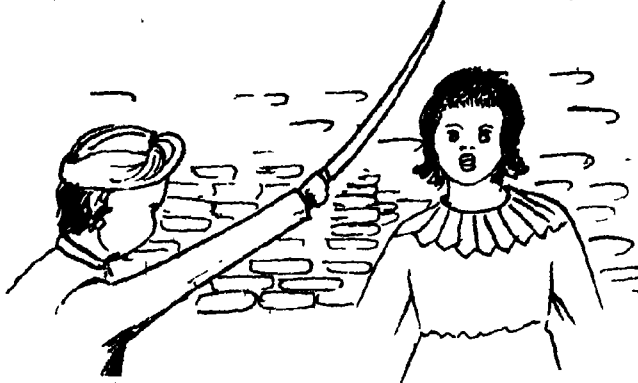
شہزادے کی شادی

عظیم آباد کے ایک گانو میں ایک شہزادہ، جس کا نام خرم تھا، شکار کھیلنے گیا۔ دریا کے کنارے اس نے ایک بزرگ کو دیکھا۔ وہ بزرگ مٹی کی اینٹوں کے جوڑے لگا لگا کر ایک طرف رکھ رہے تھے۔ شہزادہ رُک کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بزرگ سے پوچھا:

"بابا! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" بزرگ نے جواب دیا:

"میں لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کے جوڑے لگا رہا ہوں۔" شہزادے کے دل میں اپنی شادی کے بارے میں بھی جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس نے بہت ادب سے جھک کر پوچھا:

"بابا! کیا آپ میرے جوڑے کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟" بزرگ نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد بتایا:

"بیٹا تیری شادی رام نگر کی سرائے کی بھٹیارن کی لڑکی سے ہوگی۔" شہزادہ خرم یہ سنکر بہت پریشان ہوا۔ ایک شہزادے کی شادی بھٹیارن کی لڑکی سے! اف یہ کتنی شرم ناک بات ہے۔ نہیں میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا!

اس نے دل میں پکا ارادہ کرلیا اور بجائے اپنی ریاست میں جانے کے وہ سیدھا رام نگر کی طرف چل پڑا۔

رام نگر ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس میں ساری رعایا بہت آرام اور چین سے زندگی گزارتی تھی۔ شہزادہ خرم، رام نگر پہنچ کر سیدھا شاہی سرائے میں پہنچا۔ سرائے کی عمارت کے سامنے ایک خوبصورت اور پیاری سی ننھی بچی کھیل رہی تھی۔ شہزادے نے جب لوگوں سے بھٹیارن کی لڑکی کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ خوبصورت ننھی سی بچی بھٹیارن ہی کی لڑکی تھی۔ یہ سن کر شہزادے نے فوراً اپنی تلوار نکالی اور لڑکی کا پیٹ چاک کردیا۔ پھر جس رفتار سے آیا تھا اسی رفتار سے واپس اپنی ریاست میں چلا گیا۔

یہ واقعہ چشم زدن میں ہوگیا۔ لوگ لڑکی کی طرف لپکے، بھٹیارن خبر پاکر دوڑی آئی۔ پتا چلا کہ کسی شہزادے نے اس کی لڑکی پر تلوار سے حملہ کردیا ہے۔ بھٹیارن اسی حالت میں لڑکی کو گود میں لے کر راجا کے محل میں فریاد کے لیے چل پڑی۔ محل میں اس کو فوراً رانی کے دربار میں پیش کیا گیا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ لڑکی کا پیٹ چاک کرنے والا اس محل کا شہزادہ نہیں تھا۔ بلکہ کسی دوسری ریاست کا تھا۔ اس کے باوجود رانی کو اس لڑکی سے پوری ہمدردی تھی کیونکہ وہ اس کی رعایا تھی۔ لہٰذا فوراً شاہی طبیب اور وید بلائے گئے۔ لڑکی کا علاج تیزی سے ہونے لگا۔ اور آخرکار اس کا زخم بھر گیا۔

(کوٹھی نشاط افروز، سیوان (بہار))

بھٹیارن کی لڑکی اب پورے طور سے تندرست ہوگئی۔ لیکن اس کے پیٹ پر تلوار کی کاٹ کا ایک لمبا نشان رہ گیا جو سانپ کی طرح لہراتا ہوا نظر آتا تھا۔

رام نگر کی رانی کی کوئی لڑکی نہیں تھی۔ رانی کو اس لڑکی کی پیاری صورت ایسی بھائی کہ اس نے لڑکی کو گود لینے کا فیصلہ کر لیا۔ بھٹیارن کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی۔

محل میں اس کا نام گل بانو رکھا گیا۔ اب وہ شہزادی گل بانو کے نام سے مشہور تھی۔ اس کی پرورش بہت ناز و نعم سے ہوئی۔ اس کی تعلیم و تربیت کی طرف خود رانی پوری پوری توجہ دیتی۔ یہاں تک کہ وہ بڑی ہو گئی۔

جوان ہونے پر اس کے حسن وجمال اور تعلیم و تربیت کا چرچا دور دور پھیل گیا۔ اس کی شادی کے لیے دور اور قریب سے پیغام آنے لگے۔ آخرکار اس کی شادی پڑوس کی ریاست میں طے ہوگئی۔

شہزادی گل بانو کا شوہر کوئی اور نہیں تھا بلکہ شہزادہ خرم تھا۔ شہزادہ گل بانو کو پاکر بہت خوش تھا کہ اس کو ایسی خوب سیرت اور خوب صورت بیوی ملی۔

شادی کے کچھ دنوں کے بعد اچانک شہزادے کی نظر تلوار کی کاٹ کے لمبے اور لہراتے ہوئے سانپ کی طرح نشان پر پڑ گئی۔

شہزادہ خرم نے گل بانو سے اس نشان کے بارے میں دریافت کیا۔ گل بانو نے بتایا کہ کسی شہزادے نے بچپن میں اس کے پیٹ کو اپنی تلوار سے چاک کر دیا تھا۔ شہزادہ یہ بات سن کر سمجھ گیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا پیٹ اس نے چاک کر دیا تھا۔ مزید اطمینان کے لیے اس نے پوچھا:

"کیا تم رام نگر کے راجا کی لڑکی نہیں ہو؟"

گل بانو نے کہا:

"نہیں میں رام نگر کی شاہی سرائے کی بھٹیارن کی لڑکی ہوں۔ اس واقعہ کے بعد رانی نے مجھے گود لے لیا اور اب میں شہزادی گل بانو کہلاتی ہوں۔"

شہزادے کے کانوں میں اس بزرگ کے الفاظ گونجنے لگے:

"بیٹا تیری شادی رام نگر کی بھٹیارن کی لڑکی سے ہوگی۔" اب شہزادے کو اپنی اس حرکت کا بہت افسوس ہوا اور اس نے خدا کی رضا کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔ سچ ہے قسمت کی لکھی بات پوری ہو کر رہتی ہے۔

مسجد اقصیٰ

مولانا اجتبا ندوی

۲۱ ر اگست (۱۹۶۹ء) کی تاریخ مسلمانوں کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے بڑی منحوس تاریخ تھی۔ فلسطین کی مشہور مسجد، مسجد اقصیٰ میں یہودیوں نے آگ لگا دی۔ ساری دنیا میں غصے اور رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کے لیے تو یہاں کی متبرک جگہیں پہلے قبلہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلمان پہلے اسی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں خاص کر عرب ملکوں نے اس حادثے کو بہت شدت سے محسوس کیا۔

یہ مسجد اقصیٰ کیا چیز ہے، اور یہاں کی دوسری مقدس جگہوں کی تاریخی اور مذہبی حیثیت کیا ہے۔ ہماری درخواست پر محترم اجتبا ندوی (استاد مدرسہ ثانوی جامعہ) نے آپ کے لیے یہ اچھا سا مضمون لکھا ہے۔ اجتبا صاحب اپنی تعلیم کے سلسلے میں تین چار سال تک دمشق (شام) میں رہے ہیں۔ بیت المقدس دمشق سے قریب ہی ہے۔ لگ بھگ پچاس میل کا فاصلہ ہے، گھنٹے سوا گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں۔ اجتبا صاحب کئی بار بیت المقدس ہو آئے ہیں۔ انھوں نے جیسے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ اسی لیے اتنا دلچسپ ہے۔

ایڈیٹر

(یہ مضمون ۱۹۶۹ء کے پیام تعلیم سے لیا گیا ہے)

مغربی ایشیا میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ بہت پرانا بہت ہی پرانا، لاکھوں برس پرانا، انسان نے غاروں سے نکل کر میدانوں کی طرف قدم رکھا، جھونپڑیاں بنائیں، گانو بسائے قصبے آباد کیے اور ترقی کرتے کرتے شہروں کی بنیاد ڈالی اور شاید پہلے پہل یہی شہر آباد ہوا۔

اس شہر کا نام "ایلیا" تھا بعد میں یروشلم ہوا اور اب اسے بیت المقدس کہتے ہیں۔ یہ شہر ملک اردن کی راجدھانی عمان سے ۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔

بیت المقدس بڑا خوبصورت اور عجیب شہر ہے، وادیوں اور میدانوں سے گزرتے ہوئے سرسبز و شاداب بلند پہاڑیاں نظر آتی ہیں، اونچی، نیچی، ہموار، ناہموار پہاڑیاں، ان پر ہر قسم کے پھلدار درخت اُگے ہوئے ہیں۔ زیتون کے درخت تو بڑے سلیقے سے لائنوں میں کھڑے ہوتے، جیسے شہر میں ہر داخل ہونے والے کو خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔

ایک پہاڑ تو صرف زیتون کے درختوں کا ہے۔ اسی لیے اس کا نام "جبل الزیتون" (زیتونی پہاڑ) پڑ گیا ہے۔ زیتون کے درخت خوبصورت پھلوں سے لدے ہوئے ہرے، سرمئی، نیلے اور سفیدی مائل نگاہوں کو بڑے بھلے لگتے ہیں۔

جنوب مشرق کے پہاڑ "ماریا" پر مسجد اقصیٰ، اور قبۃ الصخرہ کے آسمان کو چھونے والے گنبد اور محراب دور سے نظر آتے ہیں۔ پہاڑیوں کے نیچے چشمہ ہے۔ اس کا پانی بہت صاف و شفاف ہے جیسے آئینہ اور ٹھنڈا جیسے برف۔

بیت المقدس شہر بڑا صاف ستھرا ہے، سڑکیں کشادہ گلیاں روشن مگر تنگ، بازار و در عمدہ، بہت سلیقے سے بنائے

گئے ہیں چھت دار تاکہ خریداروں کو بارش اور دھوپ کی تکلیف
کا احساس نہ ہو، دکانیں قرینے سے سجی ہوئیں، ہر قسم کا سامان اور
ہر طرح کا اسباب، زیتون کے لکڑی کے قلم دان، گل دان، رحل،
تختیاں، کھلونے اور گڑیاں، ان پر ہاتھی دانت اور سیپ کے دلکش
نقش ونگار، بازار میں چلے جائیے تو نکلنے کو جی نہ چاہے۔ ہر سامان
کو دیکھیے ضرور، خریدنا نہ خریدنا آپ کی مرضی پر ہے۔ دکاندار بڑے
بااخلاق خوش سلیقہ اور خوش مزاج، چہرہ پر تلخی نہ جھنجھلاہٹ،
گرمی نہ غصہ، خوش خوش جائیے اور خوش خوش واپس آجائیے۔

بیت المقدس ایک قدیم مضبوط شہر پناہ سے گھرا ہوا ہے۔
اس میں داخل ہونے کے لیے سات دروازے ہیں۔ ان میں
سے صرف چار ہی کھلے رہتے ہیں۔ اور زیادہ تر لوگ مشرقی دروازے
"الباب المشرق" سے داخل ہوتے ہیں۔ روشن اور ہموار مگر
پُرپیچ گلیوں سے گزرتے ہوتے مسجد اقصیٰ یا کلیسا قیامت تک
پہنچ جاتے۔ اگر کہیں راستہ بھول گئے تو گلیوں میں گھنٹوں چل
کر ہر مرتبہ مسجد اقصیٰ کے کسی دروازے کے سامنے پہنچ جائیے گا،
ہر گلی مسجد اقصیٰ کے کسی نہ کسی دروازے پر ختم ہوجاتی ہے۔ عمارتیں
نئی پرانی ملی جلی، آرام دہ اور پرفضا، نئی اور پرانی تہذیب کی
آئینہ دار۔

اسی یروشلم میں آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے دو
اجنبی (ایک مرد اور ایک عورت) داخل ہوئے۔ کلدانیوں
کی راجدھانی بابل کے رہنے والے تھے، عقیدہ، دین، اخلاق
اور نیکی کے پرچار کے لیے انھیں بابل کی زمین تنگ نظر آئی
تو اہل وطن سے رخصت ہو کر اس پُرامن اور پُرسکون شہر
میں پناہ لی، جو آگے چل کر پیغمبروں کا شہر کہلایا، اور دنیا کے
تین بڑے آسمانی مذہبوں یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے
لیے یکساں طور پر قابل احترام ٹھہرا۔

یہ دونوں اجنبی حضرات ابراہیمؑ تھے اور ان کی بیوی
سائرہ تھیں، حضرت ابراہیمؑ کی ایک دوسری بیوی ہاجرہ تھیں۔
ان سے ایک لڑکے حضرت اسماعیلؑ ہوئے، حضرت ابراہیمؑ
ان دونوں کو ایک بے آب وگیاہ[1] سرزمین میں لے جاکر چھوڑ
آئے تھے۔ یہیں بعد میں مکہ مکرمہ آباد ہوا، اور تھوڑے عرصہ
کے بعد خدا کی عبادت کے لیے کعبہ کی تعمیر کی۔

حضرت ابراہیمؑ کی پہلی بیوی سائرہ سے حضرت اسحٰقؑ
تھے، ان دونوں باپ بیٹوں نے مل کر "ماریا پہاڑ" پر ایک
چھوٹا سا عبادت خانہ بنایا تھا، اور اس میں بیٹھ کر عبادت
کیا کرتے تھے۔ حضرت اسحاقؑ کے لڑکے یعقوبؑ تھے، ان
کا دوسرا نام اسرائیل تھا، ان کے بارہ بیٹے تھے انھیں کی
اولاد کو یہود کہتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے ایک بیٹے حضرت یوسفؑ مصر کے
بادشاہ ہوئے تو اپنے والد اور گھر والوں کو مصر بلالیا۔ وہاں
یہ لوگ رہ بس گئے۔ کچھ عرصہ بعد زمانے کی گردش نے اس
خاندان کو بڑی بے چارگی اور بے بسی کی زندگی بسر کرنے
پر مجبور کر دیا، لیکن خدا نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ
ان کو اس مظلومی اور بے کسی سے نجات دلائی۔ اور یہ لوگ
"بیت المقدس" دوبارہ واپس آگئے۔ اور بنی اسرائیل کے
نام سے شہرت اور عزت حاصل کی۔

بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر سموئیلؑ نے ان کے بکھرے
ہوئے شیرازہ کو منظم اور پائیدار بنانے کی خاطر ایک لائق
اور دانشمند نوجوان حضرت داؤدؑ کو ان کا بادشاہ مقرر کیا،
حضرت داؤدؑ بڑے نیک پرہیزگار اور عبادت گزار تھے۔
حضرت ابراہیمؑ واسحاقؑ کے بنائے ہوئے "معبد" (عبادت گاہ)
کے کھنڈروں کو تلاش کر کے اسی جگہ "معبد ربانی" عمدہ
اور پختہ تعمیر کے لیے ایک لاکھ ٹیلنٹ سونا (ٹیلنٹ سوا من
کے قریب ہوتا تھا) دس لاکھ ٹیلنٹ چاندی اور بے حساب
لوہا، تانبہ اور پیتل جمع کیا تھا۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ ان
کے جانشین انھیں کے صاحب زادے حضرت سلیمانؑ
ہوئے، اور اپنی حکومت کے چوتھے سال "ہیکل سلیمانی"
کے نام سے (۹۷۵ ق م) اسی سرمایہ سے ایک "معبد"
(عبادت گاہ) کی تعمیر شروع کی، ایک لاکھ ۸۳ ہزار آدمی
روزانہ کام کرتے تھے۔ اسی طرح ساڑھے سات برس کی

[1] ایسی جگہ جہاں نہ پانی ہو نہ سبزہ۔

منت میں یہ "معبد" عبادت گاہ بن کر تیار ہوا۔

اس زمانے کی یہ سب سے خوبصورت، دل کش اور دل فریب عمارت تھی۔ یہ آل اسرائیل کی مرکزی عبادت گاہ تھی، یہ ہیکل ۴۲۴ سال تک باقی رہا، پھر مصر کا فرعون شیشنک کسی وجہ سے یہودیوں سے ناراض ہوا اور بیت المقدس پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ہیکل کو سخت نقصان پہنچا۔

۵۸۶ ق م میں بابل کے زبردست بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس پر یلغار کی اور ہیکل کو توڑ پھوڑ کے برباد کر دیا۔ لاکھوں یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ آل اسرائیل (یہودیوں) کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ اور حادثہ تھا، ان کے پیغمبر ہیکل کی بے حرمتی اور قوم کی ذلت و رسوائی پر نوحہ خوانی اور بیت المقدس کی تباہی پر ماتم کرتے تھے، اور یہود کے گناہ اور بداعمالی کی پاداش میں عذاب الٰہی سمجھتے تھے اور ہمیشہ انھیں ڈراتے رہتے تھے۔

شاید آل اسرائیل کی اس رسوائی اور ذلت پر ترس کھا کر شاہ ایران نے بابل پر حملہ کیا اسرائیلی قیدیوں کو رہائی دی، اور دوبارہ ہیکل کے تعمیر کی اجازت دی۔ ہیکل بن کر تیار ہوا لیکن اب اس میں پہلی جیسی خوبصورتی، دل کشی، دل فریبی اور نقش و نگار کہاں، وہ پہلی شان و شوکت اور آن بان کھو چکا تھا، اسرائیلی پیغمبروں کی نشانیاں تبرکات اور تحفے بھی بخت نصر کے حملے کی نذر ہو چکے تھے، تاہم یہ پانچ سو سال تک یہودیوں کی عظمت اور مرکزیت کا نشان بنا رہا۔

۲۰ ق م روم کے عظیم بادشاہ ہیرودس نے ہیکل سلیمانی کی پرانی اور ٹوٹی پھوٹی عمارت کو نئے سرے سے بنوانا شروع کیا، اور یہودیوں کی بڑی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ ہیکل بہت عمدہ، خوبصورت، مضبوط اور رشاندار سنگ مرمر اور رنگین شیشوں سے مزین و آراستہ کیا گیا۔

(باقی آئندہ)

حسان عتیق صدیقی

سرسید احمد خاں تاریخ کی روشنی میں

۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو سرسید احمد خان بمقام دہلی پیدا ہوئے۔

۱۸۳۸ء کو سرسید کے والد محترم سید متقی صاحب کا انتقال۔

۱۸۳۹ء کو سرسید احمد خاں آگرہ میں نائب منشی ہوئے۔

۱۸۴۰ء میں سرسید کی فارسی کی پہلی کتاب جام جم شائع ہوئی۔

۱۸۴۷ء کو سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید شائع کی۔

۱۸۵۸ء کو سرسید کی والدہ محترمہ کا بمقام میرٹھ انتقال ہوا۔

۱۸۵۹ء میں سرسید نے مراد آباد میں ایک مدرسہ قائم کیا۔

۱۸۶۴ء میں ایک اور مدرسہ غازی پور میں قائم کیا۔

۱۸۶۴ء میں ہی سرسید نے ایک سائنٹیفک سوسائٹی کا آغاز کیا۔

۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے ایک اخبار کا اجرا کیا۔

۱۸۶۹ء میں سرسید نے انگلستان کا سفر کیا اور ورنا کیولر یونی ورسٹی کی تجویز پارلمنٹ کو بھیجی۔

۱۸۷۰ء میں سرسید لندن کے ایک مشہور کلب اینتھم کے ممبر بنے۔

۱۸۷۰ء کو سرسید نے انگریزی میں ہندستان کی تعلیم پر ایک مختصر کتاب تحریر کی۔

۱۸۷۰ء ہی کو سرسید نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔

۱۸۷۲ء میں سرسید نے بنارس میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے اجرا کے لیے ایک اجلاس کیا

۱۸۷۵ء ۲۵ مئی کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) کا افتتاح کیا۔

۱۸۷۶ء میں سرسید کی بنارس میں پینشن ہوئی۔

۸ اور ۹ جنوری ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن آئے اور کالج و لائبریری کا آغاز ہوا۔

۱۸۷۸ء میں سرسید وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہوئے۔

۱۸۹۴ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کی میگزین کا الگ اجرا ہوا۔

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید احمد خاں کا علی گڑھ میں انتقال ہوا۔

۴/۵۸۳ سرسید نگر علی گڑھ

رفیق عابد (زاہدی) بمبئی

ایک بہت بلند حوصلہ اور قدر دان بادشاہ کے دربار میں بہت سے عالم، فاضل، عقل مند اور ہر طرح کے فن اور ہُنر جاننے والے رہا کرتے تھے۔ بادشاہ اُن کی بڑی قدر اور عزت کرتا تھا۔ بڑی بڑی تنخواہوں کے علاوہ انعام واکرام سے اُن کو نوازتا رہتا تھا۔ اور بڑی بڑی جائدادیں اور جاگیریں اُن کو دے رکھی تھیں۔ یہ ہُنرمند اور عالم لوگ بادشاہ کے بڑے خیر خواہ تھے۔ اور دل سے اُس کو دُعائیں دیتے تھے۔

یہ بادشاہ بڑا انصاف پسند اور عادل تھا۔ وہ مظلوموں اور غریبوں پر بڑا مہربان تھا۔ یتیموں، بے کسوں، محتاجوں اور بیواؤں کی دل کھول کر مدد کرتا، رعایا کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آتا تھا۔ اس لیے رعایا بھی اُس پر جان چھڑکتی تھی۔ چوروں، ڈاکوؤں، بدمعاشوں اور ظالموں پر کڑی نگاہ رکھتا اور اُن کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ اس لیے ملک میں ہر طرح امن وامان تھا۔ خوش حالی تھی۔ پولیس اور سرکاری ملازم رشوت کا نام ونشان بھی نہ جانتے تھے۔ کیوں کہ اُن کو اتنی اچھی تنخواہ ملتی کہ اُن کو رشوت لینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ رشوت دینا اور لینا دونوں بدترین جرم تھا۔ اِس کی بڑی سخت سزا مقرر تھی۔

بادشاہ ملک بھر کا دورہ کرتا اور شہر میں رات کو بھیس بدل کر اکثر گشت لگاتا تھا۔

ایسے بادشاہ کے دربار میں جہاں اور ہر طرح کے لوگ پل رہے تھے۔ ایک بڑا مشہور پہلوان بھی بادشاہ کے درباریوں میں تھا۔ جو بڑا بہادر، تلوار کا دھنی اور فن کشتی کا ماہر تھا۔ بڑا شہ زور تھا اور کشتی کے تین سو ساٹھ پیچ جانتا تھا۔ دُور دُور تک اُس کا شہرہ اور نام تھا۔ بڑے بڑے اکھاڑے اور پہلوان اُس کے سامنے کان پکڑتے۔ اپنا لنگر لنگوٹ کھول کر رکھ دیتے اور نام سُن کر تھرّاتے۔

یہ پہلوان بڑا نمازی، خدا ترس اور غریبوں کا دوست اور ہمدرد تھا۔ بادشاہ کی نگاہ میں اُس کی بڑی قدر اور عزت تھی۔ مال دار تھا۔ جتنی کی روٹی کھاتا ضرورت والوں کی ضرورتیں رفع کرتا۔ ورزش کرتا اور دن رات اللہ اللہ کرتا۔

یوں تو اُس کے بہت سے شاگرد تھے اور سب اپنے فن میں اُستاد بن چکے تھے۔ مگر ایک غریب لڑکے کو اُس نے بچپن سے پال پوس کر جوان کیا تھا اور اُس کو پہلوانی اور فن کشتی کا ماہر بنا دیا تھا۔ چوں کہ اِس کو دل وجان سے مانتا تھا اور پالا بھی تھا۔ اس لیے خوشی سے اُس نے اپنا بیٹا ہی سمجھ کر تین سو اُنسٹھ پیچ نوجوان کو سکھا دیے تھے۔ لیکن ایک یعنی تین سو ساٹھواں پیچ اُس نے نوجوان کے اصرار کے باوجود اُسے نہ بتایا اور ٹال گیا۔ کیوں کہ اُس نے اپنے اُستاد کی نصیحت یاد رکھی تھی۔

معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

"عقل مند اُستاد وہی ہے کہ ایک حربہ (ہتھیار، یہاں مُراد آخری پیچ سے ہے) کسی کو نہ بتائے۔ اپنے لیے بچار کھے۔ نہ جانے کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

لڑکا فن میں ماہر ہو چکا تھا۔ ڈیل ڈول کے اعتبار سے مست ہاتھی اور طاقت میں شیر بن چکا تھا۔ بڑا خوب صورت، دیو ہیکل، شیر ببر کی طرح بہادر اور پُھرتیلا۔ اُستاد کے اگلے پچھلے تمام شاگردوں میں سب سے ممتاز۔ دیکھتے ہی لوگ اُس کے سامنے کانپ جاتے اور کوئی اُس سے مقابلے کی جرأت نہیں کرتا۔ سب یہی کہتے:۔

"اُستاد کا اگر کوئی صحیح جانشین ہے تو بس یہی نوجوان ہے۔"

اِدھر اِس نوجوان کا یہ حال تھا کہ بادشاہ کے دربار میں اپنے اُستاد کی عزّت اور رُتبہ دوگنی رات چوگنی قدر و منزلت دیکھ دیکھ کر جلتا اور انگاروں پر لوٹتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُستاد کی زندگی میں ہی اُس کی جگہ اور اُس کا اعزاز لے کر عیش و مسرّت کی آزاد زندگی گزارے۔

عیش تو اُس کو اب بھی حاصل تھا مگر بے صبر اور جلد باز تھا۔ دوسرے یہ کہ اُسے اپنے تن و توش اور کس بل پر اِس قدر گھمنڈ ہو گیا تھا کہ اب وہ اپنے بوڑھے اُستاد کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا اور دل میں کہا کرتا:۔

"بلا سے بڈھے نے ایک پیچ ہم سے بچا لیا، تو اس سے کیا؟ طاقت کے سامنے سارے پیچ دھرے رہ جاتے ہیں۔ مضبوط پکڑ ہو تو جب تک کوئی دھرا ہو پیچ لگائے اُس وقت تک طاقت والا اُس کو پچھاڑ کر سینے پر بیٹھ چکا ہو گا۔ اُس کی جگہ لینے کے لیے اُس کی موت کا انتظار بے وقوفی

ہے۔ ہو سکتا ہے ابھی دس بیس سال زندہ رہے۔

سالانہ مقابلے میں ہر سال وہی اوّل آ کر اپنی گدّی سنبھال لیتا ہے۔ اُستاد بھی ہے اور محسن بھی ہے۔ تو اِس سے کیا؟ مقابلے میں کیا بُرائی ہے؟ جیت کر جو مستحق ہو گا وہی گدّی سنبھالے گا۔ رہا احسان کا بدلہ تو میں اُس کی جگہ لے کر اُس سے بہتر طور پر چُکا دوں گا۔ موقعے پر چُوک جانا بڑی ہی بے وقوفی ہے۔ مجھ کو رعایت مروّت میں پڑ کر نہ تو اپنا مستقبل خراب کرنا چاہیے نہ ہی اپنا دل مارنا چاہیے۔ ہمّتِ مرداں مددِ خدا۔"

چنانچہ پُرانے دستور کے مطابق سالانہ مقابلے کا دن قریب تھا۔ نوجوان پہلوان بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گزارش کی:۔

"عالی جاہ! اِس دفعہ اُستاد کے مقابلے میں کس کا نام ہے؟"

بادشاہ اپنے پہلوان کی خاطر سے نوجوان کے ساتھ شفقت سے پیش آیا کرتا تھا۔ اُس نے جواب دیا:۔

"ابھی تک تو کسی نے بھی اِس کی جرأت نہیں کی ہے شاید اِس سال بھی فنِ کشتی کا عام مظاہرہ ہی ہو کر رہ جائے اور تمھارے اُستاد پھر بلا مقابلہ اگلے سال کی گدّی سنبھال لیں۔"

نوجوان نے عرض کیا۔

"جان بخشی ہو تو گزارش کروں؟"

بادشاہ نے تعجب سے کہا "بولو!"

نوجوان نے کہا "حضور! عرصے سے اُستاد کا امتحان نہیں ہو سکا کہ اب بھی وہ واقعی اِس جگہ اور اِس اعزاز کے مستحق بھی رہ گئے ہیں یا نہیں۔ میں اُنھیں کا شاگرد ہوں اور وہ میرے مہربان، مربّی اور محسن بھی ہیں۔ اُن کی توہین مقصود نہیں لیکن اپنے فن اور اپنی قوت کا مظاہرہ بھی

کوئی جرم نہیں۔ مجھے دعوا تو نہیں مگر ایک پکڑ ہو ہی جائے
تاکہ اُستاد کے سر سے یہ الزام اُتر جائے کہ وہ ہر سال صرف
اعزازی طور پر محض آپ کی مہربانی سے اپنی گدّی سنبھال
لیتے ہیں ورنہ اور لوگ بھی اُن کی ٹکر کے بلکہ اُن سے
بڑھ چڑھ کر ہیں۔ دُنیا خالی نہیں۔ اور میرا بھی امتحان ہو
جائے کہ میں اُن کا صحیح جانشین بن سکوں گا کہ نہیں۔"

بادشاہ نے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے تعجب سے
پوچھا:۔

"تم اپنے اُستاد سے مقابلہ کرو گے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں؟ اگر آپ کا حکم ہو۔"

پھر اُس نے کہا۔

"حضور! اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ استاد پر یہ کھُل
جائے گا کہ اُنھوں نے مجھ پر جو محنت اور ریاضت کی
ہے وہ ضائع تو نہیں ہوئی اور مجھے بھی اپنی قدر و قیمت
معلوم ہو جائے تاکہ کسی اور سے ٹکرانے میں میں
گھبرا نہ جاؤں۔"

بادشاہ نے اپنی برہمی کو دبا کر کہا۔

"بہت اچھا، واقعی تم کو اپنی قدر و قیمت تو معلوم
ہو ہی جانا چاہیے تاکہ تمھارے اُستاد کے سر سے یہ
الزام اُتر جائے، اور تمھارا امتحان بھی ہو جائے۔ جاؤ
دفتر میں جا کر اپنا جوڑ لکھا دو اور مقابلے کی تیاری
کرو۔"

"عالی جاہ! میں تیار ہوں حکم کی تعمیل کی جائے گی۔"

یہ کہہ کر نوجوان چلا گیا۔

بادشاہ اپنی جگہ پر بیٹھا پیچ و تاب کھاتا اور
بڑبڑاتا رہا۔

"نالائق، پاجی، کمینہ، محسن کُش! اچھا میں تجھ کو اس
کی سزا دوں گا۔"

بادشاہ نے خلوت میں استاد کو بُلوایا اور سارا حال
بیان کیا۔

پہلوان کو ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ اور نہ اُس کی پیشانی
پر بَل پڑا۔ وہ بیٹھا مسکراتا رہا۔

بادشاہ نے کہا۔

"کیا خیال ہے اِس احسان فراموش کے بارے میں؟"

پہلوان بولا۔ "حضور! وہ ایک مَن چلا لڑکا ہے۔
اور اُس کا خیال قابل قدر ہے۔ اُس کو اِس کا موقع
ملنا ہی چاہیے۔ اِس میں کیا بُرائی ہے۔ مجھے کیا ڈر ہے
ہار گیا تو جب بھی اللہ اللہ کرنے کے لیے آپ کا سایہ
اور خدا کا گھر موجود ہے اور جیت گیا تب بھی اللہ اللہ
کرنے کے علاوہ میرے سامنے اور کیا کام ہے۔ اللہ
بہت بڑا اور غالب ہے جیتے جی آپ کی نمک حرامی
تو مجھ سے نہ ہوگی اور میں کوتاہی نہ کروں گا۔ اُس کا حوصلہ
نکل جانے دیجیے مجھے کوئی شکایت نہیں۔"

بادشاہ نے احترام اور قدر سے اِس عالی ظرف
پہلوان کو رخصت کر دیا۔

جس نے سُنا اُس نے اِس نوجوان پر لعنت بھیجی۔ استاد کے
دوسرے بے شمار شاگردوں نے اُسے قتل کر ڈالنے کا
ارادہ کر لیا۔ لیکن استاد نے سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر
خاموش کر دیا۔

بہر حال مقابلے کا دن آ ہی گیا۔ دُور دور سے عوام و
خواص اور بے شمار پہلوان استاد اور شاگرد کا مقابلہ
دیکھنے کو آ گئے۔ سرکاری حکام، ندیم و مصاحب، فوج
اور پولیس کے لوگ، درباری، اہالی۔ رُوسا اور شاہی
گھرانے کی خواتین سبھی اِس عجیب مقابلے کے تماشے
میں موجود تھے۔ حدِ نظر تک آدمیوں کا سیلاب پھیلا
تھا اور اکھاڑا اندر کا اکھاڑا بنا ہوا جگمگا رہا تھا۔

نوجوان پہلوان دُھوم دھام سے مست ہاتھی کی
طرح جھومتا جھامتا اکھاڑے میں اُترا تو جیسے اکھاڑے
کی زمین ہلنے لگی اور نوجوان کو اپنے پاؤں تلے سے پیچھے
ایسا ہی معلوم ہوا اِس لیے اُس کا بھروسا اور بھی بڑھ
گیا اور خم ٹھونکنے لگا۔ اس کی اِس حرکت پر اُستاد کے

دوسرے شاگرد خون کے گھونٹ پی کر مرنے مارنے پر کمر بستہ تھے۔ لیکن اُستاد کا حکم نہ پاکر دل ہی دل میں گالیاں دے کر کھولتے رہے۔

اُستاد نے دو رکعت نفل پڑھ کر دُعا مانگی۔ جا نماز تہ کر کے ایک شاگرد کے حوالے کی۔ اور تہمد باندھے اکھاڑے میں اُتر گئے۔ تہمد اُتار کر اکھاڑے سے باہر پھینک دیا۔ جس کو ایک شاگرد نے اُچک لیا اور چوم کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔

اُستاد نے اکھاڑے کی ایک مٹھی مٹی اُٹھا کر اپنے جسم پر ملی۔ تھوڑی سی کسرت کی اور بیچ اکھاڑے میں آگئے۔

اب استاد ایک مسکین بڈھے نہ رہ گئے تھے۔ کسرتی بدن سورج کی روشنی میں تانبے کے مانجھے ہوئے بھٹے کی طرح چمک رہا تھا اور رعب و جلال کی بارش ہو رہی تھی۔

ایک بار تو نوجوان پہلوان کا کلیجہ بھی دھڑک اُٹھا اور آنکھیں جھک گئیں۔ اُسے نہ جانے کیا لگا۔ اُس نے اس کو وہم سمجھ کر سر کو جھٹکا دیا اور زور آزمائی کے لیے قریب آگیا۔

اُستاد نے کہا۔

"ڈرو مت بیٹا!۔ میں بڈھا، تم نوجوان۔ مجھ سے ڈرنا کیسا؟ یہ عادت بڑی خراب ہے۔ فنِ کشتی میں اپنے آپ پر بھروسا سب سے بڑی چیز ہے۔ اب جس کام کا ارادہ کر لیا ہے اُس کو مستعدی سے انجام دو۔ کہاں ہاتھا پائی کرتا پھروں۔ تم مجھے اُٹھاؤ میں اپنی شکست مان لوں گا۔"

نوجوان نے اپنی طاقت کے زعم میں ترحلوہ جان کر اُستاد کے لنگوٹ میں دونوں ہاتھ ڈال دیے اور اپنے جسم کی ساری طاقت اکٹھی کر کے قوت سے اس پہاڑ کو اٹھانے میں عاجز ہو گیا اور پسینے میں شرابور ہو گیا۔ انگلیاں پھٹ پھٹ گئیں۔ سانس چڑھ گئی۔ نوجوان نے وقتاً فوقتاً خطرناک پیچوں سے بھی کام لیا مگر پہاڑ نہ اُوپر ایک انچ اُٹھا اور نہ نیچے گرا۔ بلکہ وہ تو زمین میں دھنستا جا رہا تھا اور کمر تک دھنستا چلا گیا۔

نوجوان پہلوان دُور کی منزل مارے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ روئیں روئیں سے پسینے کی دھاریں چل رہی تھیں اور انگلیوں سے خون کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

اُستاد نے پکار کر کہا۔

"پورا زور لگاؤ بیٹا! ابھی تمھارے جسم میں بہت جان ہے۔ ہمت نہ ہارو۔ اور اب ہوشیار رہو کر خود کو بھی سنبھالو اور بچاؤ!"

نوجوان نے اپنا آخری زور بھی لگا دیا اور ایک پیچ مارا۔ جس سے کمر کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ استاد اِس داؤ کو بچا تو گئے مگر اُسے شدید رنج پہنچا۔ شاگرد سے اِس بے رحمی کی اُسے اُمید نہ تھی۔

پہلوان نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔

ایک بجلی سی چمکی۔ کوئی چیز سر سے اُوپر گئی۔ گری تو اکھاڑے کی زمین ہل گئی۔ مست ہاتھی یعنی نوجوان پہلوان زمین پر چت بے ہوش پڑا تھا۔

استاد نے دستور کے مطابق ایک گھٹنا ایک منٹ کے لیے شاگرد کے سینے پر ضرور رکھ دیا۔ مگر دُور بیٹھ کر دیر تک منہ چھپا کر رو دیا۔ اکھاڑے سے نکل کر کپڑے پہنے اور مسجد کو چلا گیا۔ جن لوگوں نے اُسے مبارک باد پیش کی اُسے قبول نہ کیا۔

نوجوان ہوش میں آیا تو دیر تک آنکھیں شرم سے بند کیے رہا۔ اکھاڑے سے نکلا تو شاہی حکم نامہ ملا کہ دربار میں حاضر ہو۔

بادشاہ نے کہا۔

کمینے، پاجی! اگر تو جیت بھی جاتا تو میں اپنے ہاتھ سے تیری گردن مارتا۔ ہرگز زندہ نہ چھوڑتا۔ تو نے اپنی عاقبت اور دنیا دونوں ہی خراب کر ڈالی۔ اے روسیاہ! تو ہار گیا تو استاد کے گھر سے اپنے

کپڑے اور لتّے لے کر شام سے پہلے اس شہر سے نکل جا! جا، میں تیری جان بخشی کرتا ہوں۔ لیکن ایک ہفتے کے اندر میری سلطنت کی حدوں سے باہر ہو جانا۔ ورنہ ہفتہ بھر کے بعد اگر تو کہیں دیکھا گیا تو قتل کر دیا جائے گا۔ تیرے لیے یہی سزا کافی ہے کہ اب کوئی پہلوان تجھے منہ نہ لگائے گا اور نہ اپنے قریب پھٹکنے دے گا۔ جا، دُور ہو جا، میری نظروں سے بہت دُور۔ ورنہ مار ہنٹروں کے میں تیری کھال گرا دوں گا۔

وہ اپنے کپڑے لتّے لے کر سب کی نگاہوں سے بچتا بچاتا حیران و پریشان دُور، بہت دُور بھاگا جا رہا تھا۔ کہاں جا رہا تھا، یہ اس کو خود نہ معلوم تھا۔ اور لعنت ملامت تھی کہ اس کا پیچھا کر رہی تھی اور لوگ اس سے اس طرح کترا رہے تھے جیسے کوڑھی سے لوگ کترایا کرتے ہیں۔

اب وہ اپنی نظروں سے بھی گر گیا تھا۔
وہ بھی سوچتا۔

میں نے بدترین گناہ کیا ہے۔ میری سزا موت ہی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے اُستاد کی شفقت و محبت کو بھول بیٹھا۔ وہ جس نے مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا۔ فن سکھایا۔ اُن کے بعد تو اُن کا سب کچھ میرا ہی ہوتا۔ ناحق شیطان کے بہکانے میں آ کر اور لالچ میں پڑ کر احسانات کو بھول بیٹھا۔ اُستاد بہر حال اُستاد ہے۔ اُس نے تین سو ساٹھواں پیچ اسی دن کے لیے بچا رکھا تھا۔ اب میں کہاں جاؤں؟ میرا ٹھکانا کہاں ہے؟ دُور ہو جا، اے شیطان! اے کمینے نفس۔ اے ذلیل رُوح! اب تو نکل جا میرے اس لعنتی جسم سے۔

وہ بے ہوش ہو کر ایک جنگل میں گر پڑا۔
اس کے بعد نہ جانے اُس کا کیا حشر ہوا۔
(مرکزی خیال گلستانِ سعدی سے)

سید محمد حسن

ایک بے وقوف

ایک بے وقوف کو شادی کرنے کی بہت خواہش ہوئی ۔ لیکن اب تک اُسے کوئی نوکری نہیں ملی تھی ۔ پھر بھی وہ ماں سے شادی کی ہی فرمایش کرتا رہتا ۔ تنگ آکر ماں نے اس کی شادی کر دی ۔ اور اپنے بے وقوف بیٹا سے بولی ۔ "جا اب تو نوکری ڈھونڈ لا اور اپنا گھر سنبھال" وہ روز نوکری کی تلاش میں نکلتا مگر نا امید ہوکر ہی واپس لوٹتا ۔ ایک دن ماں غصہ میں بولی "جا آج نوکری ڈھونڈ کر آنا اور اگر نہ ملے تو مر جانا"

اُس دن بھی بیچارے کی کوشش رائیگاں گئی ۔ مجبور ہوکر مرنے کے ارادے سے وہ قبرستان کی طرف چل دیا ۔ قبرستان پہنچا تو دیکھا ایک قبر کھودی ہوئی تھی ۔ بے وقوف نے سوچا کہ چلو اب تو مرنا ہی ہے اور قبر بھی تیار ہے ۔ پھر یہ قبر کے اندر جاکر سو گیا ۔

ایک گانو کا راستہ قبرستان ہوکر جاتا تھا ۔ شدت کی گرمی پڑ رہی تھی ۔ ایک مسافر جس کا نام رمیش تھا سامان لے کر جارہا تھا دھوپ بہت سخت تھی ۔ بے وقوف کی قبر کے پاس ہی ایک درخت تھا ۔ رمیش کچھ دیر کے لیے اُس درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے بڑبڑانے لگا "اگر اس وقت کوئی آدمی ملتا تو اُسے کچھ پیسا دے کر سامان پہنچانے کو کہتا" بے وقوف نے قبر کے نیچے سے اُس کی بات سُن لی ۔ اور پھر یہ بھی بڑبڑایا :

"ہوں ۔ جب میں زندہ تھا تو کوئی نوکری نہیں دیتا تھا اور آج جب میں مر گیا ہوں تب نوکری ملتی ہے ۔ یہ دنیا بھی عجیب ہے"

رمیش نے بھی اُس کی آواز سن لی اور قبر کے نیچے دیکھ کر کہا :

"ارے تم تو ابھی دنیا ہی میں ہو ۔ تم تو زندہ ہو ۔ تم مرے نہیں"

بے وقوف بولا : "سچ ۔ میں زندہ ہوں"

رمیش : ہاں ہاں تم زندہ ہو ۔ آؤ ۔ اُٹھو ۔ رمیش نے بے وقوف کا ہاتھ پکڑ کر قبر کے اندر سے باہر نکالا ۔ بے وقوف بولا ۔ "لیکن میں ایک شرط پر آپ کا یہ سامان لے جاؤں گا ۔ جبکہ آپ مجھے نوکری دیں گے"

رمیش : ۔ ٹھیک ہے چلو میں تمھیں نوکری پر رکھ لوں گا"

پھر اس نے گھر تک سامان پہنچا دیا ۔ گھر میں رمیش کی ایک سوتیلی بڑھیا ماں تھی ۔ کچھ دن بعد یہ بڑھیا بیمار پڑ گئی ۔ رمیش ڈاکٹر کے پاس لے گیا ۔ ڈاکٹر نے پینے کے لیے ایک شیشی "سنکارا" دیا اور جسم پر مالش کرنے کے لیے ایک شیشی روغن احمر تیل دیا رمیش نے گھر آکر بے وقوف کو دونوں شیشیاں دکھائیں اور بتایا کہ "دوا پلانا اور یہ بدن پر مالش کر دینا" یہ بات سمجھا کر رمیش اپنے کام پر چلا گیا ۔ دونوں شیشیاں ایک جگہ رکھی تھیں ۔ بے وقوف سمجھ نہ سکا اور اس نے الٹا ہی کام کر دیا ۔ سنکارا سے جسم پر مالش کیا اور روغن احمر تیل پلا دیا ۔ میٹھا اس کی وجہ سے بدن پر مکھی بھنبھنانے لگی اور تیل اندر جانے سے بڑھیا کی حالت خراب ہوتی چلی گئی ۔ بے وقوف مکھی ہٹانے کے لیے پنکھا جھلتا رہا مگر مکھی اپنے ضد پر اڑی رہی ۔ بے وقوف نے پریشان ہوکر ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور بڑھیا کے اوپر پھینک دیا ۔ ہر جگہ سے خون نکلنے لگا اور بڑھیا مر گئی ۔

رات کو رمیش کام سے لوٹا تو یہ سب دیکھ کر حیران رہ گیا ۔

وارڈ نمبر ۱۴ رحمت نگر برن پور ۔ بردوان
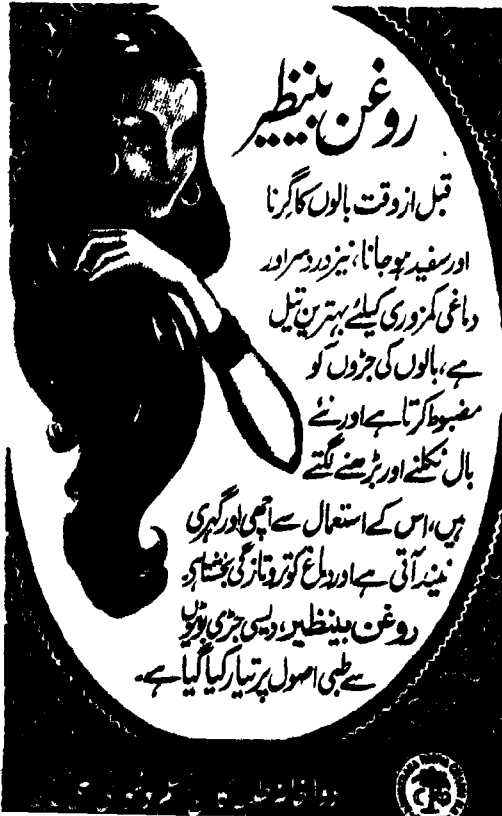
اور بے وقوف سے گھگھیا کر کہا "یہ تم نے کیا کیا؟

بے وقوف بولا: - حضور کچھ نہیں کیا صاحب -" دیکھیے نا میں نے ایک ہی بار میں ساری مکھی کو مار دیا - دیکھیے سبھی مکھیوں کا خون گر رہا ہے -

رمیش نے گھبرا کر کہا" ارے ظالم تو نے تو میری ماں کو مار دیا اب کیا ہوگا - اگر میں اس کی لاش کل نکالتا ہوں تو دنیا والے کہیں گے کہ اپنی سوتیلی ماں کو مار دیا - اس لیے ابھی ہی اسے شمشان گھاٹ لے جانا پڑے گا۔" پھر رمیش نے بے وقوف سے کہا -

"تم اسے کھٹیا میں لٹا کر شمشان گھاٹ لے آؤ - میں بازار سے کریا کرم کے لیے سامان لے کر وہاں پہنچ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر رمیش بازار کی طرف چل دیا - اور بے وقوف نے بڑھیا کی لاش کو کھٹیا میں لٹا کر اپنے سر پر اٹھا لیا - اور راستہ طے کرنے لگا - مگر بڑھیا کی لاش راستہ میں ہی گر گئی اور بے وقوف کو اس کا پتا بھی نہیں چلا - وہ خالی کھٹیا ہی لیے چلا جا رہا تھا - وہاں رمیش اس کا انتظار کر رہا تھا بے وقوف جب پہنچا تو رمیش نے کہا کہ" میں نے تمھیں ماں کو لانے کے لیے کہا تھا اور تم صرف کھٹیا لائے -"

بے وقوف بھی سوچنے لگا پھر بولا :

"نہیں صاحب میں تو اسے ساتھ لے کر چلا تھا - پتا نہیں وہ کہاں چلی گئی۔"

رمیش نے کہا : " دیکھو جا کر - تو نے کہیں راستہ میں گرا دیا ہوگا

بے وقوف دوڑتا ہوا اسی راستے پر دیکھتا جا رہا تھا - کہ اسے سفید ساڑی میں ملبوس ایک بڑھیا جاتی ہوئی نظر پڑی، تو اس نے اسے جلدی سے جا کر پکڑ لیا اور کہا -

" ارے ارے تو کہاں بھاگتی ہے ، خالی ہمیں پریشان کرتی ہے - تیرا بیٹا جلانے کے لیے بیٹھا ہے - اور تو بھاگتی جا رہی ہے۔" پھر وہ بڑھیا کو زبردستی رمیش کے پاس لے آیا -

رمیش بے وقوف کی اس حرکت پر جھنجھلا گیا اور غصہ میں پیر پٹک کر کہا -

"بھاگ جا یہاں سے - تیرے لیے وہی جگہ ٹھیک ہے - تو جہاں سویا ہوا تھا اسی قبر میں جا کر سو جا۔"

ایک بے وقوف پھر آس سے بے آس ہو گیا - ●

● کفیل — "تمھاری گھڑی میں کیا بجا ہے ؟"
جابر — "ساڑھے ......"
کفیل — "یہ کیا ؟ ساڑھے آٹھ یا ساڑھے نو ؟"
جابر — "یہ نہیں معلوم، کیونکہ گھڑی کی چھوٹی سوئی کہیں گر گئی ہے۔"

● صاحب — (نوکر سے) تم سائیکل چلانا جانتے ہو ؟
نوکر — جی ہاں !
صاحب — کار چلانا ؟
نوکر — جی ہاں !
صاحب — ہوائی جہاز چلانا ؟
نوکر — جی ہاں !
صاحب — جھوٹ بولنا جانتے ہو ؟
نوکر — اور ابھی تک میں کر ہی کیا رہا تھا !

● وکیل — (غصے میں) "مجھے تمھارے چہرے میں ایک بدمعاش نظر آتا ہے۔"
گواہ — (حیرت سے) "یہ آج ہی معلوم ہوا کہ میرا چہرہ آئینہ ہے۔"

● لڑکا — "ابا ! آپ نے کہا تھا کہ چھوٹوں کو مارنا نہ چاہیے۔"
باپ — "ہاں، کہا تو تھا۔"
لڑکا — "تو مہربانی کر کے مولوی صاحب کو بھی ہدایت کر دیجیے۔"

عطیہ صدیقی
D.33 ہاؤسنگ کالونی گونڈہ

● ڈرائیور — (مالک سے) گاڑی اب آگے نہیں بڑھ سکتی۔
مالک — کیوں ؟
ڈرائیور — پٹرول نہیں ہے۔
مالک — تو پیچھے ہی لے چلو۔

ابوبکر صدیقی
غازی پور۔ یوپی

● اے اٹھو ! یہاں گلی میں کیوں لیٹے ہو۔ معلوم نہیں آج کرفیو لگا ہے ؟
"معاف کر دیجیے حولدار صاحب غلطی ہو گئی۔"
"بکواس بند کرو چلو مرے ساتھ تھانے پر۔"
"جی اچھا۔ حولدار صاحب آپ یہ بیڑی سلگائیے جب تک میں اپنی چارپائی اندر رکھوں۔"
"ہاں ٹھیک ہے رکھ دو۔"
کھڑاک (دروازہ بند ہونے کی آواز)
"اے باہر نکلو۔"
"جی کیسے نکلوں باہر تو کرفیو لگا ہے۔"

شیبان احمد
درگا پور کٹیہار

● عدالت میں تین ملزم پیش ہوئے پہلے سے پوچھا گیا کہ تم نے کیا کیا تھا اس نے جواب دیا صاحب میں تالاب میں تربوز پھینک رہا تھا۔ دوسرے سے پوچھا گیا تم نے کیا کیا تھا اس نے گھبراتے ہوئے کہا صاحب میں بھی تالاب میں تربوز پھینک رہا تھا۔
تیسرے سے پوچھا کہ تم نے کیا کیا اس نے جواب دیا صاحب میں ہی وہ تربوز تھا جو یہ دونوں تالاب میں پھینک رہے تھے۔

ایس۔ ایس عباس رضوی

بد اچھا بدنام بُرا

یہ مثل مشہور ہے کہ بد اچھا اور بدنام بُرا اور واقعہ ہے بھی یہی کہ آج کل جتنے لوگ برائی کرتے ہیں۔ ان کو بُرا کہنے والا ایک بھی نہیں ملتا ہے حالانکہ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ دنیا کی جتنی برائیاں ہوسکتی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں لیکن کسی کی ہمّت و جرأت نہیں کہ اس سے کہہ دے کہ لوگ اسے بدمعاشوں میں گنتے ہیں۔ فوراً ہی جانی دشمن بن جائے گا۔ اسی ڈر سے کوئی اس کی طرف نظر بھی اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

برخلاف اس کے اگر کوئی غریب ہے اور کسی کے جھگڑے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا ہے اور اس گروپ سے الگ بھی ہے تو لوگ اپنے گروپ میں کر لینے کی کوشش کرتے ہیں نہیں آنے پر لوگ اسے بدنام کر دیتے ہیں۔ اسی لیے یہ مثل مشہور ہوگئی ہے کہ بد اچھا بدنام بُرا۔

اسی طرح سے سوتیلی ماں کا قصّہ مشہور ہے۔ سوتیلی ماں کیسی ہی ہمدرد اور ملنسار ہو کافی بچوں کی نگرانی و دیکھ بھال کرے لیکن پھر بھی سوتیلاپن اسی طریقے سے بدنام ہے۔ مثل مشہور ہے کہ فرحانہ سوتیلی ماں ہیں اور جب شکیل پانچ سال کا تھا تو اس کی امّی کا انتقال ہوگیا تھا۔ اور وہ برابر امّی کو تلاش کرتا پھرتا تھا ہزار لوگ اسے بہلاتے دلاسہ دیتے لیکن اسے صبر نہ ہوتا تب مجبوراً اس کے ابّو ایک دن سُرخ و سفید کپڑوں میں ملبوس ایک خوبصورت سی دلہن لے کر آئے۔ خوبصورتی کا چرچا اتنا تھا کہ ہر اک شخص اس پر ناز کرتا تھا۔

میں دلہن کو بڑی دل چسپی کے ساتھ دیکھتا رہا اور وہ بھی اس کو تک رہی تھیں حالانکہ میرے کپڑے میلے تھے معلوم ہوتا تھا کہ

کسی نے امی سے کہہ دیا تھا کہ میں ان ہی کا لڑکا ہوں اسی درمیان میں ابّا آئے اور انھوں نے مجھ کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا تو تم چاروں طرف اپنی امّی کو تلاش کیا کرتے تھے تو یہ تمھاری امی جو کہیں چلی گئیں تھیں پھر آگئیں۔ اتنا کہنے پر انھوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ امّی ہم کو بہت مانتی تھیں اور میں بھی ان کو خوب چاہتا تھا اور اب اتنا خیال رکھنے لگیں کہ کیا اپنی امّی اتنا خیال رکھتی ہوں گی۔

وہ برداشت کرتیں اور میں بھی کافی نخرے کیا کرتا تھا صرف فرق اتنا تھا کہ پیٹ سے پیدا نہیں کیا تھا۔ جب دھوپ کڑی ہوتی تھی تو امّی کمرے میں لٹا کر مجھے سوجایا کرتی تھیں۔ اور جب وہ سوجاتی تھیں تو میں موقع پاکر نکل بھاگتا تھا۔ اور جب میں باہر جاتا اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگتا تو ایک 'قابلہ' بوا تھیں جن کو لوگ زندہ اخبار کہا کرتے تھے انھوں نے مجھے دیکھا اور کہہ دیا کہ ہائے ہائے بن ماں کا بچہ کوئی دیکھنے والا موجود نہیں ہے اور آج وہ مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ مجھے بلاتیں اور بہت دُلار کرتیں پیار کرتیں اور میرے منھ پر کہتی کہ آج ماں ہوتی تو اس طرح دوپہر کو مارا مارا تو نہ پھرتا۔ میں نے کہا ارے میری ماں تو ہیں۔ بہت اچھی ماں ہیں۔ وہ تو ہم کو کبھی مارتی بھی نہیں ہیں اور بہت دلار کرتی ہیں۔ پھر وہ کہتی ارے کیا دلار کریں گی اپنی ماں کا مقابلہ کیا ہوگا۔ پھر بھی تو سوتیلی ہی ماں ہیں نا۔ نہیں نہیں چچی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میری ماں بہت اچھی ہیں۔ مجھے بہلاتی ہیں۔ کھلاتی ہیں اچھی اچھی کہانیاں

کہتی ہیں ۔

اب ہماری چچی صاحبہ کہتیں کہ وہ تمھاری خدمت کریں گی کہ اپنی موج میں رہیں گی۔ اسے پھر بھی لونڈی لونڈی ہیں انھیں اپنے آگے کسی کے بچے سے کیا۔ میں نے کہا اچھا چچی اگر وہ نہ مانیں گی تو ابا تو ہمارے وہی ہیں وہ ہم کو کیسے چھوڑ دیں گے۔ اس کا چچی نے جواب دیا کہ سوتیلی ماں بیٹے کی طرف سے شکوہ و شکایت کرکے باپ کی نظر کو پھرا دیتی ہے۔ اب یہ سننا تھا کہ میری نگاہ میں سوتیلی ماں مثل چڑیل کی مانند نظر آنے لگی ۔

اب کیا تھا اب جب کبھی امی میرا دلار کرتیں میں کہہ دیتا کہ چلئے یہ جھوٹا دلار کیسا آپ میری امی کہاں سے آئیں میری امی جو تھیں وہ چلی گئیں رخصت ہوگئیں وہ اب کیسے آسکتی ہیں۔ اس طرح کی مختلف بدتمیزیاں کر بیٹھتا اور وہ شب کی تاریکی میں ابا سے شکایت کیا کرتیں اور وہ ٹال جاتے ۔

ایک روز میں نے شکایت کرتے ہوئے سن لیا اب کیا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلے بڑھتے ہی چلے گئے اور امی کی صورت مجھے ڈراونی جیسی معلوم ہوا کرتی تھی رفتہ رفتہ یہ آگ بڑھتی گئی اور میں گھر سے دور ہوتا گیا۔ امی برابر ابا سے شکایت کرکے میری سزا کرا دیا کرتی تھیں اب چند محلے والے کہتے کہ سچ ہے، سوتیلی ماں آئے گی تو اپنے راج رچائے گی کہ وہ کسی کی خدمت کرے گی ۔ ایک دن میرے باپ نے کہا کہ بیٹے پہلے تم بہت اچھے تھے اور اب میں تمھاری شکایت سن رہا ہوں کہو کیا بات ہے۔

میں نے چھوٹتے منہ جواب دیا کہ میری یہ سوتیلی ماں ہیں اپنی ہوتی تو وہ میری برائیوں پر پردہ ڈال دیتی اور یہ ایسی ہیں کہ میری ذرا سی غلطی ہوگی تو آپ کو بڑھا کر بتلائیں گی بتایئے ابا ہم دونوں میں کتنا فرق ہے۔ ابا نے جواب دیا، "لیکن یہ تم کو بہت چاہتی ہیں مانتی ہیں پھر بھی تم ان کو برا بھلا منہ پر تو کہتے ہی ہو اور نہیں تو محلہ پاس پڑوس سب سے کہتے پھرتے ہو۔ تم بھاگو یہاں سے نکل جاؤ میں تمھاری صورت نہیں دیکھ سکتا"۔

اب کیا تھا مجھے ایک اچھا خاصا بہانہ مل گیا اس وقت تو نہیں دوسرے وقت گھر سے سچ مچ نکل گیا در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ ایک شخص نے مجھے پال پوس لیا اور بڑے ہی ناز و نعم سے پالا پڑھایا لکھایا اور نوکروں سے اتنی خدمت کی کہ میں جواب میں بھی سوچ نہیں سکتا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی میں کئی ایک سال تک رُکا رہا اور باپ ہیں کہ پریشان ہیں۔ انھوں نے کئی ایک تصویریں اخبار میں دیں اور لکھا کہ جو شخص میرے بیٹے کو ہم تک پہنچا دے گا۔ میں فرسٹ کلاس آمد و رفت کرایہ کے ساتھ کافی انعام دے کر رخصت کروں گا۔ میں نے اخبار میں مضمون پڑھ لیا تھا اور اپنی تصویر اخبار سے کاٹ کر رکھ لی تھی یہ تصویر آج سے دس برس قبل کی تھی ۔ غرض کہ رفتہ رفتہ لوگوں نے نوکری کی کوشش کی اور اب میں ملازم بھی ہوگیا ۔ لیکن میرا رجحان اسمول انڈسٹریز کی طرف تھا۔ میں نے کہا چنانچہ حسب منشا صابن بنانے کا کارخانہ کھولا اور میں مستعدی سے کام کرنے لگا ۔ اب پیروں پر کھڑا ہوگیا تھا خیال یہ ہوا کہ واپس جاؤں اور اپنے ماں باپ کو دکھلا دوں لیکن پھر بھی نجانے کیوں مجھے اس خیال سے وحشت ہوتی تھی۔ انسان چند لمحوں کے لئے سب کچھ بھول جاتا ہے یہاں میں اپنی اس انجانی خلش کو مٹاتا تھا۔ جس سے میں خود بے خبر تھا۔

ایک دن میں نے موجودہ عزیز قریب لوگوں سے اجازت لی جب ان لوگوں نے کہا کہ میں بھی ساتھ چلوں گا اور ساتھ ہی واپس آؤں گا لیکن تم کو تنہا ہرگز ہرگز نہ چھوڑوں گا غرض کہ رات مشورے ہوئے اور سامان سفر بندھا اور ہم لوگ چل پڑے مگر افسوس کہ باپ اندھے ہوچکے تھے میری آواز بدل چکی تھی انھوں نے مجھے نہ پہچانا لیکن امی نے پہچان لیا اور ابو سے کہا ارے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم لوگوں کا بیٹا ہم لوگوں سے ملا خوب گلے مل کر سب کے سب روئے اور سبھی لوگوں کی رائے ہوئی کہ ہم سبھی لوگ فیکٹری کے قریب رہیں۔ اور یکجا رہیں یہ وقت باپ کے آرام کا تھا۔ ہر طرح سہولت دی جانے گی ۔

ایک عقلمند انسان

ایک بوڑھا کسان تھا۔ وہ بہت سخت بیمار ہو گیا۔ وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کسان کے لڑکے کاہل تھے۔ بوڑھے کو یہ خوف تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے کچھ نہیں کریں گے۔ اس نے اپنے باغ میں اپنی دولت گاڑ رکھی تھی۔ بوڑھا آدمی اسی رات مر گیا۔ اس کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد لڑکوں نے تمام باغ کو کھود ڈالا، لیکن ان لوگوں نے باغ میں کہیں بھی کوئی دولت نہیں پائی۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ ان کے باپ نے جھوٹ کہا تھا۔ ان کو بہت مایوسی ہوئی۔ چونکہ باغ کھود ڈالا گیا تھا، ان لوگوں نے پھل کے درخت اس باغ میں لگائے۔ وقت پر درخت بڑھے اور ان میں بہت زیادہ پھل آئے۔ پیداوار گزشتہ سالوں سے کئی گنا زیادہ ہوئی۔ ان کو بہت روپے ملے۔ لڑکوں نے اپنے درمیان روپیا تقسیم کر لیا اب ان لوگوں نے باپ کے کہنے کا مطلب سمجھا۔ ان لوگوں نے جان لیا کہ محنت ہی دولت ہے۔ ان لوگوں نے محنت کی قیمت جانی۔ انھوں نے اپنے باپ کی عقلمندی پر اس کی تعریف کی۔

شاہد علی خاں
مرزا غالب کالج۔ گیا

سچی کہانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ بنی اسرائیل میں تین آدمی تھے۔ ایک کوڑھی، دوسرا گنجا، تیسرا اندھا۔ خداوند تعالیٰ نے ان کو آزمانا چاہا اور ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا۔ پہلے وہ کوڑھی کے پاس آیا اور پوچھا "تجھ کو کیا چیز پیاری ہے؟" اس نے کہا "مجھے اچھی رنگت اور خوبصورت کھال مل جائے اور یہ بلا جاتی رہے جس سے لوگ مجھ کو اپنے پاس بیٹھنے نہیں دیتے اور گھن کرتے ہیں۔" اس فرشتے نے اپنا ہاتھ اس کے بدن پر پھیر دیا۔ وہ اسی وقت اچھا ہو گیا اور اچھی کھال اور خوبصورت رنگت نکل آئی۔ پھر پوچھا "تجھ کو کون سے مال سے زیادہ رغبت ہے؟" اس نے کہا "اونٹ سے" پس ایک گابھن اونٹنی بھی اس کو دے دی اور کہا "اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے گا۔" پھر گنجے کے پاس آیا اور پوچھا "تجھ کو کون سی چیز پیاری ہے؟" کہا "میرے بال اچھے نکل آئیں اور یہ بلا مجھ سے جاتی رہے لوگ جس سے گھن کرتے ہیں۔" فرشتے نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر پھیر دیا وہ فوراً اچھا ہو گیا اور اچھے بال نکل آئے۔ پھر پوچھا "تم کو کون سا مال پسند ہے؟" اس نے کہا "گائے" پس اس کو ایک گابھن گائے دے دی اور کہا "اللہ اس میں برکت دے۔" پھر اندھے کے پاس آیا۔ اور پوچھا "تجھ کو کیا چیز چاہیے؟" اس نے کہا "اللہ تعالیٰ میری نگاہ درست کر دے کہ سب آدمیوں کو دیکھوں۔" فرشتے نے آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نگاہ درست کر دی۔

پھر پوچھا "تجھ کو کون سا مال پیارا ہے؟" اس نے کہا
بکری پس اس کو ایک گابھن بکری دے دی۔ تینوں
کے جانوروں نے بچے دیے۔ تھوڑے دنوں میں اس
کے اونٹوں سے، اس کی گایوں اور اس کی بکریوں سے
جنگل بھر گیا۔ پھر وہ فرشتہ خدا کے حکم سے اسی پہلی صورت
میں کوڑھی کے پاس آیا اور کہا "میں ایک مسکین آدمی ہوں
میرے سفر کا سب سامان چک گیا۔ آج میرے پہنچنے کا کوئی
وسیلہ نہیں سوائے خدا کے اور یا پھر تیرے۔ میں اللہ کے
نام پر جس نے تجھے اچھی رنگت اور عمدہ کھال عنایت فرمائی
تجھ سے ایک اونٹ مانگتا ہوں تاکہ اس پر سوار ہو کر
اپنے گھر پہنچ جاؤں۔" وہ بولا "یہاں سے چل دُور ہو مجھے
اور بہت سے قرض ادا کرنے ہیں۔ تیرے دینے کی اس
میں گنجائش نہیں۔" فرشتے نے کہا "شاید تجھ کو میں پہچانتا
ہوں کیا تو کوڑھی نہیں تھا کہ لوگ تجھ سے گھن کرتے
تھے اور کیا تو مفلس نہیں تھا پھر تجھ کو خدا نے اس قدر
مال عنایت فرمایا۔" اس نے کہا "واہ کیا خوب یہ مال تو
میری کئی پشتوں سے باپ دادا کے وقت سے چلا آتا ہے۔"
فرشتے نے کہا "اگر تو جھوٹا ہو تو خدا تجھ کو پھر ویسا ہی
کر دے جیسا تو پہلے تھا۔" پھر گنجے کے پاس اسی پہلی صورت
میں آیا اور اسی طرح سے اس سے بھی سوال کیا اور اس
نے بھی ویسا ہی جواب دیا۔ فرشتے نے کہا "اگر تو جھوٹا ہو
تو پھر خدا تجھ کو ویسا ہی کر دے جیسا پہلے تھا۔" پھر اندھے
کے پاس اسی پہلی صورت میں آیا اور کہا "میں مسافر ہوں،
بے سامان ہو گیا ہوں، آج بجز خدا کے اور پھر تیرے
کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ میں اس کے نام پر جس نے دوبارہ
تجھ کو نگاہ بخشی تجھ سے ایک بکری مانگتا ہوں کہ اس سے
اپنی کارروائی کر کے سفر پورا کروں۔" اس نے کہا "بے شک
میں اندھا تھا خدا تعالیٰ نے محض اپنی رحمت سے مجھے نگاہ
بخشی۔ جتنی بکریاں تیرا جی چاہے لے جا اور جتنی چاہے چھوڑ
جا۔ خدا کی قسم کسی چیز سے تجھ کو منع نہیں کروں گا۔" فرشتے
نے کہا "تو اپنا مال اپنے پاس رکھ مجھ کو کچھ نہیں چاہیے۔ فقط
تم تینوں کی آزمائش منظور تھی سو ہو چکی خدا تجھ سے راضی
اور ان دونوں سے ناراض ہوا۔ خدا کا کرنا کہ ان دونوں
کو ناشکری کا بدلہ ملا کہ تمام نعمت چھن گئی اور جیسے
تھے ویسے ہی ہو گئے۔ خدا ان سے ناراض ہوا۔ دُنیا
اور آخرت دونوں میں نامراد رہے اور اس اندھے شخص
کو اللہ کا شکر بجا لانے کی وجہ سے اللہ کی نعمت حاصل
رہی۔ خدا اس سے خوش ہوا اور دنیا اور آخرت میں
شاد و بامراد ہوا۔

محمد شکیل راوت
مکان نمبر ۳۹۶ محلہ کچہ کوٹ، مالیرکوٹلہ

سنجیدہ پاگل

پاگل خانے کا ڈاکٹر نئے داخل ہونے والے مریضوں
کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک پاگل اسے سنجیدہ اور ہوش مند
نظر آیا۔ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔
"تمہیں یہاں کس لیے لایا گیا؟ تم تو بھلے چنگے دکھائی
دیتے ہو۔" پاگل نہایت سنجیدگی سے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب
میں بالکل صحت مند ہوں۔ دراصل ہوا یہ کہ میں نے ایک
عورت کے ساتھ شادی کر لی جس کی ایک جوان لڑکی
اٹھارہ سال کی تھی۔ وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ میرے
گھر میں رہنے لگی۔ اتفاق سے وہ لڑکی میرے باپ کو
پسند آ گئی اور اس سے نکاح کر لیا اس دن سے میری
بیوی میرے باپ کی ساس بن گئی۔ کچھ عرصے بعد میری
بیوی کی لڑکی کو جو میرے باپ کی بیوی تھی بچہ ہوا۔
یہ بچہ رشتے کے لحاظ سے میرا بھائی ہوا کیوں کہ وہ
میرے باپ کا لڑکا تھا۔ مگر ادھر وہ میری بیوی کا نواسہ
بھی ہوا گویا میں اپنے بھائی کا نانا بھی بن گیا۔ کچھ دن
بعد میری بیوی کو بھی بچہ ہوا اس دن سے میرے باپ
کی بیوی اپنے سوتیلے بھائی کی بہن ہو گئی مگر وہ اس
کی دادی بھی بن گئی۔ کیوں کہ وہ اس کے شوہر یعنی میرے
باپ کا پوتا تھا۔ اسی طرح میرا بچہ اپنی دادی کا بھائی

بن گیا۔ اب ذرا سوچیے ڈاکٹر صاحب میری سوتیلی ماں یعنی میری بیوی کی لڑکی میرے بیٹے کی بہن بھی ہوگئی تو میرا بیٹا میرا ماموں بن گیا اور میں اُس کا بھانجا جب کہ میں خود اپنا نانا بھی ہوں اور میرے باپ کا لڑکا جو میری بیوی کی لڑکی کا بیٹا ہے وہ میرا بھائی ہے اور میرا نواسہ بھی ......" اتنا سننے کے بعد ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا اور چیخ اٹھا "بس کرو خدا کے لیے بس کرو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا"

شاہد رفیق
صفدر گنج۔ رام پور

سچی دوستی

ایک کوّے اور ہرن میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں ایک ہی جنگل میں رہا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ہرن کو خوب اچھی اچھی گھاس کھانے کو ملتی تھی۔ اس سے وہ کافی موٹا تازہ ہو گیا تھا۔ ایک دن ایک گیدڑ نے ہرن کو دیکھ کر اپنے دل میں سوچا "یہ تو بڑا موٹا تازہ ہے اگر اس کا گوشت کھانے کو مل جائے تو کیا ہی اچھا ہو"

اب گیدڑ اس کے مارنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اس نے ہرن سے دوستی کرنے کی ٹھانی اور ہرن کے پاس جاکر کہنے لگا۔

" بھائی! میں تمھارا دوست بننا چاہتا ہوں۔ میں تمھارے لیے ہری ہری گھاس ڈھونڈ لاؤں گا"

ہرن سیدھا جانور تھا۔ اس نے مکّار گیدڑ کا کہنا مان لیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر کوّے کے پاس آیا۔ کوّے نے کہا۔

" بھائی ہرن، تم نے اس گیدڑ کو بے سمجھے بوجھے اتنی جلدی دوست کیوں بنایا۔ یہ تو دھوکے باز جانور ہے"

ہرن نے اس کی بات کا کچھ خیال نہ کیا اور گیدڑ کو اپنا دوست بنا لیا۔

گیدڑ نے جنگل کی دوسری طرف چنے کے ہرے بھرے کھیت دیکھے تھے۔ وہ ہر روز ہرن کو وہیں لے جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر کسان نے اپنے کھیت میں جال بچھا دیا۔

دوسرے دن وہ دونوں پھر اسی کھیت میں گئے۔ ہرن آگے تھا۔ کھیت میں گھستے ہی وہ جال میں پھنس گیا۔ بیچارہ جتنا اُچھلتا کودتا تھا اتنا ہی اور پھنستا جاتا تھا۔ اس نے گیدڑ سے کہا "بھائی! اب کس دن کام آؤ گے؟ ذرا جلدی سے میرا جال کاٹ کر مجھے چھڑا لو" گیدڑ نے ہنس کر جواب دیا۔ "گھبراؤ نہیں۔ آج تو میں نے اتوار ہونے کی وجہ سے برت رکھا ہے کل میں آپ کو چھڑا لوں گا"۔ اتنا کہہ کر گیدڑ ایک پیڑ کی آڑ میں جا چھپا۔

جب ہرن دیر تک گھر نہ آیا تو کوّا سوچنے لگا کہ آج ضرور دال میں کالا ہے۔ وہ فوراً اُڑتا ہوا اسی کھیت کے پاس جا پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ہرن جال میں پھنسا ہوا ہے اور گیدڑ کا پتا بھی نہیں ہے۔ ہرن کوّے کو دیکھ کر پچھتانے لگا کہ سچے دوست کا کہنا نہ ماننے کا پھل یہی ہے۔ ہرن نے کہا کہ گیدڑ بھی میرے گوشت کی فکر میں یہیں کہیں چھپا ہوگا۔ اتنے میں کسان بھی آتا ہوا دکھائی دیا۔ کوّے نے ہرن سے کہا۔ " تم مردہ بن جاؤ۔ جب کسان تمھارے پاس آئے تو تم سانس مت لو۔ تب کسان سمجھے گا کہ ہرن مرگیا ہے"

ہرن نے ویسا ہی کیا۔ کسان نے اسے مردہ جان کر جال چھڑا لیا۔ جب کسان تھوڑی دور چلا گیا۔ کوّے نے کائیں کائیں کی اور ہرن اٹھ کر

بھاگ گیا۔ کسان نے جل کر ایک ڈنڈا اس کے کھینچ مارا۔ وہ ڈنڈا گیدڑ کے پیٹ میں جا لگا اور وہ مر گیا۔
سچ ہے سچے دوست ہی مصیبت میں کام آتے ہیں۔

ایم۔ امتیاز شبنم
۱۰۰۳ نئی گلی، وانمباڑی ۱

اپریل فول

رحیم میاں اسکول کے باہر کھڑے ہوئے چاٹ پکوڑی کھا رہے تھے کہ اسکول کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے جلدی جلدی چاٹ ختم کی اور اسکول میں داخل ہو گئے۔

رحیم میاں یہی کوئی آٹھ نو سال کے تھے اور پانچویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ وہ کلاس میں گئے اور اپنی سیٹ پر اپنے ساتھی عرفان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میڈم حاضری لے رہی تھیں۔ عرفان دھیرے سے پھسپھسا کر بولا۔

"ارے اقبال تمہارے چہرے پر لال نشان پڑے ہیں جاؤ صاف کر آؤ۔"

"ارے یہ تو میں نے میڈم کو اپریل فول بنانے کے لیے جان بوجھ کر لگائے ہیں۔" رحیم میاں بولے۔ ان کی باتوں سے کلاس میں شور ہو رہا تھا۔ میڈم نے ٹوکا۔ "رحیم کھڑے ہو جاؤ۔ جب دیکھو بولتے رہتے ہو۔"

اقبال ایک دم گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ میڈم بولیں "میں کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ حاضری لیتے وقت کوئی بات نہ کرے مگر تم مانتے ہی نہیں"۔ اتنے میں ان کی نظر رحیم کے چہرے پر پڑی وہ بولیں۔ "ارے یہ لال نشان کیسے ہیں تمہارے چہرے پر۔"

رحیم میاں نے پہلے ہی کوئی بہانا سوچ رکھا تھا۔ وہ رونی صورت بنا کر بولے۔ "شاید مجھے وہی بیماری ہو گئی ہے۔" "کون سی بیماری"۔ میڈم نے پوچھا۔

"جو پچھلے سال میرے چھوٹے بھائی کو ہوئی تھی۔" رحیم میاں بولے۔ "کیا نام ہے اس بیماری کا؟" میڈم نے پوچھا۔ اب تو رحیم میاں گھبرا گئے۔ کیوں کہ ان کو اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ "شاید اس کو چیچک کہتے ہیں، رحیم میاں بولے۔ ساری کلاس ہنس پڑی۔ "چپ رہو۔" میڈم نے سب کو ڈانٹا "تمھیں پتا نہیں۔ وہ بے چارہ بیمار ہے اور تم ہنس رہے ہو۔" سب خاموش ہو گئے۔ میڈم نے رحیم سے پوچھا "کیا تمھیں تکلیف بھی ہوتی ہے؟" "جی ہاں، بہت زور کی۔" وہ بولے میرے بھائی کے چہرے پر ایسے ہی نشان پڑے تھے پھر وہ سارے جسم میں پھیل گئے۔ ان سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔" یہ سن کر میڈم بہت پریشان ہوئیں۔ پھر تو فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔ "تم ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر میڈم باہر چلی گئیں۔

"رحیم صاحب ابھی ڈاکٹر صاحب آئیں گے اور سوئی لگائیں گے اب چکھو مزہ۔" عرفان نے رحیم سے کہا جو بہت پریشان تھا۔ اب رحیم نے سوچا کہ سب سے بہتر راستہ یہ ہے کہ وہ فوراً گھر پہنچ جائیں۔ انھوں نے بستہ اٹھایا اور کندھے پر لٹکا کر باہر جانے لگے۔ اتنے میں میڈم اندر آ گئیں اور بولیں "ارے کہاں جا رہے ہو؟"

"بہت زور کا درد ہو رہا ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔" رحیم میاں بڑی درد بھری آواز میں بولے۔ "میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے۔ بس وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔ تم بیٹھ جاؤ۔" میڈم بولیں۔ "مگر میں اپنا علاج صرف ڈاکٹر گھوش ہی سے کراتا ہوں۔" "گھبراؤ نہیں میں نے ڈاکٹر گھوش ہی کو بلایا ہے۔"

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے۔ انھوں نے رحیم کی نبض دیکھی۔ اور منہ میں تھرما میٹر لگایا۔ پیٹ کو دبا کر دیکھا۔ پھر دل کی دھڑکن کو سننے والا

آلہ لگا کر دیکھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سوچ کر کہا۔" بیماری بڑی خطرناک ہے میں دوا لکھے دیتا ہوں۔ جلدی سے منگا کر ایک خوراک پی لو۔" ڈاکٹر صاحب نے ایک پرچی پر کچھ لکھا اور اپنا سب سامان بیگ میں رکھ کر واپس چلے گئے۔ میڈم نے کہا:" پرچی نکال کر پڑھو کیا لکھا ہے۔ رحیم میاں نے پرچی نکالی اور پڑھا:" چاٹ پکوڑی کھانے سے صحت خراب ہوتی ہے۔ غسل خانے میں جاکر پانی سے منھ صاف کریے۔"
یہ پڑھ کر رحیم بہت شرمایا۔ میڈم بولیں:" ارے اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ آج پہلی اپریل ہے۔ تم نے سوچا کہ چلو میڈم کو بے وقوف بنائیں۔ مگر مجھے پہلے ہی سب کچھ پتا چل گیا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟"
اس طرح رحیم اپنے بنائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گئے تھے۔

سید محمد خالد
نیو کریم گنج۔ گیا۔

غریب وزیر ظفر

بہت دنوں کی بات ہے، ایک گانؤ میں ایک آدمی رہتا تھا جس کا نام ظفر تھا۔ جو بہت ہی غریب تھا۔ ظفر کے پاس صرف رہنے کے لیے مکان، ایک گائے اور ایک آم کا درخت تھا۔ گھر میں صرف ظفر کی بیوی اور اس کا اکلوتا بیٹا رہتا تھا۔ ظفر صرف مزدوری کر کے پیٹ پالتا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے ظفر کی آمدنی ہو لیکن ظفر برابر ہی نیک کاموں میں حصّہ لیتا۔ ظفر کو دن بھر کی جو مزدوری ملتی اسی سے اپنا اور اپنے بیوی بچّوں کا پیٹ پالتا۔ ظفر کے گانؤ کے لوگ بڑے ہی ظالم اور بے رحم تھے۔ ایک روز ظفر کو کہیں مزدوری نہ ملی۔ ظفر مایوس گھر واپس چلا آیا۔ دوسرے روز بھی ظفر کو کہیں مزدوری نہ ملی۔ بڑا بھوک سے تڑپنے لگا۔ ظفر نے ارادہ کیا کہ گانؤ والوں سے قرض لے کر شاید آج کا کھانا بھر کو مل جائے۔

ہوسکتا ہے رحم آجائے۔ پھر ظفر کو خیال آیا کہنا بیکار ہے۔ ان کو رحم نہیں آئے گا۔ تیسرے روز ظفر مزدوری کے لیے پھر قسمت آزمانے نکلا۔ ظفر کو غلّے کے ایک بیوپاری نے غلّے کا بورا اٹھانے کے لیے نوکر رکھ لیا اور بورا اٹھا کر رکھنے کو کہا۔ جیسے ہی ظفر بورا لے کر دو قدم چلا زمین پر گر پڑا۔ تین دن کی بھوک نے ظفر کو چور چور کر دیا۔ لوگ ہنسنے لگے۔ ظفر مایوس ہو کر گھر چلا آیا اور ایک بار پھر ہمت کرتا ہے کہ ہوسکتا ہے گانؤ والوں کو رحم آجائے اور کچھ قرض مل جائے۔ ظفر نے جاکر گانؤ والوں سے قرض مانگا۔ گانؤ والے ہنسنے لگے اور ظفر کا مذاق اُڑانے لگے۔ خدا پر بھروسہ رکھ کر واپس ظفر گھر چلا آیا۔ گھر آکر ظفر نے بچے اور بیوی کو تسلی دی۔ تب ہی ظفر کو خیال آیا۔ وہ گانؤ کے ہی ایک آدمی کے پاس گیا اپنی گائے کو گروی رکھنے کے لیے۔ اس نے اس شرط پر گائے کو گروی رکھ لیا کہ اگر گائے مرجائے تو روپیا ہم وصول کرلیں گے۔ ظفر مجبور تھا۔ اس نے یہ بھی قبول کر لیا اور گائے کو گروی رکھ کر سو روپے لے کر روتا ہوا گھر چلا آیا کیوں کہ وہ گائے ہی اس کے والد کی نشانی تھی۔ مرتے وقت والد نے گائے کو دے کر کہا تھا:" اس کو بہت سنبھال کر رکھنا۔" ظفر کو گائے چھوڑتے ہوئے کافی صدمہ ہوا۔ ظفر کے گھر ایک صاحب چندہ لینے پہنچ گئے۔ ظفر نے انھیں روپیوں میں سے کچھ روپیا چندہ دے دیا۔ وہ شروع سے ہی نیک کاموں میں حصہ لیتا۔ گانؤ والوں کو یہ بری لگی۔ وہ سب کے سب ہنسنے لگے اور کہنے لگے۔ "کھانے کا ٹھیک نہیں اور دوسروں کو چندہ دیتا ہے" ظفر خاموش ہو کر گھر میں چلا گیا۔ دن گزرتے رہے اب ظفر کے پاس کچھ ہی پیسے بچے۔ ظفر نے سوچا پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں گائے بھی چھوڑنا ہے۔ ظفر کو خیال آیا کہ آم کا درخت بالکل بیکار ہی ہے پھل بھی گانؤ والے ہی کھا جاتے ہیں اس کو فروخت کر کے گائے بھی چھڑوا لی

جائے اور کچھ پیسے بھی مل جائیں ظفر کو گاہک مل گئے
درخت فروخت ہوگیا روپیا لے کر ظفر گائے کو لینے
چل دیا اور بہت خوش ہوا کہ آج گائے واپس آجائے
گی جب ظفر نے پیسے دے کر گائے مانگی تو پتا چلا
گائے مرچکی ہے لاش کو دیکھ کر ظفر بہت رویا گھر آیا
تو درخت بھی کٹ چکا تھا ظفر نے گائے کو سپرد خاک
کیا اور گاؤں والے اس کو پاگل کہہ کر ہنسنے لگے اب ظفر
نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر دوسری جگہ چلا
جائے گا ظفر دوسرے روز ہی بیوی اور لڑکے کو ساتھ
لے کر چل دیا۔ گاؤں سے دور جانے کے بعد رات ہوگئی۔
ظفر ایک ندی کے کنارے رک گیا رات وہیں کسی
طرح گزاری صبح جب ظفر پانی لینے ندی پر گیا تو دیکھا
ایک لڑکا پانی میں ڈوب رہا ہے ظفر فوراً پانی میں
کود پڑا اور اس کو ڈوبنے سے بچالیا۔ وہ جب تھوڑی
دیر کے بعد ہوش میں آیا۔ تو وہ ظفر سے بہت زیادہ
خوش ہوا شاید اب ظفر کے دن پھرے بھرے وہ بچہ
ملک کا شہزادہ تھا وہ شہزادہ ظفر کو اپنے ساتھ لے گیا
اور ساری کہانی بادشاہ کو سنائی بادشاہ ظفر سے بہت
ہی خوش ہوا ظفر اور اس کی بیوی اور بچے کو رہنے کے
لیے مکان دیا اور ظفر کو اپنا وزیر بنا لیا شاید ظفر کا نیک
کاموں میں حصہ لینا رنگ لے آیا ادھر گاؤں والوں کے
گھروں میں آگ لگ گئی ساری فصل اور گھر جل کر راکھ
ہوگئے۔ سبھی دانے دانے کو ترسنے لگے جب ظفر کو یہ
خبر ملی تو اس نے بادشاہ سے گاؤں والوں کو امداد
دلائی اور خود غلہ لے کر گاؤں والوں کو دینے گیا۔ گاؤں
والوں کو جب پتا چلا وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ اور جس
کے پاس ظفر نے گائے گروی رکھی تھی وہ اندھا ہوگیا
تھا اس نے ظفر سے کہا ہم کو معاف کردو ہم نے تمہاری
گائے کو زہر کھلا دیا تھا۔ ہم کو معاف کردو تمہارا
سارا گھر ہم لوگوں نے اُجاڑا۔ سبھی گاؤں والوں سے ظفر
نے مسکرا کر کہا۔ خدا پر بھروسا رکھو مصیبت میں ہمیشہ صبر
کرو خدا کے بڑے بڑے ہاتھ ہیں کسی کی تکلیف پر۔
مت ہنسو نہ جانے کون کیا سے کیا بن جائے

چودھری عبدالمعید خاں منو
سرائے جگنا۔ ضلع بہرائچ۔

تین دوست

بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ کسی ملک میں
تین دوست رہا کرتے تھے۔ تینوں میں بڑی گہری
دوستی تھی۔ مگر تینوں بے حد سست اور کاہل تھے۔
تینوں جیسے جیسے بڑے ہورہے تھے۔ ویسے ویسے ان
کی کاہلی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ ان کے ماں باپ یہ
سب دیکھ کر بڑے پریشان تھے کہ اب یہ بچے بڑے
ہورہے ہیں۔ اگر کچھ کریں گے نہیں تو کھائیں گے
کہاں سے۔ آخر ان کی روزی روٹی کا انتظام کیسے
ہو۔ یہی سوچ کر وہ لوگ بہت پریشان تھے۔

اس ملک کا بادشاہ بڑا انصاف پسند تھا۔ لیکن
اسے کاہل اور سست قسم کے لڑکوں سے بہت نفرت
تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا بڑے آرام سے
رہے۔ عزت کی زندگی بسر کرے۔ خوب خوب کام
کرے۔ ہمیشہ چست اور چوکس بنی رہے۔ فصلیں لہلہائیں
کوئی بھوکا نہ رہے۔ اور اس کی حکومت ایک
مثالی حکومت ثابت ہو۔

ایک دن کی بات ہے کہ تینوں دوستوں کے
والدین جب صبح کو جاگے تو دیکھا کہ ان کے لڑکے
گھر پر موجود نہیں ہیں۔ بڑے گھبراتے اور حیرت
بھی ہوئی کہ آخر اتنی صبح یہ چلے کہاں گئے۔ انھوں نے
سمجھا کہ جائیں گے کہاں، دوسرے کے گھر کھاٹ توڑ
رہے ہوں گے۔ جب بھوک ستائے گی تو خود بخود
پہنچ جائیں گے۔ نکھٹو کہیں کے، کام چور!

مگر جب کھانے کے وقت بھی وہ لوگ اپنے
اپنے گھر نہیں آئے تو ان کے ماں باپ پریشان ہوئے۔

اب کیا کیا جائے؟ تینوں کہاں ہو سکتے ہیں۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ دوسرا بولا" بھائی مجھے بھی بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ لاکھ سست اور کاہل ہوں مگر ہیں تو اپنے لڑکے۔"

تیسرا بھی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ چلو تلاش کیا جائے نادان بچے ہیں۔ ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہیں۔

پھر تینوں اپنے اپنے بچوں کو تلاش کرنے کے لیے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گاؤں کے پرانے کوئیں کے قریب تینوں چپ چاپ سر جھکائے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ ان تینوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چلو چھپ کر ان کی باتیں سنی جائیں۔ پھر یہ تینوں آہستہ آہستہ کوئیں تک پہنچے اور پاس والے برگد کے پیڑ کے پیچھے چھپ گئے۔

ایک لڑکا بول رہا تھا۔" بھائیو! ہمارے باپوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہم سے کام لیں گے۔ بھائی کام کرنے سے زیادہ خراب چیز اور کوئی نہیں ہے۔ ہم کو اچھا یہ ہی لگتا ہے کہ بس ہم کھاٹ پر لیٹے رہیں اور روٹی خود بخود ہمارے منھ تک پہنچ جائے۔"

دوسرا بھی مایوس کن لہجے میں بولا۔" ہاں بھائی! میں نے بھی یہ بات سنی ہے۔ کل رات میرا باپ میری ماں سے یہی کہہ رہا تھا۔ بھائیو ہم لوگوں سے کچھ بھی کام نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے آؤ ہم آپس میں مل کر یہ طے کریں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

تیسرے نے بھی کافی سوچتے ہوئے کہا۔" میں نے پہلے سے ہی سوچ لیا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ سامنے والا جو غار ہے۔ وہ بالکل خالی پڑا ہوا ہے۔ وہاں کی مٹی بڑی اچھی ہے۔ وہاں ناریل اور پھلوں کے درخت ہیں۔ پھل خود بخود گرتے رہتے ہیں۔ ہم پھل کھائیں گے، ناریل کا پانی پئیں گے۔ تینوں کے آرام کریں گے۔

" یہ ہوئی نا بات!" تینوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور تینوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے برسوں سے ویران پڑے ہوئے غار میں داخل ہو گئے۔

ان کے باپ یہ سب دیکھ کر بہت گھبرائے کہ یہ تو بہت گڑبڑ ہو گئی۔ تینوں لڑکے دیکھتے دیکھتے ہاتھ سے نکل گئے۔ اب کیا کیا جائے۔ آخر میں یہی فیصلہ ہوا کہ بادشاہ سلامت کے پاس چلا جائے۔ وہی کوئی راستہ نکالیں گے۔

تینوں ہانپتے کانپتے دربار میں پہنچے۔ دربار لگا ہوا تھا۔ بادشاہ اپنی رعایا کو انصاف دے رہا تھا۔ جب ان کا وقت آیا تو بادشاہ نے پوچھا کہو کیا چاہتے ہو؟

تینوں نے ہاتھ جوڑ کر اپنی ساری کہانی بادشاہ کو سنا دی۔ بادشاہ نے سنا تو چونک اٹھا۔" میرے ملک میں اس طرح کے سست اور کاہل لڑکے۔ حیرت ہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے:" خیر تم لوگ گھبراؤ نہیں۔ اپنے اپنے گھر جاؤ مزے میں رہو اور ایک مہینے کے بعد ٹھیک آج ہی کے دن اور اسی وقت مجھ سے اس غار کے قریب ملو۔ مگر خبردار اس درمیان اپنے بچوں کی خبر مت لینا۔"

تینوں نے بادشاہ سلامت کی بات سنی اور کے گھر لوٹ آئے۔

رات کے وقت بادشاہ عجیب وغریب حلیے میں غار کے دہانے پہ پہنچ گیا۔ تینوں لڑکوں کے آزاد خراٹے فضا میں گونج رہے تھے۔ بادشاہ نے اپنے حلق سے ایک بھیانک قسم کی آواز نکالی۔ تینوں چونکے پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر بولے،" لگتا ہے۔ کوئی اور بھی اس غار میں موجود ہے۔" بادشاہ نے اپنی جیب سے ایک انگوروں کا گچھا نکالا اور ان کی جانب اچھال دیا۔ تینوں بڑے گھبرائے کہ انگور تو میٹھے میٹھے اور رس دار ضرور ہیں۔ مگر پھینکے کس نے۔ یہاں تو انگور کا درخت بھی نہیں ہے۔ یہ سوچ کر تینوں کے چہرے پیلے پڑ گئے۔

جب بادشاہ نے دیکھا کہ اس کا وار اپنا کام کر گیا ہے تو وہ کڑکتی ہوئی گمبھیر آواز میں بولا۔ "میرے دوستو! تمھیں ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمھارا دوست ہوں۔ میں تم کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ تم جہاں لیٹے ہو۔ اس زمین کے نیچے بڑے میٹھے میٹھے پھل اور ہیرے جواہرات بھرے پڑے ہیں۔ بس جب تم صبح سو کر اٹھوگے تو تم کو باہر کدال اور زمین کھودنے کے دوسرے سامان رکھے ہوتے ملیں گے۔ میرے دوستو! تم اپنے کام میں لگ جانا۔ ایک مہینے کے بعد تمھاری ساری پریشانی دور ہو جائے گی۔ تم پھل کھاؤگے اور بادشاہ بن جاؤگے۔"

تینوں کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔ "سچ سچ میرے دوست تم ہو کہاں؟ بادشاہ پھر ویسی ہی گمبھیر آواز میں بولا۔ "میں تمھارا نصیب ہوں۔ دوستو میں تمھیں نظر نہیں آؤں گا۔ مگر ہاں اگر تم کل سے ایسا کرنے کا وعدہ کرتے ہو تو ایک مہینے میں تم سے ملوں گا۔"

تینوں نے ہلکی سی تشویش ظاہر کی۔ "مگر میرے دکھائی نہ دینے والے دوست یہ کام تو ہم سے نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ہم کام سے بھاگتے ہیں۔"

"نہیں بھائی ـــ بادشاہ بولا! کام کیسا یہ تو تمھارے آرام کے لیے ہوگا۔ ایک مہینے میں ساری زمین کھود دو پھر خوب پھل کھاؤ اور ہیرے جواہرات نکال کر بادشاہ بن جاؤ۔ تینوں نے خوشی خوشی منظور کرلیا۔ بادشاہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے محل لوٹ گیا۔ اس درمیان بادشاہ مختلف بھیس بدل کر ان کی خبر لینے کے لیے آتا رہا۔ وہ یہ دیکھ کر بڑا خوش تھا کہ تینوں جی جان سے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو اپنے پسینوں کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ ہیرے جواہرات اور پھلوں کے لالچ میں تینوں زمین کو زرخیز بنائے جا رہے تھے۔ بادشاہ اب ایک مہینا پورا ہونے کے انتظار میں تھا۔

خدا خدا کر کے ایک مہینا گزر گیا۔ مقررہ وقت پر تینوں کے باپ اور بادشاہ سلامت غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ بادشاہ نے ان تینوں کو منھ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

ساری زمین کھدی ہوئی تھی۔ تینوں لڑکوں نے اس بیکار زمین کو کھیتی کے لائق بنا دیا تھا۔ اب تینوں لڑکے پسینے میں بھیگے ہوئے بھی کافی مطمئن نظر آ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ "بھائی یہاں ہیرے جواہرات تو کیا چاول کا ایک دانا بھی نظر نہیں آتا۔"

بادشاہ ان کی معصومیت پر زوروں سے ہنس پڑا اور تینوں کو اب سامنے آجانے کا اشارہ کیا۔ تینوں لڑکے اپنے اپنے باپ اور ایک اجنبی شخص کو سامنے دیکھ کر چونک پڑے۔ تب بادشاہ بولا ـــ "میرے محنتی دوستو اس دن تم سے ملنے میں ہی آیا تھا۔ میں تمھارا بادشاہ ہوں دور تک کھدی ہوئی زمین کو دیکھ کر کون کہے گا کہ تمھارے جیسے محنتی لڑکے کام سے جی چراتے تھے۔ میں تمھیں اپنے محل میں نوکری دیتا ہوں۔"

تینوں لڑکوں کی نگاہیں ندامت سے جھک گئیں۔ وہ آہستہ سے بولے "ہم اپنے پیارے بادشاہ کے شکرگزار ہیں جس نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ اب ہم جان گئے ہیں کہ محنت کیے بغیر منزل نہیں ملا کرتی۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اب ہم خوب دل لگا کر اپنا کام کریں گے۔"

تینوں کے باپوں نے بھی بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ پھر یہ سب خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئے۔

واصف علی
دلاور پور۔ مونگیر۔ بہار

پیامی ادبی معمہ ۸ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل ① دانتوں۔ صحت کے ۹۹ نکتے صہ ۱۸ ② رفتہ رفتہ۔ اسلام کے مشہور امیر البحر صہ ۲۸ ③ قصہ۔ سرخ جوتے صہ ۳۲ ④ اطاعت۔ بچوں کے اقبال صہ ۱۵ ⑤ جہاد۔ میر انیس صہ ۴۷ ⑥ روک۔ ہمارے رسول صہ ۱۴ ⑦ قاعدے۔ کہاوت اور کہانی صہ ۹۴ ⑧ بلا مشقت۔ بابا ناصح صہ ۳

بالکل صحیح حل پر پہلا انعام حاصل کرنے والے ۶ خوش نصیب فی کس ۲۰ روپے تقسیم کیے گئے

(۱) راحت سراج اشٹیکر۔ ناز لائبریری۔ شرپور۔ دھن ضلع رائے گڑھ
(۲) لقیب النسا۔ گورنمنٹ اردو لوئر پرائمری اسکول۔ بیڈر پیٹ، آنیکل ضلع بنگلور
(۳) محمد رحیم اللہ شریف۔ مکان نمبر ۱۶/۱۸۲-۲-۱۹۔ اسمت پورہ۔ حیدر آباد ۲۸
(۴) محمد سلیم اللہ شریف " " " " "
(۵) محمد خلیل اللہ شریف " " " " "
(۶) نور افشاں۔ اطفال بک ڈپو۔ مالیگاؤں

ایک غلطی پر دوسرا انعام حاصل کرنے والے ۵ خوش نصیب فی کس ۱۰ روپے تقسیم کیے گئے

(۱) ملک عنبر ہمدانی۔ اطفال بک ڈپو۔ مالیگاؤں
(۲) رضیہ سلطانہ " " "
(۳) نوید احمد عمران۔ گورنمنٹ اردو لوئر پرائمری اسکول۔ بیڈر پیٹ۔ آنیکل ضلع بنگلور
(۴) لقیب النسا " " " "
(۵) مبشر شیبان احمد معرفت پروفیسر حبیب الرحمٰن۔ محلہ درگاہ پور۔ کٹیہار (بہار)

نوٹ: انعام کی رقم بذریعہ منی آرڈر اس لیے روانہ کی جاتی ہے کہ آپ ان روپیوں سے اچھی اچھی کتابیں خرید کر اپنی لائبریری بنائیں۔

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں

پیامی ادبی معمہ نمبر ۱۰ کا صحیح جواب

ذیل کی کتابوں میں ہی ملے گا۔

کتاب	مصنف	قیمت
ننھا فرشتہ	فہمیدہ عتیق	۴/۰
رنگوں کی بستی	سہیل انور	۳/۵۰
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں	یوسف ناظم	۲/
نبیوں کے قصے	خواجہ عبد الحئی فاروقی	۴/۵۰
ایک کھلا راز	مسعود احمد برکاتی	۳/-
میر انیس	محمد حسین حسان	۲/-
بچوں کے اقبال	مرتبہ اطہر پرویز	۴/۵۰
سرخ جوتے	بیگم قدسیہ زیدی	۲/۵۰
پہاڑ کی چوٹی پر (ناول)	مرزا ادیب	۵/-
شفیع الدین نیر	اطہر پرویز	۷/۵۰
شرارت	محمد حسین حسان	۲/-
بابا ناصح	ڈاکٹر رشید الوحیدی	۲/-
سلامہ وصمصامہ	ڈاکٹر رشید الوحیدی	۴/۵۰
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
اللہ کے صفی	خلیل احمد جامعی	۲/۰
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	ادارہ	۲/۰
قرآن پاک کیا ہے	عبد الواحد سندھی	۳/-
بچوں کے افسر	مرتبہ: نور الحسن ہاشمی	۵/۰
پیارے رسولؐ	سلطانہ آصف فیضی	۴/۵۰
خلفاء اربعہ	خواجہ عبد الحئی فاروقی	۶/۵۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۴/۰

کتابیں حاصل کرنے کے پتے:

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵
۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶
۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
۴۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

پیامی ادبی معمّا نمبر 10

دفتر پیامِ تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ
۲۵ نومبر ۱۹۸۴ء

فیس داخلہ کچھ نہیں آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

150 روپے کے نقد انعامات

پہلا انعام: بالکل صحیح حل پر مبلغ 100 روپے — **دوسرا انعام:** ایک غلطی والے حل پر مبلغ 50 روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبر وار لکھیے۔

۱۔ آپؐ فرماتے "یہ ہمارے ____ ہیں۔ (ہمدرد / رہنما)
۲۔ اسلام نے جو ____ بنائے تھے اُن میں عورتوں کو بہت سے حقوق دیے۔ (اصول / قاعدے)
۳۔ ____ کا موسم تھا۔ سب لوگ چھتوں پر سوتے تھے۔ (گرمیوں / سردیوں)
۴۔ جاگو جاگو سونے والو ____ کر دن کھونے والو۔ (رو رو / سو سو)
۵۔ کبھی ہم نے ایک دوسرے سے جدا ہونے کا ____ تک نہیں کیا تھا۔ (تصوّر / خیال)
۶۔ نہیں، یہ وہ ____ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہوتا تو ضرور رُک جاتا۔ (آدمی / شخص)
۷۔ اور ساری عمر ____ کی خدمت کرتے رہے۔ (دوسروں / غیروں)
۸۔ اسی طرح حضرت رسول پاکؐ کی بیویاںؓ اپنے کام ____ کرتی تھیں۔ (خود / آپ)

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں صحیح جواب صفحہ ۳۳ کی کتابوں میں ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصّہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمّے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے:

پیامی ادبی معمّا نمبر 10 ماہنامہ پیامِ تعلیم۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ٹوکن پیامی ادبی معمّا نمبر 10

میں اڈیٹر پیامِ تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام ....

پتا ....

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd. No. D(SE)-043 Oct, 1984

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

نئی دہلی
پیام تعلیم

پھر میں چکوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت : ۱/۵۰
پان کھاکر، طبلہ بجاکر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت : ۱/۵۰
چھوٹے بچوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت : ۱/۵۰
بکرڈم کٹے کو
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰
پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰
ہپو جپو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت: ۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچوں کے لیے انھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت: ۲/۵۰
بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
بی مینڈکی اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰
جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰
تیجوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
کہانیاں کتنی۔ سب
کی سب مزے دار
قیمت ۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت :
۱/۵۰

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

نومبر ۸۴ء جلد ۲۱ شمارہ ۱۱

ایڈیٹر: ولی شاہجہانپوری

قیمت: ۲/۵۰ سالانہ ۲۰ روپے

غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

اکتوبر کے شمارے کے انتظار میں آپ کو خاصی تکلیف ہوئی ہوگی۔ ہمیں اس کا افسوس ہے۔ لیجیے حسب سابق نومبر کا شمارہ وقت پر پیش کیا جا رہا ہے۔

مولانا اجتبا ندوی کے مضمون "مسجد اقصیٰ" کی دوسری اور آخری قسط پڑھ کر آپ کو اس مقدس عبادت گاہ کے متعلق پوری معلومات ہو جائے گی۔

۱۴ر نومبر کو آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی سالگرہ یوم اطفال کی صورت میں منائی جاتی ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر بھکتہ وتسل راؤ کا مضمون "چاچا نہرو" پڑھ کر آپ اس عظیم رہنما کے کارناموں سے واقفیت حاصل کریں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کی نظم "مزدور کا گیت" حقائق پر مبنی ہے۔ نسیم سترکھی (کراچی) کی کہانی "ایک بلی اور ایک لڑکا" دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ متینہ سعادت شاہد عظیم اور عشرت رحمانی صاحبان کے مضامین بھی کافی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔

محمد شریف خاں صاحب کا مضمون "ہماری کائنات" آپ کی معلومات میں اضافہ کرے گا۔

ہمیں یہ لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ۱۴ر اکتوبر کو ہمارے ساتھی شری سرجیت لال کا دل کا دورہ پڑنے پر انتقال ہو گیا۔ ان کے پسماندگان میں ان کی بیوہ کے علاوہ دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

جامعہ کے "یوم تاسیس" کے موقع پر تعلیمی میلا ہو رہا ہے۔ یہ پرچہ عجلت میں ترتیب دیا جا رہا ہے اس لیے بچوں کی کوششیں اور گدگدیاں وغیرہ شامل نہیں کی جا سکیں۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

آپ کے البم کے لیے

خواجہ احمد عباس

مصوّر: شکیل اعجاز

مظفر حنفی

مزدور کا گیت

بے شک دنیا قائم ہے

دریا ان کے ہاتھوں میں   بجلی اِن سے راتوں میں
رائی کردیں پربت کو   یہ باتوں ہی باتوں میں

بے شک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

یہ دیواریں چنتے ہیں   مل میں کپڑا بنتے ہیں
ہم ٹی۔وی اور ٹیلی فون   ان کے دم سے سنتے ہیں

بے شک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

تانگا رِکشا چلتا ہے   گھر گھر چولھا جلتا ہے
ان کے ہاتھوں بھٹی میں   لوہا تانبا گلتا ہے

بے شک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

کیا اوقات سمندر کی   چھوٹی ذات سکندر کی
دھرتی اینڈی بینڈی تھی   مزدوروں نے سُندر کی

بے شک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

تیل نکالیں ریت سے یہ   غلّہ بنجر کھیت سے یہ
ہر فن ان کے ہاتھوں میں   آٹھوں گانٹھ کمیت ہیں

بے شک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

یہ ہنگامہ شہروں کا   پانی ان سے نہروں کا
ان کے دم سے لڑتے ہیں   دل طوفانی لہروں کا

بے شک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

جب تک پودے جھومیں گے   جب تک پہیے گھومیں گے
ان کے زخمی ہاتھوں کو   دُنیا والے چومیں گے

بے شک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

نسیم سترکھی

ایک بلّی اور ایک لڑکا

بچو :۔ یہ ایک دوپہر تھی، سورج آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ سورج کی تیز شعاعوں نے ہوا کو ضرورت سے زیادہ گرم کر دیا تھا۔ ہر شخص پسینے سے شرابور تھا۔ اسی گرم دوپہر میں وسیم کے اسکول کی چھٹی ہو گئی تھی۔ وسیم کتابوں کا جھولا اٹھائے اپنے گھر جا رہا تھا۔ گرمی کی شدت سے اسے یک بیک زور کی پیاس لگی۔ آس پاس کہیں پانی نہ تھا اور گھر بھی کافی دور تھا۔ کچھ سوچ کر وسیم سامنے والے ہوٹل میں گھس گیا۔ یہ ہوٹل بڑا عالی شان اور خوب صورت تھا۔ اس میں داخل ہونے کے لیے کئی دروازے تھے۔ اندر ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں چار چار کرسیوں کے ساتھ ایک ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ چھت میں بہت سے بجلی کے پنکھے لگے ہوئے تھے جو سب کے سب بہت تیز چل رہے تھے جس کی وجہ سے ہوٹل میں کافی ٹھنڈک تھی۔ کچھ لوگ کھانا کھا کر نکل رہے تھے اور کچھ داخل ہو رہے تھے۔

وسیم بھی چپکے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کتابوں کا جھولا اس نے اطمینان سے میز پر رکھا۔ سامنے رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور پی لیا۔ پانی پی کر اس کی پیاس تو ختم ہو گئی تھی لیکن اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا کیونکہ پنکھوں کی ٹھنڈی ہوا بدن میں لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ بدن کا پسینا خشک ہو جائے تو پھر ہوٹل سے باہر نکلے بیٹھے بیٹھے وسیم کی نظریں سامنے والی میز پر پڑیں جس پر بیٹھا ہوا ایک شخص کھانا کھا رہا تھا۔ میز کے نیچے ایک دبلی پتلی بلّی بیٹھی ہوئی تھی جس کے پچھلے دونوں پیر بیکار تھے۔ بلّی اپنے اگلے دونوں پیروں کے سہارے آگے بڑھی اور کھانے والوں کے پیروں پر اپنا منہ رکھ دیا۔ کھانا کھانے والے شخص نے اپنا پیر اس زور سے جھٹکا کہ بلّی دور جا کر گری۔ پھر وہی دبلی پتلی بلّی زمین پر رگڑتی رگڑتی دوسری میز تک پہنچ گئی اور منہ اٹھا کر کھانے والے کو دیکھتی رہی۔ اس پر بیٹھا ہوا شخص کھا پی کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر چلا گیا۔ اس نے بلّی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بلّی چپ چاپ بیٹھی میز پر پڑے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھی۔

وسیم بیٹھا بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے اپنے جھولے سے سب کتابیں نکال کر میز پر رکھیں اور خالی جھولا لے کر بلّی کے پاس پہنچ گیا۔ پہلے ادھر اُدھر دیکھا پھر بلّی کو پکڑ کر جھولے میں ڈال لیا۔ کتابیں بغل میں دبائیں اور سیدھا گھر پہنچ گیا۔

وسیم نے گھر جا کر اپنی چھوٹی بہن فرزانہ کو یہ بلّی

۴/۴/۳، ۳ نصیر آباد۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی (پاکستان)

دکھائی وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔ دونوں نے مل کر پہلے بلی کو صابن لگا لگا کر خوب نہلایا پھر دونوں بھائی بہن اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔ اس کے لیے الگ ایک صوفہ تھا۔ صوفہ پر نرم گدا رکھ کر بلی کو بٹھایا۔ فرزانہ باورچی خانہ سے جاکر ایک پیالے میں دودھ لے آئی جسے بلی نے فوراً پی لیا۔

اب اُس دبلی پتلی بلی کو روٹیوں کے ٹکڑوں اور گوشت کی ہڈیوں کی بجائے روزانہ تین وقت دودھ ملنے لگا۔ سونے کے لیے صاف ستھرا، آرام دہ صوفہ تھا۔ دونوں بھائی بہن روزانہ اسے نہلاتے بھی تھے۔ ایک دن وہ دونوں غسل خانے میں بلی کو نہلا رہے تھے۔ اسی دوران وسیم کے ابّو بھی غسل خانے میں آ گئے۔ انھوں نے بلی کو بڑے غور سے دیکھا اور کافی دیر تک دیکھتے رہے پھر بچوں سے دریافت کیا "یہ تمھیں کہاں سے ملی ہے"۔
"اس کے پچھلے پیر کسی نے مار کر توڑ دیے ہیں"۔
وسیم نے سارا قصّہ اپنے ابو سے بیان کیا۔ وسیم کے ابو ساری باتیں سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا۔ "بیٹیا تم نے بڑا اچھا کام کیا ہے جو میں بھی نہ کر پاتا۔ مجھے بھی اس بلی کا خیال رکھنا چاہیے"۔
کچھ دنوں کے بعد یہ بلی خوب موٹی تازی ہو گئی۔ فرش پر رگڑ رگڑ کر چلنے کی بجائے نرم اور آرام دہ صوفے پر اکثر سوتی رہتی تھی۔ ●

ہمیں سے ہے یہ جامعہ کا چمن
ہمیں نے عطا کی ہے اس کو پھبن

وہ ہے رات رانی، یہ سورج مکھی
چمن جامعہ، ہم سبھی ہیں کلی
نکھرتی ہے شبنم میں جیسے کرن
جامعہ اک چمن

سدا ہے ہمیں سے یہاں کی بہار
تبسّم میں غنچوں کے دلکش نکھار
یہ رنگین دھرتی، یہ نیلا گگن
جامعہ اک چمن

یہ بحرِ علوم اس میں ہے ہمری نیّا
بڑے دانا بینا ہیں ہمرے کھویّا
ازل تا ابد فیضِ گنگ و جمن
جامعہ اک چمن

۲-ڈی گل مہر ایونیو۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

عشرت رحمانی

پرانے زمانے میں کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ ں کے تین بیٹے تھے۔ کسان کی بیوی مر چکی تھی۔ وہ یلا اپنے بیٹوں کی دیکھ بھال کرتا۔ اس زمانے میں ؤں میں نہ کوئی مدرسہ تھا اور نہ استاد، اس لیے یہ وں لڑکے پڑھنا لکھنا نہ سیکھ سکے۔

کسان کے پاس صرف ایک مکان تھا۔ جس میں ہ اپنے بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے علاوہ ں کے پاس روپیا، پیسا یا جائداد اور کچھ بھی نہ تھی۔ جب بوڑھا ہوا تو اسے یہ فکر ہوئی کہ اس کے مرنے کے تینوں لڑکوں میں اس مکان پر قبضہ کرنے کے لیے کہیں لڑائی نہ ہو۔ یہ سوچ کر ایک دن اُس نے تینوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ میرے بعد تم تینوں آپس میں اس مکان کے لیے جھگڑا کروگے۔ اِس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں اِس مکان کی تقسیم کا فیصلہ کر دوں۔ میں یہ مکان تم میں سے ایک لڑکے کو دینا چاہتا ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم میں سے جس کسی کو مکان ملے گا وہ دوسرے دونوں بھائیوں کو پیار محبت سے اسی گھر میں اپنے پاس رکھے گا۔ اور تینوں بھائی مِل جُل کر اتفاق سے ایک ساتھ رہیں گے۔ یہ سُن کر ہر لڑکے کے دل میں یہ خیال آیا کہ ابا جان مکان مجھے دیں گے۔

لیکن کسان نے کہا کہ میں یہ مکان تم میں سے اس لڑکے کو دوں گا جو سب سے زیادہ ہنرمند ہوگا۔ اس لیے تم تینوں بھائی شہر جاؤ اور کوئی نہ کوئی ہنر سیکھو۔ جو لڑکا سب سے زیادہ ہنرمند ہوگا مکان کا وہی مالک بنے گا۔ باپ کی یہ باتیں سن کر تینوں بھائی باپ سے رخصت ہو کر شہر کو چل دیے۔

کسان نے انھیں راستے میں کھانے کے لیے کچھ روٹیاں اور گڑ دیا۔ اور کام سیکھنے کے زمانے میں خرچ کرنے کے لیے کچھ روپے بھی دیے۔ یہ تینوں بھائی اب ہوشیار اور عمر میں بڑے بھی ہو گئے تھے۔ وہ بچپن سے آپس میں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔

شہر پہنچ کر تینوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ ہم الگ الگ اپنی پسند اور مرضی کا کام سیکھیں اور ہنرمند بننے کی

ت نونہال کراچی

کوشش کریں۔ اس لیے وہ الگ الگ راستوں پر چل پڑے اور کھانے پینے کے لیے آپس میں تینوں نے روپے بانٹ لیے بڑا لڑکا ایک حجام کے پاس ملازمت کرکے بڑی محنت سے کام سیکھنے لگا۔

منجھلا لڑکا گھوڑے کے پانو میں نعل لگانے کا کام کرنے کے لیے ایک نعل بند استاد کا شاگرد ہوگیا اور دن رات محنت اور لگن سے کام کرکے ایک ماہر نعل بند ہوگیا۔

سب سے چھوٹا لڑکا جو کھیل کود کا بہت شوقین تھا۔ وہ بہت بہادری سے ایک مشہور پہلوان کی خدمت کرکے رات دن پہلوانی کے داؤ پیچ سیکھنے لگا اور یہ فن سیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ غرض تینوں بھائی ایک سال بعد اپنے اپنے فن میں کامل استاد بن چکے اور ماہر ہو گئے۔ بالآخر تینوں بھائی اپنے گانو میں باپ کے پاس پہنچ گئے۔

اپنے لڑکوں کو دیکھ کر کسان بہت خوش ہوا اور تینوں کو ہنرمند دیکھ کر اُن کی تعریف کی اور گلے لگا کر اُن سے کہا کہ تم تینوں اتنا علم اور ہنر سیکھ آئے ہو کہ میری موت کے بعد آرام کے ساتھ اپنی جگہ فن سیکھ کر اطمینان سے زندگی گزار سکو گے۔ اب تم تینوں اپنے اپنے ہنر کا ثبوت دو تاکہ میں اس مکان کا فیصلہ کردوں۔

سب سے بڑے لڑکے نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ ہم گھر سے باہر نکل کر کسی میدان یا سڑک پر چلیں اور وہیں اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ ابھی باپ بیٹے گھر سے نکل کر سڑک پر آئے ہی تھے کہ اتنے میں اُدھر سے بادشاہ کی سواری آتی ہوئی دکھائی دی۔ بادشاہ ایک تیز رفتار گھوڑا گاڑی پر سوار تھا اور گھوڑے دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک گھوڑے کے پیروں سے نعل الگ ہوکر گر گئے۔ منجھلا لڑکا جو نعل لگانے میں مہارت حاصل کرکے آیا تھا۔ اُس نے باپ سے کہا کہ اب میرے فن کا کمال ملاحظہ کیجیے۔ چناں چہ جب بادشاہ کی سواری قریب آئی تو وہ اپنے اوزار لے کر گھوڑا گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑا اور چلتے ہوئے گھوڑے کے پانو

میں اس نے نعل ٹھونک دیے اور گھوڑا گاڑی ایک منٹ کے لیے بھی کہیں نہیں رُکی۔ بادشاہ لڑکے کا کمال دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اسے گاڑی روک کر انعام دیا۔ کسان بیٹے کا کمال دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اور بولا کہ اس مکان پر سب سے زیادہ حق تمھارا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ابھی وہ سڑک سے تھوڑی دور پہنچے تھے کہ ایک جھبرا شخص سر پر بڑے بڑے گھنے اُلجھے بال رکھے ہوئے بڑی تیزی سے وہاں سے گزرتا نظر آیا۔ بڑے لڑکے نے جو حجام کے کام میں مہارت حاصل کرکے آیا تھا۔ باپ سے کہا: "اب میرے ہنر کا کمال بھی دیکھیے۔" یہ کہہ کر اُس نے جلدی سے اُسترا نکال کر چلتے ہوئے اس شخص کے سر کے بالوں کو مونڈ کے رکھ دیا۔ باپ یہ دیکھ کر اور زیادہ حیران ہوا اور بولا کہ تم نے اپنے فن میں ایسا کمال حاصل کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مکان کے حق دار تم سب سے زیادہ ہو۔

اتنے میں بارش شروع ہوگئی۔ چناں چہ باپ اور بیٹے پناہ لینے کے لیے ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ وہ درخت اس قدر سایہ دار اور گھنا تھا کہ پانی کی ایک بوند بھی نیچے نہیں گرنے پائی۔ جب دیر تک موسلا دھار بارش ہوتی رہی تو چھوٹے بیٹے نے باپ اور بھائیوں سے کہا۔ کہ ہم کب تک یہاں کھڑے بارش تھمنے کا انتظار کریں گے۔ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔ باپ اور بھائی نے کہا کہ اتنی تیز بارش میں ہم گھر کیسے جا سکتے ہیں۔ درخت کے سائے سے باہر نکلتے ہی پانی میں بھیگ کر شرابور ہو جائیں گے۔ اس پر چھوٹے لڑکے نے کہا: "آپ سب بالکل اطمینان رکھیں اور میرا کمال دیکھیں۔ آپ سب کے اور اپنے اوپر ایک بوند پانی نہ پڑنے دوں گا۔ آئیے میرے ساتھ ساتھ چلیے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنی لاٹھی اُٹھائی اور بارش میں سب کے ساتھ نکل کر چلتے ہوئے نہایت تیزی سے لاٹھی سر پر گھمانے لگا۔ راستے بھر وہ اسی طرح لاٹھی گھماتا چلتا رہا۔ اور جب باپ اور تینوں بیٹے گھر پہنچے تو ان کے کپڑوں اور بدن پر ایک بوند بھی نہ پڑنے پائی تھی۔ سب کے سب

دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ آخر اس نے تینوں لڑکوں
کی ہنرمندی کی تعریف کر کے ان کو مبارک باد دی اور

کہا کہ تم تینوں بھائی باکمال ہو۔ اب تم تینوں اس قابل ہو گئے ہو کہ اپنے اپنے ہنر سے اطمینان کے ساتھ کمائی کر کے آرام کی زندگی گزار سکتے ہو۔ جو لوگ محنت کرتے ہیں اور کسی ہنر میں ماہر ہو جاتے ہیں اُن کی قدر ہوتی ہے اور اُن کی ضرورتیں آسانی کے ساتھ پوری ہو جاتی ہیں۔ میں نے تم تینوں کو اسی لیے کوئی ہنر سیکھنے کا شوق دلایا تھا۔ اب تم لوگ اپنے اپنے ہنر میں اتنے ماہر ہو گئے ہو کہ اپنے اپنے مکان خود بنا سکتے ہو۔ چوں کہ تم تینوں ہی ہنرمند ہو گئے ہو اس لیے تم تینوں ہی اس مکان کے مالک ہو۔ میری دعا ہے کہ تم تینوں ترقی کرو۔ مل جل کر رہو اور خوش رہو۔

(بہ شکریہ نونہال کراچی)

کیا آپ کو اپنی باریک بینی پر پورا پورا بھروسہ ہے
اوپر اور نیچے کی تصویریں بظاہر تو ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں
ان دونوں میں کم از کم پانچ اختلافات ہیں ــــ دیکھنا تو یہ ہے
کہ آپ کی باریک بین نظریں کتنی جلد انہیں ڈھونڈ نکالتی ہیں

امۃ الرحمٰن محسنی

سیمیں اور باورچی خانے کا چولھا

ایک دن سیمیں کی نینی بازار جا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ سیمیں بھی جا رہی تھی اور بہت خوش تھی کہ بازار جا کر بہت سے کھلونے دیکھنے کو ملیں گے۔ اس نے نینی سے کہا "اگر میں آپ سے یہ وعدہ کر لوں کہ میں کہیں نہیں جاؤں گی تو آپ مجھے کھلونوں کی دکان پر کھڑا ہونے دیں گی؟ آپ اپنی چیزیں خریدنے دوسری دکان پر چلی جائیے۔ مجھے سلیم بھائی کی دکان پر چھوڑ دیجیے۔ ہے نا؟"

"ابھی سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، بازار جا کر دیکھیں گے۔" اس کی نینی نے کہا۔

سیمیں اور نینی بازار جا رہی تھیں۔ پپی سیمیں کا کتا بھی خوش خوش اچھلتا کودتا ان کے گرد گھومتا چلا جا رہا تھا۔

بازار جانے میں آج سیمیں بہت اچھی طرح چل رہی تھی۔ کوئی شرارت بھی نہیں کر رہی تھی۔ بازار پہنچ کر نینی نے کہا "میں برابر والی دکان میں کتابیں خریدنے جا رہی ہوں اگر تم پکا وعدہ کرو کہ اس کھلونوں کی دکان سے کہیں نہیں جاؤ گی تو تم یہاں کھڑی ہو سکتی ہو!"

سلیم بھائی کی دکان بازار کی سب کھلونوں کی دکان سے اچھی تھی۔ الماری کے ایک تختے پر گڑیاں سجی ہوئی تھیں ان میں ایک بچہ گڑیا تھی ایک لڑکی گڑیا ایک لڑکا گڑیا۔ لڑکے گڑیا کے برابر کھلونا کتا تھا اس کی زنجیر لڑکے کے ہاتھ میں تھی۔ کتا بالکل پپی جیسا تھا۔ سیمیں نے پپی کو گود میں لے کر کھلونا کتا اس کو بھی دکھا دیا۔ دوسرے تختے میں دو کشتیاں رکھی ہوئی تھیں ایک پانی کا جہاز تھا ایک ریل کی پٹری پر انجن اور تین ڈبے تھے۔ ایک اسٹیشن اور اس پر کئی چھوٹے چھوٹے آدمی کھڑے تھے۔

سیمیں اس الماری سے چپکی کھڑی تھی اور سب چیزوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ پھر وہ جھک کر سب سے نیچے کے تختے کی چیزیں دیکھنے لگی۔ وہاں بھی کئی کھلونے اس کو بہت اچھے لگے۔ اچانک ایک بہت ہی اچھی چیز پر اس کی نظر پڑی۔ وہ ایک چولھا تھا۔ سیمیں کو یہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ سیمیں کے پاس ایک گڑیا گھر تھا۔ اس میں ایک بیٹھنے کا کمرہ تھا۔ دو سونے کے کمرے اور ایک باورچی خانہ تھا۔ مگر باورچی خانہ میں چولھا نہیں تھا۔ سیمیں کا دل چاہتا تھا کہ اس کے گڑیا گھر کے باورچی خانے میں ایک چولھا بھی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ چولھا نہ ہونے کی وجہ سے بیچاری گڑیاں خود کھانا نہیں پکا سکتیں۔

سیمیں نے اور پاس جا کر چولھے کو خوب اچھی طرح دیکھنا شروع کیا۔ اچھا اس کے تنور میں ایک دروازہ بھی ہے اور تھوڑا سا اوپر سے کھلا ہوا بھی ہے اور کواڑ میں ایک ننھا سا ہینڈل بھی ہے۔

مسکن دودھ پور علی گڑھ

بالکل امی کے تنور جیسا ... اوہو! اوپر ایک الماری بھی ہے اس میں تو دھلی ہوئی پلیٹیں رکھی جا سکتی ہیں۔ یہ تو بڑی کام کی چیز ہے۔ گڑیا اپنی سب پلیٹیں دھوکر اس میں بڑے مزے سے رکھ سکتی ہے۔ اگر میں اس چولھے کو خرید لوں تو میرے گڑیا گھر کا باورچی خانہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ میرا کیسا دل چاہ رہا ہے کہ اس کو لے لوں! اور باورچی خانہ میں رکھ دوں۔ اسی وقت نینی بھی کتابوں کی دکان سے آگئیں۔ سیمیں نے وہ چولھا ان کو دکھا کر پوچھا کہ ان کے خیال میں یہ کتنے پیسوں کا ہوگا۔ یہ مجھے بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ میرے پاس دو آنے بھی ہیں۔ کیا دو آنے میں یہ آجائے گا؟

"آؤ سلیم بھائی سے جا کر پوچھیں کہ کتنے کا ہے۔" نینی نے جواب دیا۔

دونوں چولھے کی قیمت پوچھنے دکان کے اندر چلی گئیں۔ سلیم بھائی نے چولھے کو الماری میں سے نکال کر میز پر رکھ دیا تاکہ سیمیں خوب اچھی طرح دیکھ لے۔ اس چولھے کا کواڑ بہت آسانی سے کھل اور بند ہو سکتا تھا اور چولھے پر چائے کی کیتلی، کڑھائی، پتیلی رکھنے کی بھی جگہ تھی۔ سلیم بھائی نے سب چیزیں اس پر رکھ رکھ کر دکھائیں اور بتلایا کہ اس کی قیمت آٹھ آنے ہے۔ "نینی اب میں کیا کروں۔ میرے پاس تو کل دو آنے ہیں۔" سیمیں نے اداس ہو کر کہا۔

نینی نے کہا "سیمیں اگر تم سچ مچ اسے خریدنا چاہتی ہو تو پیسے جمع کرو۔ جب پیسے پورے ہو جائیں تو آکر خرید لینا۔ بس اب گھر چلو۔"

سیمیں دکان سے باہر آگئی اور مڑ مڑ کر اس چولھے کو دیکھتی رہی۔ سلیم بھائی نے چولھے کو پھر سے الماری میں رکھ دیا تھا۔ اس کو یہ چولھا خریدنے کی بڑی تمنا تھی۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ چولھے کے لیے وہ ضرور پیسے جمع کرے گی۔

اور کچھ ایسا ہوا کہ جلدی ہی پیسے جمع کرنے بھی لگی۔

ایک دن اس کی پروین خالہ آئیں انھوں نے اس کو ایک آنہ دیا۔ یہ پیسے اس نے اپنے خزانے میں ڈال دیے۔ اب اس کے پاس تین آنے ہو گئے تھے۔ ایک دن راستے میں فرید چچا مل گئے انھوں نے ایک آنہ دیا اور کہا کہ ٹافی خرید کر کھا لینا۔

سیمیں فوراً بولی "فرید چچا اگر میں ان پیسوں کی ٹافی نہ لوں تو آپ برا تو نہ مانیے گا؟ کیونکہ میں آج کل پیسے جمع کر رہی ہوں۔ گڑیا گھر کے باورچی خانے کے لیے مجھے ایک چولھا خریدنا ہے۔"

"ارے واہ! تم بہت اچھا کام کر رہی ہو۔ میں بالکل برا نہ مانوں گا۔ میری یہ اکنی تم ضرور جمع کرو۔"

ابّو ہر جمعہ کو ایک اکنی دیا کرتے تھے۔ جمعہ کے روز وہ اکنی بھی انھوں نے دی۔ اس کے بعد اور پیسے ملنے کی کہیں سے امید نظر نہیں آرہی تھی۔ سیمیں کو بڑا فکر لگا ہوا تھا کہ کوئی دوسرا اس چولھے کو خرید کر نہ لے جائے۔

ایک دن بہت پریشان ہو کر اس نے کہا "نینی میرے پاس تو پانچ آنے ہو گئے ہیں۔ تین آنے کیسے آئیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کوئی ایسا کام کروں جس سے مجھے پیسے مل جائیں۔ بتائیے کیا کام کروں؟"

نینی نے کہا "کل میں نے مالی کو کہتے سنا تھا کہ گملوں اور کیاریوں میں گھاس نکل آئی ہے۔ کسی آدمی کی ضرورت ہے جو گھاس نکال دے۔ اگر تم یہ کام کرو تو شاید تمھیں پیسے مل جائیں۔ اپنی امی سے پوچھ لو۔"

"ہاں۔ نینی میں گھاس نکال دوں گی" سیمیں نے کہا اور امی سے پوچھنے کے لیے بھاگی ہوئی گئی اور امی نے اس کو گھاس نکالنے کی اجازت دے دی۔

دوسرے دن صبح ہی سے وہ مالی کے پاس باغ میں چلی گئی۔ جس طرح مالی کہتا گیا ویسے ہی وہ کرتی رہی صبح کے کئی گھنٹے وہ گملوں میں سے گھاس نکالتی رہی اس لیے اس کی ننھی منی انگلیاں بری طرح دکھ گئیں جیسا

[illegible] ہونے پر اس کی امی نے دو چمکدار اکنیاں دیں تو اس کو اس قدر خوشی ہوئی کہ اپنی انگلیوں کی تکلیف بھی بھول گئی۔

امی کے دیے ہوئے دو آنے اپنی نینی کو دکھانے چلی گئی۔ "نینی دیکھیے اب میرے پاس سات آنے ہوگئے ہیں بس ایک آنہ اور ہو جائے تو میں چولھا خرید سکتی ہوں۔" سیمیں نے سوچا کہ ایک اکنی کیسے آتے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر نینی نے کہا "مجھے ایک بہت اچھی بات سوجھی ہے۔ ہمارے کمرے کے لیے پھولوں کی ضرورت ہے اگر تم اپنے باغ میں سے کچھ پھول لے آؤ تو میں ایک آنے میں خرید لوں گی۔"

"آہا جی یہ تو بہت اچھی ترکیب آپ نے بتائی ہے"، سیمیں نے خوش ہو کر کہا۔ "سچ نینی آپ وہ پھول مجھ سے خرید لیں گی۔" اور اسی وقت وہ پھول جمع کرنے باغ میں چلی گئی۔ اس نے رنگ برنگے تازہ کھلے ہوئے تھوڑے سے پھول توڑے اور ایک گچھا سا بنا کر کمرے میں لے آئی اور بڑی خوب صورتی سے گلدان میں سجا دیے۔ اور نینی کو دکھا کر پوچھا "بتائیے نینی یہ پھول ایک آنے کے ہوگئے۔"

"ہاں بالکل ایک آنے کے ہوگئے ہیں"۔ نینی نے کہا "تم اتنے اچھے رنگوں کے پھول لائیں اور بہت اچھی طرح سجایا بھی ہے۔ لو یہ ایک آنہ لو۔"

اب سیمیں کے پاس پورے آٹھ آنے ہوگئے تھے۔ پیسے پورے ہونے کی اس کو بڑی خوشی تھی۔ کہنے لگی "نینی آج ہی شام کو وہ چولھا دلا دیجیے اب تو پورے آٹھ آنے ہوگئے ہیں اور کیا اچھا ہو کہ راستے میں خالد اور اس کی نینی بھی مل جائیں اور ہمارے ساتھ چلیں، خالد مجھے چولھا خریدتے دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔"

شام کو نینی اور سیمیں بازار گئیں تو ان کو خالد تو نہیں ملا۔ وہاں اس کی نینی ملی تھیں مگر کچھ اداس تھیں۔

سیمیں نے ان سے پوچھا۔ "خالد کیوں نہیں آیا ہے؟" انھوں نے بتلایا کہ آج صبح وہ درخت پر چڑھا تھا وہاں سے گر پڑا اس کے سر، ٹانگوں اور ہاتھوں میں چوٹ لگی ہے۔ اب وہ بستر پر ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ایک ہفتہ تک وہ آرام کرے۔ لیٹے رہنے کی وجہ سے وہ بہت اداس ہے۔

"ہائے بیچارہ بچہ! کیسی تکلیف میں ہے!" سیمیں کی نینی نے کہا "میں اس کے لیے مٹھائی یا ٹافیاں خرید کر دوں گی وہ اسے دے دیجیے۔ بیماری میں اگر کوئی تحفہ دیتا ہے تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔" "شکریہ بہن"، خالد کی نینی نے کہا: "میں خود اس کے لیے مٹھائی خریدنے جا رہی ہوں۔ اس وقت اگر آپ سیمیں کو اس سے ملنے کی اجازت دے دیں تو کسی تحفے سے زیادہ اس کو اپنی دوست سے مل کر خوشی ہوگی۔"

"اچھی بات ہے" سیمیں کی نینی نے کہا۔ "میں ابھی تھوڑی دیر میں سیمیں کو لے کر آتی ہوں۔" سیمیں چپ چاپ کھڑی ہوئی یہ باتیں سن رہی تھی۔ پھر اس نے پوچھا کیا خالد کے بہت زیادہ چوٹ آئی ہے؟ "ہاں اس کے سر میں زیادہ چوٹ آئی ہے"، خالد کی نینی نے جواب دیا "وہ رویا بھی بہت تھا۔ آج ہی اس کو چڑیا گھر دیکھنے بھی جانا تھا۔ چوٹ لگنے کی وجہ سے وہاں بھی نہ جا سکا۔ اس کا بھی اس کو بہت دکھ ہے۔"

سیمیں کو خالد کی تکلیف کی باتیں سن کر بہت افسوس ہوا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خالد کو کوئی چیز دے تاکہ خالد خوش ہو جائے۔ اس نے اپنی مٹھی میں دبی ہوئی گول گول اکنی کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سی لمبی سانس لی اور نینی سے کہا: "میں اپنی اکنی کی خالد کے لیے کوئی چیز لوں گی۔ وہ بیچارہ کتنی تکلیف میں ہے۔ میرے تحفے سے وہ خوش ہو جائے گا۔" "لیکن سیمیں یہ پیسے تو تم نے چولھا خریدنے کے لیے جمع کیے تھے۔" اس کی نینی نے حیران ہو کر کہا۔ "ہاں نینی! میں چولھا خریدنے کے لیے پیسے

پھر جمع کرلوں گی۔ مجھے یہ معلوم تھوڑا ہی تھا کہ خالد درخت پر سے گر جائے گا۔ اور اسے اتنی بہت چوٹ آجائے گی۔"

دونوں سلیم بھائی کی دکان پر گئیں۔ اور وہاں سب سے پہلے جس چیز پر سیمیں کی نظر پڑی وہ ایک سپاہی تھا۔ جو کہ گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ اس نے خالد کے لیے وہی سپاہی پسند کرلیا۔ وہ جانتی تھی کہ خالد کو سب کھلونوں سے زیادہ یہ سپاہی پسند آئے گا۔ اور یہ تھا بھی پورے آٹھ آنے کا۔

سیمیں نے آٹھ آنے سلیم بھائی کو دیے۔ انھوں نے سپاہی کو بڑی خوب صورتی سے ایک کاغذ میں لپیٹ دیا اور سیمیں کو دے دیا۔

جب سیمیں خالد کے یہاں پہنچی تو وہ بیچارہ اداس بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی سیمیں نے اس کے پاس جاکر پوچھا "خالد کیا تم سچ مچ درخت پر سے گر گئے ہو" خالد بولا "ارے میں تو ایسے گر پڑا تھا" اس نے اپنا ہاتھ دھپ سے بستر پر گرا کر کہا "اسی لیے تو اتنی بہت چوٹ آئی ہے۔"

"خالد دیکھو میں تمھارے لیے ایک چیز لائی ہوں" سیمیں نے کاغذ میں لپٹا ہوا سپاہی اس کو دیتے ہوئے کہا "یہ میں ابھی کھلونوں کی دکان سے خرید کر لائی ہوں"۔ خالد نے سپاہی لے کر کھولا اور ہاتھ میں لے کر بہت دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اور خوش ہوکر کہنا رہا۔

"سیمیں! تم بہت ہی اچھی چیز لائی ہو۔ یہ مجھے بہت ہی پسند ہے میں اسے خریدنا چاہتا تھا۔ لگتا ہے یہ وہی ہے جو میں پسند کرکے آیا تھا۔ تمھاری اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں"۔ سیمیں بھی خالد کی خوشی سے خوش ہو رہی تھی۔ اسے اس کی بھی خوشی تھی کہ اس نے اپنی اٹھنی سے خالد کے لیے تحفہ خریدا۔

تھوڑی دیر وہ خالد سے باتیں کرتی رہی۔ پھر اس کی ممی نے کہا "سیمیں بس اب چلنا چاہیے"۔ جیسے ہی وہ چلنے کے لیے کھڑی ہوئی خالد نے کہا "ایک منٹ کے لیے رک جاؤ۔ میں تمھیں ایک چیز دیتا ہوں یہ لو آج میری خالہ نے میرے لیے بھیجا ہے۔ یہ میرے تو کام آئے گی نہیں۔ کیونکہ میں لڑکا ہوں۔ تمھارے کام کی ہے کھول کر دیکھو کیا پہلے سے تمھارے پاس یہ ہے؟"

خالد کی دی ہوئی چیز ایک ننھا سا چولھا تھا۔ اس کے ساتھ کیتلی، ایک پتیلی اور کڑھائی بھی تھی۔ سیمیں ان چیزوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"بہت خوب! بہت خوب"! ممی نے خوش ہوکر کہا سیمیں تم نے چولھے کے لیے جمع کیے ہوئے پیسوں کا خالد کے لیے سپاہی خرید لیا ہے۔ اور خالد کے پاس وہی چولھا تھا جو کہ تم لینا چاہتی تھیں۔ اس نے چولھا تم کو دے دیا ہے۔ خالد کا شکریہ ادا کرو اور چولھا لے لو۔"

سیمیں نے چولھا اٹھالیا اور خوش خوش گھر پہنچ کر اپنے گڑیا گھر کے باورچی خانے میں رکھ دیا۔ باورچی خانے میں وہ چولھا بہت سج رہا تھا۔ سیمیں کو یقین تھا کہ ہر رات کو گڑیاں اس چولھے پر اپنا کھانا پکاتی ہیں۔

مولانا ابوالمحاسن متین (مرحوم)

ایک سمجھ دار لڑکا

نذیر کی عمر ابھی مشکل سے گیارہ سال کی ہوگی، اس کے باپ کے اولاد بہت زیادہ تھی لیکن آج سے گیارہ برس پہلے اس کی جو آمدنی تھی اس میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوا تھا۔ گھر کا خرچ بڑھ گیا تھا جس سے وہ بہت پریشان تھا۔

عید کے دن نذیر کے باپ اس کو ساتھ لیے ہوئے اپنے ایک دوست سے ملنے کے لیے گئے۔

دوست: آج تم نے نماز کہاں پڑھی؟

نذیر کا باپ: محلے ہی کی مسجد میں پڑھی۔

پھر نذیر کے باپ نے بیٹے سے کہا: چچا کو سلام کرو۔

نذیر سلام کرکے چپکے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

باپ نے اپنے دوست سے کچھ باتیں کیں اور بیٹے سے کہا۔ تم اندر چچی سے مل آؤ۔

نذیر اندر گیا چچی کو سلام کرکے ادب سے بیٹھ گیا۔

چچی بہت محبت والی تھیں۔ کم سن بچوں سے محبت سے پیش آتی تھیں۔ پہلے نذیر کا مزاج پوچھا، پھر اس کو عیدی کے طور پر ایک روپیا دینا چاہا۔

نذیر: مجھے روپیا نہیں چاہیے۔

چچی: (اصرار سے) لو بیٹا، میوہ مٹھائی خرید کر کھالو۔

نذیر: چچی۔ میں نہیں لیتا، ابا کو معلوم ہوگا تو وہ بہت خفا ہوں گے۔

یہ کہہ کے نذیر باہر نکل آیا اور اپنے ابّا کے ساتھ ہو لیا۔

راستے میں اس نے باپ سے کہا: چچی مجھے روپیا دینا چاہتی تھیں۔ میں نے نہیں لیا۔

باپ: تم نے روپیا کیوں نہیں لیا؟

نذیر: آج کل آپ روپیا نہ ہونے سے پریشان ہیں اگر میں ان سے عیدی لیتا تو آپ کو بھی ان کے بچوں کو عیدی دینی پڑتی۔

نذیر کے باپ نے جب یہ بات سنی تو خوش ہو کے اسے دعائیں دیں۔ ●

محمد شاہد عظیم

نیولا

سانپ کا جانی دشمن
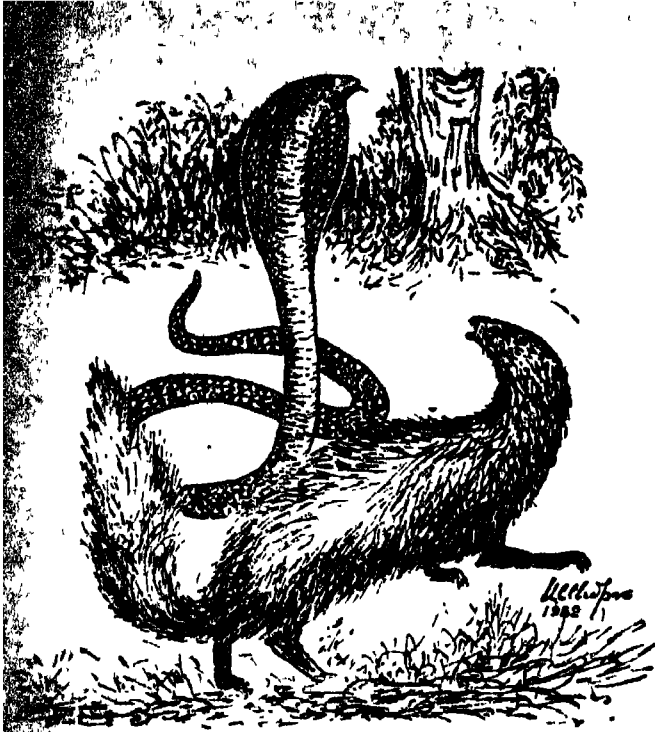
نیولا جسے انگریزی میں MONGOOSE کہتے ہیں زہریلے اور پھن دار سانپوں کو ہلاک کرنے میں لازوال شہرت کا مالک بن چکا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نیولا سانپ کو ہلاک کر سکتا ہے مگر یہ اس کی عادت نہیں ہے برخلاف اس کے سانپ اور نیولا ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں۔ بھورے خاکستری رنگ کا یہ جانور جس کا قد بلی سے کم ہوتا ہے کسی طرح بھی خوب صورت نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اپنی سرخ تھوتھنی اور چوہے جیسی شکل و صورت کے باعث بد صورت لگتا ہے۔ نیولا افریقہ اور ایشیا میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک خاص قسم اسپین میں ہے تاہم اس کا اصل وطن افریقہ ہے۔ نیولا نحیف الجثہ ہوتا ہے مگر اس میں بجلی کی سی تیزی ہوتی ہے اس کے دانت چھوٹے چھوٹے ہاتھی کے دانتوں کی طرح سفید اور استرے کی طرح تیز ہوتے ہیں۔ کان چھوٹے چھوٹے اور عجیب وضع سے مڑے ہوتے ہیں۔

انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سخت [illegible] استاد نے سبق یاد نہ کرنے پر کسی نالائق بچے کے کان [illegible] طرح مروڑ دیے ہیں۔ ان پر تیکھے اور مڑے ہوئے [illegible] کا یہ فایدہ ہے کہ جب وہ اپنے بل میں گھستا ہے [illegible] میں مٹی اور گرد داخل نہیں ہوتی۔

نیولا بہت اچھا تیراک ہوتا ہے مگر وہ تیر[illegible] وقت ہے جب وہ اس کے لیے مجبور ہو جائے [illegible] سمور بھورے رنگ کا ہوتا ہے اور بال نسبتاً سخت [illegible] کہیں کہیں سفید ہوتے ہیں۔ اس کی زبان اور لمبی [illegible] کا رنگ انتہائی سرخ ہوتا ہے۔ دم گلہری کی دم [illegible] ہوتی ہے۔

نیولے عام طور پر زمینی بلوں میں رہتے [illegible] پنجوں سے جن میں سخت ناخن ہوتے ہیں نرم مٹی [illegible] بل بناتے ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] طاقت اور جبڑات کا انحصار [illegible] ہے لیکن نیولا قد میں چھوٹا اور کمزور [illegible] فطرتاً نہایت جری اور بلا کا دلیر جانور [illegible] میں اپنے سے کئی گنا زیادہ بڑے جانور [illegible] ہے۔

[illegible] ایک ایک کرکے یا دو دو مل کر شکار کرتے [illegible] پر حملہ کرکے کھا جاتے ہیں یہ مختلف طریقوں [illegible] ہیں اور بڑے بڑے مگرمچھوں پر بھی حملہ [illegible] نہیں چوکتے۔

جب دو تین نیولے مل جاتے ہیں تو وہ کیچڑ میں کود [illegible] ہیں۔ جب کیچڑ میں لت پت ہوجاتے ہیں تو دھوپ [illegible] کر اسے سوکھنے دیتے ہیں یہ سوکھی ہوئی کیچڑ [illegible] زرہ بکتر (لوہے کا جالی دار محفوظ لباس جو زمانۂ [illegible] سپاہی پہنا کرتے تھے) کا کام دیتی ہے۔ [illegible] کے بعد وہ سانپوں پر حملہ کرتے ہیں۔ نیولے کی [illegible] شیاری کی وجہ سے سانپ انھیں آسانی سے [illegible] سکتا۔

نیولا اگرچہ کہ فطرتاً دلیر اور چوکس ہوتا ہے لیکن [illegible] اوقات اس پر بھی ڈر اور خوف طاری ہوتا ہے۔ [illegible] جسم میں خاص غدود ہوتے ہیں جن سے انتہائی [illegible] بدبو خارج ہوتی ہے۔ اس طرح نیولا بدبو [illegible] کرکے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔

[illegible] سوال یہ ہے کہ کیا واقعی سانپ اور نیولے [illegible] قدرتی اور قدیم دشمنی ہے اور یہ کہ اس [illegible] میں ہار جیت اور کون ہارتا ہے پہلے سوال کا [illegible] یہ ہے کہ نیولا عام طور پر چوہے اور گھونسوں [illegible] کرتا ہے اور سانپ اس کی غذا میں شامل [illegible] نیولا چھوٹے سانپوں کو ضرور کھاتا ہے [illegible] اور زہریلے سانپوں سے بچنے کی کوشش کرتا [illegible] جب سامنا ہوجاتا ہے تو مقابلہ پر ڈٹ جاتا

[illegible] نیولا اپنی [illegible] اور ہوشیاری سے [illegible] کے حملوں کو روکتا اور ان سے بچتا ہے اور جب سانپ [illegible] لڑتے تھک جاتا ہے تو وہ اپنے تیز دانتوں سے اس کا گلا کتر دیتا ہے۔ لڑائی کے وقت نیولے کے لمبے اور مضبوط بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہوجاتے ہیں جو ایک طرح سے ڈھال کا کام دیتے ہیں چنانچہ سانپ اس کی جلد میں دانت نہیں گاڑ سکتا۔

نیولے اور سانپ کی لڑائی تم نے ضرور دیکھی ہوگی بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ سانپ جب حملہ کرنے کے لیے اپنا پھن اٹھاتا ہے تو نیولا پلک جھپکتے ہی پھن کے نیچے پہنچ جاتا ہے اور سانپ جب ڈسنے کے لیے اپنا سر جھکاتا ہے تو نیولا اچک کر اس کا نچلا جبڑا پکڑ لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے چاروں پیروں سے لپٹ کر جھٹکے لگاتا ہے۔ لڑائی میں اس کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ نیولا اپنی تھوتھنی سانپ کے سر کے قریب رکھتا ہے اور برابر کاٹتا رہتا ہے نیولا مسلسل سانپ سے نہیں لڑتا بلکہ لڑائی کا ہر دور پانچ سیکنڈ کے قریب ہوتا ہے زندگی اور موت کی یہ لڑائی بعض اوقات پچاس منٹ تک جاری رہتی ہے۔ نیولا سانپ کو جب تک ہلاک نہیں کر دیتا چین سے نہیں بیٹھتا بعض اوقات خود بھی اس قدر زخمی ہوتا ہے کہ مر جاتا ہے۔

یہ صحیح نہیں کہ نیولے پر سانپ کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دراصل سور، بلی، کتے اور خارپشت کی طرح اس میں بھی سانپ کے زہر کو برداشت کرنے کی زبردست قوت ہوتی ہے معمولی سانپ کے کاٹنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، البتہ ناگ سانپ اور انتہائی زہریلے سانپوں کی بات اور ہے۔

نیولا گوشت خور بھی ہے اور سبزی خور بھی اس کی غذا میں چوہے، گھونس، پرندے، گھونگھے، انڈے، مگرمچھوں کے انڈے، جنگلی پھل، گری دار پھل زمینی جڑیں اور بعض درختوں کی جڑیں شامل ہیں یہ بعض اوقات صرف اپنے شکار کا خون پینے پر اکتفا کرتے ہیں پانی کے قریب رہنے والے نیولے کیکڑے، مینڈک اور مچھلیاں کھا کر گذارا کرتے ہیں انڈے تو ان کی پسندیدہ غذا ہیں جنھیں وہ ایک کنارے سے سوراخ کرنے کے بعد پی جاتے ہیں نیولے میں اس قدر سوجھ بوجھ ہوتی [illegible]

کو وہ سخت خول والے پھلوں کو اپنے اگلے دونوں پیروں میں پکڑ کر زمین سے ٹکرا کر یا قوت سے زمین پر پٹک کر توڑتے ہیں۔
وہ جس قوت سے سخت خول والے پھل توڑتے ہیں وہ اس قدر ہوتی ہے کہ اس سے انسان کو چوٹ لگ سکتی ہے۔ بڑی بڑی بلیاں، کتے اور بعض اقسام کے پرندے جن میں عقاب شامل ہیں اس کے دشمن ہیں۔ بعض اوقات انسان بھی انھیں شکار کرکے ان کا گوشت بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

نیولے کو اکثر چوہوں اور گھونسوں کو ہلاک کرنے کے لیے پالا جاتا ہے۔ ابتدا میں یہ بڑے محنتی ہوتے ہیں لیکن جب چوہوں وغیرہ کی تعداد کم ہوجاتی ہے تو مرغیوں اور بطخوں پر ہاتھ صاف کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح فائدا کے بجائے نقصان پہنچاتے ہیں۔ بلی یا کتیا کی طرح نیولے بھی مادہ بھی بچوں کو اپنے سے قریب رکھ کر انھیں دودھ پینے میں مدد دیتی ہے۔ بچّے جب دودھ پینا چھوڑ دیتے ہیں تو انھیں شکار کرنا اور دشمنوں سے اپنی حفاظت کرنا سکھاتی ہے۔ ●

نگینہ۔ بہار

ہم اپنے ابّو کے اچھّے بیٹے ہیں

رفیق عابد (زاہدی) بمبئی

شیر اور بکری

پیاس سے بے تاب بکری نہر پر
تیز چل کر آئی بے خوف و خطر
روز کا یہ گھاٹ تھا اُس کے لیے
اُس نے چاہا پی کے پانی چل پڑے
ناگہاں(۱) اک شیر اُس دن آ گیا
دیکھ کر بکری کو وہ گرما گیا
بولا "اے بکری! یہ تونے کیا کیا
زہر کیوں پانی میں اپنا بھر دیا
جب سبھی دوں اِس خطا کی میں سزا
تیرے دل میں ڈر نہ تھا میرا ذرا
زہرِ قاتل(۲) ہے ترے منہ کا لعاب(۳)
کیا کیا یہ تونے اے خانہ خراب"
بولی بکری سنیے اے عالی جناب
مجھ پہ بے جا آپ کا ہے یہ عتاب(۴)
کس لیے ہے اپنی طاقت پر غرور
سر یہاں ہوتے ہیں مغروروں کے چور
ہے غلط قانونِ جنگل کا یہاں
سب کی خاطر ہے بنی جوئے(۵) رواں
آدمیوں کی حکومت ہے یہاں
آپ کا قانون چلتا ہے کہاں
دیکھیے وہ اک شکاری آ گیا
رائفل سے اُس کی اب بچیے ذرا"
سنتے ہی یہ شیر تب گھبرا گیا
دُم دبا کر سوئے صحرا چل دیا

---

(۱) یکایک (۲) ہلاک کرنے والا زہر (۳) تھوک۔
(۴) غصہ، سختی۔ (۵) بہتی نہر

مترجم:۔ سری نواسس لاہوٹی

دودھ کا دودھ پانی کا پانی

بچو! تم نے اکثر سنا ہوگا کہ کسی فیصلے کا صحیح نتیجہ برآمد ہونے پر لوگوں کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ "یہ ہوا نا دودھ کا دودھ پانی کا پانی"!!

اس محاورے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا انصاف جس میں مناسب اور نامناسب باتیں صاف صاف سامنے آجائیں اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک بار ایک مال دار آدمی نے گوالے کو کئی من دودھ سپلائی کرنے کا آرڈر دیا۔ گوالوں نے دودھ کی مقدار کو پورا کرنے کے لیے اس میں پانی ملا دیا۔ دودھ میں پانی کی ملاوٹ کو لے کر گوالوں اور خریدار کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ خریدار کا کہنا تھا کہ دودھ میں پانی ملا ہوا ہے اور گوالے کہتے تھے کہ ایسا نہیں ہے۔ آخر میں دونوں فریاد لے کر حاکم کے پاس گئے۔

حاکم نے دونوں کی بات سنی اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد خریدار سے کہا کہ "تم فکر مت کرو! اگر دودھ میں پانی ملا ہوا ہوگا تو میں اسے الگ کر دوں گا۔"

حاکم کے انصاف کو دیکھنے کے لیے سارا شہر جمع ہو گیا۔ حاکم نے جوار کے سرکنڈے (ڈنٹل) منگوائے اور انھیں چھلوا کر ان کے ٹکڑوں کو دودھ میں ڈلوا دیا۔ جب یہ ٹکڑے پھول گئے تو ان کو علاحدہ برتن میں نچڑوایا۔

رفتہ رفتہ برتن پانی سے بھرنے لگا۔ حاکم نے یہ عمل اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ سرکنڈوں سے دودھ نکلنا شروع ہوا۔ اس کے بعد حاکم نے دودھ اور پانی کا وزن کروایا۔ یہ مقدار ٹھیک اتنی ہی تھی جتنا کہ کل دودھ تھا۔

حاکم نے گوالوں سے پانی کی مقدار کا دودھ خریدار کو دلوایا اور انھیں بے ایمانی اور ملاوٹ کی سزا دی۔ بس اسی دن سے "دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی" محاورے کی ابتدا ہوئی!!!

(ہندی سے)

اردو حال حمایت نگر۔ حیدر آباد

بڑھئی کے بے ترتیب اوزار

اب آپ ان کے نام بتائیے

بادشاہ اور دھوبی

احمد جمال پاشا

کسی زمانے میں کوئی بادشاہ سخت جاڑوں میں برف گاڑی سے کوئی دریا پار کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا ایک آدمی برفیلے ٹھنڈے پانی سے کپڑے دھو رہا تھا۔ بادشاہ نے برف گاڑی روک دی اور پوچھا۔

"پانچ سے سات کی ضرورت کیوں نہیں پوری ہوجاتی؟"

دھوبی نے جواب دیا۔

"اس لیے کہ بتیس انتظار تھوڑی کر سکتے ہیں۔"

بادشاہ نے بہت دماغ دوڑایا مگر جواب سمجھ میں نہ آیا۔ مجبوراً دھوبی کو حکم دیا کہ وہ اگلے روز دربار میں حاضر ہو۔ دربار میں

دربار میں بادشاہ نے پوچھا

"کل میں نے تم سے جو بات کہی تھی اس کا مطلب بتاؤ۔؟"

دھوبی نے کہا۔

"پانچ کا مطلب گرمی کے پانچ مہینے اور سات کا مطلب جاڑوں کے سات مہینے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔

"تم نے جو جواب دیا اس کا کیا مطلب تھا؟"

دھوبی بولا۔

"میں نے بتیس کہا تھا جس کے مطلب دانت تھے۔ گرمی کے پانچ مہینوں میں اتنی آمدنی نہیں ہوتی کہ بتیس دانت سال بھر کھا سکیں۔ اس لیے مجھے جاڑوں کے سات ماہ بھی کام کرنا پڑتا ہے۔"

بادشاہ دھوبی کی حاضر جوابی پر بہت خوش ہوا اور دھوبی کو پچاس اشرفیاں انعام دیں۔ مگر شرط یہ لگادی کہ "جب تم اپنے بادشاہ کی صورت بار بار دیکھ لو تبھی ان میں سے ایک اشرفی خرچ کر سکتے ہو۔"

دھوبی بادشاہ کا شکریہ ادا کرکے لوٹا۔ اس نے اپنے اور اپنی بیوی بچوں کے گرما گرم کپڑے خریدے۔ دودھ، انڈے مکھن، پنیر اور مزیدار چیزیں گھر بھر کھانے لگا۔ سب خوشی خوشی زیادہ محنت سے کام کرنے لگے۔ ان کی آمدنی بڑھ گئی۔ ان کے بچے اسکول میں پڑھنے جانے لگے اور انھیں پتا بھی نہ لگا کہ کب ساری اشرفیاں ختم ہوگئیں۔

دھوبی کا پٹی دار اس کی خوش حالی اور ترقی سے جل بھن کر کباب ہو رہا تھا۔ اس نے بادشاہ سے دھوبی کی چغلی کھائی۔

بادشاہ نے دھوبی کو دربار میں طلب کیا اور غصے سے کہا "تم اپنی بات سے کیوں پھر گئے۔؟" دھوبی نے کہا "بادشاہ سلامت ہر اشرفی خرچ کرنے سے پہلے دس بار اشرفی پر آپ کی صورت دیکھی اور آپ کا حکم پورا کیا۔" بادشاہ دھوبی کی حاضر جوابی پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے دھوبی کو انعام میں سو اشرفیاں اور دیں اور شاہی دھوبی مقرر کر دیا۔ ●

کوٹھی نشاط افزا سیوان۔ بہار

آگ پانی کا کھیل

کسی وقت کی بات ہے کہ ایک فقیر نے ایک بادشاہ کے بارے میں یہ شہرہ سُنا کہ وہ بہت ہی نیک مزاج ہے اور اپنی رعایا کا بے حد خیال رکھتا ہے۔ فقیر کو بادشاہ کی ان خوبیوں کا یقین نہ آیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بادشاہت صرف سیاست کے سہارے خزانے بھرنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ بادشاہت اور رعایا کی خدمت کا جذبہ ایک جا کس طرح ہوتے ؟ وہ اس بھید کو جاننے کے لیے بادشاہ کے عالی شان محل پر پہنچا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ شاید کہیں کوئی پہرہ دار ہو مگر وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ سیدھا محل کے اندر داخل ہوگیا۔ ایک غیر شخص کو اپنے محل میں دیکھ کر بادشاہ کی ابرو پر بل تک نہیں پڑے۔ اس نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ فقیر کو اپنے پاس بٹھا لیا اور آنے کا سبب دریافت کیا۔

فقیر! "دُور دُور تک آپ کی شہرت پھیلی ہوئی ہے، آپ کی حکومت میں آگ پانی ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں۔ یہی تماشا میں اپنی آنکھوں سے دیکھنے آیا تھا۔"

بادشاہ فقیر کی بات تاڑ گیا اور مسکرا کے پوچھا پھر دیکھ لیا تماشا ؟
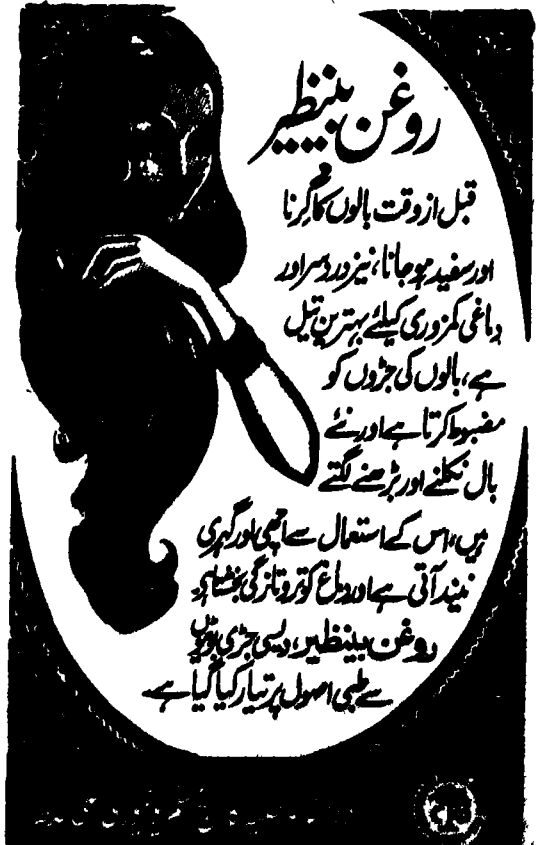
ہاں! ۔ فقیر بے دردکا سے بولا اور یہ شعر پڑھ کے جانے لگا ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ۔ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

"ٹھہرو، بابا" بادشاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی تم نے تماشا دیکھا ہی کہاں ہے ؟ میں ابھی دکھائے دیتا ہوں۔"

فقیر کو ٹھہرا کے بادشاہ نے شہر میں منادی کرادی۔ آج خاص اہتمام کے ساتھ شہر کے کوچہ و بازار آراستہ کیے جائیں، بہت دور سے ہمارا ایک مہمان آیا ہوا ہے جو سارے شہر کی سیر کرے گا۔

بادشاہ کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کوچہ و بازار دلھن کی مانند سج گئے۔ اس کے بعد بادشاہ نے فقیر کو بلایا۔ پانی سے بھرا ہوا ایک کٹورا دیا اور کہا۔ "جاؤ شہر اور بازار میں گھوم گھام کے آؤ مگر خیال رہے پانی کی ایک بوند بھی گرنے نہ پائے ورنہ تمھاری خیر نہیں۔"

فقیر نے دل میں سوچا : یہ عجیب نادر حکم ہے اور وہ غریب تماشا دیکھنے سے بھی انکار نہ کرسکتا تھا۔ ناچار شہر کی جانب روانہ ہوا ہاتھ میں کٹورا لیے اسی پر نظریں جمائے سارا شہر گھوما اور جب سیر پوری ہوچکی تو پسینے میں نہائے ہوئے بادشاہ کے حضور میں پہنچا۔

بادشاہ اسے اس حال میں دیکھ کے مسکرایا اور پوچھا۔ "کہو، بابا ! آج شہر تو بڑے سلیقے سے آراستہ پیراستہ تھا نا ؟ ۔ بتاؤ تم نے اپنی آنکھوں سے کیا کیا دیکھا اور تمھیں کون کون سی چیزیں پسند آئیں۔"

فقیر غصّے سے بولا: "او ستم ظریف! تو نے مجھے شہر کے قابل رکھا کب تھا؟ سر پر ننگی تلوار لٹک رہی تھی اور میں اپنی زندگی کی خیر منا رہا تھا کہ کٹورے ہوئے پونڈ پانی بھی چھلکنے نہ پائے۔"

بادشاہ نے زوردار قہقہہ لگایا اور دریافت کیا۔ "کیوں اب بھی تم نے سمجھا یا نہیں کہ آگ پانی کا کھیل کیا ہے؟"

فقیر کے منہ پر تالا سا لگ گیا، وہ ہکا بکا ہو کے ٹکٹکی باندھے بادشاہ کو دیکھتا رہا۔

بادشاہ نے پھر فرمایا: "ہاں! یہی بھید ہے رعایا کی خدمت کی لگن اور حکومت کے نظام کے اکٹھا ہونے کا۔ اگر دل میں خدا کا ڈر اور اس کے بندوں کی خدمت کا جذبہ ہو تو پھر حکومت کا کوئی لالچ بادشاہ کو انصاف کے راستے سے ہٹا نہیں سکتا۔" ●

بچوں کے لیے مزیدار اور دلچسپ کہانیاں

کتاب	مصنف	قیمت
جوہر قابل	مسعود احمد برکاتی	۳/-
بھوتوں کا جہاز	ڈاکٹر شمیم حنفی	۶/-
خرگوش کی چال	آصفہ مجیب	۲/۵۰
نار کی تلاش	ریاض احمد خاں	۶/۵۰
محمد شفیع الدین نیر	ڈاکٹر اطہر پرویز	۶/-
اس نے کیا کرنہ جانا	آصفہ مجیب	۱/۲۰
دُم کٹا سانپ	محمد قاسم صدیقی	۱/-
صحت کی الف بے	مسعود احمد برکاتی	۳/-
موم کا محل	پروفیسر محمد انس	۴/-
پہیلیاں	ڈاکٹر سیفی پریمی	-/۸۰
چھوٹا لڑکا	عبدالغفار مدھولی	۱/۵۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	۱/۵۰
شہزادہ اور ٹھگ		۲/-
لال مرغی	عبدالواحد سندھی	۱/۵۰
چمپاوت کا آدم خور شیر	محمد معین	۱/۵۰
ایک کٹوری تیل میں راجا جی	اسرار ندوی	۱/۵۰
چوری کی عادت	عبدالغفار مدھولی	۲/-
دادا نہرو	منور لکھنوی	۵/-
تانبیل خاں	محمد حسین حسّان جامعی	۱/۵۰
میگھ نگر کا راجا	ریاض احمد خاں	۱/۲۵
سرکس	ڈین گیسیر	۱/۵۰
سُرخ جوتے	بیگم قدسیہ زیدی	۲/۵۰
پلک نہ مارو	یوسف ناظم	۲/-
جن حسن عبدالرحمٰن	قرۃ العین حیدر	۵/-
تین اناڑی	عصمت چغتائی	۳/-
چنبیلی	محمد حسین حسّان	-/۸۰
امیر خسرو	سلمیٰ اجمیری	۵/۵۰

ڈاکٹر کے بھکتیہ وتسل راؤ

چاچا نہرو

چودہ نومبر پنڈت نہرو کا جنم دن ہے۔ یوم اطفال منایا جاتا ہے سارے ہندستان میں۔ ہر شہر کے مرکزی مقام پر جلسہ کرتے ہیں۔ کھیل وکود میں جوش و خروش سے حصّہ لیتے ہیں۔ میدان میں ورزش کا، جسمانی محنت کا، کھیل کا بڑے پیمانے پر بچے بچیاں کانونٹ کے، اسکول کے مظاہرہ میں حصّہ لیتے ہیں۔ دیکھنے کا سماں رہتا ہے۔ مٹھائی کی تقسیم بھی عمل میں آتی ہے۔ شہر کے معزز عہدہ دار وزیر ریاست کے صدر یا معزز مہمان کی حیثیت سے شرکت کرپاتے ہیں۔ نہرو جی بے حد پیار کرتے تھے۔ بچوں کو۔ لہذا بچے "چاچا نہرو" کہتے تھے۔ نہرو جی کے کارناموں کو یاد کرنے کا دن ہوتا ہے چودہ نومبر۔

پنڈت نہرو کے کارنامے کیا تھے، کیا سیوا کی ہے قوم کے لیے، دنیا کے لیے، انسانیت کی افزائش کے لیے۔ ان تمام کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے اصولوں کی اشاعت ہو، ساتھ ساتھ ہی سمجھ پائیں۔

چاچا نہرو نے ہندستان کی آزادی کے لیے کافی جد وجہد جیل گئے۔ لاٹھیوں کی ماریں کھائیں۔ اپنی خوشیوں کو ٹھوکر لگائی۔ دیش کی خدمت میں لگے رہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ملک کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ قومی منصوبہ بندی کمیشن کے صدر رہے۔ پنج سالہ پلان بنایا۔ رائے دہی کا بندوبست بھی کیا گیا۔ پرامن ماحول میں انتخاب ہوتے گئے۔ جمہوریت کی پرورش ہوئی۔ سائنسی پالیسی کی تمہید بھی کی انھوں نے پارلیمان میں ایک بل کے ذریعے۔ خصوصاً اس زمانے کے بچّوں کو حساب میں بٹاون روپیا، پونڈ، ڈالر میں تبدیل کرنے کی نسبت ڈیسمل کا پنج (اعشاریہ نظام) کو جاری کرنے میں وہ پیش پیش تھے۔ اس سے ہندستان بھر میں لوگوں کو آسانی ہوئی۔ قومی پرجکٹس کی تعمیر عمل میں لائے انھوں نے۔ مثلاً دامودر والی پراجکٹس، بھاکڑا ننگل پراجکٹ ناگارجنہ ساگر پراجکٹ۔ دیش بھر میں آزادی کے بعد فوراً بیس تحقیقی اداروں کی بنیاد بھی ڈالی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندستان کو سائنس کے احا میں آگے بڑھنا ہے۔ ایجادات کو سمجھنا ہے، فیض اٹھانا ہے۔ انسانوں کی بھلائی کے لیے۔

پنڈت نہرو ایک ادیب تھے۔ ایک مصنف تھے ایک قلمکار تھے۔ قدرت کا بھی وسیع مطالعہ کرتے تھے۔ اپنی بیٹی شریمتی اندرا گاندھی کو لکھے ہوئے خطوط انگریزی ادب میں سرمایہ ہیں۔ "ڈسکوری آف انڈیا" پنڈت نہرو کی خاص تصنیف ہے۔ جس کی عالمی شہرت ہے اس میں تہذیب کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخ کا۔ دورِ حاضر کے حالات کا جائزہ بھی ہے۔ عالمی امن کے پیامبر تھے۔ وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ عالمی سفیر تھے۔ ترقی یافتہ ممالک مثلاً روس، امریکہ، فرانس، انگلستان کا دورہ کیا۔ دنیا کے سربراہوں سے، سیاست دانوں سے، حکمرانوں سے، سائنس دانوں سے ان کا ربط تھا۔ ہر ایک ان کو چاہتا تھا کیونکہ وہ انسانیت کے علمبردار تھے۔

قومی یک جہتی کے لیے بھرپور کوشش کرتے رہے۔ وہ

B/۱/۴/۴-۱۱-۲-۲ پوسٹ آفس لین۔ نیو نالا کنٹا حیدر آباد (اے۔ پی)

ہمیشہ کہتے تھے کہ کوئی بھی فرد کسی کام کرنے سے پہلے یہ سوچے کہ اس میں بھلائی کس حد تک ہے۔ سرکاری کاموں میں لگے رہنے کے باوجود معیاری کتابوں کا چاہے فن یا سائنس کے ہوں مطالعہ کرتے تھے۔ رات کے ۲ بجے تک بھی پڑھتے رہتے تھے فوراً صبح ۵ بجے اٹھ کر گھوڑ سواری کرتے تھے اور میدان میں ٹہلا کرتے تھے۔ پھر آنے والوں کا ہجوم لگ جاتا تھا۔ تین مورتی مارگ میں۔ اب وہاں پر نہرو میوزیم قایم کیا گیا ہے۔ انھیں کی بدولت سائنسی مزاج کی ابتدا ہوئی۔ ہندستان کے بیشتر لوگوں میں۔ نہرو کے نام پر بمبئی میں نہرو سائنس سنٹر کی ابتدا ہوئی۔ جس کی طرف سے آج کل سائنس ایج" رسالہ شائع کیا جاتا ہے۔

پنڈت نہرو ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ سلیس بیانات بھی دیا کرتے تھے اس میں بھرپور مطالعہ وہ پاتا تھا۔ تنقید و تبصرہ کے ساتھ "نیشنل ہرالڈ" انگریزی روزنامہ کی بنیاد ڈالی۔ اس اخبار کے مدیر مشہور صحافی چلپتی راؤ رہ چکے ہیں۔ منظر نگاری میں ان کا دخل رہا ہے۔ کنیا کماری کے پاس تین سمندروں کا ملنا بھی، کشمیر کا ڈل جھیل کی خوب صورتی کا بھی ان کی تصانیف میں ہیں۔ ان کے نگارشات تاریخی دستاویز ہیں۔

چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو رات کے بارہ بجے جب ہندستان کو آزادی ملی تو پنڈت نہرو نے ممبران کانسٹونٹ اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جب تمام دنیا سوئی ہوئی ہے۔ ہندستان جاگ رہا ہے آزادی حاصل ہوئی ہے ٹھیک رات کے بارہ بجتے ہی"

'WHEN THE WORLD SLEEPS INDIA WILL AWAKE TO LIFE AND FREEDOM AT THE STROKE OF MID NIGHT HOUR"

گو پنڈت نہرو ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے ایک لیڈر، مدبر، کارکن، رہنما، ادیب، محب وطن، صاحب رائے، سربراہ، قلمکار، آزادی کے سپہ سالار، امن کے پیامبر کی طرح ہیں۔ آئے دن ہر ایک شہری خصوصاً بچے بچیاں ان کے کارناموں کا مطالعہ کریں، جائزہ لیں، تجزیہ کریں، یہی خراج عقیدت ہو سکتا ہے چودہ نومبر کے دن دیش کے لوگوں کو، بچوں کے یاد کرنے کا نادر موقع ہے یوم اطفال ہی نہرو کا جنم دن ہے۔ بھرپور محبت سے، نہرو جی کو سمجھنے کا، یاد کرنے کا دن ہے۔●

منّی کی گڑیا

کشور جہاں

اب یہ قصہ سن لو یارو!
ایک تھی منّی پیاری پیاری
ایسی تھی گڑیا کی صورت
آخر یہ منّی نے سوچا
آؤ چل کر سب کو بلائیں
منّی، چُنّی، روبی، سیما
بیاہ تو ہوگا پھر بھی لیکن
لاٹری آخر کار اک نکلی
چُنّی، مُنّی بنیں گی سمدھن
دھوم دھام سے ہوگی شادی
ڈھول اور باجے بجنے لگے ہیں
سب نے مل کر کھانا کھایا
گڑیا گڈے ہو گئے رخصت

میرے پیارے بھائیو بہنو!
اس کی تھی اک گڑیا رانی
جیسے ہو چینی کی مورت
بیاہ رچے تو کیا ہو اچھا
گڑیا کا پھر بیاہ رچائیں
لے آئیں گڈا اور گڑیا
کون بنے گی کس کی سمدھن
جس میں لکھا تھا چُنّی منّی
روبی، سیما ہوں گی مراثن
ہاتھی گھوڑے ہوں گے براتی
بستی والے بجنے لگے ہیں
بچوں نے اودھم سا مچایا
آ گے اپنی اپنی قسمت

قاضی بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱، اڑیسہ، انڈیا

بچوں کے لیے نئی اور دلچسپ کتابیں

کہانیاں، معلوماتی، سوانح

کتاب	قیمت
چپاوت کا آدم خور شیر	۱/۵۰
چھوٹا لڑکا	۱/۵۰
نیلا ہیرا	۴/۵۰
چیونٹی رانی	۱/۵۰
پھر میں چگوں کیا خاک	۱/۵۰
بی مینڈکی اور توتا	۱/۵۰
چھپرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
لومڑی کا گھر	۱/۵۰
بندر اور نائی	۲/۵۰
جادو کا گھر	۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں	۱/۵۰
ہیتو جیتو	۱/۵۰
پانچ بونے	۱/۵۰
تاک دِنا دِن تاکے سے	۱/۵۰
مدورانا پردیس چلے	۱/۵۰
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	۱/۵۰
پکڑو دم کٹے کو	۱/۵۰
لال امرائی	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی	۱/۵۰
جن حسن، عبدالرحمٰن (اول)	۲/۵۰
جن حسن، عبدالرحمٰن (دوم)	۲/۵۰
الو کھاتو باب خانہ (اول)	-/۵۰
الو کھاتو باب خانہ (دوم، سوم، چہارم) فی حصہ	-/۵۰
گلد بوچو بیا اور غبارے	۱/۵۰
ایک طالب علم کی کہانی	۲/۰۰
آؤ ڈراما کریں	۲/۰۰

کتاب	قیمت
محمد شفیع الدین نیر	۷/۵۰
ہار کی تلاش	۶/۰۰
موم کا محل	۴/۰۰
اس نے کیا کرنہ جانا	۱/۲۰
خربوزہ شہزادے کا سربن گیا	۱/۵۰
ایک کچھوا تیل میں	۱/۵۰
چوری کی عادت	۲/۰۰
دادا نہرو	۵/۰۰
بچوں کے اقبال	۴/۵۰
دم کٹا سانپ	۱/۰۰
پہیلیاں	-/۸۰
تین اناڑی	۳/۰۰
میگھ نگر کا راجا	۱/۲۵
سندر چنار	/۷۵
کھیل سنسار (نظمیں)	۴/۵۰
جوہر قابل	۳/۰۰
میر انیس	۲/۰۰
چنبیلی	۱/۲۰
شہزادہ اور ٹھگ	۲/۰۰
خرگوش کی چال	۲/۵۰
چٹانوں کی کہانی	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۰۰
خرگوش کا سپنا	۵/۰۰
شیر خاں	۱/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۱/۵۰
بہادر	۲/۵۰

کتاب	قیمت
میاں دھینوں کے بچے	۱/۵۰
لومڑی کے بچے	۱/۵۰
تانبیل خاں	۱/۵۰
صحت کی الف بے	۳/۰۰
دھنک (نظمیں)	۳/۰۰
گلابو چوہیا اور پری زاد	۲/۰۰
جلو مرغابی	۳/۰۰
وطن کے جاں نثار	۳/۰۰
سرکس	۱/۵۰

مذہبی کتابیں

کتاب	قیمت
ہمارا دین (اول)	۶/۰۰
ہمارا دین (دوم، سوم) فی حصہ	۶/۰۰
یسرنا القرآن	۲/۲۵
اسلام کیسے شروع ہوا	۴/۵۰
ہمارے رسول	۴/۰۰
ہمارے نبی	۲/
اسلامی عقائد و مسائل مذہب	۶/۰۰
قرآن پاک کیا ہے	۳/۰۰
اللہ کا گھر	۳/۰۰
عقائد اسلام	۱/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء	۲/۰۰
چار یار	۴/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰۰
سرکار دو عالم	۳/۰۰
اسلام کیسے پھیلا (حصہ اول)	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا (حصہ دوم)	۴/۵۰
خلفاء اربعہ	۶/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵

وکیل نجیب

وہ زمانہ یاد ہے

میٹرک کے امتحان میں شاگرد امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا ہے اچانک اس کی ملاقات پرائمری کے استاد سے ہوتی ہے اس وقت کی گفتگو۔

استاد:۔

دیر سے تیرا سدا اسکول آنا یاد ہے
روز ایک جھوٹا بہانا بھی بتانا یاد ہے
میں اگر تجھ کو سزا دینے کبھی آگے بڑھوں
تیرا اٹھ کر بے تحاشا بھاگ جانا یاد ہے
اپنی کرسی پر کبھی وہ تھک کے سو جانا مرا
چپکے چپکے وہ تیرا سیٹی بجانا یاد ہے
وہ میرا تجھ کو کھڑا کرنا کبھی اسٹول پر
اور کبھی غصے میں وہ مرغا بنانا یاد ہے
ایک دن تھی دیر اک گھنٹے کی چھٹی میں مگر
جا کے چپکے سے ترا گھنٹی بجانا یاد ہے

شاگرد:۔

ہم نے جو کچھ بھی کیا وہ بھول جانا یاد ہے
ہر سبق بچوں کو شفقت سے پڑھانا یاد ہے
میں بہت نادان تھا باتیں سمجھتا کس طرح
آپ کا ہر شے کو سمجھا کر سکھانا یاد ہے
بھاگ کر اسکول سے وہ کھیلنا میدان میں
آپ سے، والد سے، اپنی مار کھانا یاد ہے
آپ کا احسان ہے مجھ پر اے میرے محترم
آپ کا جی جان سے مجھ کو پڑھانا یاد ہے
آپ سے حاصل ہوئی ہے علم کی دولت مجھے
اپنی کم علمی کا وہ سارا فسانا یاد ہے

استاد:۔

بات یہ بچپن میں سب سے بھول ہوتی ہے نجیب
تجھ کو یہ رتبہ ملا تو ہے بہت ہی خوش نصیب

نجیب منزل، مومن پورا۔ ناگپور

مولانا اجتبا ندوی

مسجدِ اقصیٰ

قسط ۲

ہیرودس نے ھیکل کے اصل نقشے میں کچھ تبدیلی بھی کردی۔ اور اسے سیاست و عدالت کا مرکز بنا دیا، اس سے ہیکل بڑا، وسیع اور دل کش و دل فریب بن گیا۔

لیکن ہیکل کی یہ آخری بہار تھی، ہیرودس کے بعد جو رومی حاکم اس کے جانشین ہوئے وہ بڑے ظالم اور سخت گیر تھے۔ یہودی ان سے پریشان ہوکر بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہوگئے۔

رومیوں نے بیت المقدس (یروشلم) کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور تین برس تک مسلسل ان کا محاصرہ (گھیراو) جاری رہا۔ لڑائی، بھوک اور فاقہ سے یہودیوں کا بہت سخت جانی و مالی نقصان ہوا، رومی شہر میں داخل ہو گئے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، ہیکل سلیمانی کو توڑ پھوڑ دیا، صرف ایک دیوار ہیکل کی یادگار کے طور پر باقی رکھی، جو بعد میں "دیوار گریہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

یہودی اپنے ہیکل اور مقدس یادگار توریت کی تباہی و بربادی پر اس دیوار کے پاس کھڑے ہو کر آنسو بہاتے اور روتے چلاتے تھے۔

ہیکل کی آخری تباہی اور بے حرمتی اگست ۷۰ء میں ہوئی اور اس کے بعد سے یہودیوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زوال اور بے چارگی کا دور شروع ہوا۔

بعد کے رومی بادشاہوں نے یہودیوں کو وہاں رہنے سے بھی منع کر دیا تھا، اور اس جگہ کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالا کرتے تھے۔ لیکن مسلمان ترکی بادشاہ سلطان سلیم نے وہاں سے گندگی اور کوڑا کرکٹ ہٹوا کر یہودیوں کو دوبارہ رونے کی اجازت دے دی۔ اور جون ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر یہودی قبضہ تک یہ روایت باقی تھی۔

جب رومی بادشاہ قسطنطین عیسائی ہوگیا۔ تو بیت المقدس عیسائی شہر میں تبدیل ہوگیا، اور عیسائیوں کے قدیم ترین گرجا گھر "کنیسۃ القیامۃ" کی تعمیر ہوئی۔ یہ عمارت بڑی مضبوط، فلک بوس، قلعہ نما اور رنگ برنگے شیشوں اور سنگ مرمر سے آراستہ ہے۔

اسی گرجا گھر میں امیر المومنین عمر فاروق ؓ نے عیسائیوں کے امان کے لیے عہد نامہ لکھا تھا جو اس کی لائبریری میں اب تک موجود ہے اور گرجا گھر کے بڑے پادری کے پاس بیت المقدس کی وہ کنجی بھی محفوظ ہے جسے باشندوں نے حضرت عمر ؓ کے حوالے کیا تھا۔

حضرت عمر ؓ گرجا گھر ہی کے اندر تھے کہ نماز کا وقت آگیا، پادریوں نے اسی جگہ نماز پڑھ لینے کی درخواست کی، مگر امیر المومنین نے فرمایا کہ اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو اسے مسجد میں تبدیل کر دیا جائے گا، اور گرجا گھر کے دروازے سے دس قدم ہٹ کر نماز ادا کی، آج وہاں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے، اسلام کی عظمت کا نشان اور اسلام کی رواداری، انصاف و سادگی کی آئینہ دار ہے۔

بیت المقدس کو مسلمان عربوں نے ۶۳۸ء میں فتح

کیا۔ ماریا پہاڑی کے ۳۵ ایکڑ وسیع رقبہ میں "مسجد ابراہیمی" اور "معبد ربانی" کو تلاش کرکے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی، اور بنوامیہ کے تاجدار عبدالملک بن مروان نے مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ کی نئے سرے تعمیر کے لیے اپنی حکومت کے خزانے کھول دیے۔

اس کی تعمیر میں قیمتی پتھر، نادر سنگ مرمر، رنگین اور خوش رنگ اور خوش نما شیشوں کا استعمال کیا۔ دیوار پر خوبصورت حروف میں قرآنی آیتیں کندہ کرائیں۔

پہاڑ ماریا کے پھیلے ہوئے ۳۵ ایکڑ رقبے کو حرم شریف قرار دیا اور اس کے جنوب میں مستطیل شکل میں مسجد تعمیر کی گئی۔ اس کے مشرق میں مسجد عمر اور چند گز کے فاصلے پر مسجد فاطمہ ہے، اس میں صرف عورتیں نماز پڑھتی ہیں، اور مردوں کا داخلہ منع ہے۔

مسجد کے صحن میں ایک حوض ہے جو کبھی وضو کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس سے سو گز کے فاصلے پر قبۃ الصخرہ کے زینے شروع ہو جاتے ہیں۔

صخرہ چٹان کو کہتے ہیں، اسی چٹان سے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج ہوئی تھی، اور یہی مسجد اقصیٰ ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ عبدالملک بن مروان نے اس چٹان پر بہت شاندار خوبصورت اور دل کش اور دل فریب گنبد بنوایا۔

اس کے ٹھیک مشرق میں حضرت سلیمانؑ کی قبر ہے، اور اس سے متصل جنوں کا قید خانہ ہے۔ اس میں حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں قصوروار جنوں کو قید کر دیا جاتا تھا۔

گنبد سے قریب ایک برج میں زنجیر لٹک رہی ہے۔ جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ انصاف کی زنجیر ہے۔

گنبد کے مغربی جانب ایک کمرہ میں ہماری جنگ آزادی کے عظیم رہنما اور ہماری جامعہ کے بانی رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ کا مزار ہے۔ آپ کا انتقال لندن میں ہوا تھا۔ مفتی فلسطین الحاج امین الحسینی کی خواہش پر مسجد اقصیٰ کے حرم میں دفن کیے گئے۔

مسجد کے مشرق میں ایک میوزیم ہے اس میں قدیم نادر، نایاب اور قیمتی یادگاریں ہیں، کلام پاک کے خوبصورت اور قدیم نسخے، پرانے زمانے کے برتن بادشاہوں کے لباس اور صخرہ میں جلی ہوئی موم بتیاں بطور نمونہ و یادگار محفوظ ہیں۔

پورا حرم بڑا پُررونق، دل کش، خوش نما، پرسکون، امن و آشتی اور سلامتی کا گہوارہ اور مرکز معلوم ہوتا ہے۔ اس پر سے شہر بہت بھلا لگتا ہے۔ نیچے جنوب میں گہری گھاٹیاں اور وادیاں ہیں، جن میں جا بجا پانی کے چشمے غاروں میں سے بہتے ہیں۔ کہیں کہیں قدیم گرجا گھروں، عبادت گاہوں اور عمارتوں کے کھنڈر اور ملبے بھی نظر آتے ہیں۔

شمال مشرق میں پُرامن قدیم شہر بیت المقدس ہے اور اس مقدس شہر میں عرب مسلمان اور عیسائی رہتے ہیں۔ جنوب مشرق میں نیا یروشلم ہے۔ جدید طرز کی نئی اور خوبصورت عمارتیں، بلند گھنٹہ گھر، اونچی عبادت گاہیں ہیں۔ یہ حصہ یہودیوں کا ہے اور نام نہاد اسرائیلی حکومت کے قبضے میں ہے۔

قدیم اور جدید شہر کے درمیان ایک قد آدم دیوار تھی۔ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہودیوں نے پرانے شہر پر قبضہ کرکے دیوار توڑ دی۔

منصوبہ یہ ہے کہ قدیم و جدید شہر ملا کر یہودی شہر بنا دیا جائے، اور مسلمانوں اور عیسائیوں کی مقدس یادگاروں کو توڑ پھوڑ کر نئے سرے سے ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کو تلاش کیا جائے اور اس پر ہیکل تعمیر کیا جائے۔ یہ منصوبہ اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کی صبح، ۷ بجے مسجد اقصیٰ میں آگ لگانا اس منصوبے کی پہلی کڑی تھی۔ اس مجرمانہ حرکت سے نہ صرف مسجد کی بے حرمتی ہوئی بلکہ مسجد کے

بقیہ ص ۲۹ پر

محمد شریف خاں

ہماری کائنات

بچو! کیا تم جانتے ہو کہ ہماری کائنات کتنی بڑی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس سے نہ تم واقف ہو نہ کوئی اور کہ یہ بتا سکے کہ کائنات کتنی بڑی ہے۔ اتنا ہم لوگ ضرور جان سکے ہیں کہ اس میں بے شمار اجرام فلکی ہیں۔ یہ اجرام فلکی دو قسم کے ہیں۔

کیا تم یہ جانتے ہو کہ ان اجرام فلکی میں کچھ ایسے ہیں جو خود اپنی روشنی دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو دوسروں کی روشنی تم کو دیتے ہیں خود اپنی روشنی نہیں دیتے۔ پہلے قسم کے اجرام فلکی سورج یا ستارے کہلاتے ہیں اور دوسری قسم کے سیارے کہلاتے ہیں۔

تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہماری کائنات کا ایک شمسی نظام ہے جس میں سورج اور اس کے خاندان کے نو سیارے شامل ہیں۔ ان سیاروں کی شکل ایک بڑی گیند کی طرح گول ہے۔ سورج تو اپنی جگہ پر جما ہوا ہے اور سیارے اس کے چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں۔ ایک بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ سیارے ہزاروں سال سے گھوم رہے ہیں مگر اپنا راستہ کبھی نہیں بھولتے۔ اگر خدا نخواستہ یہ کبھی اپنا راستہ بھول جائے اور کسی دوسرے کے راستے پر آ جائے تو ان کی ایسی ٹکر ہوگی جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہماری دنیا میں چلنے والی گاڑیوں کی جو ٹکر ہوتی ہے اس کے نقصانات سے تو تم خوب واقف ہو گے۔ مگر اس ٹکر سے ہونے والے نقصان کا اندازہ تم لگا سکتے ہو نہ ہم لگا سکتے ہیں۔

ایک اور خوبی کی بات ہے کہ یہ سیارے بغیر روشنی کے گھومتے ہیں، ان کو جو کچھ روشنی اور گرمی ملتی ہے وہ سورج سے ملتی ہے۔ ہم لوگوں کو بغیر روشنی اور گرمی کے گھومنا کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے مگر یہ لاکھوں سال سے ایسا ہی کر رہے ہیں۔ ان سیاروں میں جو سب سے بڑا ہے اس کا نام مشتری ہے۔ اور جو سیارہ سب سے چھوٹا ہے اس کا نام عطارد ہے۔ ہماری دنیا جو تم کو اتنی بڑی لگتی ہے۔ وہ ان سیاروں میں پانچویں نمبر پر آتی ہے۔ ان کے علاوہ جو اور سیارے ہیں ان کے نام ہیں۔ زہرہ، مریخ، زحل، یورانس، نیپ ٹیون اور پلوتو۔

ان سیاروں میں کچھ سورج سے بہت دور ہیں اور کچھ بہت نزدیک۔ جو سیارے سورج سے بہت دور ہیں اور ان میں سورج کی روشنی بھی کم ہے اور گرمی بھی کم اور جو سیارے سورج سے قریب ہیں ان کی روشنی بھی زیادہ ہے اور گرمی بھی زیادہ۔ جو سیارہ سورج سے سب سے قریب ہے اس کو عطارد کہتے ہیں اور جو سب سے زیادہ دور ہے اس کو پلوتو کہتے ہیں۔

ہمارے شمسی نظام میں سب سے بڑی اہمیت

شعبۂ تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

چاند کی ہے۔ جس طرح سورج کے ساتھ بہت سے سیارے ہیں اسی طرح کچھ سیاروں کے ساتھ بہت سے چاند ہیں۔ ہماری زمین کے ساتھ صرف ایک چاند ہے۔ مگر مشتری کے ساتھ تیرہ چاند ہیں جبکہ زحل کے ساتھ نو چاند ہیں۔ یورانس کے ساتھ پانچ چاند ہیں۔ عطارد اور پلوتو کے ساتھ کوئی بھی چاند نہیں ہے۔

ہمارے شمسی نظام میں سورج کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ یہ آگ کے ایک بڑے گولے کی مانند ہے۔ تم کو یہ اپنی زمین سے بہت چھوٹا سا نظر آتا ہے مگر یہ تمھاری زمین سے کئی گنا بڑا ہے۔ لیکن تمام سیاروں میں ہماری زمین ہی ایسی ہے جہاں پانی اور ہوا اس مقدار میں ہے کہ زندگی آسانی سے گزاری جا سکتی ہے۔ ●

باقی ص ۲۷ کا

جنوبی حصے کو شدید نقصان پہنچا، اس کے قیمتی جھاڑ فانوس، عمدہ زرکاری، اور نقش و نگار اور قیمتی سرمایہ، سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کا یادگار نشان اور شاندار و نادرۂ روزگار منبر جل کر خاکستر ہو گیا۔

یہ مسجد اقصیٰ نہ صرف مسلمانوں کا قبلۂ اوّل ہے بلکہ خدا کے بیشتر پیغمبروں، بزرگوں، ولیوں اور بادشاہوں اور سلاطین کی دعوت و تبلیغ فتح و نصرت، تعمیر و آرایش، تمناؤں، امنگوں اور دعاؤں کی جولاں گاہ اور مرکز رہی ہے۔ اس کی بے حرمتی ان سب کی بے حرمتی ہے۔ اور اس کی بے عزتی و تخریب ان سب کی دل آزاری اور ان کی آرزوؤں کا خون ہے۔ ●

ہم ہندستانی ہیں

نشاط کشتواڑی

ہمیں گلشن سجانا ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں
یہیں اپنا ٹھکانا ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں

رہیں گے ہم محبت سے محبت اپنا ایماں ہے
کدورت کو مٹانا ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں

اگر کوئی مصیبت اور آفت سامنے آئے
تو اس پر مسکرانا ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں

دلوں کو جیتنا ہے آج اخلاص و محبت سے
یہی جوہر دکھانا ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں

نشاط اب امنِ عالم کے علم بردار بن جاؤ
اگر یہ گیت گانا ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں

محلہ جامع مسجد کشتواڑی (جموں و کشمیر)

جناب معین الدین احمد صاحب ندوی

ہمارے نبیؐ بچوں کے ساتھ

تم نے اپنے بزرگوں کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم (اللہ نے ان پر درود و سلام بھیجا) کا پاک ذکر کرتے وقت رحمۃ اللعالمین کا لفظ سنا ہوگا۔ شاید تم میں سے بہت سوں کو اس کا مطلب نہ معلوم ہو۔ اچھا آؤ آج ہم تمھیں بتائیں۔ اس لفظ کے معنی ہیں ساری دنیا کے لیے رحمت اور محبت۔ یعنی ہمارے پیارے نبی کے دل میں رحم، محبت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لوگوں کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو اپنی مصیبت اور پریشانیاں سمجھتے تھے۔ انھیں دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دکھ سکھ میں کام آتے تھے اور رنج و غم کے شریک تھے۔ انسان تو انسان جانوروں تک کو تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے لوگوں کو جانوروں کے ساتھ بے رحمی کے سلوک سے منع کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ اچھا سلوک، ان سے محبت اور انھیں دانہ گھاس اور چارہ کھلانا، انھیں آرام سے رکھنا ثواب کا کام بتاتے تھے

اب تم ہی اندازہ کرو کہ ایسے محبت والے نبی کا برتاؤ بچوں سے کیسا ہوگا۔ آج تمھارے پیام تعلیم میں ہم اسی کے بارے میں کچھ لکھ رہے ہیں۔

اللہ میاں نے اولاد کو دنیا کی زینت کہا ہے اور یہ بالکل سچ ہے۔ اسی لیے ہمارے نبی کو اپنی اولاد اور دوسرے بچوں سے بڑی ہی محبت تھی۔ فرمایا کرتے دنیا ایک باغ ہے اور بچے اس باغ کے پھول ہیں کہ ان سے سارا گھر مہکتا ہے۔ اور بھائی حقیقت بھی یہی ہے، دیکھو جو گھر بچوں یعنی تم سے خالی ہو وہ کیسا اُداس معلوم ہوتا ہے۔

جو لوگ بچوں کے ساتھ پیار اور محبت سے پیش نہ آتے آپؐ انھیں اچھا نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ بچوں کو پیار کر رہے تھے ایک بدو آیا، ذرا اجڈ سا تھا۔ کہنے لگا، تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو، میرے دس بچے ہیں لیکن میں کسی کو منہ نہیں لگاتا۔ آپ نے فرمایا: "اگر اللہ تعالیٰ تمھارے دل سے محبت چھین لے تو میں کیا کروں"

نماز میں بھی آپؐ بچوں کا خیال رکھتے تھے اس زمانے میں عورتیں بھی جماعت کے ساتھ ہی نماز پڑھتی تھیں۔ ایسی حالت میں کسی بچے کے رونے کی آواز سن لیتے تو نماز کو مختصر کر دیتے کہ ماں کی علاحدگی سے بچے کو تکلیف نہ ہو۔

آپ کی ایک نواسی امامہ تھیں انھیں نماز میں بھی جدا نہ کرتے اور انھیں لیے لیے نماز پڑھتے، رکوع اور سجدے میں جاتے تو گود سے اتار کر پاس بٹھا دیتے کھڑے ہونے کے بعد پھر اٹھا لیتے

حضرت حسنؓ و حسینؓ کے ساتھ آپ کو بڑی محبت تھی۔ انھیں اپنے کندھوں پر سوار کر کے نکلتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت حسنؓ یا حسینؓ کو اس حالت میں دیکھ کر کہا "میاں صاحبزادے تمھاری سواری کتنی اچھی ہے"، رسول اللہ نے فرمایا "سوار بھی تو کتنا اچھا ہے"۔

ایک مرتبہ آپؐ خطبہ دے رہے تھے کہ اتنے میں حسنؓ و حسینؓ سرخ کرتا پہنے خراماں خراماں آتے دکھائی دیے۔ ان کو دیکھ کر آپ منبر سے اتر آئے اور دونوں کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ آپ کبھی کبھی انھیں چادر میں چھپا کے نکلتے۔ ایک مرتبہ ان کو چھپائے ہوئے تھے۔ ایک صحابی نے پوچھا۔ یا رسول اللہ چادر میں کیا ہے، آپ نے اس کو کھولا تو دو خوبصورت کھلونے (حسنؓ و حسینؓ) نکلے۔

آپ کے اس لطف و محبت کی وجہ سے دونوں بھائی آپ سے بہت شوخ ہوگئے تھے۔ جہاں آپ کو دیکھتے دوڑ کر گلے سے لپٹ جاتے۔ کبھی سینے پر چڑھ جاتے، کبھی کندھوں پر سوار ہو جاتے کبھی کبھی تو نماز کی حالت میں بھی شوخی سے باز نہ آتے، لیکن رسول اللہ صلعم برا نہ مانتے۔ رکوع کی حالت میں دونوں ٹانگوں کے درمیان گھس جاتے۔ آپ ٹانگیں پھیلا کر ان کے نکلنے کا راستا بنا دیتے۔ کبھی سجدے میں اُچک کر پیٹھ پر سوار ہو جاتے آپ ان کے گرنے کے خیال سے اس وقت تک سر نہ اٹھاتے جب تک دونوں اتر نہ جاتے۔

غلاموں کے بچوں کے ساتھ بھی اسی لطف و محبت کا برتاؤ تھا۔ آپ کے ایک غلام زید بن حارثہ تھے۔ ان کے بچّے اسامہ کو حسنؓ کے ساتھ زانوں پر بٹھا کر دونوں کے لیے دعا کرتے

غیر بچوں کے ساتھ بھی اسی لطف و محبت سے پیش آتے تھے۔ جس کا بچہ مل جاتا پیار کرتے اس سے لطف و محبت کی باتیں کرتے۔ جب کہیں باہر سے تشریف لاتے تو جو بچہ راستے میں مل جاتا اُسے اپنے ساتھ سواری پر بٹھا لیتے۔ فصل کا کوئی نیا میوہ آتا تو جو سب سے چھوٹا ہوتا اسے پہلے مرحمت فرماتے۔ جب کوئی ایسا تحفہ آتا جو بچوں کے لائق ہوتا تو اسے سب سے چھوٹے بچّے کو عنایت فرماتے۔ ایک مرتبہ کہیں سے کپڑے آئے، ان میں بچوں کے لائق سیاہ آنچل کی چادر تھی۔ اسے آپ نے ایک چھوٹی بچی امِ خالد کو بلا کر اڑھایا اور اس کے بوٹے امِ خالد کو دکھا کر حبشی زبان میں (یہ بچی حبشہ میں پیدا ہوئی تھی اور حبشی زبان سمجھتی تھی) فرمایا "امِ خالد کیسے اچھے بوٹے ہیں۔"

ہجرت کے وقت جب آپ مدینے تشریف لے گئے، تو انصار کی چھوٹی چھوٹی بچیاں آپ کے آنے کی خوشی میں اپنے گھروں سے نکل کر گیت گانے لگیں۔ آپ نے ان سے فرمایا بچیو! کیا تم مجھے پیار کرتی ہو انھوں نے کہا ہاں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا میں بھی تمھیں پیار کرتا ہوں۔

آپ تعلیم تربیت کے لیے بھی بچوں کو ڈانٹتے ڈپٹتے نہ تھے بلکہ پیار سے سمجھا دیتے تھے۔ ایک صاحبزادے کا معمول تھا کہ کھجور کے باغوں میں جا کر خوب ڈھیلے بازی کرتے۔ ایک دن انھیں لوگ رسول اللہ کے پاس پکڑ لائے۔ آپ نے ان سے پوچھا کیوں میاں ڈھیلے کیوں مارتے ہو۔ صاحبزادے ذرا تیز تھے جواب دیا کھجوریں کھانے کے لیے۔ آپ نے فرمایا ڈھیلے نہ چلایا کرو جو کھجوریں زمین پر گر جائیں انھیں اٹھا کر کھا لیا کرو۔ یہ نصیحت فرما کر ان کے سر پہ ہاتھ پھیر کر دعا دی۔

آپ بچوں کو خوش کرنے کے لیے ان سے ہنسی کی باتیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے غلام زید کے لڑکے اسامہ سے مسکرا کر فرمایا "اگر یہ لڑکی ہوتی تو میں زیور پہنا کر اسے سنوارتا۔"

ایک صحابی کے گھر آپ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادے کا نام عمیر تھا۔ انھوں نے ایک مینا پال رکھی تھی۔ اتفاق سے وہ مرگئی اس حادثے کے بعد جب ان صحابی کے یہاں آپ کا جانا ہوا تو آپ نے صاحبزادے سے کہا عمیر نغیر (مینا) پر کیا گذری۔

ایک مرتبہ ایک صحابی خالد بن سعید آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی چھوٹی بچی بھی ساتھ تھی اور سرخ رنگ کا کرتہ پہنے تھی۔ آپ نے اسے خوش کرنے کے لیے فرمایا کیا اچھا کرتہ ہے وہ لڑکی مہر نبوت[1] سے کھیلنے لگی۔ خالد نے ڈانٹا آپ نے روک دیا اور فرمایا "کھیلنے دو۔"

حضرت عبداللہ بن عباس صحابی بچپن سے آپ کی خدمت میں اکثر آیا جایا کرتے تھے، آپ کبھی کبھی ان کو گود میں بٹھاتے اور پیار و محبت سے ان کے سر پہ ہاتھ پھیر کر ان کے لیے دعا فرماتے۔

جب چھوٹے بچے بیعت[2] کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر کیے جاتے تو آپ ان سے مسکرا کر بیعت لیتے۔

مسلمان تو مسلمان مشرکوں کے بچوں کو بھی آپ لطف و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی لڑائی میں مشرکوں کے چند بچے غلطی سے مارے گئے۔ آں حضرت کو معلوم ہوا تو بڑا رنج ہوا۔ ایک صحابی نے کہا یا رسول اللہ وہ تو مشرکوں[3] کے بچے تھے۔ آپ نے فرمایا مشرکوں کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں خبردار بچوں کو قتل نہ کرو۔

(جنوری ۱۹۳۶ء کے پیام تعلیم سے)

[1] رسول صلعم کی پشتِ مبارک پر کچھ ابھرا ہوا گوشت تھا جس پر بال اُگے ہوئے تھے اسکو مسلمان مہرِ نبوت کہتے ہیں۔

[2] بیعت کہتے ہیں کسی بزرگ کے سامنے اچھے کام کرنے اور برے کام نہ کرنے کا عہد لینا یا عہد کرنا۔ [3] جو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرے اسے مشرک کہتے ہیں۔

نثار احمد قاسمی

چند وصیت نامے

موت سے پہلے اپنے وارثوں کو جو نصیحت کی جاتی ہے اس کو وصیت کہتے ہیں۔ اس کا رواج زمانہ قدیم سے ہی چلا آرہا ہے۔ وصیت نامے سے انسان کے کردار کا بڑا دلچسپ اور حقیقت پسندانہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ انسان زندگی میں جس کام کو ادھورا چھوڑتا ہے یا جو کام بہت سعی و کاوش کے بعد بھی پورا نہیں کر پاتا ہے تو وہ وصیت نامے کے ذریعے سے اسے پورا کرانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح ابدی سکون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آئیے چند وصیت نامے پڑھ کر ہم بھی وصیت کرنے والے کے ذہنی شعور اور ادراک کا پتا لگانے کی کوشش کریں۔

(۱) ایک تاجر نے وصیت نامے کے ذریعے اپنی تمام دولت ڈرامو کے شوقین دوستوں کے نام لکھ دی تاکہ وہ ہر سال میں کم از کم ایک بار شیکسپیر کا شہرہ آفاق ڈراما اسٹیج کیا کریں اور ہر بار وصیت کنندہ کا رنج و افسوس کے ساتھ ذکر کیا کریں تاکہ اس طرح اس کی روح کو سکون حاصل ہو۔

دراصل اس تاجر کو بچپن سے ہی ایکٹر بننے کا شوق تھا مگر اس کے والدین نے جو مذہبی خیالات کے تھے، اسے ایک شپنگ کمپنی میں لگا دیا لیکن مرتے دم تک تاجر کے دل سے ایکٹر بننے کی آرزو نہ گئی اور آخر اس نے وصیت نامہ لکھ کر اپنی دلی تمنا کو پورا کرنے کا راستہ نکال ہی لیا۔

(۲) بیسویں صدی کا سب سے عجیب و غریب وصیت نامہ نائیس کے ایک ڈاکٹر کا تحریر کردہ ہے جس کی چھوڑی ہوئی دولت سے آج تک ایک معقول رقم بطور وظیفہ نائیس کے اس شہری کو ملتی ہے جس کی ناک سب سے زیادہ لمبی، کلائیاں سب سے زیادہ چھوٹی اور ہاتھ سب سے زیادہ لمبے ہوں۔ مزید شرط یہ ہے کہ وظیفے کے مستحق کے بال سرخ اور بھویں سیاہ ہونی چاہییں۔ دراصل وصیت کرنے والا بڑے بے ہنگم جسم کا مالک تھا اور اسی لیے اس کو خوبصورت اور مناسب اعضا والے آدمیوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سماج کی تشکیل اس طرح ہو جہاں سب برابر کا درجہ رکھتے ہوں اور خوبصورتی و بدصورتی کے معیار پر لوگوں سے محبت یا نفرت نہ کی جاتی ہو۔

(۳) مسٹر ہربرٹ شاب نے اپنا کثیر اثاثہ ایک یونیورسٹی کے نام چھوڑا مگر اپنے وصیت نامے میں تاکید کر دی کہ اس رقم سے صرف ان طالب علموں کو وظیفے دیے جائیں جو سگریٹ اور تمباکو نوشی نہ کرتے ہوں۔ اس تحریر میں یہ بھی درج تھا کہ جو طالب علم تمباکو نوشی کا بیکار خرچ برداشت کر سکتا ہے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنی تعلیم کا خرچ بھی خود برداشت کرے۔ وصیت کنندہ کو تمباکو نوشی سے سخت نفرت تھی اس طرح اس نے مرنے کے بعد وصیت کے ذریعے اپنی نفرت کا انتقام جاری رکھا۔

(۴) ایک شخص الاسکا میں عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ اس نے اپنی وصیت جیل کی دیوار پر لکھ دی اور جب موت کے بعد ورثے کی تقسیم پر جھگڑا ہوا تو ورثے کے امید واروں کی درخواست

۲۳۲ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

پر جج نے جیل کی دیوار کا وہ حصہ عدالت میں پیش کرنے کو کہا جس پر وصیت لکھی گئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وصیت کنندہ کو اس جیل کی دیوار سے سخت نفرت ہوگئی تھی کیوں کہ وہ اپنے تمام حربے استعمال کرنے کے باوجود جیل سے نکلنے میں ناکام رہا تھا اور چوں کہ اس ملک میں اختلافی اشیا کو جج کے سامنے پیش کرنا قانونی حکم تھا اس لیے اس نے جیل کی دیوار سے اپنا بدلہ نکالنے کے لیے وصیت کا سہارا لیا اور آخر مرنے کے بعد اسے تڑوا کر اپنی حسرت نکال ہی لی۔

(۵) برلن کی ایک عورت نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس نے اپنی وصیت اپنی پُشت پر لکھوائی تھی اس وصیت نامے کے الفاظ دو سو تھے اور یہ کمر کی جلد پر لکھے گئے تھے۔ اس نے یہ اقدام اس لیے کیا تھا کہ وہ بہت معذور ہو چکی تھی اور اس کو خوف تھا کہ اگر وہ اپنی وصیت کسی کاغذ پر لکھے گی تو اپنی موت تک شاید اسے محفوظ نہ رکھ سکے گی۔

کہا جاتا ہے کہ ہمارے عجائب گھروں میں کچھ وصیت نامے ایسے ہیں جو تین ہزار سال پرانے ہیں۔ قانون داں آج بھی وصیت ناموں کے قانونی نکات پر بحث کرتے وقت مشہور مفکر ارسطو کی شہرہ آفاق وصیت کا حوالہ دیتے ہیں جو یونان کے اس نامور بلند پایہ فلسفی نے ۳۰۲ قبل مسیح یعنی اب سے ۲۲۸۵ سال قبل تحریر کیا تھا۔ اس وصیت نامے کی عبارت ہر اعتبار سے مکمل اور جامع ہے اور آج بھی دنیا بھر کی عدالتوں میں اس وصیت کو سب سے زیادہ معیاری دستاویز سمجھا جاتا ہے۔●

پیام تعلیم قمری کیلنڈر ۱۴۰۵ھ

عبدالمجید آنیکل بنگلور					محرم / جمادی الثانی / ذی قعدہ	صفر / رجب	ذی الحجہ	ربیع الاول / شعبان	ربیع الثانی / رمضان	جمادی الاول / شوال
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	بدھ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	جمعرات
	۲۴	۱۷	۱۰	۳	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعہ
	۲۵	۱۸	۱۱	۴	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	ہفتہ
	۲۶	۱۹	۱۲	۵	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	اتوار
	۲۷	۲۰	۱۳	۶	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	پیر
	۲۸	۲۱	۱۴	۷	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	منگل

کیا آپ جانتے ہیں!

۱۔ سورج ۱۲ گھنٹے میں ۱۸۰ درجہ کا (نصف دائرہ) فاصلہ طے کرتا ہے۔
۲۔ سورج کو ایک گھنٹے میں ۱۵ درجے اور ایک درجہ طے کرنے میں ۴ منٹ صرف ہوں گے۔
۳۔ چاند زمین کے گرد ½ ۲۹ دن میں ایک چکر لگاتا ہے۔
۴۔ زمین کو سورج کے گرد گھومنے یعنی پورا ایک چکر لگانے میں ¼ ۳۶۵ دن لگتے ہیں۔
۵۔ ٹھیک نو بجے صبح کو سورج ۴۵ درجے پر ہوگا۔
۶۔ ہم ایک منٹ میں ۱۷۔۱۸ مرتبہ سانس لیتے ہیں لیکن پرندے فی منٹ ۶۰ مرتبہ سانس لیتے ہیں۔
۷۔ سطح سمندر پر ہوا کا دباؤ ۳۰ انچ ہوتا ہے۔
۸۔ چاند ہماری زمین سے ۲ لاکھ ۴۰ ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔
۹۔ سورج ہماری زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔
۱۰۔ ٹھیک ۱۲ بجے دوپہر کو سورج ۹۰ درجے پر یعنی سر پر ہوگا۔
۱۱۔ خوبصورت ترین طیارہ زہرہ
۱۲۔ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو حضور صلعم اس دنیا میں تشریف لائے۔
۱۳۔ ۶ اگست ۶۱۰ء کو سب سے پہلے حضور پر سورۂ علق نازل ہوئی۔
۱۴۔ ۲۸ جون ۶۲۲ء کو نبی صلے اللہ علیہ نے مکہ کو ہجرت کی۔
۱۵۔ ۷ مارچ ۶۳۴ء کو خلافت حضرت عمرؓ کا آغاز ہوا۔
۱۶۔ ۲۲ جنوری ۶۳۵ء کو شام اور عراق فتح کیے گئے۔
۱۷۔ ۲۱ دسمبر ۶۴۰ کو مصر فتح کیا گیا۔
۱۸۔ ۱۹ نومبر ۶۴۴ء حضرت عثمانؓ کی خلافت کا آغاز ہوا۔
۱۹۔ ۱۱ جولائی ۶۵۶ء خلافت علیؓ کا آغاز ہوا۔
۲۰۔ ۹ فروری ۶۸۰ء وفات حضرت حسینؓ

نصیر خاں بی اے، ملکاپور

دفتر پیام تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ
۲۵ دسمبر ۱۹۸۴ء

پیامی ادبی معمّا نمبر 11

150 روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ کچھ نہیں۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

پہلا انعام: بالکل صحیح حل پر مبلغ 100 روپے۔ **دوسرا انعام:** ایک غلطی والے حل پر مبلغ 50 روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اسے ہی نمبروار لکھیے

1۔ رسول خدا سے دین کی باتیں ـــــ (سنتے / سیکھتے)
2۔ ہم کو تو بس ـــــ کی مدد چاہیے (آپ / خدا)
3۔ جب قوم کی دشمنی اپنی ـــــ کو پہنچ گئی تو وہ دن آگیا جس سے ان کو ڈرایا جاتا تھا۔ (حد / انتہا)
4۔ میں تمھیں جادو کے ایسے ایسے ـــــ دکھاؤں گا کہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں۔ (کھیل / کرتب)
5۔ ہندستانیوں نے ایک ـــــ جماعت بنالی۔ (مذہبی / سیاسی)
6۔ بے چارا چپراسی ـــــ گیا اور جلدی سے اٹھا کر مجھے باہر لے گیا۔ (ڈر / سہم)
7۔ کیا پہلے بھی کوئی ـــــ گیا تھا؟ (مر / بچ)
8۔ خدا بخش اوّل تھا اور عبداللہ کے ہاتھ میں ـــــ کی رپورٹ تھی۔ (پاس / فیل)

ادھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں صحیح جواب صفحہ ۳۵ کی کتابوں میں ہی ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہوا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصّہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمّے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

ذرا سنیے

انعام کی رقم بذریعہ منی آرڈر اس لیے روانہ کی جاتی ہے کہ آپ ان روپوں سے اچھی اچھی کتابیں خرید کر اپنی ذاتی لائبریری بنائیں۔

پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن ٹائیٹل کے صفحہ ۳ سے کاٹیے۔

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے

پیامی ادبی معمّا نمبر 11 ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

بچّوں کی
کتابیں
ریڈیو فیچر
(جگن ناتھ آزاد)
بچوں کی دلچسپی کے دو مزیدار ڈرامے۔ یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔
قیمت : ۲/۲۵
گاندھی باباکی کہانی
(بیگم انیسہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت : ۴/۰۰
اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہوسکے گا۔
قیمت : ۷/۵۰
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت : ۴/۰۰
کھیل سنسار سطوت رسول
بچّوں کے لیے مترنم بحروں میں لکھے ہوئے دلچسپ گیتوں کا ایسا مجموعہ جسے بچّے شوق سے پڑھتے ہیں۔
قیمت : ۴/۵۰
تین اناڑی عصمت چغتائی
گکو، بنو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔ قیمت ۳/=
ترجمہ: قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمٰن
الہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہوگئی، لیکن اب تو اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(سیفی پریمی)
کہاوت اور کہانی
روزمرّہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت : ۴/۵۰
سرکس
تزئین کار : ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰
ٹوکن پیامی ادبی معمّا
میں اڈیٹر پیام تعلیم کے ہر فیصلے سے متفق ہوں۔
نام ....
پتا ....

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd. No. D(SE)-043 Nov. 1984

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

بچوں کی مذہبی کتابیں

ہمارا دین (اول، دوم، سوم)	سید شہاب الدین دسنوی (فی حصہ)	۶/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول، دوم)	عبدالواحد سندھی (فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امیرالبحر	" "	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اول، دوم)	" " (فی حصہ)	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	" "	۳/۰۰
اسلام کیسے شرو[illegible]	"	۴/۵۰
رسولِ پاک	"	۳/۵۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۳/۰
رسولِ پاک کے اخ[illegible]	"	۳/۰۰
اللہ کے خلیل	" "	۲/۵۰
تحسین القرآن	تالیف۔ خدیجہ سید طاہر سیف الدین	۴/۵۰
منہاج القرآن	" "	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
عقائدِ اسلام	" "	۱/۵۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
آں حضرتؐ	" "	۱/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۳/۷۵
نبیوں کے قصے	" "	۲/۲۵
ہمارے رسولؐ	" "	۳/۰۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۳/۰۰
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی	۱/۵۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان	۳/۰۰

لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹر مکتبہ جامعہ لمٹیڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی ۲۵
جب تک سورج چاند رہے گا
اندرا تیرا نام رہے گا

پان کھاکر، طبلہ بجاکر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت : ۱/۵۰
پھر میں چلوں کیا چال
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت : ۱/۵۰
چھوٹے بچوں کے لیے
مزے دار کہانی
قیمت : ۱/۵۰
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰
پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰
ہتو جیو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت: ۱/۵۰
کس نے پکائی
قیمت: ۲/۵۰
بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰
بی پنڈکی اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
کہانیاں سبھی سب
کی سب مزے دار
قیمت: ۱/۵۰
مدو رانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت :
۱/۵۰

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دلی ۲۵

دسمبر ۸۴ء جلد ۲۱ شمارہ ۱۲

اڈیٹر: ولی شاہجہانپوری

قیمت: ۲/۵۰ سالانہ ۲۰ روپے

غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

۳۱ اکتوبر کو وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کی شہادت اس صدی کا دوسرا اور اس سال کا پہلا عظیم سانحہ تھا جس نے ہندستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو رنج والم میں مبتلا کر دیا۔ اس سے پہلے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو مہاتما گاندھی کو ایک ہندستانی نے اپنی گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایک ہندستانی ہی نے جو ان کے حفاظتی دستے کا فرد تھا، یہ بہیمانہ قتل کیا۔ اس نقصان عظیم کے بعد بھی غیر سماجی اور ملک دشمن لوگوں نے تین دن تک سیکڑوں بے گناہوں کی جانیں اور کروڑوں روپے کی املاک کو تباہ کیا۔ اس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔

آنجہانی اندرا گاندھی نے ۱۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو الٰہ آباد کے ایک ایسے گھر میں جنم لیا جو سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ پانچ ہی برس کی تھیں کہ ان کے دادا پنڈت موتی لال نہرو نے انھیں تحفے میں ایک چرخا دیا تھا۔ بارہ برس کی ہوئیں تو "بانر فوج" کے نام سے بچوں کی ایک جماعت بنا ڈالی جو کانگریس کے مخالفوں کی کارروائیوں کی مخبری کرتی تھی۔ اس طرح ملک و قوم کی خدمت ان کی گھٹی میں پڑ گئی تھی۔ پھر تو سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا ہو کر رہ گئی۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے سولہ سال تک ملک وقوم کو ترقی کی راہ پر لے گئیں۔ دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم اور کھیل کود کے شعبوں کو بھی آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

سارے ملک کے ساتھ ہم بھی سوگوار ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ مسز اندرا گاندھی کی آتما کو شانتی ملے اور جناب راجیو گاندھی صبر وشکر اور ہمت واستقلال کے ساتھ آنجہانی والدہ کے صحیح جانشین ثابت ہوں۔

پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

مرتضیٰ ساحل تسلیمی

یہ دیس ہمارا ہے

ہندو ہوں، مسلماں ہوں
سکھ ہوں کہ ہوں عیسائی
کی سب نے یہاں مل کر
جب خون سے سینچائی
آزادی کی یہ نعمت
تب جا کے کہیں پائی

گاندھی ہوں کہ نہرو ہوں
آزاد ہوں، جوہر ہوں
رنجیت، بھگت، ذاکر
اشفاق ہوں، شیکھر ہوں
قدوائی ہوں، حسرت ہوں
یا ٹیپو و حیدر ہوں

ہم سب نے سنوارا ہے
یہ دیس ہمارا ہے

ان سب نے نکھارا ہے
یہ دیس ہمارا ہے

ہم آج جو بچّے ہیں
اک روز بڑے ہوں گے
تب دیس کی سیوا میں
جُٹ جائیں گے تن من سے
تیار ہیں لڑنے کو
دشمن سے نہیں ڈرتے

جی جان سے پیارا ہے
یہ دیس ہمارا ہے

عزیز مرآدبادی

دیس کی نیتا جگ کی رہبر

جام شہادت جس نے پیا ہے
دیس کی خاطر ایسا کیا ہے
عزم و عمل میں مثلِ آہن
اور طبیعت جس کی گلشن
امن و اماں تھا جس کو پیارا
جس نے تشدّد کو للکارا
جس نے سب کو دوست بنایا
دُکھیاروں کو گلے لگایا
راہِ ترقی جس نے سُجھائی
دیس کی کشتی پار لگائی
دیس کا مان بڑھایا جس نے
سورج سا چمکایا جس نے
دُنیا جس کی عزّت کرتی
دُنیا اُس کا ہی دم بھرتی
دیس کی نیتا، جگ کی رہبر
آتی تھی امداد کو بڑھ کر
ہند کی ماں، بیٹی اور دیدی
پیار کا ساگر، سچّا موتی
کون ہے وہ، یہ ذکر ہے جس کا؟
بچّو! جان گئے تم، اچھا!
ہاں ہاں، ٹھیک ہے، یہ ہیں وہ ہی
نام ہے جن کا اِندرا گاندھی

محلہ قاضیاں۔ بسی کرت پور۔ بجنور۔ یوپی

بشکریہ

"اگر میں دیش کی خدمت کرتی ہوئی مر بھی گئی تو مجھے فخر ہوگا کہ میرے خون کا ہر قطرہ ملک کی ترقی میں شامل ہو کر اسے مضبوط اور مستحکم بنا دے گا۔"
(اندرا گاندھی کی آخری تقریر کا حصہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

پنڈت نہرو کی بیٹی، ہندستان کی عظیم سپتری، عالمی شخصیت کی تمثیل شریمتی اندرا گاندھی کا جنم آنند بھون الہ آباد میں ۱۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو ہوا۔ آنند بھون جنگ آزادی کی تاریخ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ الہ آباد کانونٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ بعد میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے بعد شانتی نکیتن میں داخل ہوئیں جو گرو دیو ٹیگور کا تعلیمی مرکز تھا۔ ہندستانی قومیت، عالمی برادری، انسانیت کا پرچار اس مرکز کے نصب العین تھے "اکیلا چلو رے" ... کا اثر اندرا گاندھی پر ہوا۔ کلا بھون میں نندلال ... نگرانی میں پینٹنگ کا کام بھی سیکھ لیا۔ رقص سے بہت دلچسپی ہوگئی۔ شانتی نکیتن میں اندرا پر یہ ... کا نام تھا۔ معنی ہوتے ہیں دیکھنے کے لیے خوب صورت۔ سوئٹزرلینڈ کے اسکول میں بھی تعلیم حاصل کی سمرولے کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئیں۔ ۱۹۴۱ء میں بھارت لوٹیں۔ نہرو کی کتابیں "گلمپس آف ورلڈ ہسٹری" اور "لیٹرس فرام فادر ٹو ہز ڈاٹر" ان کی ابتدائی تعلیم تھیں۔ تجربہ کی موجد تھیں۔ سب سے بڑا تجربہ تو سترہ سال تک ان کے والد آنجہانی جواہر لال نہرو کے ہاتھوں سنورنا اور ان کے میزبان کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔ والد کے ساتھ کئی ممالک کا دورہ کیا۔ کئی ممالک کے سربراہوں کا استقبال کیا۔ ان کے تہذیب و تمدن کو دوران سفر و حضر سمجھنے کا سنہرا موقع ملا۔

اکیس سال کی عمر میں کانگرس کی ممبر بنیں۔ ۱۹۴۲ء میں فیروز گاندھی سے شادی ہوئی۔ سنجے اور راجیو دو بیٹے ہوئے۔ نہرو جی کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں برٹش دولت مشترکہ کانفرنس

دیکھنے کا موقع ملا۔ اقوام متحدہ کی کارروائیوں کو بھی دیکھا۔ ملکہ ایلزبتھ کی تاج پوشی کی رسم میں شریک رہیں۔ روس و چین کا بھی دورہ کیا۔ دل میں کشادگی تھی، اعلا خیال تھا۔ عالمی بھائی چارگی تھی۔ انسانی قدروں کی پہچان تھی۔ انسانی احساسات کی گھٹن جہاں کہیں انھوں نے محسوس کی برابر تنقید کرتی رہیں۔

۱۹۵۵ء میں اندراجی کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رکن بنیں۔ ۱۹۵۹ء میں انڈین نیشنل کانفرنس کی صدر چنی گئیں۔ یکم مئی ۱۹۶۰ء کو انھی کے مشورہ سے گجرات و مہاراشٹر بنائے گئے۔ ۱۹۶۴ء میں ملک کی وزیر اطلاعات مقرر ہوئیں۔ ۲۴ جنوری ۱۹۶۶ء کو وزیر اعظم کی حیثیت سے شریمتی اندرا گاندھی نے عہدہ سنبھالا۔ پیرس، لندن، ماسکو، واشنگٹن کے دورے کیے۔ ۱۹۶۷ء میں ہندستان کے کئی مقامات کا انتخابی دورہ کیا۔ ۱۹۶۹ء میں چودہ بنکوں کو قومیانے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا۔

بنگلہ دیش کے قیام میں بھی دلچسپی لی۔ ۱۹۷۵ء ان کے لیے کٹھن وقت تھا۔ ملک کے حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے ایمرجنسی کو دیس بھر میں لاگو کر دیا۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں انتخابات ہوئے۔ جس سے ان کی پارٹی اقلیت میں آ گئی۔ نومبر ۱۹۷۸ء میں چکمگلور سے پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوئیں۔ ۱۹۸۰ء میں میڈک حلقہ سے انتخاب میں کامیاب ہوئیں اور وزیر اعظم کا عہدہ پھر سے سنبھالا۔ آخری سانس تک بھارت واسیوں کی خدمت کرتی رہیں۔ ناگہانی موت نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو نو بج کر بیس منٹ پر قاتلوں کے بھیس میں آ کر حملہ کیا۔ سخت صدمہ اس بات کا ہے کہ ان کے اپنے محافظی دستہ کے دو جوانوں نے ہی ان پر گولیوں کی بوچھار کر دی۔ کتنا ظلم ہوا ہمارے دیش کی نیتا پر۔ اس دکھ کو برداشت کرنا مشکل ہے۔ وہ سیاست کے میدان میں رہبر تھیں۔ عالمی امن کی پیامبر تھیں۔ انسانیت کی علمبردار تھیں۔

دیش کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ عالمی سطح پر خلائی سفر میں دلچسپی لی۔ راکیش شرما کا روسی نوجوانوں کے ساتھ خلائی سفر کرنا اس کی دلیل ہے انیٹ ا. بی سے ٹی۔ وی پروگرام ملک بھر میں جاری ہونا ان کا سائنسی نقطہ نظر ہے۔ ناوابستہ تحریک کی سربراہی کرنا ان کا نیک کارنامہ اور جرأت مندانہ اقدام ہے۔ ایشیائی کھیلوں کا انعقاد بھی ان کی انتھک محنت و دلچسپی سے ہوا۔ اپنے گھر میں، مقامات دورہ کرتے وقت بھی ہر ایک سے محبت، انس و شفقت سے پیش آتی تھیں۔

ایک سوشل ورکر بھی تھیں شریمتی اندرا گاندھی، غریب عوام بے حد چاہتے تھے۔ ان کو کئی ممالک کی طرف سے اعزازات و انعامات بھی ملے۔ ۱۹۷۲ء میں بھارت رتن سے انھیں نوازا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں امریکہ نے مدرس ایوارڈ دیا۔ کئی جامعات نے اعزازی ڈگریاں بھی عطا کیں۔

شریمتی اندرا گاندھی گو ہم میں موجود نہ رہیں۔ لیکن ان کا بتایا بتایا ہوا راستہ ہمارے سامنے ہے۔۔ وہ ایک مثالی انسان ہمدرد، مددگار تھیں۔ قومی یکجہتی کے لیے ہمیشہ کام کرتی رہیں۔ بچوں سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ گھر میں سنجے گاندھی، راجیو گاندھی کے بچوں سے بھی وقتاً فوقتاً کھیلتی تھیں۔

قوم کی ترقی میں مرتے دم تک انھوں نے حصہ لیا۔ اڑیسہ کے دورہ میں انھوں نے آخری قطرۂ خون کو دیس کے لیے نچھاور کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر چل کر دیس کی خدمت میں مصروف رہ جانے کا ہم عہد کریں۔ اس سے قوم کی ترقی ہوگی۔ قومی یکجہتی مضبوط ہوگی اور ہندستانی تہذیب کی جڑیں مستحکم ہوں گی۔

مسعود احمد برکاتی

عبدالواحد سندھی

بچوں کے بزرگ ادیب

بچوں کے لیے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ بات میں چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے کے تجربے کے بعد لکھ رہا ہوں، اس لیے اس بات میں کچھ نہیں، خاصی سچائی ہونی چاہیے۔ اتنے عرصے تک آپ کے لیے لکھتے رہنے کے دوران میری یہ کوشش رہی ہے کہ ایسی تحریریں لکھنا سیکھوں جو آپ کو اچھی لگیں۔ اس طرح مجھے اندازہ ہوا کہ بچوں کے لیے لکھنا بڑوں کے لیے لکھنے سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ اسی وجہ سے میں ان ادیبوں کا زیادہ احترام کرتا ہوں جو بچوں کے لیے لکھتے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں بچوں کے بہت کم ادیب ہیں۔ ان تھوڑے سے بچوں کے ادیبوں میں جناب عبدالواحد سندھی بھی شامل ہیں۔ آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہوگا لیکن نہ بھی سنا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کیوں کہ اب وہ کچھ عرصے سے بچوں کے لیے نہیں لکھ رہے ہیں۔ یوں بھی سیدھے سادے آدمیوں کی دال آج کل مشکل ہی سے گلتی ہے۔ سیدھا آدمی کتنا ہی قابل اور عمدہ ہو، گم نام یا کم نام ہی رہتا ہے۔ عبدالواحد سندھی صاحب بھی نہایت سیدھے اور شریف انسان ہیں۔ لیکن میری رائے میں وہ ایک بڑے انسان ہیں۔ میں ان کے متعلق آج کچھ باتیں لکھتا ہوں، تاکہ آپ کو بھی اپنے

ایک محسن کے حالات معلوم ہوں۔

جناب عبدالواحد سندھ کے ایک قصبے پنوں عاقل میں پیدا ہوئے۔ اپنے پیدا ہونے کی تاریخ خود ان کو بھی یاد نہیں۔ ہاں شادی کی تاریخ یاد ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ان کی شادی ہوئی تھی اور اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال تھی۔ اس طرح حساب لگائیں تو وہ ۱۹۰۵ یا ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ خیر اس سے بہت زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا کہ آدمی کس تاریخ کو پیدا ہوا تھا۔ اصل بات تو یہ دیکھنے کی ہوتی ہے کہ اس نے دنیا میں آنے کے بعد کیسے کام کیے۔

عبدالواحد صاحب ایک نومسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اور یہ گھرانا کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ خاندان کے لوگ اسلام لانے سے پہلے لڑنے جھگڑنے کے عادی تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد ان میں تہذیب، تمیز آ گئی۔ واحد صاحب کے والد کا نام عبدالوارث تھا۔ یہ نو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کو ایک بزرگ حضرت حماد اللہ اپنے ساتھ لے گئے جو ان کے عزیز بھی تھے اور بڑے عالم بھی۔ ان کے چچا مولوی محمد صابر صاحب نے بھی ان کی تعلیم و تربیت میں دل چسپی لی، ابھی آپ کی تعلیم جاری تھی کہ آپ نے اخبار میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے متعلق پڑھا اور آپ نے سوچا کہ

۲۴۶ دستگیر سوسائٹی۔ کراچی۔ ۳۸

آپ کو جامعہ میں [illegible] حاصل کرنی چاہیے۔ واحد صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس اس وقت پیسے تو تھے نہیں۔ ایک بزرگ [illegible] محمد صاحب سے ذکر ہوا تو انھوں نے کہا کہ جامعہ ملیہ ضرور جانا چاہیے اور نئی باتیں سیکھنی چاہییں۔ انھوں نے کچھ رقم بھی دی۔ اس طرح واحد صاحب دہلی پہنچے، اور وہاں سے علی گڑھ۔ علی گڑھ میں بہت اچھا ماحول اور انتظام تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے دہلی آ گئی۔ آپ نے جامعہ میں انٹرنک پڑھا اور پھر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے آپ کو جامعہ کے پرائمری اسکول میں استاد مقرر کر دیا۔ کچھ دن بعد موگا مشن ٹریننگ اسکول لدھیانے میں پڑھانے کی تربیت لینے کے لیے بھیجا۔ ایک سال کی ٹریننگ لے کر واحد صاحب وہاں سے واپس آئے تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کہا کہ اب آپ بچوں کے لیے کتابیں بھی لکھیں۔ جب عبدالواحد صاحب نے پہلی کتاب لکھی تو ذاکر صاحب نے بہت پسند کی اور یہ کہہ کر دل بڑھایا کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو آپ کو خلعت سے نوازتا۔ واحد صاحب نے بتایا کہ جامعہ ملیہ میں میرا داخلہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے کرایا تھا۔ ڈاکٹر محمود حسین صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور پاکستان بننے کے بعد یہاں کے وزیر بنے اور پھر کراچی یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ بھی رہے۔ عبدالواحد صاحب کہتے ہیں کہ محمود صاحب بڑی محبت والے آدمی تھے۔

عبدالواحد سندھی صاحب نے پہلی کتاب جو لکھی اس کا نام ہے "روٹی کس نے پکائی"۔ پہلے یہ اپنا نام عبدالواحد جامعی لکھتے تھے۔ جب ان کی کتاب "رسولِ پاک کون تھے" چھپی تو اس پر پہلی بار ان کا نام عبدالواحد سندھی لکھا گیا۔ عبدالواحد صاحب بڑے مزے سے بتاتے ہیں "کہ میں سندھ میں پیدا ہوا اور میری مادری زبان سندھی ہے اس لیے شروع میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میری بیوی میرے نام سے لکھتی ہیں۔" عبدالواحد صاحب کی شادی نور فاطمہ صاحبہ سے ہوئی تھی۔ جن کا خاندان علی گڑھ کا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ تھے، چاہتے تھے کہ جامعہ کے استاد شادی شدہ ہوں تاکہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سکون و اطمینان سے جامعہ میں رہیں اور خدمت کریں۔

عبدالواحد صاحب نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ ذاکر صاحب کا خلوص اور خدمت کا جذبہ قابلِ تقلید ہے۔ انھوں نے ۷۵ روپے ماہوار پر ساری عمر جامعہ ملیہ میں گزار دی حالانکہ آپ کو حیدرآباد دکن کی حکومت کی طرف سے ہزاروں روپے کی پیش کش تھی۔ جامعہ ملیہ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ ذاکر صاحب اور دوسرے سارے استاد بہت معمولی تنخواہ لے کر پڑھاتے تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور خدمت کر کے خوش تھے۔ عبدالواحد صاحب کی تنخواہ ۲۵ روپے ماہانہ تھی۔ ایک بار انھوں نے جوش میں آ کر ذاکر صاحب سے کہا کہ آپ کام تو ہم سے گدھوں کی طرح لیتے ہیں لیکن معاوضہ بہت کم دیتے ہیں۔ ذاکر صاحب اس وقت تو ناراض ہوئے اور چپ ہو گئے۔ لیکن جلد ہی واحد صاحب کو ترقی دے دی اور کہا کہ آئندہ سے آپ کی بیوی بھی پڑھائیں گی۔ اور ان کو بھی تنخواہ ملے گی۔

ایک بار ذاکر صاحب نے سندھی صاحب سے کہا کہ آپ بمبئی جا کر جامعہ کا یہ کام کرائیں۔ سندھی صاحب کا بچہ آصف اس وقت بیمار تھا۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں۔ میں بچے کی دیکھ بھال کروں گا۔ چناں چہ جب تک سندھی صاحب بمبئی سے واپس نہ آئے ذاکر صاحب ان کے گھر جا کر بچے کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ آصف نے کہا کہ میں انگور کھاؤں گا۔ اس وقت انگوروں کا موسم نہیں تھا، اس لیے ذاکر صاحب نے کہا کہ "بیٹے، اس وقت تو انگور نہیں ملیں گے، لیکن ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ جب انگور آنے لگیں گے تو تمھیں انگور کھلائیں گے۔" ذاکر صاحب نے اپنا وعدہ یاد رکھا اور جب انگوروں کا زمانہ آیا تو اپنے گھر پر سندھی صاحب کے پورے گھر کی دعوت کی اور انگوروں کی ایک ٹوکری آصف کو دی۔ اس زمانے میں انگور ہندستان میں بڑے مہنگے ہوتے تھے۔ ایک چھوٹی سی ٹوکری ۴۵ روپے کی آتی تھی۔ ۴۵ روپے بھی اس وقت بڑی حیثیت رکھتے تھے۔ خود ذاکر صاحب ۷۵ روپے تنخواہ لیتے تھے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ انھیں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم صاحب کا ذکر ہے جو آزادی کے بعد صوبۂ بہار کے گورنر، ہندستان کے

نائب صدر اور پھر صدر بھی ہوئے، لیکن عہدے سے کچھ نہیں ہوتا ذاکر صاحب اپنی جگہ بڑے آدمی تھے۔ بڑے آدمی وعدے کے سچے، بات کے پکے اور مزاج کے سادہ ہوتے ہیں۔

عبدالواحد سندھی صاحب کو کتابیں لکھنے کا معاوضہ بھی ملتا تھا۔ کچھ اندازہ ہے سندھی صاحب کو اپنی پہلی کتاب کا کتنا معاوضہ ملا ہوگا۔ صرف پندرہ روپے۔ سندھی صاحب کا اپنا شوق، بزرگوں کی ہمت افزائی اور پھر کچھ معاوضہ بھی مل جاتا تھا۔ وہ لکھتے رہے اور کتابیں چھپتی رہیں۔ کوئی چالیس تو چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہوں گی۔ کہانیوں کے علاوہ دینی اور تاریخی کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں سے چند تو بہت مشہور ہیں مثلاً (۱) اسلام کیسے شروع ہوا (۲) اسلام کے مشہور سپہ سالار سو حصّوں میں (۳) اسلام کے مشہور امیر البحر (۴) اسلام کیسے پھیلا۔ (۲ حصّوں میں) (۵) قرآن پاک کیا ہے (۶) رسولِ پاک کون تھے۔

آزادی ملی اور دہلی میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوا تو سندھی صاحب ۱۹۴۸ء میں پاکستان آگئے یہاں وہ حکومت پاکستان کے شعبۂ اطلاعات سے وابستہ ہوگئے۔ سندھی زبان میں ایک سرکاری رسالہ "نئین زندگی" (نئی زندگی) جاری ہوا تو آپ اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹ سال تک یہ رسالہ ترتیب دیتے رہے۔ ریٹائر ہوتے تو جامعۂ تعلیم ملّی کراچی کی طرف سے بچّوں کے لیے اردو کا ایک رسالہ "ستارہ" نکالا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۷۸ء میں نکلا اور پانچ سال تک یہ رسالہ نکلتا رہا۔

سندھی صاحب نے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کی فرمائش پر پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک کے لیے اردو کی نصابی کتابیں بھی لکھیں۔ آپ نے سندھی میں بھی کتابیں لکھیں ہیں۔ اس طرح آپ نے سندھی اور اردو دونوں زبانوں کے ذریعہ سے بچّوں اور علم و ادب کی خدمت کی۔ آپ کی کتابیں اب بھی ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ شائع ہو رہی ہیں۔ آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بچّوں کے مشہور رسالے "پیام تعلیم" میں بھی اکثر مضمون لکھا کرتے تھے۔ سندھی صاحب کو ہمدرد نونہال بھی بہت پسند ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ رسالہ بڑی اچھی خدمت کر رہا ہے۔

عبدالواحد سندھی صاحب کے تین بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے آصف جیلانی ہیں، جن کو آپ جانتے ہوں گے مشہور صحافی ہیں۔ اخبار جنگ لندن کے ایڈیٹر ہے۔ اب بی بی سی لندن میں کام کرتے ہیں۔ دوسرے بیٹوں کا نام عارف اور شعیب ہیں۔ سندھی صاحب کو گزرا ہوا زمانہ بہت یاد آتا ہے جب وہ علی گڑھ میں پڑھتے تھے تو ان کے ساتھ پیرالٰہی بخش صاحب (سابق وزیر اعلا سندھ) اور قاضی فضل اللہ صاحب (سابق وزیر پاکستان) بھی وہاں پڑھتے تھے۔ سندھی صاحب کہتے ہیں کہ جامعہ کا ماحول بڑا اچھا تھا اور ہمیں لکھنے پڑھنے کا چرچا تھا۔ ذاکر صاحب ان سے کہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لکھو، اچھے سے اچھا لکھو۔ اس زمانے میں جامعہ میں جو مشاعرے ہوتے تھے وہ بھی ان کو یاد آتے ہیں۔ کہتے ہیں بڑے اچھے مشاعرے ہوتے تھے۔ ہم نے ان میں بڑے بڑے شاعروں کا اچھا اچھا کلام سنا۔ مولانا حسرت موہانی بہت بڑے انسان تھے۔ وہ سادہ اور بے لوث اور بہادر تھے اور سچ بولتے تھے اور کسی کے ڈر سے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ سچّے آدمی تھے۔

عبدالواحد سندھی صاحب بھی اچھے اور سچّے انسان ہیں خدا ان کو سلامت رکھے۔

مناظر عاشق ہرگانوی

سراغ

پلنچ کی چھٹی ختم ہوئی تو لڑکے پھر اپنی اپنی جماعت میں چلے گئے۔ پڑھائی شروع ہوگئی۔ تبھی ایک لڑکے نے کھڑے ہوکر کہا "سر، کسی نے میری پنسل چرالی ہے۔"

"اس جماعت میں کوئی لڑکا چور نہیں ہے۔" ماسٹر صاحب نے کہا۔ "تم پنسل گھر بھول آئے ہوگے۔"

"نہیں سر" لڑکے نے پھر کہا "میں نے لنچ کی چھٹی سے پہلے اپنی پنسل سے لکھا تھا۔ کئی ساتھیوں نے مجھے اس پنسل سے لکھتے دیکھا بھی تھا۔"

ماسٹر صاحب نے جماعت کے سب لڑکوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "اپنے اپنے بستے دیکھو۔ کسی کے پاس غلطی سے پنسل چلی گئی ہو تو اسے دے دو۔"

فوراً سب لڑکوں نے ماسٹر صاحب کے حکم کی تعمیل کی۔ سب نے اپنے بستے دیکھے لیکن پنسل کسی کے پاس نہیں نکلی۔

اسی وقت کچھ لڑکوں نے ایک ساتھ کھڑے ہوکر کہا۔ "ہم کلاس سے اٹھ کر چلے گئے تھے، لیکن آفتاب بیٹھا رہ گیا تھا۔ آفتاب ہی پنسل کے بارے میں بتا سکتا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے آفتاب سے پوچھا "جب سب لڑکے چلے گئے تھے تو کیا تم اپنی جگہ پر بیٹھے رہے تھے؟"

"جی ماسٹر صاحب۔" آفتاب نے کہا۔

"تم نے اس لڑکے کا بستہ دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا۔ پنسل بھی کھلی کتاب پر رکھی ہوئی تھی۔" آفتاب نے جواب دیا۔

"تم نے تو پنسل نہیں لی؟" ماسٹر صاحب نے پوچھا

"نہیں سر، میں نے پنسل نہیں لی۔" آفتاب کے جواب میں سچائی تھی۔

ماسٹر صاحب نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتے تھے کہ آفتاب چور نہیں ہے۔

شام کو چھٹی ہوئی تو سب لڑکے پھر پنسل کی بات کرنے لگے۔ سبھی لڑکے آفتاب کو ہی چور ٹھہرا رہے تھے۔

دوسرے دن لنچ کی چھٹی کے بعد پھر ایک لڑکے نے کھڑے ہوکر کہا "سر میرا ربر غائب ہے۔" یہ لڑکا آفتاب کے نزدیک ہی بیٹھتا تھا۔

ماسٹر صاحب اور جماعت کے سبھی لڑکوں نے آفتاب کی طرف دیکھا۔ کچھ لڑکوں نے کھڑے ہوکر کہا۔ "آج بھی ہم باہر چلے گئے تھے۔ مگر آفتاب یہیں تھا۔"

ایک لڑکے نے یہ بھی کہا "ربر یقیناً آفتاب نے ہی چرایا ہے۔"

ماسٹر صاحب ڈانٹ کر بولے "آفتاب چور نہیں ہے۔" پھر انھوں نے سمجھانے کے لہجے میں کہا۔ "بغیر دیکھے،

مارواڑی کالج۔ بھاگل پور

بغیر سوچے سمجھے، کسی کو چور نہیں کہنا چاہیے۔ اور آفتاب تو تمھارا ساتھی ہے۔ اگر وہ غلطی سے ربر لے بھی لیتا تو قبول کر لیتا۔"

اس دن شام کے وقت لڑکوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ آفتاب سے بولنا بند کر دیں گے۔

چوتھے دن پھر ایک لڑکے کا تصویر رنگنے کا برش غائب ہو گیا۔ اس بار بھی جماعت کے لڑکوں نے آفتاب کو ہی چور ٹھہرایا۔ ایک لڑکے نے ماسٹر صاحب کے پاس جا کر ان کے کان میں کہا "سر، آج بھی لنچ کی چھٹی میں آفتاب یہیں بیٹھا رہا ہے۔ کہیں گیا نہیں۔ برش یقیناً اس کے بستے میں ہے آپ اس کے بستے کی تلاشی لیں۔"

ماسٹر صاحب آفتاب کے بستے کی تلاشی لینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا دل کہہ رہا تھا کہ آفتاب چور نہیں ہے۔ پھر بھی انھوں نے لڑکوں سے کہا "تم میں سے جو لڑکا آفتاب کو چور سمجھتا ہے، وہ آگے آئے اور خود اپنے ہاتھ سے اس کے بستے کی تلاشی لے۔ برش نکل آیا تو آفتاب کو اتنی چھڑیاں پڑیں گی کہ دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔"

لیکن کوئی لڑکا آگے نہیں بڑھا۔ ماسٹر صاحب نے آفتاب سے ہی کہا، "تم خود اپنے بستے کی سبھی چیزیں ان سب کے سامنے نکال کر دکھا دو تاکہ انھیں اطمینان ہو جائے۔"

آفتاب نے اپنے بستے کی سبھی چیزیں اُلٹ دیں، پھر وہ بولا "چور میں نہیں ہوں، لیکن میں نے چور کا پتا لگا لیا ہے سر، اگر آپ ایک کدال منگوا سکیں تو میں چور کو پکڑ سکوں گا اور شاید غائب شدہ سبھی چیزیں بھی نکال دوں۔"

ماسٹر صاحب کے حکم پر ایک لڑکا مالی سے کدال مانگ کر لے آیا۔ کدال ہاتھ میں لیتے ہوئے آفتاب نے کہا "چور لنچ کی چھٹی میں کلاس میں تنہائی دیکھ کر آ جاتا ہے اور ڈیسک پر رکھی ہوئی ہلکی چیزوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ آج ہی میں نے اس چور کا پتا لگایا ہے یہ چور کلاس کے پیچھے ایک بل میں چھپا بیٹھا ہے۔"

آفتاب بل کے پاس آیا۔ ماسٹر صاحب اور سبھی لڑکے اس کے پیچھے تھے۔ پھر آفتاب نے بل کھودنا شروع کیا اور دو فٹ کے بعد ہی اس میں سے ایک چوہا نکل کر بھاگا۔ کچھ لڑکے اس کے پیچھے دوڑے اور باقی لڑکے بل میں رکھی ہوئی غائب شدہ چیزوں کو دیکھنے لگے! چور ہلاک کر دیا گیا۔ اور سارا سامان مل گیا۔ ●

شہاب الدین انصاری

گھریلو ملازمہ
نوبل انعام کی حقدار

زمانے کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ کبھی یہ گمنامی میں پیدا ہونے والے کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہیں تو کبھی معروف خاندان کے فرد کو گمنامی کے اندھیرے میں دھکیل دیتی ہیں۔ اب "میریا اسکلوڈوسکا" کو ہی دیکھیے۔ باپ پولینڈ کے اسکول کا ایک معمولی ٹیچر، ملک، غیر ملکی حکومت کا غلام، ماں ٹی بی کی مریض۔ ایسے خاندان میں ایک بچی پیدا ہوتی ہے ابھی گیارہ برس کی بھی نہیں ہو پائی کہ ماں کا انتقال ہو جاتا ہے۔ باپ کو اپنے وطن کی آزادی کی کوشش کے جرم میں ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے، ایک بہن ٹائیفائیڈ کے مرض میں مبتلا ہو کر موت کا لقمہ بن جاتی ہے۔ حکمراں قوم نے عورتوں کی تعلیم پر پابندی لگا رکھی ہے۔

مشکلات کے ان پہاڑوں کے سامنے اچھے اچھوں کی ہمت جواب دے جاتی، لیکن میریا ایک عام لڑکی کب تھی، اسے تو دشواریوں سے ہار مان لینے کے بجائے ان کا مقابلہ کر کے ہی خوشی ہوتی تھی ہم وطنوں کی حمایت پر باپ کا جو انجام ہوا وہ اس کے سامنے تھا۔ لیکن خوف زدہ ہونے کے بجائے اس نے چھپ کر گاؤں کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کی بڑی بہن برونیا کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے، پولینڈ میں رہ کر ڈاکٹر بننا تو درکنار اعلا تعلیم ہی حاصل کرنا غیر ممکن تھا۔ خواہش کے پورا ہونے کا ایک ہی راستہ تھا۔ فرانس کا سفر۔ لیکن سفر خرچ اور پیرس میں رہنے کے اخراجات کا بندوبست کیسے ہو؟ اب میریا کو اپنے ایثار کے جذبہ کے مظاہرہ کا ایک اور موقع ہاتھ آیا۔ اس نے بہن کے فرانس بھیجنے اور تعلیمی اخراجات کا بار اٹھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس کام کے لیے اس نے شہر کے ایک کھاتے پیتے خاندان میں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ملازمت کر لی۔ البتہ بڑی بہن سے یہ وعدہ لے لیا کہ جب وہ تعلیم مکمل کر لے گی تو میریا کو فرانس بلا لے گی۔

کچھ عرصے بعد جس خاندان میں میریا بحیثیت گورنس کام کرتی تھی، اس کے بڑے لڑکے نے میریا سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میریا بھی شادی کے لیے رضامند تھی، لیکن گھر کی ایک ملازمہ کو بہو بنا کر لانے کا ماحول تو ابھی یورپ میں بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔ نتیجہ ذہنی کوفت، شرمندگی اور احساس تنہائی۔ اور کوئی ہوتا تو یہی غم جان لینے کے لیے بہت تھا۔ لیکن اپنی ناکامی پر آنسو بہانے کے بجائے میریا نے ایک عزم کے ساتھ خود کو سائنس کی تعلیم حاصل کرنے میں گم کر دیا۔ دھن کی پکی، ہمت و جرأت کا نمونہ یہی میریا اسکلوڈوسکا آخر ایک دن دنیا کے چند آن سائنسدانوں میں شمار ہوئی جسے نوبل انعام سے دوبار نوازا گیا۔ جو ایک نوبل انعام پانے والی کی ماں اور دوسرے کی ساس بنی اور جسے دنیا مادام میری کیوری کے

نام سے جانتی ہے۔

۱۸۹۰ء تک ماریا کے گھریلو حالات قدرے بہتر ہو چکے تھے اور وہ چاہتی تو پیرس جا سکتی تھی لیکن احتیاط کا تقاضا تھا کہ ابھی کچھ اور صبر کیا جائے۔ آخر ۱۸۹۱ء میں وہ فرانس کے لیے روانہ ہوئی۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے اُسے ٹرین کے سب سے نچلے درجے میں سفر کرنا پڑا۔ شروع کے کچھ دن اس نے اپنی بہن کے گھر گزارے۔ یہاں اُسے ساری سہولتیں میسّر تھیں، وقت پر کھانا، دل بہلانے کے لیے بڑی بہن، ہم وطنوں سے میل جول کے مواقع۔ البتہ یہاں اسے فرانسیسی ماحول جو زبان سیکھنے کے لیے مناسب تھا نہیں مل پا رہا تھا۔ دوسری طرف فرانس میں تعلیم کے لیے فرانسیسی زبان پر عبور ضروری تھا۔ آخر ماریا نے گھر کے آرام کو تعلیم کی ضرورت پر قربان کر دیا اور اپنی بہن کے گھر کو چھوڑ کر وہ سوربون یونی ورسٹی کے پاس ایک کرایے کی کوٹھری میں رہنے لگی۔ یہ کوٹھری مکان کی تیسری منزل پر تھی جہاں چڑھنا اترنا مشکل تھا پھر کھانے کا بندوبست مناسب نہیں تھا اور اکثر ماریا کو بھوکی رہ جانا پڑتا۔ لیکن ان پریشانیوں کے باوجود ماریا کو یہ جگہ پسند تھی، یہاں اسے مجبوراً فرانسیسی بولنی پڑتی اور مطالعے کے لیے بہت وقت ملتا۔ آخر مشکل دن ختم ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میں وہ فزکس اور ۱۸۹۴ء میں میتھمیٹکس کے امتحان میں پوری کلاس میں اوّل اور دوم مقام کے ساتھ کامیاب ہوئی۔ انھیں دنوں ان کی ملاقات پیرے کیوری سے ہوئی جو فزکس کے مضمون میں اعلا صلاحیت کے مالک تھے۔ آہستہ آہستہ دونوں میں قربت بڑھی۔ کیوری اکثر ماریا کو تحفے بھیجتے لیکن یہ تحفے پھولوں کے گلدستے کے بجائے ان کے مضامین ہوتے ور ماریا انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں کیونکہ ب انھیں اپنے تحقیق کے کام کے لیے کسی مناسب موضوع کی لاش تھی۔ دوستی کا یہ بڑھتا ہوا رشتہ ۲۰ جولائی ۱۸۹۵ء وشادی کے رشتے میں تبدیل ہو گیا اور ماریا اب میری یوری بن گئیں۔

سائنس کی دنیا میں تکنیکی ایجادات کو بالعموم نظری موضوعات کے مقابلے میں کم قدر و قیمت حاصل ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظری میدان میں پیش رفت بڑی حد تک تکنیکی ایجادات کے سہارے ہی ممکن ہو سکی ہے۔ چنانچہ ماریا بھی اپنے تحقیقی نتائج حاصل کرنے کے لیے ایک ایسی ہی تکنیکی ایجاد ویکوم پمپ کی احسان مند ہیں۔ ویکوم پمپ کی مدد سے تجربہ کی بدولت کیتھوڈ شعاع کی ماہیت کا پتا چل پایا اور ایٹم کے ذرات جنھیں الیکٹرون کا نام دیا گیا، دریافت ہوئے۔ الیکٹرون باہم پیوست ہو کر آخر کیوں کر ایٹم کی صورت اختیار کرتے ہیں؟ تجربے اور جستجو کی اسی راہ پر چل کر ویلہم رونٹجن نے ایکسرے کی دریافت کی اور اپنی بیوی کے ہاتھ کی اندھیرے میں ایسی تصویر کھینچی جس میں صرف ہڈیاں اور انگلی کی انگوٹھی نظر آتی تھی۔ سائنس کی دنیا میں اس تصویر کا مقام مونا لیزا کی تصویر سے کم اہم نہیں۔

طبیعیاتی تحقیق کے میدان میں یہ وہ دور تھا جب شعاعوں کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش سائنسدانوں کا مرغوب مشغلہ تھا۔ میری نے بھی اسی میدان میں مزید تحقیق کرنے کا ارادہ کیا۔
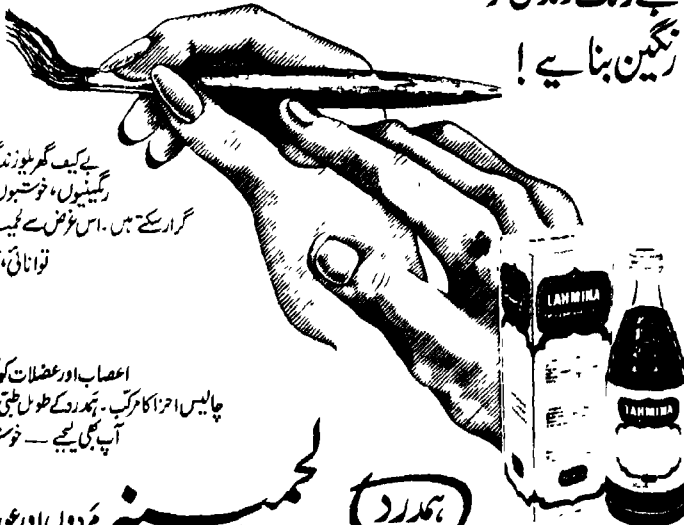
میاں بیوی نے تابکاری کے اس نئے عنصر کی مناسب مقدار حاصل کرنے کے کام کو روایتی ڈھنگ سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں بوہیمیا کی کانوں سے یورینیم کی چھنی ہوئی کئی ٹن راکھ حاصل کی اور اس میں سے نئے مادّے علاحدہ کرنے کا صبر آزما کام شروع کیا۔ اپنے اس کام میں دھن کے پکے یہ دونوں سائنسداں چار برس تک لگے رہے۔ اسی دوران میری کی بڑی بیٹی ایرین پیدا ہوئیں۔ اپنے تجرباتی کام کو یہ دونوں سائنسداں اپنے مکان کے صحن میں ایک شیڈ کے نیچے کرتے تھے اور یہ شیڈ اتنا خراب تھا کہ اس میں سے پانی ٹپکتا رہتا تھا۔ میری بالٹی بھر بھر کر راکھ لاتی اور اسے بڑے پتیلے میں پکاتی تھیں۔ پیر کیوری حاصل شدہ فضلہ پر تجربہ

کرتے۔ چھت میں دود کش نہ ہونے کی وجہ سے پکاتے وقت نکلنے والی گیس ان کے جسم میں داخل ہو رہی تھی لیکن دونوں اس کے مضر اثرات سے بے خبر تھے۔ اس گیس کے ذریعے اُن کے جسم میں داخل ہونے والی ریڈیو ایکٹی ویٹی بڑی حد تک آگے چل کر پیر کیوری،مادام کیوری اور ان کی بڑی بیٹی آمیرین کی موت کا سبب بنی۔ دوسرے لفظوں میں یہ تینوں افراد سائنسی تحقیق کے شہید کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربات کے نتائج جس ڈائری میں لکھے ہیں وہ آج تقریباً ۸۵ سال گزرنے کے بعد بھی ریڈیو ایکٹو ہے۔ لیکن واہ رے شوق۔ مشکل کے ان ایام کے بارے میں مادام کیوری لکھتی ہیں کہ بے سروسامانی کا یہ دور ان کی زندگی کا سب سے خوشیوں بھرا دور تھا۔ مارچ ۱۹۰۲ء میں آخر وہ خالص اس مادّہ کو اتنی مقدار میں علاحدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کا ایٹمی وزن معلوم کیا جا سکے۔ یہ وہی مادہ تھا جو آگے چل کر کینسر جیسے موذی مرض کے علاج میں معاون ہوا۔ نوبل کمیٹی نے میاں بیوی کو ۱۹۰۳ء میں ان کی اس تحقیق کے لیے نوبل انعام کا مستحق قرار دیا۔ ان کی یہ دریافت نظری طبیعیات کے میدان میں ایک سنگ میل ہے۔ اب یہ بات صاف ہو گئی کہ ایٹم کے اندر ایک قوی عمل واقع ہوتا رہتا ہے۔ اس سمت میں اور زیادہ تحقیق کی بدولت روودر فورڈ نے گاما اور بیٹا شعاعوں کی نشاندہی کی۔

سچ ہے انسان میں اگر سچی لگن ہو تو غلامی کا ماحول،سہولیات کی کمی، صبر آزما حالات یہ سب چیزیں راہ میں رکاوٹ کے بجائے کامیابی کی منزل کا زینہ بن جاتے ہیں اور ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میری کیوری کی زندگی ہمارے لیے ایک ایسی ہی مشعل راہ ہے۔

شیخ رحمٰن اکولوی

قصّہ بلّی اور چوہے کی دشمنی کا

اگلے وقتوں کی بات ہے۔ جنگل میں خون کے بدلے خون والا قانون رائج نہیں تھا۔ جنگل میں ہر طرف منگل ہی منگل تھا۔ تمام جانور چھوٹا بڑا، طاقتور کمزور، اونچ پنچ احساس برتری اور احساس کمتری سے عاری، محبّت اور بھائی چارگی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی کسی کے خون کا پیاسا نہ تھا۔ کسی کے دل میں، دوسرے کے لیے کینہ نہیں تھا۔ شیر جنگل کا راجا تھا، سب اس کا احترام کرتے۔ وہ بھی اپنی رعایا کے سُکھ دُکھ کا پورا پورا خیال رکھتا۔ کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ سب اپنی زندگی میں مگن تھے۔ ہر جانور کو اس کی خواہش کے مطابق کام تقسیم کر دیے گئے تھے۔ ہاتھیوں کے ذمّے جنگل کے سوکھے درختوں کو اکھاڑ کر لکڑیاں جمع کرنے کا کام تھا۔ دودھ کی ذخیرہ اندوزی کا کام دودھ دینے والے جانوروں کے سپرد کیا گیا تھا۔ سانپ اپنے جنگل کے لیے جاسوسی کرتے اور شرپسند عناصر کا پتا لگانے میں مصروف رہتے۔ درختوں سے پھل توڑنے کی ذمّہ داری بندروں نے لے رکھی تھی۔ کوئل اور بلبل خوشی کے موقعوں پر گیت گا کر اور مور اور سارس ناچ کر تفریح کا سامان مہیّا کرتے۔ چیتے حفاظتی فوج میں شامل تھے۔ کیوں کہ چھپ کر حملہ کرنے میں وہ طاق تھے۔ بلّی کو دودھ کے ذخیرے کی حفاظت کا کام سونپا گیا تھا۔ اس وقت بلّی سبزیاں کھاتی تھی اور دودھ کے مزے سے بالکل ناواقف تھی۔ ہر جانور بڑی ایمانداری اور مستعدی سے اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔ سب خوش تھے۔ اور سب کو خوش دیکھ کر شیطان بڑا ناخوش تھا —— جانوروں کی پر امن اور خوشحال زندگی اسے بھلا کیسے اچھی لگتی؟ وہ جنگل میں شوشہ چھوڑنے کی فکر میں رہنے لگا اور ایک دن اس کے ذہن میں ایک شیطانی اسکیم اُبھری۔ وہ لومڑی بن کر بلّی کے پاس پہنچا اور مزاج پُرسی کے بعد بلّی سے بولا "بی بلّی، کیا تم نے کبھی دودھ کا مزہ چکھا ہے؟" —— بلّی نے کہا "کیا بات کرتی ہو لومڑی بوا۔ تم کیا مجھ سے ایسی بے ایمانی کی امید کرتی ہو؟"

"نہیں ری" میرا مطلب یہ تھا کہ جس چیز کی حفاظت کی ذمّے داری تم پر عائد کردی گئی ہے۔ اس چیز کے مزے سے تمھاری واقفیت ضروری ہے۔ جب تک کسی چیز کا مزہ ہمیں معلوم نہیں ہوگا، ہم اس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ نہیں

دیپک چوک متصل ہارون چال۔ اکولہ

کر سکتے۔" آخرکار بلّی لومڑی کی باتوں میں یعنی شیطان
کی باتوں میں آگئی اور ایک مگ بھر دودھ اس نے
نوش کیا۔ اور زندگی میں پہلی مرتبہ دودھ کا مزہ
چکھا۔ پھر دودھ کا مزہ اسے ایسا بھایا کہ روزانہ
دودھ چرا کر پینے لگی۔ اس کی چوری آخر کتنے دن
چھپتی۔ ایک دن ایک چوہے نے اسے دودھ پیتے
دیکھ ہی لیا۔ اور شیر راجا کی حضور میں اس طرح
بلّی کی شکایت کی "حضور! بلّی بے ایمان ہے وہ
دودھ چرا کر پیتی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے
اسے دودھ پیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس نے جنگل کے
سماج میں چوری جیسی لعنت کی ابتدا کی ہے۔
اسے سخت سے سخت سزا دی جانی چاہیے تاکہ
آیندہ کوئی اور جانور بلّی کے نقش قدم پر چلنے کی
جرأت نہ کرے۔"

چوہے کے منہ سے بلّی کی چوری کی خبر سن
کر شیر آگ بگولہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون
اتر آیا۔ اس کی مونچھوں اور دُم کے بال کھڑے
ہو گئے۔ وہ دہاڑا " اس نا معقول، ناہنجار بلّی کو
فوراً گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔
اگر اس کا جرم ثابت ہو گیا تو وہ ہی نہیں اس
کی اگلی پشتیں بھی اس کی زد میں آجائیں گی۔"
شیر راجا کا حکم سنتے ہی چار چیتے سپاہی بلّی
کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہوئے ___ تھوڑی
دیر بعد ہی بلّی گلے میں زنجیر پہنے شیر راجا
کے دربار میں کھڑی تھی۔ دربار جانوروں سے
کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیوں کہ بلّی کی چوری
کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔
تمام جانور دم بخود تھے کہ دیکھیں بلّی کا کیا ہوتا ہے؟
شیر نے بلّی کو خونخوار نظروں سے گھورتے
ہوئے کہا " یہ چوہا کہتا ہے کہ تم دودھ چرا کر پیتی ہو؟"
بلّی نے کہا " نہیں سرکار، مائی باپ، یہ غلط
کہتا ہے۔ مجھے دودھ کی حفاظت کے لیے تعینات
کیا گیا نہ کہ دودھ پینے پر۔ چوہے کو یقیناً کوئی
غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔"
شیر نے زور دار قہقہہ لگایا پھر بولا ___
"اے بلّی تیری پچھلی خدمات دیکھتے ہوئے شاید
میں تیری بات کا یقین کر لیتا لیکن ___ تیری
مونچھوں میں لگی ہوئی دودھ کی ملائی تیرے
گنہگار ہونے کا ثبوت بن گئی ہے۔"

شیر کی بات سنتے ہی بلّی کا ہاتھ
بے اختیار اپنی مونچھوں پر گیا۔ اور وہ بے بس
نظر آنے لگی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ دودھ
پیتے وقت اس نے اپنے ہونٹ تو پونچھے
تھے لیکن مونچھوں کا اسے خیال نہیں رہا
تھا۔ اپنی صفائی کے لیے اس کے پاس اب کچھ
بھی نہ تھا۔ اس نے ندامت سے سر جھکا لیا ___
شیر راجا نے فیصلہ سنایا " ہم جنگل کے راجا،
بلّی کو اس کے جرم کی پاداش میں جنگل بدر
کرتے ہیں۔ آیندہ یہ یا اس کے خاندان کا کوئی
ممبر جنگل میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اور اگر انھوں
نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو انھیں قتل کر دیا
جائے گا۔"

شیر راجا نے فیصلہ سنا کر دربار برخواست
کر دیا تو چار چیتے سپاہی بلّی کو جنگل کے باہر
چھوڑ آئے۔ کچھ جانور بھی ان کے پیچھے ہو لیے
تھے۔ وہ سب کے سب بلّی پر لعنت ملامت
کر رہے تھے۔

کچھ دنوں بعد چوہے کو بھی کسی جرم کی
پاداش میں جنگل بدر کر دیا گیا۔ تب سے چوہا
اور بلّی شہر میں انسانوں کے بیچ رہ رہے
ہیں۔ بلّی چوہے کی نسل سے اپنا انتقام لیتی
رہتی ہے اور جہاں کہیں اس کو کوئی چوہا

نظر آتا ہے اسے لقمہ بنا لیتی ہے۔ اب تک وہ کتنے چوہوں کو ہضم کر چکی ہے۔ لیکن اس کے انتقام کی آگ اب بھی نہیں بجھی۔ اسی انتقامی جذبے کی وجہ سے شیر خوری کے ساتھ ساتھ گوشت خوری بھی اس کی فطرت میں شامل ہو گئی ہے۔ سبزیاں کھانا اس نے قطعی چھوڑ دیا ہے۔ گوشت اور دودھ پر ہی گزارا کرتی ہے۔ لیکن اب جب کبھی وہ دودھ پیتی ہے تو ہونٹ صاف کرنے کے بعد اس کا ہاتھ، بے اختیار اس کی مونچھوں پر پھر جاتا ہے۔ کیوں کہ ایک بار ایسا نہ کرنے کی وجہ سے اس کی چوری پکڑی گئی تھی اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنگل بدر کر دیا گیا تھا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس لومڑی کا کیا ہوا؟ سارے فساد کی جڑ تو وہی تھی؟۔

ارے بھئی وہ تو شیطان تھا جس نے لومڑی کا روپ دھار کر بلی کو بہکایا تھا۔ اس کی مَتی خراب کی تھی۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ ایک طرف اس کی وجہ سے بلّی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنگل بدر کر دیا گیا تھا، چوہے سے اس کی دشمنی ہو گئی تھی۔ اور دوسری بچاری لومڑی سارے جانوروں میں مکّار اور دھوکے باز مشہور ہو گئی تھی۔

چوہے کو کس جرم کی پاداش میں جنگل بدر کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک الگ قصّہ ہے وہ پھر کبھی۔

اِدھر اُدھر سے

پنت نگر میونسپل اردو اسکول کی کامیابی

گذشتہ ماہ ساقی ناتھ میونسپل اردو مدارس بیٹ ۶ کے مختلف جماعتوں کے درمیان تقریری مقابلے ہوئے۔ اس میں پنت نگر میونسپل اسکول گھاٹ کوپر کے ہونہار طالب علم ندیم الحق نے دوسرا انعام حاصل کیا۔ ہم ان کو مبارک باد دیتے ہیں۔

علامہ اقبال اور اشتہار

علامہ اقبال مرحوم سے عقیدت کا یہ حال ہے کہ پچھلے دنوں جوڑ بازار کراچی (پاکستان) کے ایک لوہے یعنی ہارڈ ویر مرچنٹ نے اشتہار دیا تو اس کا عنوان بھی کلام اقبال میں سے ڈھونڈا۔

"جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں"

نیچے لکھا تھا کہ اپنی بھینسوں، گایوں اور بکریوں کو باندھنے کے لیے علامہ اقبال مارکہ زنجیریں ہمارے یہاں سے خرید لیے۔ اصلی فولاد کی ہیں اور اتنی مضبوط ہیں کہ ذوق یقیں کے باوجود نہیں کٹ سکتیں۔ غلط ثابت کرنے والے کو علامہ اقبال کی کتابوں کا ایک سیٹ، دیا جائے گا۔"

اہرام مصر

آج سے پانچ ہزار سال پہلے مصر کے ایک بادشاہ غوخوسنے کچھ اہرام بنوائے جو اس کے مرنے کے بعد اس کا مقبرہ بنے ان میں کم و بیش ۲۳ لاکھ پتھر استعمال کیے گئے تھے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر پتھر کا وزن ستر من تھا۔

پتھر کے سکّے

آپ یقین کریں یا نہ کریں جاپان کی ایک قدیم بستی یاپ میں لوگ اپنا کاروبار پتھر کے روپے سے کرتے ہیں۔ یہ روپے پتھر کے بنائے جاتے ہیں۔ اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کچھ سکے بیل گاڑی اور اسکوٹر کے پہیوں کے برابر ہوتے ہیں۔

دادا اور پوتا

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ امریکہ کے ایک صدر ابراہام لنکن کے دادا کا نام بھی ابراہام تھا۔ دونوں کی بیویوں کا نام نیری تھا۔ دونوں کے بیٹوں کا نام ٹامس تھا اور دونوں قتل کیے گئے۔

زلزلے کا پتا دینے والا درخت

کیوبا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کو زلزلے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کہ جب کبھی زلزلہ آنے کے آثار ہوتے ہیں تو اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔

پتھر کا چشمہ

انڈمان جزیرہ میں ایک ایسا چشمہ پایا جاتا ہے کہ اگر اس کا پانی باہر نکال لیا جائے تو وہ پانی پتھر بن جاتا ہے اور جب اس پتھر کو پھر چشمے میں ڈال دیا جائے تو پھر پانی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ آئی ساجد

شاہی حجام

دربار بڑے قرینے اور سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ سب سے اوپری حصّے پر بادشاہ سلامت اور ملکہ عالیہ کی جھلملاتی سنہری کرسیاں تھیں۔ وزیراعظم کی کرسی کچھ فاصلے پر تھی۔ اس سے نیچے امرا اور درباریوں کی کرسیاں تھیں اور پھر عوام و خواص کے لیے مسند بچھائی گئی تھی۔ تمام لوگ دربار میں آچکے تھے۔ اور بادشاہ کا انتظار کر رہے تھے۔ چونکہ آج بادشاہ کی پچاسویں سال گرہ تھی اس لیے دور دراز کے ملکوں سے خاص خاص مہمان بھی تحفے تحائف لے کر آئے ہوئے تھے۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ نقارے پر چوب پڑی اور آواز سنائی دی، با ادب با ملاحظہ ہوشیار! بادشاہ سلامت، ملکۂ عالیہ کے ہمراہ تشریف لا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی سب لوگ اپنی اپنی جگہ ادب و احترام سے کھڑے ہو گئے۔ ایک شانِ تمکنت سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بادشاہ سلامت اپنی ملکہ کے ساتھ مخصوص کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رعب دار چہرہ، قیمتی لباس، ہیروں سے جگمگاتا ہوا تاج، بادشاہ سلامت تو بس بادشاہ سلامت ہوتے ہیں۔ ان کی تعریف کے لیے الفاظ کہاں سے لائیں بھلا۔

بادشاہ سلامت کے بیٹھتے ہی سب لوگ بھی بیٹھ گئے۔ وزیراعظم نے دربار کی کارروائی شروع کر دی۔ تحفے تحائف نذرانے گزارے گئے۔ بادشاہ کی شان میں تقریریں کی گئیں۔ قصیدے پڑھے گئے۔ فریادیں سنی گئیں انصاف کیا گیا اور پھر سب سے آخر میں بادشاہ سلامت تقریر کرنے کھڑے ہوئے انھوں نے کہا:

دل و جان سے زیادہ عزیز رعایا!

میری مملکت کو مضبوط اور پائیدار بنانے والے بہادر و جاں نثارو! میرے دل کی دھڑکنوں میں بسنے والے سپوتو! آج تم سب کو یہاں دیکھ کر جو خوشی مجھے حاصل ہو رہی ہے اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہر برس کی طرح آج بھی آپ لوگوں نے ہمیں سال گرہ کی مبارکباد دے کر اپنی بے شمار محبتوں اور خلوص کا جو اظہار کیا ہے اس کے لیے آپ لوگ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بادشاہت ہمیں ورثتاً میں ملی ہے۔ یہ حکومت آپ سب کی محبت، خلوص، ہمت، وفاداری و جاں نثاری پر قائم ہے۔ یہ آپ لوگوں کا جذبۂ وفاداری ہی تو ہے

نمرہ۔ پکی مسجد کھام گاؤں۔ بلڈانہ

...تے ہیں اب تک بادشاہ بنائے رکھا۔ یہی وجہ ... آج تک ہماری گردن سوائے خدا کے کسی اور ... منے کبھی نہیں جھکی اور جب تک ہم آپ کی بھلائی اور ملک کی ترقی کے کام انجام دیتے رہیں گے ہمارا سر سوائے خدا کے کسی بھی فرد کے سامنے کسی بھی حالت میں ہرگز ہرگز نہ جھکے گا۔"

سب نے تالیاں بجا کر پُرجوش انداز میں بادشاہ کی بات کا خیر مقدم کیا۔ بادشاہ اپنی تقریر ختم کرکے بیٹھنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک پندرہ سالہ لڑکا اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "حضور بادشاہ سلامت! اگر جان کی امان پاؤں اور اجازت ہو تو ایک بات عرض کرنے کی جرأت کروں؟"

سب لوگ حیرت سے لڑکے کو دیکھنے لگے —

بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا: "اجازت ہے"۔ "میں بادشاہ سلامت کا بے حد شکرگزار ہوں کہ جناب والا نے اجازت مرحمت فرمائی۔ میں جو بات کہنے جا رہا ہوں حضور بادشاہ سلامت اس گستاخی کے لیے درگزر کریں اور میرے ساتھ میرے خاندان کی جاں بخشی کا بھی اعلان کریں تو عین بندہ نوازی ہوگی"۔ لڑکے نے کہا۔ بادشاہ نے متبسم ہو کر کہا: "اے بہادر لڑکے ہم تیری اور تیرے خاندان کی جاں بخشی کا اعلان کرتے ہیں اب کھل کر صاف صاف کہہ جو کہنا چاہتا ہے۔"

لڑکے نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا: "خدا، بادشاہ سلامت کا اقبال ہمیشہ بلند رکھے۔ ابھی ابھی حضور نے فرمایا تھا کہ "ہمارا سر سوائے خدا کے کسی بھی فرد کے سامنے کسی بھی حالت میں ہرگز ہرگز نہ جھکے گا۔ ہماری گردن نہ کسی کے سامنے جھکی ہے اور نہ جھکے گی۔" مجھے اس بات پر اعتراض ہے بندہ پرور!"

یہ سُن کر بادشاہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، ماتھے کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ پورا دربار سناٹے میں آ گیا "کیا کہنا چاہتا ہے تو لڑکے؟" بادشاہ نے کڑک کر پوچھا۔

لڑکے نے سر کو خم کرتے ہوئے کہا: "حضور! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جناب کا سر مبارک خدا کے علاوہ وقتاً فوقتاً کسی اور فرد کے آگے بھی جھکتا ہے اور فرد بھی ایسا جو بہت معمولی حیثیت رکھتا ہے!"

یہ سنتے ہی بادشاہ غصے کی زیادتی سے کھڑے ہو کر کانپنے لگا۔ شاہی جلال بادشاہ کے چہرے پر چھا گیا۔ اس نے کہا "گستاخ اور بدزبان لڑکے! اگر ہم نے جاں بخشی کا اعلان نہ کیا ہوتا تو بخدا اسی وقت تیری گردن تن سے جدا کر دی جاتی۔ تو نے جو کچھ بکا ہے اسے ثابت کر ورنہ عبرت ناک سزا کے لیے تیار ہو جا۔"

لڑکے نے بلا خوف بادشاہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"بے شک بادشاہ سلامت میں ثابت کر دکھاؤں گا لیکن میری تین شرطیں ہیں؛ اول تو یہ کہ مجھے ایک ماہ تک اپنے محل میں رہنے کی اجازت دی جائے؛

دوم یہ کہ آپ کی نجی مصروفیات کی پل پل کی خبر مجھے دی جائے۔ اور سوم یہ کہ میں جب چاہوں دربار منعقد کرایا جائے۔"

کچھ دیر سوچ کر بادشاہ نے کہا "ہمیں تیری تینوں شرطیں منظور ہیں۔" دربار برخاست ہو گیا۔ سب لوگ حیرت زدہ ڈرے ڈرے، سہمے سہمے سے اس انہونی پر سوچتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

لڑکا محل میں رہنے لگا اور اسے بادشاہ کی نجی مصروفیات کی ایک ایک پل کی خبر ملنے لگی۔ ادھر بادشاہ الگ حیران و پریشان کہ یہ مسئلہ کس طرح حل ہو۔ وزیراعظم، سپہ سالار اور دیگر دانشور سر جوڑ کر بیٹھتے لیکن نتیجہ حاصل نہ ہوتا۔

آخر بیس روز بعد لڑکے کو وہ موقع مل گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ اسے بتایا گیا کہ بادشاہ سلامت کچھ دیر بعد غسل سے پہلے اپنے بال ترشوائیں گے۔

وہ سیدھا بادشاہ کی نشست خاص میں پہنچ گیا۔ یہاں خلیفہ (حجام) قینچی، استرا اور کنگھے کی مدد سے بادشاہ کے بال تراش رہا تھا۔ وہ کبھی بادشاہ کا سر دائیں کرتا اور کبھی بائیں۔ کبھی اوپر اٹھاتا اور کبھی نیچے جھکاتا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب خلیفہ سامنے کھڑا تھا اس نے بڑے احترام سے بادشاہ کا سر نیچے جھکایا اس طرح کہ بادشاہ کی نظریں خلیفہ کے ٹخنوں پر ٹکیں اور خلیفہ بادشاہ کے سر کے درمیانی حصہ کے بالوں کو بڑے سلیقے کے ساتھ اپنے فنکارانہ ہاتھوں سے درست کر رہا تھا۔ اسی لمحے بادشاہ کے کانوں میں لڑکے کی آواز گونجی "حضور بادشاہ سلامت! دخل در معقولات اور گستاخی کی معافی چاہتے ہوئے عرض ہے کہ اس وقت آپ جس حالت میں ہیں اس پر توجہ کرتے ہوئے غور فرمانے کی زحمت گوارا کریں تو مجھے یقین ہے کہ حضور میری بات سمجھ جائیں گے"

جیسے ہی یہ الفاظ بادشاہ کے کانوں میں پڑے سر جھکانے والی حقیقت بادشاہ کے سامنے آگئی ــ انھوں نے آہستہ آہستہ سر اوپر اٹھایا تو دیکھا سامنے خلیفہ قینچی استرا اور کنگھا ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔ اس حالت کو محسوس کرتے ہوئے بادشاہ شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ حقیقت ان کے سامنے تھی وہ حیران بھی تھے کہ اتنی چھوٹی سی بات ان کے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ بادشاہ کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ معمولی سا آدمی کون ہے جس کے سامنے میرا سر جھک جاتا ہے وہ لڑکے کی عقلمندی سے بہت خوش ہوئے۔

کچھ ہی دیر بعد لڑکے کی خواہش کے مطابق دربار لگایا گیا۔ تمام لوگ دیکھتے ہی دیکھتے دربار میں حاضر ہوگئے۔ آج تو دربار کی شان ہی نرالی تھی! آخر بادشاہ سلامت نے اٹھ کر کہنا شروع کیا "میری مملکت کے جاں نثارو! آج ہم اس لڑکے کی ہوشیاری عقلمندی اور سوجھ بوجھ کے قائل ہوگئے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ ہمارا سر خدائے برتر کے علاوہ بحالت مجبوری و ضرورت ایک اور شخص کے سامنے بھی جھکتا ہے اور آپ جانتے ہیں وہ کون ہے؟ (پورا دربار خاموش تھا ــــ کوئی آواز نہیں) بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا ہم بتاتے ہیں وہ کون ہے؛ وہ ہے ہمارا شاہی حجام؛ بال ترشواتے وقت جس کے سامنے ہمارا سر اور گردن جھک جاتی ہے۔ کہنے کو یہ ایک معمولی سی بات ہے لیکن ہمارے دعوے کو باطل کرتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو ہمیں اس ہونہار لڑکے نے بتائی۔ ہم اس کی عقلمندی و ہوشیاری سے خوش ہوتے ہوئے اسے عاقل خاں کا خطاب مرحمت فرماتے ہیں۔ ساتھ ہی اسے انعام واکرام اور خلعت فاخرہ دیتے ہوئے اپنی مجلس مشاورت میں شامل کرتے ہیں"

بادشاہ کے اس فیصلے پر سارا دربار خوشی سے جھوم اٹھا۔ تمام دربار نے تالیاں بجا کر اور بادشاہ سلامت زندہ باد کے نعرے لگا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ سچ ہے آدمی اگر اپنی عقل اور سمجھ بوجھ سے کام لے تو ترقی شہرت اور دولت اس کے قدم چومتی ہے

چائے کی دعوت

(یہ مضمون ہماری ان ننھی پیاری خریداروں کے لیے ہے جن کو ابھی باورچی خانے میں جانے کی اجازت نہیں ملتی ہے۔ اس لیے بڑی لڑکیاں پڑھ کر ناک بھوں نہ چڑھائیں۔)

کیوں بھئی۔ تم اپنی سہیلیوں کی دعوت تو کرتی ہوگی۔ لیکن چائے تیار کرنے کا بوجھ انھیں پر پڑتا ہوگا۔ دل تو تمھارا بھی چاہتا ہوگا کہ ایسی دعوت کرو جس میں تم سارا کام اپنے ہاتھ سے کرو۔ تمھاری مدد کے لیے میں یہ مضمون لکھ رہی ہوں۔ پہلے کچھ ہدایتیں سن لو۔

۱۔ دعوت دینے سے پہلے امّی کی اجازت لے لو۔

۲۔ پہلی مرتبہ زیادہ مہمان نہ بلاؤ گڑ بڑ ہو جائے گی۔

۳۔ کل سامان کی فہرست ایک مرتبہ اپنی امی کو دکھا دو۔ گھڑی گھڑی مانگ کر انھیں دق نہ کرو۔ اب ترکیب سنو!

راحت جان

سامان دو بڑے یا چار چھوٹے سنترے یا اگر سنترے نہیں تو تین پکے پکے امرود اور ایک نیبو۔ چار چمچے بھر شکر۔ دو چمچے (چائے کے) بھر نمک۔ ایک چمچہ چائے۔ گول مرچ پسی ہوئی۔
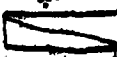
ترکیب سنترے کو چھیل کر پھانکوں کو خوب صاف کر لو اور چھلکی سے پکڑ کر پھانک کا باریک چھلکا الگ کر لو کہ گودہ رہ جائے۔ اس گودے کو ایک بڑے شیشے یا چینی کے پیالے میں ڈالتی جاؤ۔ اگر امرود ہے تو امرود چھیل کر باریک قتلے کاٹ لو۔ بیچ والا حصہ الگ کر دو اور پیالے میں ڈال دو۔ اوپر سے شکر اور نمک مرچ ڈال دو اور نیبو کاٹ کر نچوڑ دو۔ سنترے میں نیبو کی ضرورت نہیں۔ اب ڈھک کر رکھ دو۔ اور کوئی پندرہ منٹ کے بعد چمچے سے ملا دو۔ تم دیکھو گی کہ پیالے میں رس بھرنا شروع ہو گیا ہے۔ جتنی دیر رکھا رہے گا اتنا ہی مزے کا ہوگا۔ اس لیے چائے کے وقت سے دو گھنٹے پہلے تیار کرنا چاہیے۔

گڑیا کیک

سامان تین گول بسکٹ۔ چھے چھوٹے چمچے بھر شکر۔ تین چمچہ بھر ملائی۔ ایک پیالی دودھ۔ ذرا سا کترا ہوا ناریل اور بادام اور آٹھ دس کشمش۔

ترکیب بسکٹوں کو صاف تشتریوں میں ایک ایک الگ الگ رکھ دو۔ اب تھوڑا تھوڑا دودھ تینوں تشتریوں میں ڈال دو۔ اور اوپر سے ایک ایک چمچہ بالائی ڈال کر پھیلا دو۔ پھر دو دو چمچے شکر چھڑک دو، سب کے اوپر سے ناریل اور بادام اور کشمش تھوڑا تھوڑا ڈال دو اور رکھ دو۔ یہ بھی دو گھنٹے پہلے بنا نا چاہیے۔ تو بسکٹ پھول کر ملائم ہو جائیں گے اور چمچے سے کھاؤ گی تو پیسٹری کا مزہ دیں گے۔

یہ دو مہمانوں کے خیال سے لکھا ہے زیادہ ہوں تو زیادہ سامان چاہیے

سینڈوچ یا توس

سامان چھ پتلے پتلے ڈبل روٹی کے توس بغیر سکے ہوئے۔ آدھی ٹکولی مکھن۔ آدھا چمچہ پسا ہوا نمک، آدھا چمچہ کالی مرچ پسی ہوئی۔ آدھا چمچہ پسی ہوئی رائی۔ دو بڑے بڑے ٹماٹر۔

ترکیب ٹماٹر کے پتلے پتلے ٹکڑے کاٹ لو۔ مکھن کو ذرا آگ کے سامنے ملائم کرکے نمک مرچ اور رائی ملا دو۔ اب روٹی کے توس پر ایک ایک طرف تھوڑا تھوڑا یہ مکھن لگا دو۔ پھر ایک توس کے اوپر ٹماٹر کے تھوڑے قتلے رکھ کر اوپر سے دوسرا توس رکھو۔ اور چھری سے بیچ میں کاٹ دو۔ اگر ایسا کاٹو گی تو اچھا رہے گا۔ [ ] اب ان دوہرے تکونوں کو آہستہ سے اٹھا کر پلیٹ میں سجا دو۔

میٹھے توس

سامان چھ پتلے پتلے ڈبل روٹی کے توس بغیر سکے ہوئے۔ آدھی ٹکولی مکھن یا ملائی چھ چمچے۔ چار چمچے چھوٹے جام یا جیلی۔

ترکیب مکھن اور جام یا مکھن اور ملائی کو چھری سے خوب ملا لو۔ اب ایک توس کے اوپر تھوڑا سا لگاؤ۔ پھر اس کے اوپر دوسرا توس رکھو اور اس پر لگاؤ۔ اور اس کے اوپر تیسرا توس رکھو اور چھری سے تین ٹکڑے کر دو۔ اب یہ تین تہہ کے ٹکڑوں کو سنبھال کر ایسے ہی اوپر نیچے رکھے ہوئے پلیٹ میں سجا دو۔ اسی طرح باقی تین توس کا بناؤ۔

چائے

سامان چائے کی پتی اور گرم پانی۔ دودھ ایک پیالی۔ شکر ایک پیالی۔

ترکیب پہلے چائے دان کو ذرا سے گرم پانی سے دھو لو۔ پھر جتنی پیالیاں ہیں۔ اتنے ہی چھوٹے چمچے چائے کی پتی ڈالو۔ اور ایک چمچہ چائے زیادہ (چائے دانی کے حصہ کا) ڈالو۔ اب اوپر سے ابلتا ہوا پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک دو۔ تین منٹ کے بعد پیالی میں چائے ڈال کر ذرا سا دودھ اور ایک چمچہ شکر ڈال دو۔ چائے وقت کے وقت ہی بنانا چاہیے۔ ورنہ ٹھنڈی اور بدمزہ ہو جائے گی۔ پانی جیسے ہی ابلنے لگے ویسے ہی اتار لینا چاہیے۔

تمھاری دعوت کامیاب تبھی ہو گی جب دسترخوان اور برتن صاف ستھرے ہوں گے۔ صاف کپڑے سے ایک ایک پیالی اور تشتری کو پوچھنا چاہیے۔ پھر بیچ میں کھانے کی چیزیں اور ہر مہمان کے سامنے ایک ایک پیالی اور ایک ایک خالی تشتری چاہیے۔ بیچ میں اگر چھوٹے سے گلدان میں پانی بھر کر دو چار پھول لگا دو گی تو کیا ہی بہار دے گا۔

اگر یہ دعوت کامیاب رہی تو اب کے اور ایسی ہی چیزوں کی ترکیب بتاؤں گی جس میں ذرا چولھے کے پاس بھی جانا پڑے۔

(پیام تعلیم مئی ۱۹۳۷ء سے)

پیامیوں سے

"پیام تعلیم" کے مضامین کے بارے میں اپنی رائے علاحدہ کاغذ پر لکھ کر بھیجا کریں۔

حضرت علیؓ کا عملی کردار

حضرت علیؓ کی شخصیت کسی قسم کے تعارف کی محتاج نہیں، لیکن پھر بھی یہ ضروری ہے کہ آج کل کے موجودہ دور میں بچوں کو آپ کی شخصیت اور کردار سے برابر آگاہ کیا جاتا رہے، تاکہ وہ آپ کی مثالی زندگی سے بھرپور سبق حاصل کرسکیں اور اس طرح دینی تربیت و تعلیم کی طرف متوجہ ہوسکیں۔

حضرت علیؓ آلِ ابراہیم ہیں۔ قریش کی نسل سے بنی ہاشم کے ممتاز گھرانے میں عبدالمطلب کے پوتے، ابوطالب کے فرزند تھے۔ آپ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا۔ جنھیں رسولؐ خدا مثل اپنی ماں کے سمجھتے تھے۔ حضرت علی خدا کے گھر میں یعنی خانۂ کعبہ جیسے مقدس مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کے ماں باپ کے علاوہ حضرت رسولؐ خدا بھی آپ کی ولادت پر بڑے خوش ہوئے۔

پورے عالم اسلام میں مردوں میں حضرت علیؓ اور عورتوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ایسی شخصیتیں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اسلام کو قبول کیا، ایمان لائے۔

حضرت علیؓ کی شادی حضرت رسول خداؐ کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیٹی حضرت سیّدہ فاطمہ زہراؓ سے ہوئی تھی۔ یہ شادی بڑی سادگی کے ساتھ انجام دی گئی جو آج بھی تمام انسانوں کے سامنے عموماً اور مسلمانوں کے سامنے خصوصاً ایک عملی نمونہ پیش کرتی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ نے جتنی بھی جنگیں لڑیں وہ سب اسلام کے تحفظ کے لیے تھیں۔ اسلامی جنگیں محض خدا کی راہ میں لڑی گئیں، اس میں نفسانیت کا کوئی دخل نہ تھا۔ آپ کی شجاعت اور بہادری کی دھاک جمی ہوئی تھی۔ یہودیوں میں مرحب اور کفّارِ قریش میں ابن عبدود کو اپنی بہادری اور دلیری پر بڑا ناز تھا۔ لیکن جنگ خندق اور فتح خیبر کے موقع پر دیکھنے والوں نے حضرت علیؓ کی بے مثال بہادری کو دیکھ لیا جن کی ذوالفقار (حضرت علیؓ کی تلوار کا نام ہے) نے ان کا چراغ حیات بجھا دیا۔

جنگِ جمل اور جنگ صفین میں بھی آپ نے حق پسندی کو نہ چھوڑا اور نہ اپنی نفسانیت کو راہ دی۔ جنگ جمل ایک اجتہادی غلط فہمی سے واقع ہوئی اور جہاں حق کی راہ دکھائی دی، ختم ہوگئی۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدّیقہؓ کو آپ نے بصد عزت و احترام مدینہ منورہ روانہ فرمادیا۔

جنگ صفین بھی آپ پر لادی گئی لیکن وہاں بھی آپ نے اصول اسلام کا دامن نہ چھوڑا اور خوارج کی سرکشی کے باوجود آپ نے حزم و احتیاط کو مدنظر رکھا۔ تاریخ اس وقت کے آپ کے احکام کی گواہ ہے۔

حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور ہمیشہ رہا۔

دنیائے اسلام اگر تاریخ اسلام پر نظر کرے اور بہ غور اس کا مطالعہ کرے تو وہ اس بات سے ہرگز انکار نہیں کرسکتی کہ حضرت علیؓ رسول کریمؐ کی قوت بازو تھے جب حضرت رسول کریمؐ کو مکّہ سے مدینے کو ہجرت کا حکم ہوا تو آپ حضرت رسولؐ کے بستر مبارک پر دشمنوں کی یلغار میں کچھ امانتیں ادا کرنے کے لیے بے خوف و خطر سوئے تھے

کامران پور علی گڑھ

اور صبح کو اُٹھ کر اطمینان سے حضرت رسول کریمؐ کے احکام کی تعمیل کے بعد مدینے کا قصد کیا۔

حضرت رسول کریمؐ کو آپ سے غائت درجہ محبت تھی اور شیرِ خدا (شیرِ خدا حضرت علیؓ کا خطاب تھا) خدا اور رسولؐ کے سچّے عاشق اور جاں نثار تھے۔

آپ حد سے زیادہ نیک، منکسر مزاج، محنتی، سخی اور عبادت گزار تھے۔ کسی سائل کا سوال رد نہ کرتے۔ اگر اپنے پاس نہ ہوتا تو قرض لے کر اُس کی ضرورت پوری کر دیتے۔

آپ بڑے عالم، فاضل، فصیح، بلیغ اور دانش مند تھے۔ رسول صلعم سے تربیت پائی تھی۔ قرآن اور حدیث پر اُن کی نگاہ تھی۔ اس لیے آپ کی رائے صائب مانی جاتی تھی کیوں نہ مانی جاتی "علی بابھا" کی حدیث قدسی سب کی نظروں کے سامنے تھی۔ فقہ، سیاست، غزوات[1] و محاربات[2] سب میں آپ کا مشورہ مفید اور آپ کی رائے ٹھوس ہوتی، دقیق[3] سے دقیق مسائل[4] کو آپ فوراً حل کر دیتے۔ زمانۂ نبویؐ کے بعد تینوں خلفائے اسلام (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ) کے زمانے میں آپ ان کے مشیر کار[5] رہے اور ہر معاملے میں اُن کو نیک مشورے دیتے رہے۔

اپنی خلافت کے دور میں بھی آپ کی سادگی، انکساری، حلم[6]، بُردباری، عفو[7]، درگزر، رحم اور حسنِ سلوک[8] کا وہی حال رہا۔ آپ کو مال و دولت اور جاہ[9] و منزلت کی کبھی خواہش نہ ہوئی اور نہ ان کی تلاش و جستجو کی۔ رسولؐ نے آپ کو "بوترابؓ" کا خطاب دیا تھا۔ وہ ہمیشہ "بوتراب[10]" ہی رہے۔

آپ ولایت کا سرچشمہ ہیں۔ تمام سلسلے آپ ہی پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ شیروں کے شیر اور دلیروں کے دلیر تھے۔ لیکن آپ کی شجاعت اور دلیری سب اسلام کے لیے وقف تھی۔ اپنے نفس اور اپنی ذات کے نفع کے لیے آپ نے کبھی اس کا سہارا نہ لیا۔

امیر المومنین ہونے کے باوجود آپ کا لباس سادہ رہا آپ کی غذا سادہ رہی۔ غریبوں کی امداد سے آپ کو سچّی مسرّت حاصل ہوتی۔ کبھی چٹائی پر اور کبھی زمین ہی پر سو جاتے، باغ لگاتے، اُس میں پانی سینچتے۔ غلام کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹاتے۔ محتاجوں کو اپنا کھانا کھلا دیتے اور خود بھوکے رہ جاتے اور پیشانی پر شکن تک نہ آتی۔

لیکن افسوس اسلامی تہذیب و تمدّن کا یہ علَم بردار اپنی مثال آپ ہونے کے باوجود ظالموں کی عداوت سے نہ بچ سکا۔ خدا کے گھر یعنی مسجد میں حالتِ نماز میں ابن ملجم شقی کے ہاتھوں زخمی ہوئے۔ جب آپ کے قاتل کو گرفتار کر کے آپ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اپنے دونوں بیٹوں (حضرت حسنؓ، حسینؓ) کو ہدایت کی کہ تم جو کھاؤ وہی اس کو کھلانا، اگر میں بچ گیا تو جو مناسب فیصلہ ہوگا کروں گا۔ اور اگر میں نہ بچوں تو تمھیں بھی صرف تلوار کی ایک ہی ضرب لگانے کا اختیار رہے، اس لیے کہ اس نے بھی مجھے صرف ایک ہی وار میں اس حال کو پہنچایا ہے۔

افسوس ہے یہ شیرِ خدا، ولی با خدا، اسلام کا علَم بردار، رسول خداؐ کا رضا کار ظالم کی زہریلی تلوار کی تاب نہ لا سکا اور جام شہادت پی کر اپنے خدا اور رسولؐ سے جا ملا

---

(۱) "غزوات" مذہبی لڑائیاں (۲) "محاربات" جنگیں (۳) "دقیق" مشکل ترگہرے (۴) "مسائل" مسئلہ کی جگہ (۵) "مشیر کار" کام میں مشورہ دینے والے (۶) "حلم" برداشت، تحمّل (۷) "عفو" معاف کر دینا (۸) "حسن سلوک" اچّھا سلوک (۹) "جاہ" مرتبہ، دبدبہ، منزلت۔ درجہ (۱۰) "بوتراب" مٹی کے باپ یعنی انتہائی منکسر مزاج (یہ خطاب رسول کریمؐ نے حضرت علی کو دیا تھا۔

● ماں ۔" دیکھو نازیہ ! یہ چاروں آم آج ہی نہ کھا لینا ۔ دو کل کے لیے اٹھا رکھنا ۔"
نازیہ ۔" امی ! آپ تو آج تک سمجھاتی آئی ہیں کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑا کرو ۔"

عطیہ صدیقی ۔ گونڈہ

● ہوٹل منیجر نے گاہک سے پوچھا آپ ان چمچوں کو کیوں دھو رہے ہیں ۔ یہ کام آپ کا نہیں ہے ۔
گاہک نے کہا : واہ صاحب واہ اگر میں چمچے نہیں دھوؤں گا تو میری جیب خراب ہو جائے گی ۔

محمد ہارون کیرانہ شاپ مالیر کوٹلہ

● جیلر (قیدی سے) تمھیں جیل میں کوئی شکایت ہے ؟
قیدی : جی ہاں ! باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے ۔
جج (ملزم سے) تمھیں سزائے موت دی جاتی ہے ۔
ملزم (خوش ہوتے ہوئے) یا خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پھانسی کی سزا تو نہیں ملی ۔

الوالعامر ۔ بوتدھیا ۔ گونڈہ

● ایک دن ننھے میاں کو باپ کی جوانی کی تصویر مل گئی جو الماری میں پڑی تھی وہ بھاگے بھاگے ماں کے پاس گئے اور پوچھا :
"امی یہ صاحب کون ہیں"؟ ماں نے فخریہ انداز میں کہا : " بیٹے تمھارے ابو ہیں" ، ننھے میاں یہ سن کر بڑے حیران ہوئے بولے ۔
" اگر یہ ابو ہیں تو پھر وہ گنجے سے عینک والے بوڑھے سے کون صاحب ہمارے گھر میں رہتے ہیں ؟

اقبال حسین پتیانہ کلٹی

● استاد : بتاؤ ہاتھی کہاں پائے جاتے ہیں ؟
شاگرد : سر ہاتھی اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کے کھوئے جانے کا سوال ہی نہیں ہوتا ۔

● ایک جاگیر دار نے موٹر خریدی ۔ ان کے صاحبزادے کو لمبے سفر کا شوق ہوا ۔ چلتے وقت باپ سے کہنے لگے دعا کیجیے گا کہ میں صحیح سلامت واپس آجاؤں اور کوئی حادثہ پیش نہ آئے ۔
باپ نے کہا : میں دعا کرتا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ میری دعا صرف ۲۵ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار کا ساتھ دیتی ہے زیادہ کا نہیں ۔

سلیم انور گملا ۔ رانچی

● ایک بادشاہ کو بزرگوں کی نشانیاں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا ۔ اس نے اپنی سالگرہ کے موقع پر تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دے دیا ۔ تمام قیدی جانے لگے ۔ آخر میں ایک بوڑھا قیدی آیا ۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا " بابا تم کب سے قید ہو" ۔ قیدی نے جواب دیا ! " حضور آپ کے دادا کے وقت سے" ! اسے فوراً بند کر دو" بادشاہ نے حکم دیا "میں اپنے بزرگوں کی کسی نشانی کو ضائع نہیں کرنا چاہتا" ۔

قمرالعارفین مضطر ۔ ہسپورہ ۔ اورنگ آباد

● ماں (بیٹے سے) ارے یہ کیا ؟ کیچڑ سے سارے کپڑے خراب کر لیے ۔
بیٹا : کیا کرتا ماں ! جب میں گر گیا تب مجھے کپڑے اتار کر رکھنے کا موقع ہی نہیں ملا ۔

شگفتہ جاوید ۔ ڈالی گنج ۔ لکھنؤ

● عاصم (زیبرا دیکھ کر ابو سے) ابو یہ کیا ہیں ؟
ابو : یہ گدھے ہیں جن کو سویٹر پہنا دیا گیا ہے ۔

ماجد ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

بچوں کی کوششیں

فرض کی پکار

"اگر میں صحیح وقت پر گاؤں نہ پہنچ سکا ؟ تو...... تو..... میری ماں مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی جائے گی.... ان دوائیوں کا گیارہ بجنے سے پہلے گاؤں پہنچنا ضروری ہے۔ لیکن اب جب کہ پونے گیارہ ہوا ہی چاہتے ہیں اور میں گاؤں سے بیس میل دور ہوں. اگر ایک منٹ میں ایک میل بھی طے کر دوں تو بھی اپنی ماں کے پاس نہ پہنچ سکوں گا اور پھر یہ تو پہاڑی علاقہ ہے ...... سانپ کی طرح لہراتے ہوئے یہ راستے .... جن پر اگر کار چلاتے وقت احتیاط نہ برتی جائے ـــ تو اگلے لمحے کار کسی کھڈ کی گہرائی میں گم ہو جائے گی...... اور پھر وہی کھڈ میری قبر بھی بن سکتی ہے" عرفان یہی سوچتا ہوا کار کا اسٹیرنگ وھیل سنبھالے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اس کے دماغ میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی کہا تھا کہ اگر یہ دوائیاں ایک گھنٹے کے اندر اندر مریضہ کو نہ ملیں تو پھر..... نہیں نہیں میں ایسا نہ ہونے دوں گا ـــ میں ایسے اپنی ماں کو مرنے نہیں دوں گا کیا میرا کوئی فرض نہیں بنتا کہ اپنی اس ماں کے لیے جس نے لاکھوں مصیبتیں اور دکھ جھیل کر مجھے اس قابل بنایا ـــ مجھے پھولوں پر سلا کر خود کانٹوں پر سوئی۔ اس ماں کے لیے جس نے انتہائی صبر و تحمل سے کام لے کر زندگی کی اس آزمائش کو پورا کیا .... جسے کرنے کا حوصلہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے ـــ یہ نہیں ہو سکتا ـــ میری ماں بغیر دوائیوں کے نہیں مر سکتی ـــ میں وہاں جلدی پہنچ جاؤں گا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا ـــ ماں سن میں آ رہا ہوں ـــ میں آ رہا ہوں ـــ آ رہا ہوں"

اس کے ساتھ ہی اس نے کار کی سپیڈ بڑھا دی ـــ اب کار نہایت تیز رفتاری سے فاصلہ طے کر رہی تھی۔ لیکن گھڑی کی سوئی کار سے بھی تیز بھاگتی محسوس ہوئی ـــ اس نے کار کو فل اسپیڈ پر چھوڑ دیا۔ کار کی رفتار خطرناک حد کو بھی پار کر چکی تھی اور پھر ایسے ہی لمحے جب کار پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ سامنے سے ایک ٹرک نمودار ہوا۔ ٹرک دیکھ کر تو جیسے اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے جلدی سے بریک پیڈل پر دباؤ ڈالا لیکن کار کی رفتار میں ذرہ بھر کمی نہ ہوئی اس نے پھر دباؤ ڈالا اور وہ بریک پیڈل پر دباؤ ڈالتا ہی چلا گیا۔ لیکن بے سود۔

"اوہ ـــ! بریک فیل ہو چکے ہیں" اس نے دل میں سوچا اور اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے موتی جھلک اٹھے۔

اس نے اپنی کار کو بائیں ہاتھ کر لیا اور اسی سمت چلانے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ ٹرک بالکل نزدیک آ چکا ہے تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن یہ کیا ـــ! ٹرک 'شوں' کی آواز کے ساتھ کار کے بالکل ساتھ سے گزر گیا۔ عرفان نے سوچا "اب کی بار بچ گیا ہوں لیکن آج تو موت یقینی ہے ماں۔! آج تو لگتا ہے کہ ہم دونوں کی اوپر اللہ میاں کے پاس جا کر ہی ملاقات ہو گی ـــ" یہ سوچتے ہوئے عرفان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور وہ کسی نادان بچے کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

کار اسی ہوا کی سی تیزی سے فراٹے بھرتی ہوئی بھاگ

رہی تھی۔ جس راستے سے کار اب گزر رہی تھی وہ ڈھلوان راستہ تھا جہاں پر کار کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی اور ہر لمحہ کار کے الٹنے کا اندیشہ تھا۔

عرفان کو یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ زندہ اپنی ماں کے پاس نہیں پہنچ سکے گا۔ اپنے انجام کو یاد کر کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے بار بار اپنی بیمار ماں کا چہرہ آنے لگا۔ عرفان کو اپنی ماں کی آنکھوں میں حسرت و نا امیدی کے سائے صاف نظر آئے۔

اچانک اسے سامنے لیول کراسں دکھائی دیا۔ گاڑی کے آنے کا وقت ہو چکا تھا اس لیے اور بھی دو تین کاریں لیول کراس کے اس پار کھڑی تھیں جدھر سے عرفان کی گاڑی آرہی تھی۔

عرفان کو اب بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اب جب کہ کار تیز رفتاری سے فاصلہ طے کر رہی تھی اور سامنے لیول کراس (ریلوے پھاٹک) پر دو تین کاریں رکی ہوئی تھیں۔ اسی لیول کراس کے اس پار اس کا گاؤں تھا۔ اس نے سوچا کہ اب تو بچنے کی کوئی بھی صورت نظر نہیں آتی میری گاڑی دوسری کاروں سے ٹکرائے گی اور ایک دھماکہ ہوگا۔ پھر ــــ کچھ نہ بچے گا۔

جوں جوں کار لیول کراس سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی عرفان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ چلانا چاہتا تھا لیکن آواز اس کے حلق سے نکل نہیں رہی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح کار کے شیشوں پر ہاتھ مارنے لگا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ہی دوائیوں کا تھیلا پڑا ہوا تھا۔ عرفان حسرت بھری نگاہوں سے تھیلے کو تکے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا، ہونٹ خشک ہو چلے تھے اور وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

اب جبکہ کار لیول کراس سے بیس میٹر کے فاصلے پر تھی۔ اچانک عرفان نے دوائیوں کا تھیلا اٹھایا ــــ ادھر ریل گاڑی بھی اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔ اور لیول کراس کی طرف بڑھ رہی تھی کار کا دروازہ کھولا اور باہر کود گیا۔ وہ اوندھے منہ نیم پتھریلی زمین پر گر پڑا۔ کار ایک زبردست دھماکے کے ساتھ لیول کراس سے ٹکرائی اور آگ نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

چند لمحے عرفان اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا۔ دوسری گاڑیوں کے ڈرائیور اور لوگ اسے حیرت سے تک رہے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ شخص آگے بڑھا اور عرفان سے بغل گیر ہو کر کہا "خدا تمہیں تمہاری نئی زندگی میں کامیابی عطا کرے"۔ عرفان نے اس کی باتیں ان سنی کرتے ہوئے جلدی سے دوائیوں کا تھیلا اٹھایا ــــ گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بجنے میں پانچ منٹ رہتے تھے۔ یہ فاصلہ اس کو دس منٹ سے بھی کم وقت میں طے کرنا تھا۔ اور وہ ریلوے لائن پار کرنے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی دائیں ٹانگ میں تھوڑا فریکچر ہو گیا تھا۔ لیکن اسے اس کی پروا نہ تھی وہ جلد سے جلد اپنی ماں کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

اب وہ گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ بھاگتا بھاگتا گھر میں داخل ہوا۔ تو ڈاکٹر اس کی ماں پر جھکا ہوا نبض دیکھ رہا تھا۔ عرفان کو آتے دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بڑھا اور دوائیوں کا تھیلا جھپٹنے کی سی حالت میں پکڑا اور اپنا ٹریٹمنٹ شروع کر دیا۔

آدھے گھنٹے کے وقفے کے بعد عرفان کی ماں کو ہوش آیا۔

عرفان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا "مسٹر عرفان ــــ! اب آپ کی ماں بالکل ٹھیک ہے"۔ اور پھر دوائیاں دے کر ڈاکٹر رخصت ہو گیا۔ اس وقت عرفان اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا اور خوش قسمت انسان تصور کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی رقص کر رہی تھی۔ ــــ آج اسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنی ماں کو بچا کر اپنا فرض نبھایا ہے۔

محمد شکیل راوت
مکان ۳۹۷ محلہ کچلہ کوٹ مالیر کوٹلہ
پنجاب ۱۴۸۰۲۳

اندھی تقلید کا نتیجہ

ایک گاؤں میں ایک نمک اور ایک کپڑے کے سوداگر کا مکان

تھا۔ گاؤں کے کنارے ایک ندی تھی جس میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پانی رہتا تھا۔ سوداگر کے یہاں بازار سے سامان لانے کے لیے دو گدھے تھے۔ ایک روز سوداگر اپنے دونوں گدھوں کو لے کر بازار کی طرف روانہ ہوا۔ بازار پہنچ کر اس نے کپڑے کے دو تھان خریدے اور نمک کے دو بورے بھی — ایک گدھے پر نمک کے بورے لادے اور دوسرے پر کپڑے کے تھان۔ جب وہ بازار سے لوٹ رہا تھا تو راستے میں ایک گدھا جس پر نمک کا بورا لدا تھا۔ دوسرے گدھے سے بولا "بھئی مدد کرو، ورنہ میری حالت راستے میں خراب ہو جائے گی۔" لیکن دوسرے گدھے نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ خیر وہ بیچارہ کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ گیا۔ لیکن وہ اس کا بدلہ لینے کی کوشش میں لگ گیا۔

دوسری دفعہ جب وہ مال لانے کی غرض سے گدھے کے ساتھ بازار گیا اور جب وہ لوٹ رہا تھا تو اس گدھے نے جس پر سوداگر نمک لادا کرتا تھا ندی میں پہنچ کر اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے پانی میں ڈبکی لگائی۔ جس سے سارا نمک گھل کر بہہ گیا اور وہ آسانی سے چلنے لگا۔

دوسرے گدھے نے سوچا کہ میں بھی اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے کیوں نہ پانی میں غوطہ لگا دوں۔ جب اس نے غوطہ لگایا تو کپڑے کے تھان بھیگ کر اور بھی وزن دار ہو گئے۔ بے چارا گدھا پریشان ہو گیا۔

صداقت حسین (پپو)
رحمت نگر برہانپور

دعا کا اثر

دراصل اس کو دعا سے چڑ بھی تھی وہ ہمیشہ سے یہی سمجھتا تھا کہ دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو کیوں غلام بنائے کیونکہ لوگ دوسروں کو اپنا غلام بنا کر بڑے دھونس سے کام لیتے ہیں۔ وہ ہر وقت اسی سوچ میں رہتا تھا۔ کبھی کسی کام کے بارے میں سوچتا کہ یہ کام اچھا رہے گا کبھی کسی دوسرے کام کے بارے میں خیال کرتا کہ یہ اچھا رہے گا۔ آخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ اس نے ایک کشتی خرید لی اور اب ندی کے پاس صبح آتا اور شام کو اپنے گھر جاتا۔ اس میں وہ بہت خوش تھا۔ نہ کسی کی ڈانٹ کھانے کو ملتی اور نہ ہی کسی کی دھونس برداشت کرنا پڑتی۔ یہ تو اپنا کام تھا جب دل چاہا چلے گئے اور جب دل چاہا لوٹ کر آ گئے۔ اس کام میں اس کو بہت فائدہ تھا۔ اس کو منہ مانگے پیسے مل جایا کرتے تھے۔ پیسوں کو دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔

ایک دن کیا ہوا کہ اچانک اس کی کشتی زبردست بھنور میں پھنس گئی کشتی ہچکولے کھانے لگی کشتی کے مسافر رونے چلانے لگے وہ خود بھی پریشان ہوا تھا اس نے اللہ سے رو رو کر دعا مانگی کہ اے اللہ میری عزت رکھ کیونکہ میرے مسافروں کو مجھ پر بھروسا ہے تو چاہے تو میری جان لے لے میں اکیلا ہوں لیکن کشتی کے مسافروں کو بچا دے۔ بس اس کا اتنا کہنا تھا کہ کشتی خود بخود بھنور سے نکل کر بڑے آرام سے چلنے لگی۔ وہ خوش تھا، کشتی کے مسافر خوش تھے سب کے سب اللہ کا شکر بجا لائے اسی لیے کہتے ہیں کہ جب ہم دوسروں کے لیے بھلا کریں گے تو خدا ہمارا بھلا کرے گا۔

اور جو سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں ان کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اس لیے ہم سب پیامی بہنیں اور بھائی مل کر اپنے مکتبہ اور پیام تعلیم کے لیے سچے دل سے دعا کریں کہ اللہ پاک ہم سب معصوم بچوں کی دعا سے مکتبہ اور پیام تعلیم کو ترقی دے آمین۔ اور اپنا سر خدا کے آگے جھکاتے رہیں آمین۔

بدر فاطمہ
E 95 کوارٹر باغ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کہانی ایک گھوڑے کی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک انیمچی اپنے نوکر انیمچی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر سفر کے لیے نکلے۔ کچھ دور سفر کرنے کے بعد وہ ایک جگہ ٹھہر گئے تاکہ ناشتہ وغیرہ کر کے اور تازہ دم

ہو کر پھر چلیں۔ انھوں نے گھوڑے کو قریب کھڑے درخت سے باندھ دیا۔ جب مالک اور نوکر دونوں نے افیون کھالی تو چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ افیمی مالک نے افیمی نوکر سے کہا۔

"دیکھ بھائی کچھ بھولنا نہیں ہوشیار رہنا کیوں کہ ہم سفر میں ہیں"

مالک کی بات سن کر نوکر بولا۔

"صاحب بھولنے کا کیا سوال ہے جہاں تک میرا خیال ہے کہ آپ کے پاس افیون کا ڈبّہ ہے اور میرے پاس حقّہ اور کوئلوں کی تھیلی"

الغرض وہ دونوں اپنی منزل کی طرف چل نکلے چند قدم چلنے کے بعد مالک نے نوکر سے پھر کہا۔

"کیوں بھائی کچھ بھولے تو نہیں؟ دیکھو مجھے کچھ شک ہو رہا ہے اب بھی موقع ہے رک کر دیکھ لو"

نوکر نے جواب دیا۔

"صاحب آپ کو تو خواہ مخواہ کچھ وہم ہو گیا ہے۔ میرا سامان میرے پاس ہے اور آپ کا سامان آپ کے پاس، پھر کچھ بھولنے کا کیا سوال ہے"۔ اس بات چیت کے بعد وہ دونوں پھر چل کھڑے ہوئے اور آخر کار ایک شہر کی سرائے میں پہنچ گئے اور سرائے کی بھٹیارن سے بولے۔

"اے بھٹیارن جلدی سے کھانے۔ دانے اور گھاس کا انتظام کر کیونکہ ہم لوگ افیمی ہیں ہم کو بھوک اور پیاس برداشت نہیں"

بھٹیارن نے یہ فرمایش سن کر دانہ اور گھاس منگوائی اور کھانا پکانے میں لگ گئی۔ کچھ دیر بعد بھٹیارن کو خیال آیا کہ میاں صاحب نے دانہ اور گھاس تو منگوا لیا پر ان کا گھوڑا تو کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید تھکن کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو، شام ہو گئی تب بھٹیارن نے پوچھا۔

"اے دانہ گھاس میرے پاس تیار رکھا ہے۔ اور تیرا گھوڑا ابھی تک نہیں آیا۔ اس کا کیا مطلب ہے۔

افیمی نوکر نے جب یہ بات سنی تو اس کے تو ہوش ہی اڑ گئے اور دل میں کہنے لگا "واقعی میاں سچ کہہ رہے تھے کہ کچھ بھولے تو نہیں معلوم ہوتا ہے کہ شاید گھوڑا ہی بھول آئے"

آخر کار افیمی نوکر اپنے مالک کے پاس گیا اور بولا۔ غضب ہو گیا حضور بھٹیارن پوچھ رہی ہے تمھارا گھوڑا کہاں ہے۔ دانہ گھاس خراب ہو رہا ہے۔

نوکر کی بات سن کر مالک نے غصّہ ہو کر کہا۔

"کیوں بے گدھے میں نہ کہتا تھا کہ کچھ بھولے ہیں آخر کو میرا کہا سچ ہوا"

"ہاں حضور آپ نے سچ ہی کہا تھا" نوکر نے منہ لٹکا کے جواب دیا۔ غرض وہ دونوں الٹے پاؤں گھوڑے کی تلاش میں دوڑ پڑے۔

محمد نسیم حسین

ڈاک خانہ بھونگام ضلع مین پوری۔ یو پی

ایک خواب حقیقت

سلیم آج بہت خوش تھا۔ وہ صبح سے اخبار کا انتظار کر رہا تھا کیوں کہ آج مڈل کے امتحانات کا رزلٹ نکلنے والا تھا۔ سلیم سوچ رہا تھا کہ امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے گا۔ تو اسے نہ جانے کتنے کھلونے ملیں گے۔ طرح طرح کی مٹھائیاں کھانے کو ملیں گی۔ ابّا، امّاں، دادا، دادی چچا سبھی نے تو اس کی کامیابی پر کھلونوں اور مٹھائیوں کا وعدہ کیا تھا۔ پھر مبارکباد دینے والوں کی گھر میں ایک قطار سی لگ جائے گی۔ اس نے سوچا وہ ایک کھلونا بھی کسی کو نہیں دے گا۔

وہ کچھ اس طرح کے خیالات میں مگن تھا کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ سامنے اخبار والا اخبار لیے کھڑا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں عجیب سی ہلچل مچی تھی۔ اول درجہ میں آنے کی امید تو تھی ہی خدا خدا کر کے اس کا رول نمبر مل گیا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا تھا یہ خوش خبری گھر کے اندر لوگوں

کو سنائی۔ یہ خبر گھر اور محلے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ کچھ ہی دیر میں مبارک بادیوں کا تانتا بندھ گیا۔ حسب وعدہ لوگوں نے کھلونے اور تحفے سلیم کی شاندار کامیابی پر پیش کیے۔ سلیم خوشی سے پھولا نہ سمار ہا تھا۔ اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ان تحائف میں ایک پارکر قلم بھی تھا۔ جو اس کے والد نے اسے دیا تھا۔

سلیم کا ایک چھوٹا بھائی تھا راشد۔ وہ بھی اپنے بھائی کے پاس سارے کھلونے دیکھ کر پھولا نہیں سمارہا تھا مگر اس کی خوشی جلد ہی کافور ہو گئی۔ راشد سلیم کی کوئی بھی چیز مانگتا تو سلیم دینے سے صاف انکار کر دیتا۔ جب سلیم اپنے دوستوں کے ساتھ باہر چلا گیا تو راشد سلیم کا نیا قلم لے کر کوٹھے پر چلا گیا اور اس سے لکھنے لگا۔ جب سلیم کھیل کر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ قلم نہیں ہے، وہ سمجھ گیا کہ یہ کام راشد کا ہے۔ پورے گھر میں اسے راشد کہیں نہ ملا۔ آخر وہ تھک ہار کر چھت پر گیا تو اسے وہاں راشد مل گیا۔ راشد کو اپنے قلم سے لکھتے دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ غصے میں آ کر اس نے راشد کو ایک ہاتھ جڑ دیا۔ اور اس سے قلم چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ راشد کی کوشش تھی کہ قلم اسے نہ دے اس کشمکش میں دونوں آگے پیچھے ہوتے ہوئے چھت کے کنارے پر پہنچ گئے اور پتا نہیں کیا ہوا کہ راشد چھت سے نیچے جا گرا۔ سلیم کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی معمولی سی بات کے لیے اتنا سنگین معاملہ ہو جائے گا۔ اس نے سوچا کہ اگر اتنے سارے تحفوں میں سے دو چار چیزیں اپنے چھوٹے بھائی کو دے دیتا تو کون سی آفت آجاتی؟ آخر راشد اس کا سگا بھائی تھا۔ چھوٹا سا پیارا پیارا! اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ نیچے جا کر بھائی کی حالت کو دیکھتا۔ بس وہ دل کی گہرائیوں سے دعا مانگ رہا تھا کہ اے اللہ تو میرے پیارے بھائی کو خیریت سے زندہ سلامت رکھ۔ اللہ کرے اسے کچھ نہ ہو تو پھر میں اپنے تمام کھلونے اس کے حوالے کر دوں گا اور زندگی میں پھر کبھی اس سے نہیں لڑوں گا۔

مگر یہ کیا! سلیم تو اپنے بستر پر پڑا تھا اور اس کے بازو میں سویا ہوا راشد پلنگ کے نیچے گر گیا تھا اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور پلنگ سے کود کر والہانہ انداز میں راشد کو چومنے لگا۔ اس کا رزلٹ تو آج نکلنے والا تھا اس نے عہد کر لیا کہ اس کی کامیابی پر ملنے والے تحائف میں ہر وہ چیز راشد کی ہوگی جس کی وہ خواہش کرے گا۔

راشد این۔ پی گڈو
نبی منزل۔ محلہ سبری۔ نالندہ (بہار)

میرے دادا

لاٹھی ٹیک چلا کرتے
باغوں میں گھوما کرتے
کرتے رہتے کام سدا
میرے دادا میرے دادا

کرسی پر جم جاتے ہیں
پھر یہ حکم سناتے ہیں
حقّہ بھر کر لا ذرا جا
میرے دادا میرے دادا

سب میں گھل مل جاتے ہیں
قصّے نئے سناتے ہیں
وعدہ کرتے ہیں پورا
میرے دادا میرے دادا

غم میں مسکراتے ہیں
آگے قدم بڑھاتے ہیں
چاہے جیسی ہو بادھا
میرے دادا میرے دادا

عطیہ صدیقی
۵۲۳ ہاؤسنگ کالونی گونڈہ۔ یوپی ۔ ۲۷۱۰۰۱

اولیات حضرت صدیق اکبرؓ

۱۔ آنحضرتؐ کو نبوت ملتے ہی حضرت صدیق اکبرؓ نے سب سے

پہلے اسلام قبول کیا اور آنحضرتؐ سے کوئی معجزہ طلب نہیں کیا۔

۲۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اسلام میں عوام کے آگے سب سے پہلے خطبہ دیا۔

۳۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اسلام لانے کے بعد اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنائی۔ یہ پہلی مسجد ہے جو اسلام میں بنائی گئی۔

۴۔ جب آنحضرت کو معراج ہوئی تو سب سے پہلے صدیق اکبرؓ نے تصدیق کی۔

۵۔ حضرت صدیق اکبرؓ پہلے بزرگ ہیں جن کے حکم سے قرآن جمع کیا گیا۔

۶۔ حضرت صدیق اکبرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قرآن کا نام مصحف رکھا۔

۷۔ حضرت صدیق اکبرؓ کو اسلام میں سب سے اوّل لقب ملا (یعنی صدیق)

۸۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے سب سے پہلے آنحضرتؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔

۹۔ حضرت صدیق اکبرؓ سب سے پہلے مجاہد ہیں جو آنحضرت کی جانب سے کفار سے لڑے۔

۱۰۔ حضرت صدیق اکبرؓ سب سے پہلے ایسے خلیفہ ہیں جن کو باپ کی زندگی میں خلافت ملی

محمد ارشاد عالم

اُدگانواں (نالندہ)

کیاآپ جانتے ہیں؟

قرآن مجید میں کونسا حرف کتنی بار استعمال ہوا ہے

حرف	تعداد	حرف	تعداد
ا	۴۸۸۷۲	ج	۲۲۷۲
ب	۱۱۴۲۸	ح	۹۷۳
ت	۱۱۹۹	خ	۲۴۱۶
ث	۱۲۷۶	د	۵۶۰۲
ذ	۴۶۷۷	ف	۸۴۹۹
ر	۱۱۷۹۲	ق	۶۸۱۳
ز	۱۵۹۰	ک	۹۵۰۰
س	۵۹۹۱	ل	۲۴۳۲
ش	۲۱۱۵	م	۳۶۵۶۵
ص	۲۰۱۲	ن	۴۰۱۹۰
ض	۱۲۰۷	و	۲۵۵۳۶
ط	۱۲۷۷	ہ	۱۹۰۷۰
ظ	۸۴۲	لا	۳۷۲۰
ع	۹۲۲۰	ی	۴۵۹۱۹
غ	۲۲۰۸		

نواب عتیق اطہر زاہدی

رانی گنج اردو ہائی اسکول (رانیگنج)

چار بے وقوف اور ایک بڑھیا

ایک تھی بڑھیا، نیک سیرت اور خوب صورت، ایک بار وہ کسی کام سے بازار گئی۔ اتفاق ہی کہیے کہ اس نے سر کھجانے کے لیے ہاتھ اٹھایا اسی وقت وہاں سے چار آدمی گزر رہے تھے۔ انھوں نے بڑھیا کو ہاتھ اٹھاتے دیکھا تو ان میں سے ایک بول اٹھا۔

"اس نیک سیرت بی بی نے بغیر منہ بولے ہی مجھے سلام کیا ہے"

یہ سن کر دوسرا بولا۔

"اے بے حیثیت! تجھ میں ایسی کیا خوبی ہے جو بڑی بی تجھے سلام کرے گی اس نے تو مجھے سلام کیا تھا"

تیسرے اور چوتھے آدمیوں نے بھی یہی کہا کہ بڑی بی نے انھیں سلام کیا ہے، غرض کہ، اتنی سی بات پر چاروں میں تکرار ہونے لگی۔ بات اتنی بڑھی کہ وہاں بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے، ہجوم میں سے ایک عقل مند آدمی نے کہا۔

"دوستو! تم بے وجہ آپس میں جھگڑتے ہو۔ وہ بڑھیا

ابھی آگے جارہی ہوگی، جاکر اسی سے پوچھو کہ اس نے تم میں
سے کسے سلام کیا تھا۔ ذرا سی بات کو بیکار اتنا بڑھا رہے
ہو۔ یہ معقول بات سن کر وہ چاروں نامعقول دوڑے اور اس
غریب بڑھیا کے قریب پہنچے اور یوں کہنے لگے۔

"اے بڑی بی! ہم چاروں میں سے تم نے کس کو
سلام کیا تھا؟"

یہ بات سن کر بڑھیا دل میں سوچنے لگی، معلوم ہوتا ہے
کہ چاروں شخص بالکل بے وقوف ہیں، اس نے مسکرا کر ان
سے کہا۔

"اے میاں!! تم چاروں میں سے جو زیادہ بیوقوف
ہوگا اسی کو میں نے سلام کیا ہوگا۔"

پہلے بے وقوف کی کہانی

بڑی بی کی بات سن کر ان میں سے ایک بے وقوف
بولا۔

"بڑی بی! میں ایک مرتبہ اپنی سسرال گیا۔ وہاں لوگوں
نے کھانے کے وقت مجھ سے کہا! کچھ کھالو پھر اطمینان
سے آرام کرو۔ مجھ بدقسمت کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ میں
تو اپنے گھر سے کھانا کھا کے آیا ہوں۔ بے چاروں نے
بہت خوشامد کی کہ تھوڑا بہت کھالو۔ لیکن میں راضی نہ
ہوا اس لیے کہ اپنی بے وقوفی سے پہلے انکار کرچکا تھا۔
اور اب اپنی اس حماقت کو نبھانا بھی تھا، غرض کہ بیچارے
سب چپ ہورہے اور میں بھوکا ہی سوگیا۔ تھوڑی ہی
رات گزری تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ بہت زوروں کی بھوک
لگ رہی تھی، اب جو میری شامت آئی تو میں نے یہ انوکھی
حرکت کی کہ بھیس بدلا اور چپکے سے دروازہ کھول کر بھیک
مانگنے کے ارادے سے باہر نکل گیا اب دیکھیے کہ ایک
گھر سے دوسرے گھر ٹکڑے مانگتا مانگتا اپنی ہی سسرال
کے دروازے پر آپہنچا اور بھیک کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ اندر
سے ایک ملازمہ جس کا نام چنبلی تھا، روٹی کا ٹکڑا لے کر
باہر نکلی۔ میں نے جو اُسے پہچانا کہ یہ تو ہماری نوکرانی ہے
اور یہ دروازہ بھی اپنی ہی سسرال کا ہے تو وہاں سے پچھلے
پاؤں ہٹنا شروع کیا۔ نوکرانی بھی روٹی دینے کے لیے برابر
آگے بڑھتی رہی جوں جوں میں پیچھے ہٹتا وہ آگے بڑھی چلی
آتی تھی اور یہ کہتی تھی۔

"ارے فقیر! تو روٹی کا ٹکڑا کیوں نہیں لیتا؟"

اب قسمت کا کرنا یہ ہوا کہ میں پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک کنویں
کے کنارے آگیا اور دھڑام سے کنویں میں گر پڑا۔ میرے
کنویں کے اندر گرتے ہی شور مچ گیا کہ کوئی غریب قسمت
کا مارا فقیر کنویں میں گر پڑا۔ آخر کار لوگوں نے نہایت محنت
کے بعد مجھے کنویں کے اندر سے نکالا اور سبھوں نے پہچان
لیا کہ یہ تو فلاں کا داماد ہے۔ ارے!! اس کی یہ کیا کم بختی
تھی جو یہ اس پُرملامت حالت میں گرفتار ہوا۔

غرض کہ اس ذلت اور ندامت کی وجہ سے آج کے
دن تک میں نے پھر کبھی سسرال کا نام لیا اور نہ کبھی ادھر کا
رخ کیا۔ سو بڑی بی! یہ تھی میری بے وقوفی جو میں نے بیان
کی۔" بڑی بی نے یہ قصہ سن کر کہا۔

"بہت خوب! آفریں مرحبا!"

دوسرے بیوقوف کی کہانی پھر کبھی.......

ایم انور عادل عثمانی
محلہ بتیانہ۔ کلنی۔ بردوان

صحیح حل معمہ ۹

(۱) دو۔ نبیوں کے قصے ص۳۳ (۲) اچانک یغما فرشتہ ص۴۵
(۳) سورج۔ شفیع الدین نیر ص۱۲ (۴) نمک۔ میرانیس ص۶۹
(۵) لفافہ۔ جدید پہیلیاں ص۸ (۶) عرب۔ قرآن پاک کیا ہے ص۴۱ (۷) لطف۔ کھیل سنسار ص۹ (۸) تنہائی۔ صحت کے ۹۹ نکتے ص۶۔

نتیجہ پیامی ادبی معمہ ۹

بالکل صحیح حل پر پہلا انعام پانے والے ۱۲ خوش نصیب

فی کس ۸/۵۱ روپے تقسیم کیے گئے

۱۔ محمد خلیل اللہ شریف مکان ۱۶/۱۸۲-۲-۱۸۲ رنجیت پورہ حیدرآباد
۲۔ محمد رحیم اللہ شریف مکان ۱۶/۱۸۲-۲-۱۹۔ رنجیت پورہ حیدرآباد
۳۔ محمد سلیم شریف مکان ۱۶/۱۸۲-۲-۱۹۔ رنجیت پورہ حیدرآباد
۴۔ گل صنوبر اطفال بکڈپو ۱۴۴ محمد علی روڈ مالیگاؤں (ناسک)
۵ رضیہ سلطانہ ۳۶۸ نیو وارڈ مالیگاؤں (ناسک)
۶۔ عبدالمجید مدرسہ اسلامیہ پوسٹ رفیع گنج۔ اورنگ آباد (بہار)
۷۔ نجم السحر مکان نمبر ۳۶۸ نیو وارڈ۔ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳
۸۔ اسمار خاتون ۱۳۵۰ پہاڑی املی جامع مسجد دہلی ۶
۹۔ رعنا خلیل (۱۰) سایستہ خلیل (۱۱) سید عشرت خلیل ان کا پتا وہی ہے جو اسمار خاتون کا ہے۔
۱۲۔ خلیق احمد کمرہ نمبر ۴۳۹ اے ونگ لیجسلیٹوڈ پارلیمنٹ منسٹری شاسشتری بھون نئی دہلی ۱

ایک غلطی پر دوسرا انعام پانے والے ۱۱ خوش نصیب

فی کس ۴/۵۵ روپے تقسیم کیے گئے

۱۔ نجم السحر اطفال بکڈپو، ۱۴۴ محمد علی روڈ مالیگاؤں۔ ناسک
۲۔ مشتاق احمد۔ ۳۶۸، نیو وارڈ مالیگاؤں۔ ناسک،
۳۔ ہما خانم۔ ۴۔ نور افشاں ۵۔ ملک عنبر۔ (ان سب کا پتا وہی ہے جو مشتاق احمد کا ہے)
۶۔ محمد شاہین اطفال بکڈپو، ۱۴۴ محمد علی روڈ مالیگاؤں۔ ناسک۔
۷۔ نثار تانبے ولد ابراہیم تانبے۔ راج واڑی جہار ضلع رائے گڑھ
۸۔ سعید احمد رضوان گورنمنٹ اردو ہائر پرائمری اسکول آنیکل بنگلور
۹۔ نسیم اسماعیل پرکار مقام پیوا تعلقہ منڈن گڑھ۔ ضلع رتناگری۔
۱۰۔ نوید احمد عمران گورنمنٹ اردو لوئر پرائمری اسکول آنیکل
۱۱۔ ارشد مکان نمبر ۱۳۵۰ پہاڑی املی۔ جامع مسجد دہلی ۶

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں

پیامی ادبی معمہ نمبر ۱۱ کا صحیح جواب

ذیل کی کتابوں میں ہی ملے گا

کتاب	مصنف	قیمت
ننھا فرشتہ	فہمیدہ عتیق	۴/۵۰
رنگوں کی بستی	سہیل انور	۳/۵۰
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں	یوسف ناظم	۲/۰
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۴/۵۰
ایک کھلا راز	مسعود احمد برکاتی	۳/۰
موم کا محل	پروفیسر محمد انیس	۴/=
بہادر	ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۲/۵۰
شیر خاں	〃 〃	۱/۵۰
میر انیس	محمد حسین حسان	۲/=
پہاڑ کی چوٹی پر (ناول)	مرزا ادیب	۵/=
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
دم کٹا سانپ	محمد قاسم صدیقی	۱/=
دادا نہرو	منور لکھنوی	۵/=
سرکار کا دربار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
بھوتوں کا جہاز	شمیم حنفی	۶/=
اس نے کیا کرنہ جانا	آصفہ مجیب	۱/۲۰
بچوں کے افسر	مرتبہ: نور الحسن ہاشمی	۵/=
پیارے رسولؐ	سلطانہ آصف فیضی	۴/۵۰
چمپاوت کا آدم خور شیر	محمد معین	۱/۵۰
مچھیرا اور اس کی بیوی	عبدالواحد سندھی	۲/۵۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۴/۰

کتابیں حاصل کرنے کے پتے

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶
۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
۴۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

پیامی اَدبی مُعمّا نمبر 12

150 روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ کچھ نہیں۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

دفتر پیام تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ

۲۵ر جنوری ۱۹۸۵ء

پہلا انعام: بالکل صحیح حل پر مبلغ 100 روپے۔ دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر مبلغ 50 روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ھی نمبروار لکھیے۔

1. ...میری آنکھ سے ـــــ نکال لو۔ (کنکر / تنکا / نیلم)
2. اس کے بعد وہ ـــــ پور چلے گئے۔ ـــــ سال تک کام سیکھا۔ (جوں / کان / ناگ) (چار / دو / تین)
3. شہزادہ ـــــ تلوار لیے ہوئے آیا اور ـــــ "ہاں اب بتاؤ۔ (کھلی / ننگی) (کہا / پوچھا)
4. اپنے ایک ساتھی سے درخواست کی کہ وہ ـــــ شروع کرے۔ (پڑھنا / تلاوت)
5. تو پھر وہ بدلہ لینے پر ـــــ جاتا ہے۔ (اُڑ۔ تل)
6. چلو اس ـــــ تک دوڑیں۔ (کھمبے / مینار / درخت)
7. آپ ـــــ کر بولے "یوں کہیے سراسر مہمل تھا" (ہنس / مسکرا)
8. ـــــ جنگل گویا آگے تھا۔ (بھیانک / خطرناک)
9. میں نو کل ـــــ کارتوس لایا تھا۔ (چار / دو / تین)

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ صحیح جواب صفحہ ۳۴ کی کتابوں میں ہی ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

ذرا سنیے

انعام کی رقم بذریعہ منی آرڈر اس لیے روانہ کی جاتی ہے کہ آپ ان روپوں سے اچھی اچھی کتابیں خرید کر اپنی ذاتی لائبریری بنائیں۔

(اپنے حل اِس پتے پر بھیجیے)

پیامی ادبی معمّا نمبر 12 ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن ٹائیٹل کے صفحہ ۳ سے کاٹیے۔

ہمارا خراجِ عقیدت —— اتحاد

”ہم سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں، جس کی بندگی ہم مختلف ناموں سے ادا کرتے ہیں۔ اس لئے، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے لازمی اتحاد کو محسوس کریں، اور انسانوں کے درمیان چھوت چھات، برتری اور کمتری کے احساس کو ترک کر دیں۔“

ایسا کہا تھا مہاتما گاندھی نے جنھوں نے اپنی ہستی کمزوروں کے لئے مکمل طور پر وقف کر دی تھی۔ باپو ”پورے سماج کی فلاح“ کے علم بردار تھے۔ سماجی انصاف ہمارا قومی نصب العین ہے، جس کے حصول کے لئے ہم کئی ترقیاتی پروگراموں پر عمل کر رہے ہیں، خاص طور سے 20 نکاتی پروگرام پر۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے لفظوں میں ”ملک کی ترقی کے تمام منصوبوں کا مقصد، اقتصادی بنیاد کو مستحکم بنانا ہے، تاکہ ہم لوگ بتدریج، اور اگر ممکن ہو تو بتعجیل، اپنے ملک سے غربت کا خاتمہ کر دیں، اور اپنے سماج سے اقتصادی پسماندگی کو اکھاڑ پھینکیں۔“

ہمارا عزم —— پسماندگی کا خاتمہ

84/141

بچوں کی دل چسپی کے دو مزیدار ڈرامے۔
یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔
قیمت : ۲/۱۵
گاندھی بابا کی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت: ۴/-
اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
قیمت: ۷/۵۰
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت: ۴/۰۰
کھیل سنسار
سطوت رسول
بچوں کے لیے مترنم بحروں میں لکھے ہوئے دلچسپ گیتوں کا ایسا مجموعہ جسے بچے شوق سے پڑھتے ہیں۔
قیمت: ۴/۵۰
تین اناڑی
عصمت چغتائی
گڈو، بلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔
قیمت ۳/=
ترجمہ
قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمٰن
الٰہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی، لیکن اب تو اس جن کا قصّہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
کہاوت اور کہانی
روز مرّہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت: ۴/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔
قیمت ۱/۵۰
ٹوکن پیامی ادبی معمّا
میں اڈیٹر پیام تعلیم کے ہر فیصلے سے متفق ہوں۔
نام ....
پتہ ....

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage

Regd. No. D(SE)-043 Dec. 1984

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

بچوں کی مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
ہمارا دین (اول، دوم، سوم)	سید شہاب الدین دسنوی (فی حصہ)	۶/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول، دوم)	عبدالواحد سندھی (فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امیر البحر	" "	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اول، دوم)	" " (فی حصہ)	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	" "	۳/۰۰
اسلام کیسے شروع ہوا؟	" "	۴/۵۰
رسولِ پاک	" "	۳/۵۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۳/۰۰
رسولِ پاک کے اخلاق	" "	۳/۰۰
اللہ کے خلیل	" "	۲/۵۰
تحسین القرآن	تالیف: خدیجہ سید طاہر سیف الدین	۳/۵۰
منہاج القرآن	" "	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
عقائدِ اسلام	" "	۱/۵۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
آں حضرتؐ	" "	۱/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۲/۷۵
نبیوں کے قصے	" "	۲/۲۵
ہمارے پیارے رسولؐ	" "	۳/۰۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۳/۰۰
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی	۱/۵۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان	۳/۰۰

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲